[illegible]

[illegible]

سنه ١٩٣١ع

[illegible]

ہندستانی

ہندوستانی اکیڈیمی کا سہ ماہی رسالہ

جلد ۱ } جنوری سنہ ۱۹۳۱ ع { حصہ ۱

اُردو اِملا

از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ایم - اے - ، پی ایچ - ڈی -

ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور اُن قاعدوں کی بنیاد صحیح اصول پر ہو - اگر قاعدے معین نہ ہوں تو زبان کی یکرنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا اور اُردو اِس وقت اِسی قسم کے خطرے میں ہے - عربی، فارسی، انگریزی، غرض کہ ہر شائستہ زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں، ہر لکھنے والا اُن کی پوری پوری پابندی کرتا ہے - مگر اُردو والے اپنے تئیں ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں - اِملا کی خرابی یا بیضابطگی کی صورتیں جب کسی متمدن قوم کو پیش آئیں تو اُس کے زبان‌دانوں نے فوراً خرابی کی اصلاح کی - ترقی کرنے والی قومیں اِس زمانے میں بھی اپنی زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں - عام طور پر اصلاح کی ضرورت اِس لیے پڑتی ہے کہ ایک لکھنے والا اپنی رائے کو دخل دے کر ایک غلط راہ اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے بغیر تحقیق کیے ہوئے اُسکی غلطی کی پیروی کرنے لگتے ہیں - جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی وہ کتابوں اور اخباروں میں راہ پا گئی -

عوام کے لیے یہ ایک بڑی سند ہو گئی کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسی اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے ۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو صحت اور اصول پر نظر رکھتے ہوں ۔ بڑا گروہ مقلدوں یا عادت کے بندوں کا ہوتا ہے ' اور تدارک یا اصلاح کی ذمہ‌داری اہل تحقیق پر عائد ہوتی ہے ۔ بس ایسی خرابیوں کا انسداد یوں ہی ہو سکتا ہے کہ علمی انجمنیں اپنے فرض کا احساس کر کے نہ صرف قاعدے بنائیں بلکہ ہر ممکن ذریعے سے اُنہیں عمل میں لانے کی کوشش کریں ۔

اِس وقت صرف چند ضروری مسئلے پیش کیے جاتے ہیں ۔—

(۱) مختفی ہٗ یا اَلِف ؟

جہاں تک تلفظ سے بحث ہے اُردو لفظوں میں مختفی ہٗ کا وجود نہیں ہے بلکہ مختفی ہٗ فارسی کی چیز ہے ' اردو ہندی لفظوں میں نہیں آسکتی ' لفظ کی ابتدا یا بیچ میں کبھی نہیں آتی ' آخر ہی میں آسکتی ہے ۔ اُردو اور ہندی کی طرح فارسی کی بھی یہ ایک خصوصیت ہے کہ لفظ کا آخر حرف ساکن ہوتا ہے البتہ بعضے فارسی لفظ ایسے ہیں کہ پرانی فارسی زبان میں اُن کے آخر میں ایک کؔ تھا جو کؔ سے گؔ ہوا اور پھر گرگیا ۔ اگر اُس کؔ یا گؔ سے پہلے الفؔ تھا تو وہ بغیر کسی دقت کے قائم رہا ' جیسے پرانے لفظ اژدھاکؔ سے اژدہا رہ گیا ۔ دقت اُن لفظوں کی کتابت میں آپڑی جن کے آخر میں کؔ تھا اور اُس سے پہلے زبر اِس لیے کہ اخیر حرف پر حرکت رہ گئی اور عام قاعدے کے بموجب اُس آخر حرف کو ساکن ہونا چاہیے تھا ۔ مثال کے طور پر صرف ایک لفظ کو لیجئے :—

"بندہ" ۔ پرانی فارسی زبان میں "بندک" اور "بَنْدَگ" تھا ۔

بعد کو (یعنی اسلامی دور سے شاید کچھ پہلے ہی) گ گر گیا؛ تو ''بَنَدَ'' رہ گیا اور کتابت میں ''بَنْدَ'' اور ''بَنَد'' میں کوئی فرق نہ رہا - پہلوی تحریر میں تو پرانی کتابت (یعنی ''بندک'') جاری رہی مگر جب عربی حروف اختیار کیے گئے تو فکر ہوئی کہ آخر حرف کی حرکت کو جو تلفظ میں آتی ہے تحریر میں کیوں کر ظاہر کریں - تدبیر یہ ٹھہری کہ ایک ہ آخر میں لکھ دیں اور اُسے زبر کی طرح پڑھیں ؛ ہ کی آواز اُس میں نام کو نہ ہو - اِسی لیے اُس کا نام ''مختفی'' پڑا اور اُس کے مقابلے میں اصلی ہ کو ''ملفوظ'' کہنے لگے - یاد رہے کہ یہ سب کچھ فارسی ہی میں ہوا - عربی میں اِن دونوں اصطلاحوں کا کہیں ذکر نہیں آیا -

فارسی لغت کی اکثر کتابوں میں ہر موقع پر اشارہ کردیا گیا ہے کہ فلاں لفظ کے آخر میں جو ہ ہے وہ ''مختفی'' ہے یا ''ملفوظ'' - فارسی میں بھی املا کے متعلق بہت احتیاط برتی جاتی ہے اور کبھی کوئی وہ لفظ جس کے آخر میں الف ہے ہ سے نہیں لکھا جاتا - سوا اِس کے کہ قافیے کی ضرورت سے ''آشکارا'' کو ''آشکارہ'' اور ''خارا'' کو ''خارہ'' لکھ دیا - آج سے بیس پچیس برس پہلے تک اُردو والے بھی اِس کا بہت خیال رکھتے تھے -

ایک بات اور بھی اِس سلسلے میں بیان کرنے کے لائق ہے - وہ یہ کہ فارسی والوں نے جب عربی کے بہت سارے لفظ اپنی زبان میں لیے

---

* یہی گ ''بندگان'' اور ''بندگی'' میں اور اسی قبیل کے بہت سے فارسی لفظوں (جیسے ''زندگان'' - ''مردگان'' - ''زندگی'' - ''شرمندگی'' وغیرہ) میں اپنی اصلی حالت پر رہا - آگے والے حرف نے اُسے گرنے سے روک لیا -

اسی گ کو عربوں نے ج کردیا جو بہت سے معرب لفظوں میں دکھائی دیتا ہے جیسے نموذج ، بنفسج ، بابونج ، زندج ، شاہترج ، کوسج وغیرہ میں - جو لفظ عربوں نے جاہلیت کے عہد میں ایرانیوں سے ساسانیوں کے توسط سے لیے اُن کے آخر میں گ کے بجائے ک تھا ، پس اُن معرب لفظوں میں ج کی جگہ ق پایا جاتا ہے جیسے خورنق ، خندق وغیرہ میں -

تو اُن میں سے کسی کسی میں تصرف بھی کیا - اُنھیں میں سے ایک تصرف یہاں بیان کیا جاتا ھے - عربوں کے ھاں ایک حرف ھے جو بعضے اسموں کے آخر میں آتا ھے - شکل اُس کی ہ کی ھے مگر اُسے معمولاً ت پڑھتے ھیں - اِسی لیے اُس پر دو نقطے لگا دیتے ھیں . (ة) - جب اِس گول ہ والا کوئی لفظ کسی جملے کے آخر میں آ پڑتا ھے اور آواز ہ پر ٹوٹتی ھے تو اُس کا تلفظ ملفوظ ہ کا سا ھوتا ھے اور اُس سے پہلے زبر بھی ھوتا ھے - اکثر اِس ہ کا تلفظ گہرا نہیں ھوتا، کس واسطے کہ آواز کا زور اُس پر ختم ھوتا ھے اور اِس وجہ سے دھیما پڑ جاتاھے - ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ چیز اُن کی مختفی ہ سے بہت ملتی جلتی ھے، اکثر صورتوں میں اُسے مختفی ہ کی طرح بولنا شروع کردیا - اور کہیں کہیں اُس کو ت قرار دے کر اِسی طرح بولنے اور لکھنے لگے - عزة، خدمة، حجة وغیرہ، کو عزت، خدمت، حجت، بنادیا اور درجة، مدرسة وغیرہ کو درجہ، مدرسہ - کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچوں میں ڈھال دیا جیسے اجارہ اور اجارت، ارادہ اور ارادت، اِضافہ اور اضافت وغیرہ - اِن لفظوں میں جہاں‌جہاں ہ سے ہ ھوگئی وہ ہ مختفی ھی قرار پاگئی - یہہ عربی لفظ فارسی سے اُردو میں آئے تو یہاں بھی اِن کا تلفظ وھی رھا جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا -

اِس طرح اُردو میں مختفی ہ فارسی اور عربی لفظوں کے ساتھہ مخصوص ھے مگر اِس ہ کی اصلیت کو لوگوں نے بھلا دیا اور خود اپنی تحریر کے لیے کوئی ھنجار قائم نہ کیا - نتیجہ یہہ ھوا کہ بد مذاقی پھیلی اور ٹھیٹ اُردو لفظوں میں بھی لوگ مختفی ہ لکھنے لگے - ھندی کے دیوناگری خط میں تو ایک अ ھے - اور اُس کا نمائندہ اُردو میں سوا

---

[1] اگر فارسی کے بعضے مصنفوں نے ھندی لفظوں کو مختفی ہ سے لکھا تو یہ درست نہیں - اُردو والے کسی طرح اُس کی سند نہیں پکڑ سکتے -

الف کے اور کوئی حرف ہو ہی نہیں سکتا ۔ ہندی لفظ تو ایک طرف رہے ۔ طرہ یہ کہ وہ عربی فارسی لفظ بھی جن کے آخر میں الف ہے ہ سے لکھے جانے لگے ۔ یہ املا سراسر غلط ہے ۔ قاعدہ اِس کا یوں ہے :۔

ا ۔ ہندی لفظ ہو تو الف سے لکھا جائے (سوا بعض مقاموں کے ناموں کے جیسے آگرہ، پٹنہ، کلکتہ، کس واسطے کہ یہ نام ہمیں ہمیشہ سے اِسی طرح لکھے جاتے ہیں) مقاموں کے ناموں کے سوا جتنے لفظ ہیں اُن کو الف ہی سے لکھنا چاہئے، جیسے :۔

اِکا (اِسے ''یکہ'' لکھنا تو یوں بھی غلط ہے کہ تلفظ کے سراسر خلاف ہے ۔ فارسی میں یہ لفظ گاڑی کے معنوں میں موجود بھی نہیں ۔ ہمارے اردو لفظ ''ایک'' سے بنا ہے نہ کہ فارسی لفظ ''یک'' سے ۔ اِسی طرح ''موم بتی کا اِکا'' ۔ ''تاس کا اِکا''، زیور جسے عورتیں صرف ایک ہی بازو پر باندھتی ہیں اور اُس میں ایک ہی بڑا نگینہ ہوتا ہے ۔ جس میں زیادہ نگینے ہوتے ہیں اُسے ''نو نگا'' کہتے ہیں)، اکھلا، آنولا، باجا، باجرا، بادلا (ایک قسم کا نفیس کپڑا)، باڑا (''امام باڑا'' وغیرہ مرکبوں میں بھی آتا ہے)، بتوا، بتوارا، بچھنا، بدکانا، بچھڑا، بچھونا، بکھیرا، بلبلا، بنجارا، بھاجا، بھتیجا، بھروسا، بھیڑیا، بانگا، باوڑا، بٹا (بسان کے معنوں میں)، پٹّا، پنّا، پِتا (باپ)، پُتلا، پتیلا، پتاخا، پتارا، پتّھا، پچھتاوا، پڑاٹا، پسینا، تارا (جسے فارسی میں ''ستارہ'' کہتے ہیں)، تایا (چچا، جو باپ سے عمر میں بڑا ہو)، چارا (گھاس وغیرہ)، چبوترا، جرائتا، چرچا، چرسا، چکارا، چِلاّ، چھالا، چَھلاّ، جھلاّ، داسا، ڈُبتا، دُبلا (دو

بلک والا۔ ایک مصنوعی نگ جیسے بلور کے دو ٹکڑوں کو ملا کر بناتے ہیں)، دُخَما (یعنی دو خم والا نیچہ)، دگلا، دھکا، دھوکا، ٹورنا، ٹرہ خما (یعنی ترچھہ خم والا نیچہ)، راجا، سرونا، کنّھیا، کوئلا، کھلونا، لڑاکا، مہینا، ملا، ناتا (رشتہ داری)۔ یاد رہے کہ مذکر صفتیں بھی الف ہی سے صحیح ہیں، جیسے جاہلا، دینگا، بھلا وغیرہ۔

اِسی طرح وہ لفظ بھی جو یورپ کی زبانوں سے آئے ہیں، جیسے بِلاّ (تمغا وغیرہ کے معنوں میں)، ڈراما، فرما، کمرا، مارکا (نشان) وغیرہ اور یہی حال اُن لفظوں کا ہے جو فارسی یا عربی سے نکلے تو ہیں مگر خود اُن زبانوں میں اُن کا وجود اِس ہیئت میں نہیں ہے؛ جیسے بدلا، بے فکرا، بو دولتا، کتابدا (کتاب والا)، برفیا (برف والا)، خاصا ("اچھا خاصا" پورا کے معنوں میں)، بعضا (= بعض)، مسالا، ملیدا (ف۔ "مالیدہ")، دستنا وغیرہ۔

[خاصا (جمع۔ خاصے اور مونث خاصی) اور بعضا (بعضے، بعضی) میں آخر کے الف یا ے کو ہ سے ظاہر کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ جن معنوں میں "خاصہ" فارسی میں استعمال ہوتا ہے، اگر اُنہیں معنوں میں استعمال ہو تو البتہ اُس کو ہ سے لکھنا ٹھیک ہوگا۔ مسالا ہر معنے میں س اور الف سے لکھنا چاہیے۔ (۱) "گرم مسالا"۔ (۲) "مسالا" (گوٹا کناری وغیرہ)۔ (۳) "مسالا" (کسی چیز کے اجزا یا ضروریات اور لوازمات وغیرہ)۔ "مصالح" لکھنا یوں غلط ہے کہ یہ "مصلحت" کی جمع ہے۔ ہمارے لفظ کو اِن معنوں سے اصلا تعلق نہیں۔ مزید بر آں

یہہ کہ لفظ بھي مختلف ہے - یہی حال ‘‘مصالحہ’’ کا ہے - ‘‘مصالحہ’’ کے معنے ہیں ‘‘لڑنے والے فریقوں کے درمیان صلح’’ - ملیدا کا لفظ بھی فارسی ‘‘مالیدہ’’ سے بدل گیا ہے اور اُس نے ایک خاص مفہوم اختیار کر لیا ہے بس اِسے بھی اُسی طرح لکھنا چاہیے جس طرح ہم بولتے ہیں - دستانا اور فارسی ‘‘دست بناہ’’ میں بھي معنے اور لفظ دونوں بدلے ہوئے ہیں - ‘‘دست بناہ’’ فارسی میں ‘‘چمٹے’’ کے معنوں میں نہیں بولا جاتا بلکہ اُس کے معنے ہیں ‘‘دستانہ’’ -]

اُن لفظوں کے آخر میں بھي الف ہی لکھنا چاہیے جو ایک اُردو اور ایک فارسي یا عربی جز سے بنے ہیں: جیسے ‘‘دڑہ جما’’ (یعنی وہ جگہ جس میں تڑہ جم ہو)، ‘‘بتاشا’’ ‘‘جھماشا’’ ‘‘بخرنگا’’ ‘‘سنہرنگا’’ وغیرہ -

اِس سے یہ ایک کلیہ ہاتھہ آیا کہ جب کسي اور زبان کا لفظ اُردو میں دوسرے معنے اور اُسی کے ساتھہ دوسرا لفظ اختیار کر لے تو اُس کا املا ٹھیٹ اُردو لفظوں کی طرح ہونا چاہیے -

۲ - جو لفظ خود فارسی هي میں الف سے لکھے جاتے ہیں وہ ہرگز ہ سے نہ لکھے جائیں - اِن لفظوں کي تفصیل یہ ہے —

(الف) وہ جامد اسم یا صفتیں جن کے آخر میں الف ہے اور حرف اصلی کی حیثیت رکھتا ہے: جیسے اژدہا، آشنا (حکمی)، آسمان، آسنا، بوریا، جلیبا، پارسا، جارا (ایک قسم کا پتھر)، دارا، درا (گھنٹہ، ‘‘بانگ درا’’)، دلاسا، دوبالا، دوریا، سیما (‘‘دیو سیما’’ یعني دیو کي سی

سکل والا)، سارا («خالص»، جیسے «عمر سارا» میں)، سورنا (سور + نا ۔ نا کے معنے ہیں دکائی ہوئی چیز ۔ یہ لاحقہ کھانوں کے بہت سے ناموں میں آتا ہے ۔)، سبوا («وصیح» کے معنوں میں جیسے «سبوا زبان» مگر ڈھنگ اور حرکات و سکنات کے معنوں میں جو لفظ ہے وہ ہ سے لکھا جاتا ہے «سبوہ»)، ناسنا، فربا، گندنا ۔

(ب) فارسی فعلوں سے بنے ہوئے اسم فاعل اور صفت مشبہ وغیرہ، جیسے دونا، بینا، نا بینا، دانا، زیبا، دلربا، جویا، گویا، جہان آرا، جان فرسا، جان فزا، دل کشا، صبر آزما، ہوش ربا وغیرہ ۔

(ج) بعض لفظ جن کے آخر سے کوئی حرف گر کر الف رہ گیا ہو؛ جیسے پا (پاے)، جدا (جداے)، یا (پاے)، وغیرہ، یا جیسے آوا («آواز» کا مخفف)، آوما («افتادن» کا مخفف) وغیرہ۔

(د) وہ لفظ جو ہا زیادہ کر کے جمع بنے ہوں، جیسے صدہا، ہزارہا، دلہا وغیرہ ۔

(ہ) بعض لفظ یا نام جن کے آخر میں پیار یا حقارت یا ندا کے لیے الف بڑھا دیا گیا ہو؛ جیسے یارانا (یعنی یاراری)، بسدرا، رکنا، طالبا، حافظا، سعدیا وغیرہ ۔

[یاد رکھنے کی بات ہے کہ «سعیعا» ایک قسم کا خط ہے جیسے مُلّا سیعا نے ایجاد کیا تھا اِس لیے «خط سیعا» مشہور ہوا ۔ اُسے «سعیعہ» یا «شیعہ» لکھنا غلط ہے ۔]

۳ ۔ ترکی لفظ جو فارسی اُردو میں مستعمل ہیں اور جن کا املا الف ہی سے ہونا چاہیے :—

آلتمغا، تمغا، طغرا ۔ اِس لیے «تمغۂ شرافت» اور

"طغرۂ سلطانی" غلط ہوگا - صحیح "مغائے شرافت"
اور "طغرائے سلطانی" ہے -

۴ - عربی کے جو لفظ خود عربی ہی میں الف سے لکھے جاتے ہیں
اُن کو ۃ سے لکھنا صحیح نہیں - وہ الف ہی سے لکھے جائیں - اِن لفظوں
کی تفصیل یہ ہے :—

(الف) وہ اسم جو افتعال یا استفعال کے وزن پر مصدر ہیں اور
اُن کے آخر میں الف کے بعد ایک ہمزہ ہے - یہ ہمزہ
اُردو میں گر جاتا ہے اور الف رہ جاتا ہے؛ جیسے :—

ابتدا، احتیا، ارتضا، ارتقا، اصطفا، اقتدا، اکتفا،
التوا، امتلا، انتہا، استثنا، استدعا، استسقا، استغنا،
استغنا، استفتا، استمرا، استقصا، استنجا، استیلا وغیرہ -

(ب) یہ لفظ جن میں سے بعضے اسم جامد ہیں اور بعضے صفت -
اِن کو بھی ۃ سے لکھنا غلط ہے —

حلوا، سقّا، سہلا ("نرگس سہلا")، عزا ("شاعر غرّا")،
بیضا ("ید بیضا")، مُحابا، مُدارا، مُداوا وغیرہ -

(ج) بعض مذکر نام الف پر ختم ہوتے ہیں - اِن میں سے بعض
کے آخر میں ایک ہمزہ بھی تھا سو وہ اُردو میں گر چکا،
اور بعضوں کے آخر میں ہمزہ تھا ہی نہیں صرف الف تھا -
ۃ اِن میں سے کسی میں نہ تھی :—

یحیےٰ، زکریا، عادیا، مسیحا وغیرہ -

(د) بعضے مونث ناموں کی حالت بھی یہی ہے —

زہراء (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نام)[*]، سارا، حوّا وغیرہ -

---

[*] "زہرہ" اِس سے مختلف ہے - ایک ستارے کا نام زُہرہ ہے - کبھی بچیوں کا
نام اِس مناسبت سے بھی رکھا جاتا ہے -

(ہ) بعض جمعیں* جیسے بقایا ، برایا ، بلایا ، رعایا ، عطایا ، وصایا ، ہدایا وغیرہ ۔

(و) بعض متعلق فعل جن کی تنوین فارسی اور اردو میں گر گئی ہے ؛ جیسے اصلاً ، ظاہراً ۔

(ز) ان لفظوں کے آخر میں الف مقصورہ تھا ، جیسے عربی کے قاعدے سے یوں (ی) لکھتے ہیں ، مگر فارسی اور اُردو میں اُس کے لیے ایک معمولی الف لکھتے ہیں ۔ ی سے اِن لفظوں کو لکھنا سراسر غلط ہے ۔

تماشا ، تقاضا ، ماجرا ، مدعا ، معما ، مربا ، ماوا ، منشا ، دعوا ، تقوا ، مصفّا ، مطلا ، معرا وغیرہ

[بعض لوگ عربی املا کی پیروی میں "دعوا" اور "تقوا" یا "مربا" اور "منشا" کو الف مقصورہ کے ساتھ لکھتے ہیں جو جائز ہے ۔ مگر اُردو میں سیدھے سادھے الف کو ترجیح ہونا چاہیے ۔

فائدہ ۔ بعضے عربی یا فارسی لفظ ایسے ہیں کہ اُنکے آخر میں ہ آتی ہے مگر جب اُن کی جمع بناتے ہیں تو اُس مختفی ہ کو الف سے بدلنا ضروری ہوجاتا ہے ؛ یعنی اُن تمام مونث اسموں اور بعضے مذکر اسموں کی جمع میں ہ کو الف سے بدل کر جمع کی علامت لگاتے ہیں ؛ جیسے "بیوہ" سے "بیوائیں" ، "بیواؤں" ، "دایہ" سے "دایائیں" "دایاؤں" ، "قحبہ" سے "قحبائیں" "قحباؤں" ، "قابلہ" سے "قابلائیں" "قابلاؤں" وغیرہ اور "طلبہ" سے "طلباؤں" "علّامہ" سے "علاماؤں" ۔

---

* تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے رسالہ اُردو اورنگ آباد بابت ۱۹۲۳ء ج ۲ صفحہ ۲۴۱ - ۲۴۲ ۔

[بعض لوگ ""بیوؤں"" ، ""دایؤں"" وغیرہ بولتے اور لکھتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں -]

اِن تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ اُردو کا خاص حرف الف ہے اور ہر موقع پر ہمیں اُسی کو کام میں لانا چاہیے سوا چند فارسی اور عربی لفظوں کے جن کا املا ہ سے ہے (اور اس ہٓ کی آواز الفٓ کی سی ہے) - اب جن عربی یا فارسی لفظوں کے آخر میں ہٓ ہے اُن کو بھی ہم بعض حالتوں میں ہٓ کی جگہہ الفٓ سے لکھتے ہیں - اِن میں سے ایک حالت تو اوپر بیان ہو چکی - دو تین حالتیں اور بھی ہیں —

(۱) جب قافیے میں مختفی ہٓ ، الفٓ کے مقابل ہو تو اُس مختفی ہ کو لکھنے میں الف سے بدل دینا چاہیے ، جیسے

معاملہا ہے جا کا گِلا کیا -

(۲) ایسے لفظوں میں جو اُردو میں گھل مل گئے ہیں اور اُن کی غیریت محسوس نہیں ہوتی ، ہٓ کی جگہہ الفٓ لکھنا جائز ہے ، جیسے ""مزہ"" کی جگہ ""مزا"" -

(۳) ایسے الفاظ جن میں اُردو والوں نے کوئی تصرف کر لیا ہو ، جیسے ""دوماہہ"" سے ""دُماہا"" - ""دُخما"" (یعنی دوخم والا) وغیرہ -

(۲) مختفی ہٓ یا ےٓ؟

(الف) مختفی ہ پر ختم ہونے والے مذکر اسموں کی جمع میں تو لوگ باقاعدہ ، آواز کے مطابق ، لکھتے بھی ےٓ ہی ہیں - جیسے ""دو بچے کھیل رہے تھے"" - مگر جب وہی لفظ واحد محرف حالت میں ہوتے ہیں اور تلفظ اُن کا وہی ہوتا ہے جو جمع قائم کی حالت میں ہوتا ہے تب بھی

اکثر لوگ اُن کو ہ سے لکھتے ہیں - یہ کسی طرح درست نہیں - اُنہیں لکھنا بھی ویسے ہی چاہیے جیسے وہ بولے جاتے ہیں ، یعنی یوں —

'' وہ چھٹے درجے میں پڑھتا ہے '' - '' میں مدرسے جاتا ہوں '' - '' اُس بچے نے اِس معمے کو حل کرلیا '' - '' سیر کے پنجے میں بڑی طاقت ہوتی ہے '' - '' اِس واقعے سے سب کو عبرت ہوئی '' -٭

(ب) پانچ کے بعد کے عدد کو لوگ عام طور پر '' چھہ '' مختفی ہ کے ساتھ لکھتے ہیں ، حالانکہ اس لفظ کا فصیح تلفظ '' چھے '' ہے - پس کوئی وجہ نہیں کہ اِسی طرح نہ لکھا جائے -

(ج) '' کیوں کر '' کی جگہ اگلے وقتوں میں '' کیونکے '' بولتے تھے اور ے کے ساتھ لکھتے تھے - ایک دوسرا لفظ ہے '' کیونکہ '' (یعنی '' کیوں کہ '' جس میں '' کہ '' کا تتابعہ ہے) - لوگوں نے '' کہ '' اور '' کے '' کے معنوں میں فرق نہ کرکے '' کیونکے '' کو '' کیونکہ '' بنا دیا اور پرانے استادوں میر، سودا، درد، وغیرہ کے دیوانوں میں '' اصلاح '' فرما دی - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں، تصحیف ہے - '' کیونکر '' کے معنے میں '' کیونکے '' اب تحریری زبان سے تو گویا خارج ہو گیا ہے لیکن بعض شہروں کے لوگ بول چال میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں - پس نہ صرف پرانے اساتذہ کے کلام میں بلکہ بول چال کی بنا پر اِس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اِس لفظ سے کہیں نہ کہیں

٭ دیکھو ایضاً صفحہ ۲۲۳ - ۲۲۴ -

دُشوار ہوں گے - اِس لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ''کر'' کا قائم مقام ہو تو ''کے'' اور نہیں تو ''کہ'' لکھا جائے ' جیسے

نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بد عہدی — (غالب)

(۳) نونِ غُنّہ -

بعضے لفظ' جن میں نون غنہ ہے' کئی طرح سے لکھے جاتے ہیں - اُن میں سے صرف اُسی طرز کو اختیار کرنا چاہیے جو تلفظ میں سب سے زیادہ قریب ہو - ''گُنْوا'' - ''گُنوواں'' ' ''کُنواں'' تین طرح سے لکھتے ہیں - اِن تینوں میں بہتر ''گُنْوا'' ہے (اور ''گُنْوے'' ' ''کُنْووں'') ' اِسی طرح ''دھنْوا'' (اور ''دھنْوے'' - ''دھنْووں'') - ''گانو'' (جمع : ''گانْوؤں'') - ''چھانْو'' - ''آنو'' - ''دانو'' (جمع : ''دانْوؤں'') ' ''پانو'' (جمع . ''پانْوؤں'') -

اِس طرح پر ''کنواں'' - ''دھنواں'' - ''کواں'' - ''دھواں'' ، ''پاوں'' ، ''گاوں'' ، ''داوں'' ، ''چھاوں'' وغیرہ صورتیں ترک ہو جائیں گی -

البتہ : ''ڈھلواں'' ، ''گنھواں'' ، ''جڑواں'' اور ترتیبی گنتیاں جیسے ''پانچواں'' - ''ساتواں'' - ''آٹھواں'' - ''نواں'' - ''دسواں'' وغیرہ اور ''پانچویں'' - ''پانچویں'' (مونث) وغیرہ درست ہیں -

گنتی کے لفظوں میں (۱۱ سے ۱۸ تک) آخر کا حرف ''ہ'' ہے - بعضے لوگ اُن کے آخر میں اںؔ لکھہ دیتے ہیں - اِس لیے کہ بعض جگہوں میں

؎ بعض لوگوں کو اس پر اصرار ہے کہ ''کنواں'' ضرور لکھنا چاہیے - اِس لیے کہ اِس لفظ کے پہلے اور دوسرے دونوں بول غنہ رکھتے ہیں - لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے - غنہ پہلے ہی بول میں ہے اور دوسرا پہلے سے گزرنے سے متاثر ہوگیا ہے -

''گیاراں'' ، ''باراں'' وغیرہ بولتے ھیں - اور جو لوگ ''گیارا'' ''بارا'' بولتے ھیں وہ کبھی کبھی اُسی طرح لکھہ بھی جاتے ھیں مگر یہ درست نہیں، کس واسطے کہ اِن لفظوں میں ہ اصلی اور ملفوظ ھے - پس اِن گنتیوں کو ہ کے ساتھہ لکھنا چاھیے - یعنی ''گیارہ'' - ''بارہ'' - اب جس کا جي چاھے وہ ''گیارا'' یا ''گیاراں'' بول لے - یہ وھي بات ھے کہ ''ھودا'' کو بعض جگہ ''وا'' بولتے ھیں مگر اِس طرح لکھہ نہیں سکتے -

بعض لوگ ''دونوں'' کو ''دونو'' بغیر ''ن'' کے لکھتے ھیں - یہ غلط ھے - صحیح ھے ''دونوں'' جیسے ''تینوں'' - ''چاروں'' - ''پانچوں'' - ''چھیؤں'' - ''ساتوں'' وغیرہ -

جمع منادا کے ساتھہ کبھي کبھي لوگ ایک ''ن'' بھي لکھہ دیتے ھیں یعنی ''اے لڑکوں!'' - یہہ درست نہیں ؛ بغیر نون کے لکھنا چاھیے ؛ جیسے ''اے لڑکو!'' - ''صاحبو!'' -

جھوٹ کہتا نہیں، میں، سچ جانو،

کافرِ عشق ھوں، مسلمانو! — (میر لکھنوی)

(۴) همزہ (ء) -

(الف) اِس بات کو نہ بھولنا چاھیے کہ همزہ، الف کا قائم مقام ھے - پس جب دو حرف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو اُن کے بیچ میں همزہ آسکتا ھے، نہیں تو نہیں - اِس لیے ''آؤ''، ''جاؤ''، ''گیت گاؤ'' - ''دو لڑکے آئے''، - ''آپ آئے'' ؛ ''میں آؤں، تو کیا لاؤں؟'' ؛ ''میں چاھتا ھوں کہ آرام سے سوؤں'' وغیرہ میں همزہ لکھا جائے ؛ مگر ''بناؤ سنگار''، ''بھاؤ بتاؤ''، ''بہاؤ''، ''گھاؤ''، ''کڑھاؤ''

میں همزہ کا کچھ کام نہیں - اِسی طرح ''گاے''، ''چاے''، ''راے''، ''هاے'' میں بھی همزہ نہ چاهیے اور یہی حال ''دیو'' اور ''سیو'' اور ''ریو و ریا'' وغیرہ کا هے - اِن لفظوں میں الف ے الف و یا ے و مل کر ایک آواز دیتے هیں اِس لیے اُن کے بیچ میں همزہ کی گنجائش نہیں -

(ب) ''لیے'' (دونوں معنوں میں) ''اُس نے دو سو روپئے دیے اور دو گھوڑے ''لیے'' - ''اُس نے اپنے لیے چار جوڑ موزے لیے اور اپنے بھائی کے لیے ایک هي جوڑ'' - ''سیکڑوں دیے جل رهے هیں - دیوالی کی بہار هے'' -

اوپر کے جملوں میں دیے اور لیے کی بہت سی مثالیں آگئیں - همزہ کہیں نہیں آنا چاهیے - ''چاهیے''، ''دیجیے''، ''لیجیے'' وغیرہ میں بھي همزہ نہیں بلکہ یے هے - اِسی طرح ''تھالیوں''، ''گالیوں'' وغیرہ میں -

همزہ اُسي وقت آئے گا جب اُس سے پہلے زبر هو - اگر اُس سے پہلے زبر هوگا تو یے آئے گی یعنی ''گئے'' میں همزہ هے مگر ''کیے'' میں یے -

(ج) جہاں همزہ لکھنا ضروری هے وهاں لوگ اکثر کاهلی کے مارے اُسے چھوڑ جاتے هیں : جیسے

''بچھوؤں'' کو ''بچھووں'' بلکہ کبھی ''بچھوں''۔ ''لکھنئو'' کو ''لکھنو'' - ''هندوؤں'' کو ''هندووں'' یا ''هندوں'' - یہ درست نہیں -

(٥) ں ب اور ن ب -

جب کسي لفظ میں نون غنہ کے بعد هي ب هو تو یہ دونوں حرف

مل کر مٓ کی آواز دیتے ہیں: جیسے آبٓ سے آمٓ (جس کی تصغیر "امبیا" کا تلفظ "امبیا" بلکہ "امیا" ہوتا ہے)، تبٓ سے تمٓ، سنبٓ سے سمٓ - ان لفظوں کو مٓ ہی سے لکھنا چاہئے - فارسی عربی لفظوں زنبور - تنبورہ - سنبہ - گنبد - جنب میں جو ساکن ن ہے وہ تلفظ میں مٓ ہو جاتا ہے مگر لکھا نٓ ہی جاتا ہے - البتہ جب "گُنبد" سے اُردو والوں نے "گُمٹ" بنایا اور اُس کی تصغیر "گُمٹی" - تو ان دونوں لفظوں کو مٓ ہی سے لکھنا پڑا - پس قاعدہ یہ نکلا کہ فارسی عربی کا لفظ ہو تو املا میں انھیں زبانوں کی پیروی کی جائے نہیں تو مٓ لکھا جائے -

(۹) ذٓ یا زٓ ؟

فارسی اور اُردو لفظوں میں ذٓ اور زٓ کے لکھنے کے متعلق ہمارے ملک میں بڑا اختلاف ہے - سب سے پہلے مولوی نذیر احمد دہلوی نے ایک خط میں* جو انھوں نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا، یہ خیال ظاہر کیا کہ ذٓ عربی کے مخصوص حرفوں میں ہے - اس لیے فارسی لفظوں کو زٓ سے لکھنا چاہیے نہ کہ ذٓ سے - ادیبوں اور شاعروں کے گروہ میں یہ مسئلہ مدتوں زیر بحث رہا اور اب بھی کبھی کبھی یہ بحث چھڑ جاتی ہے -†

---

* یہ خط "موعظۂ حسنہ" میں درج ہے -

† سنہ ۱۹۰۵ع اور سنہ ۱۹۰۶ع میں رسالہ "فصیح الملک" دہلی' میں اس پر مسلسل بحث ہوتی رہی - سنہ ۱۹۰۷ع میں رسالۂ 'عالم گیر'' ہردوئی' کے ایک مضمون پر غالباً یہ سلسلہ ختم ہوا اور گونہ بے لطفی کے ساتھ - پھر "فصیح الملک'' کے تمام مضمون کو جو اس بحث سے متعلق تھے جناب وصل بلگرامی نے' کہ وہی اس بحث کے چھیڑنے کے ذمہ دار تھے - رسالہ '' مرقع '' لکھنؤ بابت اپریل و مئی سنہ ۱۹۲۸ع میں اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا - باوجود ایسی مفصل بحث کے فارسی میں ذ کے ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ مسئلہ ہی رہا -

واقعہ یہہ ہے کہ "ذ" عربی کے ساتھہ مخصوص نہیں ہے اور حقیقت میں "ث" بھی مخصوص نہیں - یونانی اور قدیم ایرانی زبانوں میں اِن دونوں حرفوں کی آوازوں کا وجود تھا - چنانچہ عربی زبان میں جو لفظ یونانی یا فارسی سے لئے گئے ہیں اُن میں یہ دونوں حرف ملتے ہیں۔* یہہ سمجھنا صحیح نہیں کہ "اُستاد" کی "د" پر عربوں نے تصرف کر کے ایک نقطہ لگا دیا - اصلیت یوں ہے کہ اُنہوں نے ایرانیوں سے "اُستاذ" ہی سنا اور اُسی طرح بولنے اور لکھنے لگے - خود ایرانیوں کی زبان میں بعد کو وہ "د" ، "ذ" ہوگئی - اِس لیے کہ اِسلامی زمانے میں بلکہ شاید اُس سے کچھہ پہلے ہی "ث" اور "ذ" کی آوازیں زبان سے جاتی رہیں - ہر "ذ" ، "د" ہو گئی مگر ایسے گنے چنے لفظوں میں "ذ" کا تلفظ "ز" سے بدل گیا - لیکن اُن لفظوں کو لوگ پرانی عادت کے مطابق "ذ" ہی سے لکھتے رہے جیسے "آذر" - "گذشتن" - "پذیرفتن" - "پذیر" - "کاغذ" - ایک "گنبد" ایسا لفظ ہے جو دونوں طرح سے بولا اور لکھا جاتا ہے یعنی "گنبد" اور "گنبذ" - ہندوستان میں لوگوں نے اِس لفظ کی اِسی دوسری صورت سے "گمز" بنا لیا اور اُس کی تصغیر "گمزی" ہوئی - ایران کے بعض مقامات میں "پذیر" کی جگہ "پدیر" اور "کاغذ" کی جگہ "کاغد" بھی سنا جاتا ہے - خلاصہ یہ ہے کہ اِن فارسی لفظوں میں اگر آواز کا لحاظ کیجیے تو "ز" ہے اور قدیم زبان اور کتابت کو مانیے تو "ذ" -

اُردو میں "گذر" اور "گذار" اور اُس کے مشتقات کو زیادہ تر "ز" ہی سے لکھتے ہیں اور یہہ کچھہ بے جا نہیں مگر "ذ" بھی اِن لفظوں میں صحیح اور جائز ہے "آذر" اور "کاغذ" کو ہمیشہ اور "پذیرا" وغیرہ کو اکثر "ذ" سے لکھتے ہیں اِن کو یوں ہی رہنے دینا چاہیے - اِن

---

* کسی آئندہ موقع پر تفصیل کے ساتھہ اِس مسئلے پر بحث کی جائے گی -

فارسی لفظوں کے علاوہ جن لفظوں میں ذ آتی ہے وہ عربی سے آئے ہیں – اب چاہے وہ ٹھیٹ عربی ہوں یا کسی اور زبان سے عربی میں مستعار – ایسے لفظوں میں عربی اِملا کی پیروی لازم ہے گو کہ آواز کے لحاظ سے اُردو میں ایک اکیلی ز ہی ذ ، ض اور ظ کی قائم مقام ہے –

چند عربی اور فارسی لفظوں کا غلط اِملا رواج پا گیا ہے ؛ البتہ محتاط لوگ اُس سے پرہیز کرتے ہیں – اُن لفظوں میں سے یہ مثالیں زیادہ اہم ہیں —

(۱) "بحر زخّار" کو بعض کم سواد لوگ "بحر ذخار" لکھتے ہیں – غالباً اِس دھوکے میں کہ "زخّار"، "ذخیرہ" سے بنا ہوگا – اصلیت یوں ہے کہ "زخار" کو "ذخیرہ" سے اصلا تعلق نہیں بلکہ "زخار" کے معنے ہیں "بہت اُمنڈتا ہوا (سمندر)" یا "چڑھا ہوا (دریا)" –

(۲) "ذکی" اور "زکی" اپنی اپنی جگہ پر دونوں صحیح ہیں – مگر لوگ "زکی" کے محل پر بھی "ذکی" لکھا کرتے ہیں – یعنی "زکی الدین" یا "محمد زکی" کسی کا نام ہو تو اُس کو ز ہی سے لکھنا چاہیے – اس لیے کہ "زکی" کے معنے ہیں "پاک" اور "ذکی" کے معنے "تیز فہم" بھی ہیں اور "قابل ملامت" بھی –

(۳) "زکریا" کو بعض لوگ غلطی سے ذ سے لکھتے ہیں بلکہ بعضے تو یہ ستم کرتے ہیں کہ "ملازم" میں بھی ذ لکھ دیتے ہیں –

(۴) "آزوقہ" – عربی لفظ نہیں ہے فارسی ہے اور اُس کا اِملا ز سے صحیح ہے – غلطی سے لوگ ذ سے لکھ دیتے ہیں اور یہ غلطی فارسی کتابوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہے –

(۵) ''آزر'' (حضرت ابراهیم کے چچا کا نام) ز سے ہے اِسے فارسی لفظ ''آذر'' سے کوئی تعلق نہیں -

(۶) '' ذات '' - عربی لفظ ہے ' جس کے معنے ہیں '' نفس '' یا '' نفس نفیس '' یا '' شخص '' - '' برادری '' یا '' قوم '' وغیرہ کے معنے نہیں ہیں - اِن معنوں میں جو لفظ اُردو میں بولا جاتا ہے وہ حقیقت میں سنسکرت کے لفظ '' جاتِ '' سے نکلا ہے - هندي میں ت کا کسرہ اِس وجہ سے گر گیا کہ کسی لفظ کا آخر حرف متحرک نہیں ہو سکتا - اُردو والوں نے ج کو ز کی آواز سے بدل دیا - چاهیے تھا کہ اِس لفظ کو ز سے لکھتے - لیکن عربی لفظ '' ذات '' کے دھوکے میں اِس کو بھی ذ هی سے لکھنے لگے - اِس غلط طریقے کو قطعاً ترک کرنا چاهیے اور جہاں '' برادری '' '' قوم '' وغیرہ کے معنے ہوں وہاں ز هی سے لکھنا چاهیے جیسے '' زات پات '' - '' زات جماعت '' '' زات زات '' - '' وہ زات کا برهمن ہے '' - '' اُس کی زات کھری ہے '' -

(۷) عربی کا ایک لفظ '' ذرہ '' ہے (جس کی ز پر تشدید ہے) - اِس کے معنے ہیں ''کسی چیز کا بہت چھوٹا ٹکڑا'' - اُردو میں یہہ لفظ بولا جاتا ہے اور اِنہیں معنوں میں بولا جاتا ہے - مگر اِس کے علاوہ ایک اور لفظ بھی ہے جو صرف صفت یا متعلق فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جس کے معنے ہیں '' تھوڑا '' - اِس کی ز پر تشدید نہیں اور تیسرا حرف آ ہے ۃ نہیں ؟ مگر بعض لوگوں کو اصرار ہے کہ چونکہ اِس لفظ کے پیدا ہونے کا باعث

عربی لفظ "ذرہ" ہوا ہے اِس لئے اِسے بھی ذ ہی سے لکھنا چاہئے ۔ یہ نہیں دیکھتے کہ تلفظ میں ایک چھوڑ دو دو تصرف ہوئے ۔ معنوں میں فرق ہو گیا ۔ یوں کہنا چاہئے کہ اُردو نے یہ ایک بالکل نیا لفظ پیدا کیا ۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ز سے نہ لکھا جائے ۔ ادیبوں اور شاعروں کے رایوں میں اختلاف ہے ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ذ سے لکھو، کچھ لوگوں کا قول ہے کہ اِس کا املا ز ہی سے صحیح ہے اور ذ سے غلط ۔ اصولاً ز کو ترجیح ہے ۔ اِس لیے کہ اب عربی لفظ "ذرہ" سے اِسے نہ تلفظ کی رو سے کچھ واسطہ رہا اور نہ معنے کی جہت سے ۔ بلکہ "ذرا" بحیثیت اُردو لفظ ہو گیا ۔

(۷) ص یا س ؟

فارسی والوں نے اپنی زبان کے بعض لفظوں کو عربی حرفوں سے لکھنا شروع کر دیا ۔ اِس لیے کہ ہم آواز لفظوں کا ایک دوسرے سے امتیاز ہو سکے ۔

"صد" ، سو کے معنے میں ، حقیقت میں س سے ہے ؟ مگر اِس کا رواج ایسا متواتر رہا ہے کہ اب غلطی کی اصلاح کچھ ناممکن سی ہو گئی ہے ۔

"شصت" (ساٹھ) دونوں طرح سے لکھا جاتا ہے ۔ اِس لئے اگر اُردو میں کبھی اِس فارسی لفظ کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑے تو شست لکھنا بہتر ہوگا ۔

"مسالا" کی بحث اوپر آچکی ہے (دیکھو الف اور مختفی ہ کا بیان)۔

(۸) ط یا ت ؟

فارسی اور ترکی کے بعض لفظ کسی نہ کسی وجہ سے ت کے بجائے کبھی ط سے بھی لکھے جاتے ہیں ۔ جیسے "طاس" ۔ "طپیدن" ۔

"طشت" - "طوطی" - محتاط لوگ تے ہی سے لکھتے ہیں اور ہم کو یہی املا اختیار کرنا چاہیے یعنی "تس"۔"تشت" - "تشتری" - "توتا" - "توپ" - "تماچا" - "تیار" کو "طیار" بھی لکھتے ہیں - ہم کو "تیار" اختیار کرنا چاہیے ' سوا اِس کے کہ یہ لفظ "اُڑنے والا" کے معنوں میں استعمال ہوا ہو -

(۹) کچھ اور لفظ -

بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ وہ صحیح لکھے جاتے ہیں لیکن اُن کا غلط املا بھی ایک حد تک رائج ہو گیا ہے - اُن میں سے چند خاص توجہ کے قابل ہیں —

صحیح املا	معنی	غلط املا
ازدحام	ہجوم - بھیڑ	اژدہام - اژدھام - اژدحام
اسراف	فضول خرچی	اصراف
تباشیر	بنس لوچن	طباشیر
تریاق	زہر کا مارک	طریاق
تلاطم	سمندر یا دریا کا تھپیڑے مارنا	طلاطم
توتیا		طوطیا
دوات	روشنائی کا برتن	داوات
عوض	بدلا	عیوض
مرہم	زخم کی دوا	مرحم - ملہم
مُسرف	فضول خرچ آدمی	مصرف
مع	ساتھ - سمیت	معہ

قرونِ وسطیٰ میں ہندو مسلم تعلقات

از پروفیسر محمد حبیب (آکسن)

ہمارے زمانۂ وسطیٰ کی بادشاہی ایک خالص دنیاوی سلطنت کی حیثیت رکھتی تھی ۔ شاہی اقتدار کی بنیاد میں اسلامی قانون نہیں، بلکہ ایرانی روایات کار فرما تھیں ۔ شاہان و سلاطین دہلی اصولاً نہایت احتیاط سے اپنے فرائض مذہبی اور اپنے ذاتی عقیدے میں تفریق و امتیاز رکھتے تھے ۔ جہاں تک کہ قانون عامہ کا تعلق ہے، اُنھوں نے شریعت کا نفاذ بہ جبر روا نہیں رکھا ۔ وہ صرف امیرالمؤمنین نہ تھے بلکہ مثل بادشاہوں کے اپنی تمام رعایا کے ساتھ یکساں برتاؤ رکھتے تھے ۔ یہ چیز ہے جو غائر توجہ کی مستحق ہے اور جو ایک طرف زمانۂ وسطیٰ کے عصبیت و غربت قومی احساس، اور سیاسیات کے مکمل دنیاوی ہو جانے کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری طرف سلطنت دہلی (اور صرف سلطنت دہلی) کی تمام رعایا میں حقیقی رواداری کی وسعت پذیری کو نمایاں کرتی ہے ۔

سلاطین دہلی اور ہندوؤں کے مابین، ان کے ممالک محروسہ میں رشتۂ اتحاد، عقیدہ و مذہب نہ تھا ۔ بلکہ صرف بادشاہ و رعایا کا تعلق تھا جسے طرفین اپنے اپنے مقام پر اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ بادشاہ کو اپنی ہندو رعایا کی روحانی نجات سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ وہ اس کی کوئی اخلاقی ذمہ‌داری محسوس کرتا تھا، نہ سوال اس کے فیصلے کے لئے تھا ۔ جب تک وہ (ہندو رعایا) اس کی واجبی فرماں برداری کا حق ادا کرتی رہتی، وہ بالکل مطمئن ہوتا تھا ۔

ہندو، ہر چند کہ بادشاہ کے سیاسی معاملات میں اعانت کے لئے تیار رہتے تھے لیکن اپنے معتقدات میں کسی قسم کی مداخلت روا نہ رکھتے تھے ترکی حملوں کا سیلاب، جب اپنا فاتحانہ دور ختم کر چکا تو حکومت کی امکانی پالیسی تمام رعایائے مملکت کے لئے "رواداری" تسلیم کر لی گئی - سلطنت دہلی کے تمام طول و عرض میں ہندوؤں کی عبادت‌گاہیں دوامی امن کی حالت میں چھوڑ دی گئیں - اقدام مظالم کے وہ تین یا چار حوالے، جن کی طرف ہمارے مؤرخین اشارہ کرتے ہیں، بجائے "رسم عام" کے ثبوت کے، اس کے عدم ثبوت پر شاہد ہیں کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کو گھوڑوں پر سوار ہونے اور تیر وغیرہ چلانے کی اجازت نہ تھی اور جلوس نکالنے، پہان اور پوجا پاٹ کرنے کی عام ممانعت تھی مگر یہ داستانیں، اصل ماخذوں، کے غلط مطالعہ کے باعث تیار ہوئی ہیں -

---

* مثلاً ضیاءالدین برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے، "علاؤالدین خلجی کے طرز عمل سے "ہندو" کی حالت اتنی پست ہو گئی تھی کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو سکتا تھا نہ ریشمی لباس پہن سکتا تھا اور نہ اپنی پان سے تیر چلا سکتا تھا" برنی کے بیان کے غائر نظر سے پڑھنے والے کو اطمینان ہو جائیگا کہ اس کا مطلب تمام ہندوؤں سے نہیں بلکہ ایک خاص طبقے کے ہندوؤں سے ہے جن کے خلاف علاؤالدین نے یہ طرز عمل اختیار کرنا چاہا تھا اور جن کو برنی، "مقدم" "کھوت" اور "بلاھر" بتاتا ہے - مقدم کے معنی پہلے آدمی کے ہیں، کھوت غالباً فارسی لفظ، خط، کی بگڑی صورت ہے - خط یا دستاویز کا مطلب اُس آدمی سے ہے جس نے محکمۂ محاصل میں یہ اقرار نامہ داخل کیا ہو کہ وہ اس مقام یا موضع کے محاصل اراضی کا ذمہ دار ہوگا - لفظ "بلاھر" کا ٹھیک مفہوم معلوم کرنا مشکل ہے لیکن اس میں مطلق شک کی گنجائش نہیں کہ برنی، "ہندو" سے گاؤں کا مکھیا مراد لیتا ہے - علاؤالدین نے گاؤں کے مکھیاؤں کے خلاف دو باتیں کیں - اول یہ کہ اُس نے حقوق چودھری (یعنی لگان کی اس دستوری کو جو انہیں تحصیل لگان کے صلہ میں ملا کرتی تھی) موقوف کر دیا اور تحصیل لگان کا انتظام محکمۂ محاصل یا دیوان کے نمایندوں (نوابوں) کے ذریعہ کر دیا - دوسری یہ کہ اُس نے ہدایت کی کہ تمام اراضی کا لگان، اس کی پیمائش کے اعتبار سے لیا جائے اور یہ کہ طاقتور کا بار کمزور پر ہرگز نہ ڈالا جائے -

بظاہر اِس منصفانہ قانون نے مکھیاؤں کو سخت صدمہ پہونچا دیا لگان وصول کرنے والے کی حیثیت سے، وہ اِس وقت تک اراضی کا، جس کی وہ خود کاشت کرتے تھے، کوئی

ملک نائک نامی ایک ہندو جنرل ، علاؤالدین کی فوج کے میمنہ پر کمان کرتا تھا اور جتور کا راجا پانچ ہزار آدمیوں کے ساتھ اس کے ہراول کی رہنمائی کرتا تھا یہہ اور اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں تو کیا ایک ایسی جماعت کے لوگ ، جنھیں گھوڑوں پر سوار ہونے اور سلحہ لگانے کی ممانعت رہی ہو ، یہ حیثیت حاصل کر سکتے تھے ؟

میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس قسم کی رائے دینی پسند نہیں کرتا کہ تمام مملکت میں جو رواداری ہندو مذہب کے لیے منظور کی گئی تھی وہ بادشاہ کی آزاد مرضی کا نتیجہ یا یہ کہ اس کی مسلمان رعایا کا متعصب طبقہ بھی اسے پسند کرتا تھا وہ تو زیادہ تر مجبوریوں اور سیاسی ضرورتوں کا تقاضا تھا - اُس زمانہ کا ہندو مذہب ، مسلح و منظم تھا اس کے ساتھ رواداری اس لیے برتی جاتی تھی کہ رواداری کرنی ہی چاہیے تھی اور اس کے سوا کوئی اور دوسری راہ نہ تھی -

---

معاوضہ نہیں دیتے تھے بلکہ اس کے عوض وہ ان ہمسایوں کو اصل مطالبے سے زائد ادا کرنے کے لئے مجبور کیا کرتے تھے -

اگر ہم تاریخ فرشتہ پر اعتماد کریں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین نے مویشی رکھنے کی زیادہ سے زیادہ تعداد معین کر دی تھی - ایک گاؤں والا ، چار بیل - (گائے یا بھینس) اور بیس بکریاں (یا بھیڑیں) رکھہ سکتا تھا تاکہ چراگاہیں گاؤں کے قابو یافتہ اور سر برآوردہ لوگوں کے بیجا استعمال سے محفوظ رہ سکیں - علاؤالدین شکایت کیا کرتا تھا کہ اس کی تخت نشینی کے وقت یہ مکھیے باہم جنگ کیا کرتے تھے اور محکمہ محاصل کے نمایندے جب ان کے یہاں جاتے تو وہ ان کو قید کر لیتے اور طرح طرح سے ستایا کرتے تھے آج اِس قانون نے ، جو علاؤالدین کے سپاہیوں کے ذریعہ سے تمام ہندوستان میں نہ جبر رائج کرایا گیا ، مکھیاؤں کو محتاجی کی حد تک پہونچا دیا - وہ اپنے گاؤں پر مالکانہ حقوق کے مدعی ہو چلے تھے لیکن علاؤالدین نے انہیں کاشتکار کی حیثیت میں لا کر پست کر دیا - برنی یہہ نہیں کہتا کہ ان کو یہہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں اور ریشمی لباس نہ پہنیں بلکہ اس کے بیان کے مطابق وہ اس درجہ غربت و محتاج ہو گئے تھے کہ آئندہ سے ان خطوط کی انہیں مقدرت ہی نہیں رہ گئی تھی - بد قسمتی سے اس فقرے نے بڑی غلط فہمی پیدا کردی لیکن اُس پڑھنے والے کو کوئی دشواری نہیں پیدا ہوسکتی ، جو حسب بیان برنی علاؤالدین خلجی کی دیگر اصلاحات کے ساتھہ اِس کا بھی مطالعہ کرتا ہو -

گو مکھیاؤں میں اکثریت ہنود ہی کی تھی لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ان میں بہت مسلمان بھی تھے - علاؤالدین کا یہ عمل ان سب کے خلاف تھا -

(فارسی متن صفحات ۲۹۶ - ۲۸۲)

سنہ ۱۲۹۱ ع میں سلطان جلال الدین خلجی نے رنتھنبور کا محاصرہ کرنا چاہا لیکن اُسے نا قابل تسخیر پاکر اُس نے فوج کو پسپائی کا حکم دے دیا - جس وقت شاہی بزم مشاورت میں اس پر بحث شروع ہوئی تو اس کے بھتیجے ملک احمد حبیب نے اس حکم کی سختی سے مخالفت کی اس نے اعتراضاً کہا "اگر شہنشاہ رنتھنبور کو بغیر فتح کئے واپس ہوئے تو لوگوں (کے دلوں) سے آپ کا احترام کم ہو جائے گا - حضور والا سلطان محمود اور سلطان سنجر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کیوں نہیں فرماتے ؟ وہ جو دین اسلام کے ستون تھے اور جنہوں نے دنیا فتح کرکے رکھدی - آپ ان کی مہمات وفتوحات (کی مثالوں) سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے" سلطان نے ہنس کر جواب دیا "صاحبزادے ! محمود اور سنجر کے اسلحہ بردار اور نقادے تک مجھ سے ہزار درجہ بہتر اور معزز تھے میں ، کہ عارضی بادشاہت کے ایک فریب نظر مغالطے کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا ، اِن کاموں کی انجام دہی کا خواب تک کیوں کر دیکھ سکتا ہوں جنہیں اُن بڑے بڑے فرماں رواؤں اور فاتحوں نے تکمیل کو پہونچا دیا ؟ میں کیا اور میری بادشاہی کی شان و طاقت کیا ، جو میں اُن کاموں کے لئے کوشش کروں جنہیں محمود اور سنجر نے کر دکھایا ہے ؟ بیوقوف ! تو دیکھتا نہیں کہ ہندو ، روزانہ میرے محل کے سامنے سے سنکھ بجاتے اور ڈھول پیٹتے ہوئے جمنا کے کنارے اپنے بتوں کو پوجنے کے لئے گزرتے ہیں ، وہ میری آنکھوں کے سامنے اپنی کفر کی رسمیں مناتے ہیں ، میری اور میرے شاہی اقتدار کی تحقیر کرتے ہیں - میں اگر ایک حقیقی مسلم بادشاہ ہوتا تو کیا میں اُن کو پان کھاتے دیتا اس طرح صاف کپڑے پہننے دیتا ، اور ان کو بے فکری کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان ، بستی مارے دیتا ؟ شرم ہے میرے لئے اور میری بادشاہی کے لئے ! میرا نام ہر جمعہ کے خطبے میں پڑھا جاتا ہے ، جھوٹے خطیب

مجھے حامئی دین کہہ کر پکارتے ہیں - لیکن میرے دین کے دشمن ہیں کہ میری دارالخلافہ میں اور میری آنکھوں کے سامنے ، عیش و عشرت اور شان و شوکت سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور اپنی دولت و خوش حالی کے باعث ، مسلمانوں سے گستاخانہ طور پر اظہار تفاخر کرتے ہیں - وہ کھلے بندوں ڈھول بجا کر اپنے بتوں کو پوجتے ہیں اور اپنی کافرانہ رسوم کو انجام دیتے ہیں - شرم ہے میرے لیے ! میں اُن کو اُن کے عیش و عشرت اور فخر و غرور میں چھوڑے ہوئے ہوں اور اُن چند ٹنکوں پر قناعت کیے ہوئے ہوں جو وہ خراج کے طور پر مجھے دے دیتے ہیں -"

یہ بھی ایک مجبور و ناتواں تعصب کی آخری گریہ و زاری ؟ جلال الدین ، جس کا عام احساس اس کی دینداری سے بلند تر واقع ہوا تھا - دہلی واپس آیا لیکن ہندوؤں کے خلاف اُس نے کوئی کارروائی نہیں کی - محمود غزنوی کا زمانہ رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ دوبارہ واپس نہیں آسکتا تھا - سلاطین و شاہان دہلی ، بہ طیب خاطر یا بہ جبر و اکراہ ، انہیں شرائط پر تخت نشین ہوا کرتے تھے جو ہندوؤں کے لیے قابل قبول ہوتے -

وہ غیر رواداری ، جس کی جلال الدین خلجی ہدایت کرتا تھا مگر عملاً جس پر کاربند نہ ہوتا تھا ، یقیناً اسلام کا کوئی جزو نہیں ہے - وہ مسلمان ، جو غیر رواداری کو اپنا فرض سمجھتے تھے انہوں نے قطعاً اپنے کو مجبور پایا - متعصبوں کے لیے ایذا دہی ایک طرح کی خیالی چیز ہو گئی جسے عملی لوگوں نے تصورات کے کرکری خانے میں ڈال دیا -

ایک غیر ملکی اور مطلق العنان شخص مثلاً سلطان محمود (جس کی حمایت میں ایک منظم قوم کی طاقت ہو) تو ضرور پر امن شہروں

؛ ضیاءالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی - فارسی متن صفحہ ۲۱۶ -

کو لوٹ کر اور مال غنیمت لاد کر لے جا سکتا تھا - لیکن سلاطین دہلی کے لئے جو اپنی ہندو رعایا کے لگان ان کی فوج اور مادی طاقتوں کے آسرے پر تھے اس طرح کا طرز عمل نا ممکن تھا - ان کے لئے وقفہ دارانہ معرکوں کا مفہوم ایک ناگزیر تباہی ہوتا - وسط ہند میں ابتداً ہی کے مفروضہ واقعات انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں لیکن جب ان کی جانچ زیادہ قریب سے کی جاتی ہے تو وہ جماعتی مظالم نہیں بلکہ افراد کی بے انصافیوں کے واقعات ٹھہرتے ہیں اور کم از کم اُس عہد کے لوگ بھی ایسا نہیں سمجھتے تھے - یہ عجیب بات ہے کہ قرون وسطیٰ کے سیاسی یا مذہبی لٹریچر میں ؟ مسلمانوں کے خلاف ہندو قوم کے مقابلہ کے خفیف ترین آثار بھی نہیں پائے جاتے ؟ لیکن اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ ہندو اس کے لیے تیار نہ تھے یا مقابلہ کے قابل نہ تھے - نہیں ! وہ تو اپنی جنگ جوئی اور شوق جدال کے لئے بدنام تھے لیکن ہندوستان کے زمانۂ وسطیٰ کی متعدد لڑائیوں میں سے کسی ایک لڑائی میں بھی ہم فوجوں کی تقسیم مذہبی (اعتبار سے) نہیں پاتے - افغانی سپاہیوں کا ایک دستہ ، جنگ ترائن میں رائے پتھورا کی سرکردگی میں لڑا تھا - مسلمانوں کی ایک پیادہ سپاہ نے پانی پت کی لڑائی میں مرہٹوں کی مدد کی تھی - مگر اصلی ہندو مسلم جنگ در اصل کبھی نہیں ہوئی -

اگر ہم ہندوستان کے زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ ، صحیح طور پر سمجھ لیں تو ہم اِس غیر حقیقی اور نامعقول تصور کو ایک ہی مرتبہ اور ہمیشہ کے لئے خارج کردینگے کہ "غیر ملکی فاتحین کی ایک جماعت ، ایک پُر امن و بے ضرر آبادی پر حکومت اور بہ جبر حکومت کر رہی ہے" اس قسم کی رائے کی تائید کے لئے اصل ماخذوں میں شہادت کا ایک ریزہ اور ایک نقطہ بھی موجود نہیں ہے -

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بادشاہوں نے ، ہندو راجاؤں سے جنگ

کي لیکن اُس سے زائد مرتبہ وہ دوسرے مسلمان بادشاہوں سے بھی لڑے - اسي طرح ایک جنگ میں ایک راجپوت کے لیے جس سے سلطان دهلي سے جنگ هوئی تھي ، تقريباً ایک سو راجپوت ، راجستھان کے فرقہ وار جاگیروں میں قتل کئے گئے تھے - هندو مذهب بهر صورت پوری طرح مسلح تھا اور هندوستان کے زمانۂ وسطی کی حکومت ؟ دو مستعد اور جنگجو جماعتوں میں، ایک رفیق کار کی حیثیت رکھتی تھی - شهنشاہ ایک مسلمان تھا اور اس لیے کہ هندو مذهب ذات در ذات منقسم تھا، مسلمانوں کي حیثیت قوي ترین اور متحدہ اقلیت کي سي هوگئی تھی - اور چھتریوں بلکہ برهمنوں سے تعداد میں بڑھی هوئي تھي - اگر هندو مذهب میں ، مساوات اور جماعتي جمهوریت کي روح موجود هوتي، جو زمانۂ وسطی میں ، اسلام کی بهترین خصوصیت تھی، تو یقیناً معاملات اس سے مختلف هوتے !

لیکن ان سلاطین کي رواداري، بهت سختی سے ان کي مملکت کے اندر محدود تھي - ایک مرتبہ وہ یا ان کي سپاہ ، اگر شاهي سرحد سے باهر نکل جاتي تو ان تمام رواداریوں بلکہ اعلیٰ احساسات و انسانیت تک کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ، متعصبانہ جوش ، جو باهر تو اسلامی تشدّد کے ساتھ بھڑک اُٹھتا تھا ، ملک کے اندر تہ جبر قابو میں رکھا جاتا تھا - سلطان محمود کي جابرانہ سختي، اگر ملک کافور کي اُس تعدي سے ، جو دکن میں هوئی ، بڑھ چڑھ کر نهیں تو برابر ضرور تھی - کھلے هوئے واقعات سے انکار کرنا بےفائدہ ہے - قرون وسطیٰ کا ایک مسلمان مورخ بھي ایسا نهیں ہے جس نے مندروں ؟ بتوں اور بے مثل صنعتي یادگاروں کي اُس تباهی کے ذکر کرنے میں کمي کی هو ، جو دهلی کی فتوحات سپاہ کے پیچھے پیچھے هوتی جاتی تھی - وہ خود ان افسوسناک کامیابیوں پر فخر کرتے تھے اور (اسي لئے) ان کے چھپانے، میں انھوں نے کوئي کوشش نهیں کی - یہ بالکل صحیح ہے کہ مندروں اور عبادتگاهوں کی تخریب

مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہے اور ایک مذہب کی حیثیت سے، اسلام کا اندازہ اُن ارباب سیاست کے کارناموں سے نہ کرنا چاہیے جنھوں نے قرون وسطیٰ کے اوائل میں اُسے اس غلط طور پر پیش کیا (لیکن اسی کے ساتھ) یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ، رسوم بھی مختلف ہوتے رہتے ہیں - اُس زمانہ کے مسلّمہ روایات کے بموجب دشمن کی عبادت‌گاہ کی غارت گری، جنگ کے جائز اعمال میں سمجھی جاتی تھی -

جب منگولیا کے خانہ بدوشوں نے، مسلمانوں کی سر زمین وسط ایشیا، ایران اور افغانستان پر حملہ کیا تو اپنی فتوحات کا کلی طریق کار، مساجد اور کتب‌خانوں کی تخریب و غارت‌گری سمجھا - شہاب‌الدین غوری کی فتح ہندوستان، یا ملک کافور کا حملۂ دکن، اُن ہنگاموں سے نسبۃً غنیمت معلوم ہوگا جو سلجوقیوں، عربوں اور تاتاریوں نے ایران کے شہروں اور موضعوں میں برپا کیے - جنگ بچوں کا کھیل نہیں ہے - ذی فہم ملکۂ سبا نے کہا تھا - "بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی تخریب کرتے ہیں اور وہاں کے عزیزترین شہریوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں" یہی خیال و جذبہ تھا جس نے ایک ہی بادشاہ کی دو رعایا میں، باوجود اختلاف مذہب، رواداری کی اجازت دی - اور اسی نے غیر ملکیوں کے جبر و سختی کو، ہم‌مذہب ہونے کی صورت میں بھی روا رکھا - اہل ہند نے، با وجود اپنی غیر معمولی نیک خیالی کے، اکثر اخلاقی زندگی کے دیگر اُصولوں میں، اپنے کو غیر مخلص ثابت کیا - تُرک اور خلجی شہنشاہوں کی سپاہ، ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں پر مشتمل تھی چنانچہ، ہند میں مندروں کے انہدام میں ہندوؤں نے بھی حصہ لیا تھا - اُس زمانہ کی لوٹ مار کی اصل غرض، سونے

---

* قرآن مجید سورۂ نمل رکوع ۱۸ -

جاندی کی حرص و ھوس تھی - یہ سکتی کا ادعائے دُرفرست تو محض باھر کی "دد واہ وا" کے لئے تھا - مملکت سے باھر ھندوؤں کے خلاف مُہم تو شہنشاھوں کے لئے ایک خالص کار و باری قسمت آزمائی تھی اور اُس زمانہ کے اقتصادی حالت نے اُسے تجربہ کار مہنمموں کی مجلس کے ھاتھوں میں دے دیا تھا جو جمع اموال کی سب سے بڑھ کر نفع بخش صورت تھی - تجارتی منافع ایک مدت سے ھندوستان کو کھنچتا چلا آ رھا تھا - قیمتی دھاتیں ملک میں آھستہ آھستہ جمع ھوتی جارھی تھیں اور بے شمار عقیدتمندوں کے خلوص کی بدولت بڑے بڑے مندروں میں جگہ پاتی جا رھی تھیں - ھندوستان ایسے زراعتی ملک میں گاؤں والوں کو لوٹنے میں سوا سخت تکروں کے اور کیا حاصل ھو سکتا تھا - چنانچہ ان سخت تجربات کے لئے نہ ھندوؤں نے کوشش کی اور نہ مسلمانوں نے - قرون وسطی کی تقریباً تمام مہمات میں معمولی شہری اور دیہاتی بالکل امن کی حالت میں چھوڑ دئے گئے - اصل مطلب مندروں اور اُس کی روایتی دولت سے تھا اور اُس کی تھی اصل غرض مذھبی تعصب تھیں بلکہ مالی ھوس تھی - اگر ھندوؤں کے مندر بھی مسلمانوں کی مسجدوں کی طرح سادہ اور معمولی ھوتے تو نہ محمود غزنوی ھندوستان پر حملہ کرتا اور نہ علاء الدین خلجی اپنے نائب سپاہ کو دکن روانہ کرتا !

قرون وسطیٰ کے لوگ مسلح اور سرکش تھے وہ ایک ایسی مرکزی بادشاھت کی اعانت کیوں کرتے ؟ بلکہ کیوں اس کو گوارا کرتے جب وہ بادشاھت، نہ تو ان کے اسنحصالی حاجتہ کے اعتبار سے مناسب تھی اور نہ قانون مذھبی کی کتابوں کے رو سے ؟ بہر حال لوگوں نے سلطنت کے لئے کام کیا اور لڑے مرے — وہ یقیناً اُس کے لئے کوئی نہ کوئی امید اور اعتماد ضرور رکھتے ھو گے اور اُس نظام کو گوارا کرنے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی اخلاقی احساس و شعور بھی رکھتے ھونگے جس کے لئے وہ اپنی بڑی قربانیاں کرنے کو تیار تھے -



محمود غزنوی نے هندوستان پر حملہ کیا تو اُس نے یہاں متعدد ایسے رئیس پائے جو مغرور تھے اور باہم غیر متحد اور هندستانیوں کی بدقسمتی کے لیے ان کے لمحات آزمائش میں صرف ایک گزری ہوئی سلطنت کی یاد باقی رہ گئی تھی - سلاطین دهلی ملک کو متحد کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے جب اُن کے هندو پیشروؤں کے لیے یہ کام سخت دشوار ثابت ہوا تھا ؟ تقدیر کا فیصلہ انسانی ہی ہاتھوں کے توسط سے اپنے کو نمایاں کرتا هے - دانستہ یا نا دانستہ طور پر لوگوں کے دلوں میں سلاطین دهلی کو اپنے مخالفین پر ترجیح دینے کے کچھ وجوہ ضرور موجود هونگے - علاوہ جماعت کا هونا تو ایک طرف ' هندوستانی بڑے شورہ پشت اور سرکش تھے اور بہت سے معاملے تو تیار تھے کہ اسی طرح کے اول موقع پر اپنے کو کام میں بھی لائیں - اس زمانہ میں سمجھدار لوگ ' ظلم سے نہیں بلکہ بد نظمی سے زیادہ خائف تھے - اول اول یہ امر' ابتدائی طور پر ذهن نشین کر لینا چاهیے کہ سلطنت کا وجود در اصل حملوں کے انقلاب کے ساتھ شروع ہوا علام بادشاهوں کی حکومت محض ایک دهوکا اور ڈھونگ تھی یا ایک بلند عمارت تھی نے بنیاد' جو اکبر ترکیں کے ہاتھ سے شروع ہوئی اور دهلی کے باب بداؤنی پر ختم هو جاتی تھی - هندستان کو متحد کرنے کا کام بند خو اور آتش مزاج علاؤالدین خلجی نے کیا جس کے بعد سے قومی اتحاد کا تخیّل' لوگوں کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوا - بلوے ہوئے بغاوتیں اور خانہ جنگیاں هوئیں - هم نے لڑائیاں بھی کیں اور مارا بھی لیکن حالت امن یا زمانہ جنگ کسی حالت میں بھی هم نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ هم ایک هی گھر کے رهنے والے هیں اور هم کو ایک حکومت رکھنی چاهیے عام اس سے کہ اس کی حیثیت کیسی هی هو -

قطب یہ چاهتی تھی کہ همالیہ کے جنوبی حصہ کی زمین ایک

قسم کے لوگوں کا ملک ہو اور فطرت کا یہ مقصد، مذہب و صنعت کے ذریعہ سے تکمیل کو پہونچ گیا - شمال مغربی کوہستانی دروں کو عبور کرکے، ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں اول اول جس مسلمان نے قدم رکھا تھا اُس سے بھی صدیوں پیشتر، ہمارے دیسی اور نسبی اتحاد کی بنیاد رکھی جاچکی تھی - یہ بڑا کام، بڑے ہی دھنوں کے کرنے کا تھا - مندروں اور جاتروں کے ضوابط میں، ویدوں کے رسموں اور ریتوں میں، رامائن اور مہابھارت کے قصوں میں، بودھ مذہب کے روادارانہ فلسفے میں، اور منو کے قانون میں ہم وہ قومی اجزاء پاتے ہیں جنھوں نے آریہ ورت کے سرزمین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نا قابل تقسیم بنا دیا - اگر یہ عظیم الشان کام، اس سے پہلے انجام نہ پاجاتا تو اکبر اور علاؤالدین کا انتظامی بندوبست، اخلاقی مضبوطی سے محروم رہ جاتا اور اُن کی سلطنتیں بھی، سکندر کی سلطنت کی طرح، چندروزہ ثابت ہوتیں -

ہندو مسلم صوفیہ نے، شاید نا دانستہ، اسے عظیم المرتبت ہندو ہستیوں کے نقش قدم کی پیروی کی - ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ یہ سخت نا انصافی ہوگی کہ اُن کا اندازہ اُن کے اُن بادشاہوں کے چال چلن سے کیا جائے جس کے وہ کسی طرح ذمہ دار نہ تھے - لیکن اُن کے مذہبی پیشواؤں، اُن کے صناعوں، اور اُن کے شاعروں سے بے بوجھی کی جائے جو اُن پر اِن سے کہیں زیادہ اثر رکھتے تھے - اُس وقت کے جمہور مسلمان (اور آج کل کے بھی) متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے - سائمیں تحقیق کو صوفیہ کے ملفوظات کا ایک سرسری مطالعہ اس امر کا یقین دلا سکتا ہے کہ مثل حکمرانان ہند، اُن کی روزانہ زندگی، کسی بلند منصب کو پیش نظر رکھنے کی بجائے ایک افسردہ کن افلاس کی حالت میں گذرتی تھی - اُن کے سروں پر ہمیشہ چھت بھی میسر نہ آتی تھی اور شکم سیر ہوکر کھانا تو ایک نادرالوقوع واقعہ سمجھا جاتا تھا - یہ محدود کامیابی، جو

اِسلام نے ہندوستان میں حاصل کی وہ اپنے بادشاہوں اور اربابِ سیاست کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے فقرا و مشائخ کی دولت کی ایک نئے مذہب کے لئے اس کی تمام باتوں کا انحصار اُس کے طریقۂ تبلیغ پر ہے - اِسلام اگر اس ملک میں، سوا عرب کے متعصب جانباز بدوؤں کے، کوئی اور طرز نہیں اختیار کرسکتا تھا تو یہاں کے قلیل لوگ بھی اس کو قبول نہیں کر سکتے تھے، لیکن اِسلام، اپنے نمائندے ان سے کہیں بہتر اور شریف تر رکھتا تھا یعنی وہ، جو شاہی درباروں اور فوجی قیام گاہوں کی فضا سے بہت دور، مسکین لوگوں کی طرح، خاکسارانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس نبی (صلعم) کی سنت کے مصداق تھے "جس کا فقر اس کے لئے باعثِ فخر تھا"* -

ہندو مذہب نے اپنے وسیع المشرب نقطۂ خیال سے، ان مُسلمان صوفیہ کو اپنے رسموں میں داخل کر لیا اور جذبات ہمسایگی نے بہت جلد بڑھ کر ایک مُشترکہ سلسلہ بزرگوں کا تیار کر دیا - یہی تیرھویں صدی عیسوی میں تھا اور آج بھی یہی باقی ہے !

غرض اس طرح، ترکوں کے لا حاصل تعصب کی جگہ، ایک بارہ تر مگر بلندتر فلسفے نے حاصل کرلی چنانچہ ایک صبح کو شیخ نظام الدین اولیا ؒ نے جو زمانۂ وسطیٰ کے زبردست صوفیہ میں تھے، اپنی خانقاہ کی چھت پر چڑھ کر کچھ ہندوؤں کو دیکھا کہ وہ اپنے بتوں کو پوج رہے ہیں - ایک مسلمان کے لیے یہ بات عجیب تھی کہ وہ ایک آزاد مخلوق کو اس حالت میں دیکھے کہ وہ اُس بُت کی پرستش کر رہی ہو جسے اُس نے اپنے ہی ہاتھوں سے پتھر سے تراش کر بنایا ہو - لیکن شیخ مذکور کے فلسفے نے کافری کو بھی اپنے رواداراانہ آغوش میں لے لیا - آپ نے فرمایا : "ہر

---

* ارشادِ نبوی ہے "الفقر فخری" -

قوم کی (الگ الگ) ایک جاہر راہ ' ایک مذہب اور ایک پرستش گاہ ہے - *

یہہ بھی ہمارے مذہبی سمجھوتے کی حقیقی بنیاد قرون وسطی میں ! اور یہ سمجھوتا بھی ایسا تھا جسے ہندستان کے بڑے بڑے اصحاب فکر، بڑے بڑے اہل علم' اور بڑے بڑے ارباب سیاست نے تسلیم کر لیا تھا - ہماری تمام تر رضامندی کی تہ میں' اختلاف کرنے کی رضامندی کارفرما تھی - ہم میں سے ہر ایک کے لیے اپنا عقیدہ' سب سے اچھا اور سب سے بہتر تھا - ہندو کو ایک اچھے ہندو' اور مسلمان کو ایک اچھے مسلمان ہونے کی' آزادانہ طور پر' اجازت تھی - گویا اسلام' اس مُلک میں بالکل ایک دوسرا نظام تخیل تھا جو بہت سے مخالف نظریوں کو گوارا کیے ہوئے تھا - ایک ایسی ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی)' جو ساتھ در ساتھ فرقوں میں مُنقسم ہو' مُسلمان کی حیثیت' صرف ایک '' مزید فرقہ '' کی سی ہو گئی تھی - یہ نیا مذہب' ہندستانی قومیت کی وسیع تحدیدیوں پر محتوی اور مُشتمل تھا - اُس لیے سیاست میں' اپنے ملک کی لوگوں کی قیادت' ایک مسلمان کے لیے آسان ہو گئی - یہ (نیا) مذہب' دیرانے مذہب کے معاقد میں بھی جلد جلد داخل ہونے لگا - مسلمانوں کی عام جماعت نے (جو ہندو مذہب چھوڑکر داخل اسلام ہوئی تھی) گو مسجد کے لیے اپنا مندر ترک کر دیا لیکن اپنے روایتی رسوم کے تبدیل کرنے کا اُسے خیال بھی نہیں آیا —

---

* ہر قوم راست راہے - دینے و قبلہ گاہے - جس پر امیر خسرو نے جو اس وقت موجود تھے یہ مصرع اضافہ کیا ع

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے -

اس مصرع میں اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ اس وقت شیخ کی کلاہ پیشانی کی طرف ترچھی ہو گئی تھی - یہہ واقعہ تزک جہانگیری میں منقول ہے -

ہندستانی مسلمانوں میں ' اربہ ورب کے قدیم رسموں کا رواج ' آج بھی ایک بدنامی اور نا قابل انکار واقع ہے - ہندستان کے کسی ایک طبقے کو بقیہ لوگوں پر حکومت کرنے کی کوئی خاص وجہ نہ بھی چنانچہ مسلمانوں نے ' بڑھ کر ٹھیک وہی حیثیت اختیار کرلی جو اُن سے پہلے راجپوتوں کو حاصل تھی - اگر ایک مسلمان شہنشاہ اپنی انتظامی و سیاسی قابلیت کی بنا پر اپنے کو کار آمد اور ناگزیر ثابت کر سکتا تھا تو (اہل ملک کو) اس کے اختیار و اقتدار کے تسلیم کر لینے میں کوئی سخت اعتراض نہ ہوتا تھا -

لیکن ما بعد کے دو اسباب نے ایک مرکزی حکومت کے قیام و استحکام کو اور زیادہ نا گزیر اور گوارا بنا دیا (١) ایک تو منگولیا والوں کا خروج (٢) دوسرے ہندوستان کی دیہاتی جماعتوں کی بد نظمی -

خلجیوں کے عروج سے تقریباً ساٹھ برس پہلے، منگولیا والے ' ہندوستان کی سرحد پر خطرے کی طرح منڈلا رہے تھے - انھوں نے ترکستان * ، ماوراءالنہر ، ایران اور افغانستان کے تمام زرخیز شہروں کو غارت کر دیا تھا اور پنجاب میں لاہور تک بڑھ آئے تھے - (اس وقت) ہندو اور مسلم دونوں یکساں طور پر خطرے میں تھے کیوں‌کہ منگولیا والے مسلمانوں کے جانی دشمن تھے - انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب کے تمام مرکزی مقامات کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا - اسی طرح وہ ہندوؤں کے بھی دوست نہ تھے ' اُن کی زبان ناقابل فہم ' اور ان کے اطوار و عادات سخت ناگوار تھے - وہ جہاں گئے وہاں کی عورتوں کو ' عام اس سے کہ وہ ادنیٰ طبقے کی ہوں یا اعلیٰ طبقے کی ' اُنھوں نے کنیزیں بنا لیا اور ان کی حالت ' موت سے بھی زیادہ سخت اور سقیم بنا ڈالی -

---

* آکسس (دریائے آمو) اور جکسرٹیز کے درمیان کی زمین - اور جیکسرٹیز کے آگے کی زمین ترکستان ہے -

وہ بچوں کو بے دردی سے قتل کر ڈالتے' قتل عام اور خونریزی سے انھیں مسرت ہوتی (اس طرح) دو نسلوں تک ایک تاریک اور مہیب بادل' آسمان پر گھرا ہوا تھا اس وقت وہ آدمی ' یا آدمیوں کا وہ گروہ ' جس نے منگولوں والوں کو راستے ہی میں روک دیا' یقیناً ناقابل انکار طور پر ہندوستان بھر کے لوگوں کے شکریے کا مستحق ہوا ہوگا دوسرے یہ کہ شہابی جماعتوں کا جمہوری نظام ' شہاب الدین کے حملے سے صدیوں پہلے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا - قانون اور رواج کی جگہ جبر و قوت نے لے لی تھی - ایسی ہمہ گیر بد نظمی کے زمانے میں مکھیاؤں اور مقدم لوگوں نے یہ دیکھ کر' کہ کوئی زبر دست طاقت ان کی سر براہی کرنے والی ہے ' گاؤں پر خود مختارانہ قوت قائم کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی - اور غریب کاشتکار رعایا کو بے رحمی کے ساتھ ستانا شروع کر دیا تھا - (ایسی حالت میں) صرف ایک مضبوط مرکزی حکومت کا قیام ہی کاشتکاروں کو مکھیاؤں کے چنگل سے رہائی دلا سکتا تھا -

پس یہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھے جنھوں نے منگولیا والوں کو مار بھگایا - اور ملک کے نظام محاصل کو از سر نو درست کیا چنانچہ جہاں بے قاعدگی کی نہ کدورت تھی وہاں اس امر کے بساط کی وجہ ' کچھ تو اتفاقی تھی اور کچھ دیہی جماعتوں کے حالات کا اقتضا تھا - علاؤ الدین خلجی کی سخت نسلی سے پہلے کسی وقت بھی ہندوؤں کا ایک زبردست حملہ' سلطنت دہلی کو خاک میں ملا سکتا تھا - لیکن (علاؤالدین کے عہد میں) مسلم ارباب سیاست نے' یقیناً اپنے رعیتوں سے بڑھ کر' دور اندیشی اور ہوشیاری دکھلائی - ان کے گزشتہ تلخ تجربات نے انھیں منگولیا کے حملہ آوروں کے خلاف ایک سخت اور کامیاب مقابلے کا اہل بنا دیا اور چونکہ رسم و روایات کے بندھنوں سے وہ نسبتاً آزاد تھے اس لئے اُن انتظامی اور مالی اصلاحات کے تجربہ اور نافذ کرنے کے قابل ثابت ہوئے جس کی ملک کو ضرورت تھی -

هندوؤں کی سرداری کی باگ، راجپوتوں کے قبضہ میں آ گئی تھی جو اس درجہ غیر متحد اور باھمی خانہ جنگیوں کے سابق تھے کہ نہ وہ اندرونی انتظامات کے لئے لوگوں کو متفق کر سکتے تھے اور نہ بیرونی مدافعت کے لئے، اور نہ پھر راجستان کا ریگزار ھی اس قابل تھا کہ ہندوستان کی سلطنت وھاں تعمیر یا پامال کی جا سکتی!

ـــ * اُردو زبان کے لغت

(از سید مسعود حسن صاحب رضوی ریڈر لکھنؤ یونیورسٹی)

یوں تو ملک کے مختلف حصوں میں طرح طرح کی بولیاں بولی جاتی ہیں مگر اُن میں زبان کا درجہ صرف اُنھیں کو حاصل ہے جن کے صرف و نحو کے قاعدے بن چکے ہیں، لغت مرتب ہو چکے ہیں، فصاحت اور بلاغت کے معیار قائم ہو چکے ہیں، اور جن میں کتابوں کا کافی ذخیرہ بھی موجود ہے - اُردو بھی ایک زمانے میں صرف ایک بولی ہی تھی- لیکن ترقی کرتے کرتے اب زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے - اور کم سے کم اِس حیثیت سے ہندوستان کی سب زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے کہ اُس کے بولنے اور سمجھنے والوں کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع ہے -

اُردو کی اِس ترقی کے ذریعے بھی وہی ہیں جو اُوپر بیان کیے گئے - اِس لیے اُردو زبان کی تاریخ میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہے کہ اُس کی تنظیم اور تہذیب کب سے شروع ہوئی - اور اب تک اس سلسلے میں کیا کیا کوششیں ہوتی رہیں - اِس غرض کے لیے ضرورت ہے کہ لغت - قواعد اور بلاغت کی کتابیں اور اُن کی ترتیب وار فہرستیں سامنے موجود ہوں -

اِسی طرح اُردو ادب کی تاریخ کے لئے مختلف علموں اور فنوں کی کتابوں اور اُن کی تاریخ وار فہرستوں کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے یہ کتابوں کے ذخیرے اور فہرستیں جس قدر مکمل ہونگی اُتنی ہی زبان اور ادب کی تاریخ بھی مکمل ہوگی -

---

* یہ مضمون اکیڈمی کی گذشتہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا -

عام طور پر لوگوں کو علم نہیں ہے کہ اُردو میں ہر علم و فن پر کتنی کتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔ اور اکثر لوگ تو اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اُردو کا کتابی سرمایہ بہت ہی حقیر ہے ۔ اگر مختلف مضمونوں کی تمام کتابوں کی فہرستیں مرتب ہو جائیں تو یہ غلط فہمی دور ہو جائیگی ۔ اور اُردو کا اعتبار اور وقار بہت بڑھ جائیگا ۔

اِنہیں خیالوں کو سامنے رکھ کر میں نے کئی سال ہوئے اِس کام کی ابتدا کر دی تھی اور اُردو لغتوں کی فہرست بنانا شروع کر دیا تھا ۔ افسوس ہے کہ مجھے اس فہرست کو مکمل کرنے کی فرصت نہ مل سکی ۔ بہر حال اب رسالہ "ہندستانی" کے اڈیٹر صاحب اور اڈیٹوریل بورڈ کے سخت اصرار سے مجبور ہوکر یہ فہرست اِسی غیر مکمل حالت میں پیش کی جاتی ہے ۔ دُھن کے پکے لوگ ایسی فہرستوں کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھ لیں اور ایک مضمون کی فہرست مرتب کرنا اپنا فرض قرار دے لیں تو اُردو کی ایک بہت بڑی خدمت انجام پا جاۓ ۔

مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب مرحوم نے اردو کی کل کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی کوشش کی تھی اُن کی اِس کوشش کا نتیجہ "المفہرست" کی صورت میں دنیا کے سامنے آچکا ہے ۔ اول تو یہ ایک آدمی کے کرنے کا کام ہی نہ تھا ۔ دوسرے اِس کتاب کی تالیف اور ترتیب میں جو سہولت پسندی اور بے احتیاطی برتی گئی ہے اُس کا کسی قدر اندازہ اِس فہرست کو اُس کتاب کی فہرست لغات سے مقابلہ کرنے پر ہو جائیگا ۔ بہر حال "المفہرست" جس غرض سے مرتب کی گئی تھی وہ پوری نہیں ہوئی اور اُردو کتابوں کی فہرست کی جتنی ضرورت پہلے تھی اُتنی ہی اب بھی باقی ہے ۔

اِس فہرست میں ایسی کئی چیزوں کا ذکر ہے جن تک بہت کم نگاہوں کی رسائی ہوئی ہوگی اور بعض تو ایسی ہیں جن کا دیکھنا کیسا

اب تک اُن کا نام بھی نہ سنا گیا تھا اِن نادر چیزوں میں سے اکثر میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں -

یہہ اُردو لغتوں کی فہرست ہے لیکن میں نے اِس کو صرف اُنہیں کتابوں میں محدود نہیں کیا ہے جن میں اُردو لفظوں اور محاوروں وغیرہ کے معنی اُردو ہی میں بتائے گئے ہیں - بلکہ اُن تمام کتابوں کو شامل کر لیا ہے جن میں اُردو زبان کے لفظوں اور محاوروں کے معنی کسی زبان؟ میں یا کسی زبان کے لفظوں اور محاوروں کے معنی اُردو زبان میں دئے گئے ہیں - دوسری قسم کی کتابیں بہت کم ہیں اور اُن کا اِس فہرست میں شامل کیا جانا کچھہ بہت مناسب بھی نہیں معلوم ہوتا - مگر چونکہ میرا مقصد یہہ ہے کہ ہر فن کی اُردو کتابوں کی فہرست مکمل تیار کی جائے اور اِن کتابوں کی جگہ کسی اور فہرست میں نہیں نکلتی اس لئے اسی فہرست میں داخل کر لی گئیں کیونکہ اگرچہ وہ اُردو زبان کے لغت نہیں ہیں لیکن لغت ہیں اور اُردو زبان میں ہیں -

میری خواہش تو یہ تھی کہ ہر لغت کے مؤلف کا نام - تالیف کا زمانہ؟ کتاب کا حجم اور اُس کی خصوصیتوں کا ذکر کروں - اِس لئے جتنی کتابوں تک میری پہونچ ہو سکی اُنہیں غور کی نظر سے دیکھا اور اپنے کام کی جتنی باتیں مل سکیں لے لیں - لیکن جو کتابیں میرے دسترس سے باہر تھیں اُنکے بارے میں جو کچھہ بھی کسی ذریعے سے معلوم ہوسکا اُسی پر قناعت کرنا پڑی - بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جنھیں میں نے خود دیکھا ہے لیکن اُن کے مؤلف اور تالیف کے زمانے کا پتا کسی طرح نہ لگ سکا - بہر حال جہاں کہیں میں کُل ضروری اطلاعیں بہم نہیں پہونچا سکا وہاں ہمیشہ مجبوری کا عالم تھا - میری کاہلی یا بے احتیاطی کو اِس میں دخل نہیں -

کتابوں کی ترتیب اُن کی تالیف کے زمانے کے لحاظ سے قائم کی گئی ہے ۔ لیکن جن کتابوں کی تالیف کا زمانہ معلوم نہیں ہو سکا اُنہیں آخر میں بلا ترتیب درج کر دیا ہے ۔

جن چند لغتوں کا حال مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو "اورنگ آباد" کے اُس مضمون سے لیا ہے جس کا عنوان ہے ۔ "اہل یورپ نے اُردو زبان کی کیا خدمت کی" اُن کا بیان ختم کرکے قوسین میں ع + ح لکھ دیا ہے ۔

(۱) خالق باری

حضرت امیر خسرو کو جس طرح اور بہت سی چیزوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے ؟ اسی طرح اُردو کا سب سے پہلا لغت لکھنے کا فخر بھی اُنہیں کے لئے ہے ۔ اب تک اُردو کا کوئی ایسا لغت دستیاب نہیں ہوا جو خالق باری سے زیادہ قدیم ٹھہرتا ۔ مولانا آزاد مرحوم "آب حیات" میں لکھتے ہیں ۔

"خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی" ۔

افسوس ہے کہ خالق باری کا کوئی بہت قدیم نسخہ نہ ملا جو اِس قول کی تصدیق کر سکتا ۔ مجھے جو پرانے سے پرانا نسخہ ملا ہے اُس کی تاریخ تحریر ۱۳ شعبان ۱۲۱۷ھ ہے یعنی اُس کی عمر سوا سو برس سے کچھ زائد ہے ۔ مگر کتاب کی تصنیف کو کوئی ساڑھے چھ سو برس ہو چکے ہیں اِس لئے یہ نسخہ بھی قدیم نہیں کہا جا سکتا ۔

عام طور پر مشہور ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے مگر جو لوگ تحقیق کی دھن میں کسی بات کو بغیر کافی ثبوت کے نہیں

مانئے ۔ اور کسی بات کی شہرت کو اُس کی صحت کی دلیل نہیں جانتے اُنھیں اِس میں بھی شک ہے لیکن خالق باری کے اُردو لفظوں اور فقروں کی قدامت امیر خسرو کا ہندی اور فارسی دونوں پر عبور رکھنا امیرخسرو کی ایجاد خیز طبیعت اور کتاب کی آخری بیت میں امیر خسرو کے تخلص کا نہایت حسن سے آنا یہ سب باتیں عام رائے کی تائید کرتی ہیں ۔اور امیر خسرو ہی کو خالق باری کا مصنف ثابت کرتی ہیں ۔

خالق باری ایک منظوم لغت ہے جس میں فارسی عربی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ جو روز مرہ کی بات چیت کے لیے ضروری تھے جمع کر دیے گئے ہیں ۔ اِس طرح کا منظوم لغت امیر خسرو کی ایجاد نہیں ہے ۔ سنسکرت میں ایسے لغت خالق باری سے بہت پہلے تصنیف ہوچکے تھے ۔ فارسی میں بھی کم سے کم ایک ایسی ہی کتاب اِس سے پہلے ضرور موجود تھی ۔ اور اُس کو جو عام مقبولیت ہندوستان میں ابھی کچھ دن پہلے تک حاصل تھی وہ ہمیں دلاتی ہے کہ امیر خسرو کی نظر سے وہ کتاب ضرور گزری ہوگی ۔ میری مراد کتاب نصاب الصبیان سے ہے جو ابو نصر محمد بدرالدین فراہی نے ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں تالیف کی تھی ۔ یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ امیر خسرو کو خالق باری لکھنے کا خیال اِسی کتاب کی بدولت پیدا ہوا ہو نصاب الصبیان کی طرح خالق باری میں بھی مختلف بحروں میں بہت سے قطعے ہیں ۔ یہ مشابہت بھی میرے خیال کی تائید کرتی ہے ۔ امیر خسرو کی ہر تصنیف کی طرح خالق باری بھی بہت مقبول ہوئی ۔ اِس کے بعد اُسی طرز کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں مگر با وجود اس کے کہ وہ رائج الوقت زبان میں ہونے کی وجہ سے خالق باری سے کہیں زیادہ مفید تھیں ۔ اور خالق باری کی قدیم زبان بوجھنے

والے تو در کنار پڑھانے والے بھی نہ سمجھہ سکتے تھے - پھر بھی اُن کتابوں کو وہ قبول عام نصیب نہوا جو خالق باری کو چھہ سو برس سے زیادہ حاصل رہا -

خالق باری کے طرز کی جتنی کتابیں لکھی گئیں اُن کا مقصد بالعموم یہہ تھا کہ ہر وقت استعمال میں آنے والے لفظ یکجا کر کے نظم کر دیے جائیں کہ بچوں کو اُن کے یاد کرنے میں آسانی ہو - مگر خالق باری غالباً بچوں کے لیے نہیں لکھی گئی تھی - امیر خسرو کے زمانے میں چنگیزیوں کی تاخت و تاراج نے ایران و توران کو زیر و زبر کر دیا تھا - اُن کے جدال و قتال سے تنگ آکر ہزارہا ایرانیوں اور تورانیوں نے ہندستان میں پناہ لی تھی اِن لوگوں کو ہندستانیوں سے بات چیت کرنے میں بڑی دقت پڑتی تھی - نہ وہ اِن کی بات سمجھتے تھے نہ یہ اُن کی - قیاس کہتا ہے کہ اسی دقت کو دور کرنے کے لئے امیر خسرو نے فارسی اور ہندی کے ضروری ہم معنی الفاظ یکجا کر کے نظم کر دیے ہونگے -

جس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے امیر خسرو نے خالق باری تصنیف کی تھی وہ ضرورت اب باقی نہیں رہی - نہ پرانا طریقہ تعلیم باقی رہا - اِس لیے خالق باری کی شہرت عوام میں روز بروز کم ہوتی جائیگی - لیکن اب ادبی تحقیق کا ذوق اور زبان اردو کی تاریخ جاننے کا شوق بڑھہ رہا ہے اِس لئے خواص میں اِس کی وقعت دو حیثیتوں سے بڑھتی جائے گی ایک یہ کہ اِس میں آج سے چھہ سو برس پہلے کی اُردو کے نمونے موجود ہیں - اور دوسرے یہہ کہ یہہ اُردو کا سب سے پہلا لغت ہے -

خالق باری کی وجہ تسمیہ تو ظاہر ہے - جس طرح شیخ سعدی شیرازی کا پند نامہ اور شیخ علاءالدین خراسانی کا ترجیع بند اپنے

اسے ابتدائی لفظوں کی بنا پر کریما اور مامقیماں کے نام سے مشہور ہو گئے ۔ اُسی طرح خالق باری کے ابتدائی دو لفظ اُس کا نام قرار پاگئے ۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خود امیر خسرو نے اِس کتاب کا نام کیا رکھا تھا ۔ البتہ پتا ضرور چلتا ہے کہ آج سے کوئی تین سو برس پہلے بھی یہ کتاب خالق باری ھي کے نام سے مشہور تھي ۔ الله خدائي (نمبر ۴ فہرست هذا) جس کا ذکر آگے آئیگا ۱۰۶۰ ھ کی تصنیف ھے اِس کے مصنف تجلی نے کتاب کي مختصر منظوم تمہید میں یہ شعر بھی لکھا ھے :—

ساید از لطف و رحمت باري

روح خسرو بساعدم باري

اِس شعر میں امیر خسرو کي روح سے مدد مانگي ھے اور اِس کے پہلے مصرعے کے آخري لفظ سے خالق باري کي طرف اشارہ کیا ھے اِس کے علاوہ خود اپني تصنیف کا نام الله خدائي رکھا ھے اِس سے صاف ظاھر ھے کہ اُس زمانے میں بھی امیر خسرو کا هندي و فارسی منظوم لغت موجود تھا اور اُس کا نام بھی خالق باري ھی تھا - تجلي نے جس طرح منظوم لغت لکھنے میں خالق باری کا انداز اختیار کیا اُسي طرح اُس کا نام بھی خالق باري کے طرز پر الله خدائی رکھا - ورنہ ظاھر ھے کہ کتاب کا یہ نام رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی - کیونکہ اِس نام کو کتاب سے کوئی مناسبت نہیں ھے - خالق باري کے تمام مطبوعہ نسخوں میں ۱۹۲ بیتیں ھیں لیکن جو پرانا قلمي نسخہ میرے پاس ھے اُس میں یہ بیت نہیں ھے - بیت

راہ سنبل طرفی دہقان

ادبھہ بہو گا مارگ جان

اِس طرح اُس میں صرف ۱۹۱ بیتیں ھیں ـ ذیل میں ابتدائی تین بیتیں نمونے کے طور پر لکھتا ھوں ـ

خالق باری ـ سرجن ہار واحد ایک ـ بدا کرتار
رسول پیمبر ـ جان بسیٹھہ یار دوست ـ بولي ـ جا اتھہ
اسم اللہ ـ خدا کا ناؤں گرما ھے دھوپ ـ سایہ ھے چھاؤں

(۲) بحرالفضائل فی منافع الافاضل ـ

یہہ فارسی زبان کا لغت ھے جس کو محمد بن قوام کرھی نے ۷۹۵ ھ میں تالیف کیا ـ اس کتاب کی دو جلدیں ھیں ـ پہلی جلد میں فارسی کے لفظ اور اصطلاحیں ھیں ـ دوسری جلد میں پہلي جلد کے ضمیمے چودہ بابوں میں ھیں ـ آخری باب کا عنوان یہہ ھے :ـــ

" در بعضے الفاظ ھندوی کہ در نظم ھندوي استعمال کنند "

یہ گویا اُن ھندی لفظوں کا لغت ھے جو آٹھویں صدی ھجری میں مسلمانوں کي زبان پر چڑھہ گئے تھے ـ

(۳) قصیدہ در لغات ھندی

یہہ قصیدہ خالق باری کے طرز پر لکھا گیا ھے ـ اِس کے مصنف حکیم یوسفي ھیں ـ حکیم صاحب ھرات کے رھنے والے تھے ـ بابر بادشاہ کے زمانے میں ھندوستان میں موجود تھے ـ بہت سي کتابیں اُن کي تصنیف سے ھیں ـ منجملہ اُن کے طب یوسفی ؛ رسالہ نبض ؛ رسالہ قارورہ ؛ رباعیات یوسفي وغیرہ مدتوں طب کے درس میں داخل رھیں ـ یوسفي کو نظم پر وہ قدرت حاصل ھے کہ طبي مسئلے اور نسخے وغیرہ نہایت صفائي سے بے تکلف نظم کرتے چلے جاتے ھیں ـ مدرسے کتب خانے میں اُن کے رسالوں کا ایک بہت قدیم مجموعہ ھے ـ اُس میں ایک مختصر سي مثنوی تھي " مذہب

نحل و نحمل " میں ہے ایک قصیدہ ہے جس میں دواءوں کے نام عربی و فارسی میں نظم کیے ہیں اور کہیں کہیں اُن کے خواص بھی لکھہ دیے ہیں - اِسی مجموعے میں " قصیدہ در لغات هندي " بھي ھے اور جس رسالے میں یہ قصیدہ ھے اُسی میں ایک قصیدہ سلطان صحب کے اُصول میں بھی ہے جو شہنشاہ بابر کے نام معنون کیا گیا ہے - عنوان کی عبارت یہ ہے —

" اِس قصید است در حفظ صحت مزین بنام حضرت بادشاہ - سکندر حشمت سلیمان جاہ - تاج بخش عالم آرائے - عدو بند قلعہ کشائے طراز کسوت سلطنت و فرمان روائی ' نگین خاتم عظمت و کشور کشائی - قوت بازوئے مسلمانی - فروغ دیدۂ جہانبانی - خورشید روشن رائی - جمشید ممالک آرائی " -

آنکہ اورا رسد سرافرازی شاہِ جم قدر بابرِ غازی
کف او غیرتِ سحاب آمد رائے او رشک آفتاب آمد
تابعِ رائے اوست فوج ملک مسند قدر اوست اوجِ فلک
فلک آمد نہاد او فاخر خرد از مدح او بود قاصر
تا جہاں باشد ایزد متعال دارَدش بر سریر عز و جلال

ظاہر ہے کہ اِس نظم کی تصنیف کو کم سے کم سوا چار سو برس ضرور ہو چکے ہیں اِس "قصیدہ" کا پہلا شعر یہہ ہے —

نام هر چیزے بہ هندی بشنو از من اے پسر
خاصہ نامِ هر دوائے بیع برداری مگر

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کل دواءوں اور بہت سی ضروری چیزوں کے نام هندی میں بتانا چاہتا ہے لیکن میرے پاس اِس قصیدے کے صرف ۴۴ شعر ہیں اور اُن میں دواءوں کے نام بہت ہی کم ہیں ممکن ہے

که پوری نظم طویل هو اور یه صرف اسکا ایک حصه هو ذیل میں چند شعر نقل کیے جاتے هیں .—

بُل تکلم باشد و بُل کر بگو یعنی سخن
بول

شکر فرماید ترا آنکس که گوید شکر کر

جیبَ و کن آمد زبان و گوش و داڑی ریش دان
جیبهه کان داڑهي

موچ را می خوان بروت و کانَه کور و بهرَه کر
مونچهه کانا بهرا

کال پوست و پر مغز و استخوان گویند هاڈ
کهال هاڑ

انگولي انگشت باشد انگوٹه انگشت بر
أنگلي انگوٹها

هست پیشانی مته سینه چهتی دست است هت
ماتها چهاتي هاتهه

موه روئے و حل روان شو پٹ پسیں دکَ نگر
منه پیٹهه دیکهه

گوسفند آمد بهَر بز بکری و اوٹ اشتر است
بهیڑ اونٹ

بلد گاو و فیل هاتی گهوره اسپ و گدهَ خر
بردہ هاتهی گهوڑا گدها

تمر هندی امبلی السی بود تخم کتان
املی

منڈوه نوعی ز ارزن دان و گنده نیشکر
منڈوه گنڈا = گنا

ریشم ابریشم بود - کالا سیاہ اُجلا - سفید

سرمہ کاجل - مرچ فلفل - سعد موتھ - عود اگر

مانک و موتی بود - یاقوت و مروارید لیک

کھرپا ناسد کنور و روپہ نقرہ سونہ زر
سونا روپا

(۴) اللہ خدائی

اِس کتاب کا نام ھی بتاتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب امیر خسرو کی تقلید میں خالق باری کے طرز پر لکھی ہے "سبب تالیف" میں خود بھی اِس کا اعتراف کیا ہے - لکھتے ھیں —

بعد ازاں سر کنم بیانِ سخن فصلہ گرد آورم زخوانِ سخن

بہرِ مرغ سخن نہادم دام مددے خواستم ز روحِ تمام

شاید از لطف رحمتِ باری روح خسرو نمایدم یاری

تا مگر وکنم بنام اُحد طائر معنی ام بدام اُمد

خالق باری جو حقیقتاً میں اوپر لکھہ چکا ھوں کریما اور مامقیماں کی طرح اپنی ابتدائی لفظوں سے موسوم ھو گئی - بہت ممکن ہے کہ امیر خسرو نے اِس کا کچھہ اور نام رکھا ھو - مگر اللہ خدائی کا نام خود مصنف کا تجویز کیا ھوا ہے - چنانچہ خاتمے میں کہتے ھیں —

چوں بفضل خدائے گشت تمام

کردم اللہ خدائی اِس را نام

اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کتاب اِس نام سے مشہور نہیں ہو سکتی تھی اِس لیے کہ اِس کی پہلی بیت میں یہ لفظ موجود ہی نہیں ہیں -

اِس کتاب کے مؤلف شاہ جہانی عہد کے کوئی بزرگ ہیں اُن کا تخلص تجلی ہے اور تصنیف کا زمانہ ۱۰۶۰ھ خود کہتے ہیں —

در ضمیرم چوں ایں ہوس افزود
سال ہجری ہزار و شصت بود

کل کتاب میں ڈھائی سو بیتیں ہیں - ابتدا کی چند بیتیں یہ ہیں —

ہے صمد پاک اور احد یکہ جان اُم‌القریٰ کو تو مکہ
اب پدر باپ - والدہ مائی ہست اخوی برادر و بھائی
جد دادا - عمو بود چاچا قول در لفظ ہندوی باچا

(٥) تحفۃ الہند

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کو ہندوؤں کے علموں کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا - خانجہاں کوکلتاش خاں کی فرمائش سے مرزا محمد ابن فخرالدین محمد نے یہ کتاب تالیف کی - مؤلف نے اِس کا دیباچہ اپنے زمانے کے رنگ کے خلاف اور اورنگزیب کی طبیعت کے موافق نہایت مختصر لکھا ہے - میں اُسے یہاں نقل کیے دیتا ہوں کہ کتاب کی تالیف کا سبب اور مضامین کی فہرست خود مؤلف کی زبان سے سن لیجیے —

"الحمد للہ رب‌العالمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین اما بعد - چنیں گوید مست بادۂ ہذیاں بیخود مرزا محمد ابن فخرالدین محمد کہ در عہد میمنت مہد جہاں کشورستان - خدائگان قضا فرمان - بدر اوج صاحبقرانی اختر برج گورگانی - شہنشاہ خورشید کلاہ

گردون سریر ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بادشاہ عالمگیر خلد اللہ تعالیٰ ملکہ و سلطانہ - افاض علی العالمین برہ و احسانہ - حسب الاشارت با بشارت وزارت و امارت مرتبت - ابہت و اسالت منزلت - رضیع شاہ جم جاہ سکندر مکان کوکلتاش خان برائے مطالعہ ہمایوں بندگان سپہر بار والا تبار مرکز محیط سلطنت کبریٰ مرکز (؟) دولت عظمیٰ در علوم متداولۂ ہندیان - حروے چند پرداختم و آں را بہ تحفۃالہند موسوم و مشہور ساختم و آں مشتمل است بر مقدمہ و ہفت باب و خاتمہ -

۱—مقدمہ در بیان مصطلحات حروف تہجیہ ہندیہ و علم خط و ذکر اشکال حروف مذکورہ از مفردات ومرکبات و بعضے قواعد کلیہ -

۲—باب اول—در علم پنگل یعنی علم عروض اہل ہند -

۳—باب دوم—در علم تک یعنی علم قوافی اہل ہند -

۴—باب سوم—در علم الکار یعنی علم بیان و بدیع اہل ہند -

۵—باب چہارم—در علم سنگار رس یعنی علم عاشقی و معشوقی و بیان احوال عاشق و معشوق -

۶—باب پنجم—در علم سنگیت یعنی علم موسیقی اہل ہند وغیرہ -

۷—باب ششم—در علم کوک یعنی علم اقسام زن و مرد و صحبت داشتن و معاشرت با زنان -

۸—باب ہفتم—در علم سامدریک یعنی علم قیافہ کہ علامات خیر و شر در انسان ازاں معلوم شود -

۹—خاتمہ در ذکر لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند - من اللہ توفیق والرشاد منہ السداد و الیہ المعاد -

میں نے اِس کتاب کو اِس فہرست میں صرف اُس کے حاشیے کی

وجہ سے جگہ دی ہے کیونکہ اِس میں "لغات ومصطلحات و کنایات اہل ہند" کا ذکر ہے کتاب تحفۃالہند ۔ اب بہت کمیاب ہے ۔ اس لیے مجھے بہت افسوس تھا کہ اِس کا جو قلمی نسخہ مجھے دستیاب ہوا وہ ناقص ہے ۔ باب نجم کا زیادہ حصہ اور "خاتمہ" پورا غائب ہے ۔ لیکن قدیم قلمی کتابوں کے جس ذخیرے میں سے یہ نایاب نسخہ مجھے ہاتھ آیا تھا اُسی میں ہندی اور فارسی کا ایک لغت بھی نکل آیا مگر نہ مصنف کا نام معلوم ہو سکا نہ کتاب کا نہ تصنیف کے زمانے کا پتا لگ سکا نہ تحریر کی تاریخ کا ۔ میں اِسی کوشش میں تھا کہ کسی طرح اِن میں سے کسی بات کا سراغ لگ جائے کہ یکا یک خیال آیا کہ کہیں یہ تحفۃالہند کا خاتمہ نہ ہو ۔ اب جو میں نے غور کرنا شروع کیا تو خیال صحیح نکلا ۔ اِس کی صحت کے چند ثبوت ذیل میں لکھتا ہوں —

(۱) یہ لغت اور تحفۃالہند دونوں کتابیں ایک ہی کاتب کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔ اگرچہ دونوں کتابوں کی ضخامت میں فرق ہے مگر خط ایک ہے ۔

(۲) تحفۃالہند کے خاتمے میں مؤلف نے جو کچھ لکھنا چاہا تھا وہی یعنی "لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند" اِس لغت کا موضوع ہے ۔

(۳) بعض لفظوں کے معنی اِس لغت میں بھی دیے گئے ہیں اور تحفۃالہند میں بھی ۔ یہ معنی جن عبارتوں میں لکھے گئے ہیں اُن میں ایسی لفظی مشابہت موجود ہے ۔ جو یقین دلاتی ہے ۔ کہ دونوں عبارتیں ایک ہی قلم سے نکلی ہیں مثلاً "کوک" کے معنی لغت میں یوں لکھے ہیں —

"نام علمیے است در معرفت اقسام زن و مرد و فن مباشرت" اور تحفۃالہند میں کوک کی تعریف یوں دی ہے —

"علم کوک یعنی معرفت اقسام زن و مرد و صحبت داشتن و
مباشرت کردن با زنان"

لفظ "سنگیت" کے معنی لغت میں یوں لکھے ہیں -

"علم موسیقی را نامند و آن مشتمل است بر راگ و تال
و نرت یعنی نغمۂ و اُصول و رقص" -

اور تحفۃالہند میں 'سنگیت' کی تعریف میں لکھا ہے —

"عموماً مجموعۂ راگ و تال و نرت یعنی نغمۂ و اُصول و رقص و
خصوصاً بمعنی نغمہ باشد"

لفظ رومانچ کے معنی لغت میں یہ بتائے ہیں :—

"در اصطلاح اہل سنگار رس نام "بھاوے" است و آن
"بھاوے" باشد کہ از شوق و خواہش صحبت نائک
نائکا را قشعریرہ پیدا شود و موئے برا ندام بیع کند"

اور تحفۃالہند میں علم سنگار رس کے تحت میں "بھاؤ" کے
اقسام بیان کرتے ہوئے "رومانچ" کی تعریف یوں
کرتے ہیں :—

"آن حالتے بود کہ از استیلائے شہوت و غلبۂ شوق صحبت نائک
موئے بر اندام نائکا بایستند و قشعریرہ واقع شود -

لفظ "ابھرن" کے معنی لغت میں یوں لکھے ہیں :—

"بمعنی زیور و ہر ہست و آرایش بود و آن باصطلاح انسان
(یعنی اہل ہند) دوازدہ است و در علم سنگار رس
بتفصیل ذکر نمودہ شد" اِس عبارت کا آخری جملہ
یعنی "در علم سنگار رس بتفصیل ذکر نمودہ شد"

صاف ظاہر کرتا ہے - کہ اِس لغت کا مصنف علم سنگار رس کا بیان

اِس سے پہلے کر چکا ہے ۔ اور لغت کا دیکھنے والا اُس بیان کو پڑھ بھی چکا ہے اِس لیے بارہ ابھرنوں کی دوبارہ تفصیل ضروری نہیں ہے ۔ صرف اُس بیان کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے ۔ عبارت کے انداز سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علم "سنگار رس" پر مصنف نے کوئی علحدہ کتاب نہیں لکھی تھی کیونکہ اگر مصنف اپنی کسی دوسری کتاب کا حوالہ دے رہا ہوتا تو اوپر نقل کیے ہوئے جملے میں "سنگار رس" کی جگہ اُس کتاب کا نام ہوتا یا اُس معنی کے لفظ ہوتے کہ "وہ کتاب جو میں نے علم سنگار رس میں لکھی ہے" ۔ اگر "سنگار رس" ہی کو کتاب کا نام فرض کر لیں تو بھی "علم سنگار رس" کی جگہ "کتاب سنگار رس" ہونا چاہیے اور ان سب باتوں پر نظر کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لغت کسی ایسی کتاب کا ایک جزو ہے جس میں علم سنگار رس کا بیان بھی اِس سے پہلے موجود ہے اب ذرا کتاب تحفۃالہند کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ اُس کا باب چہارم علم سنگار رس کے بیان میں ہے ۔ اور "خاتمہ" میں "لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند" کا ذکر ہے جو اِس لغت کا موضوع ہے ۔ شکی طبیعت والے تو اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاید کوئی اور کتاب بھی ایسی ہو کہ اُس میں علم سنگار رس کا بیان بھی ہو اور لغات و مصطلحات و کنایات اہل ہند کا ذکر بھی ہو اور یہ لغت اُسی فرضی کتاب کا ایک جزو ہو ۔ لیکن اگر اِس طرح کے شبہوں کو دخل در معقولات کا موقع دیا جائے تو شاید ہی کوئی بات کبھی ثابت ہو سکے بہرحال ادبی تحقیق کے سلسلے میں جس طرح کے ثبوت بالعموم کافی سمجھے جاتے ہیں ان پر نظر کر کے میرے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ یہ لغت تحفۃالہند کا "خاتمہ" ہے جسے مرزا محمد ابن فخرالدین محمد نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں تالیف کیا تھا ۔

اِس لغت میں هندی لفظوں کا تلفظ اور ان کے معنی فارسی میں دیے گئے ہیں - کل لفظوں کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب ہے - اگرچہ اِن میں بہت سے لفظ ایسے ہیں جو اردو میں گھل مل نہیں سکے - لیکن بہت سے لفظ ایسے بھی ہیں جو قدما کے کلام میں پائے جاتے ہیں مگر اب متروک ہو جانے کی وجہ سے اُن کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہے - اردو کے دوسرے لغتوں میں اول تو یہ لفظ ملتے ہی نہیں ہیں اور اگر ملتے بھی ہیں تو اُن کے صحیح تلفظ اور لغوی معنی معلوم نہیں ہو سکتے - ان کے علاوہ رائج الوقت الفاظ بھی بہت ہیں -

تحفۃالہند کا جتنا حصہ میرے پاس ہے اُس کی ضخامت ۲۲۲ صفحے ہے اور اس کے ' خاتمے ' کا حجم ۴۴ صفحے ہے - ہر صفحے میں اوسطاً ۲۲ سطریں ہیں اور خط بہت جلی ہے -

(۶) فرینسس کَس ایم تیورنی سس کا لغت

مؤلف ایک اطالوی مشنری تھا جو هندستان میں تبلیغ مذهب کی غرض سے آیا تھا - اُس نے ۱۷۰۴ ع میں هندستانی زبان کا ایک لغت لکھا تھا (ع - ح) -

(۷) جان جُو شُواکِٹلر کا لغت

مؤلف پروشیا کا باشندہ تھا - ڈلندیزوں نے اِس کو اپنا سفیر بنا کر شاہ عالم کے دربار میں بھیجا تھا - چند سال هندستان میں رہ کر پھر ۱۷۱۶ ع میں ایران کا سفیر ہو کر چلا گیا - اُس نے هندستانی زبان کا ایک لغت غالباً لاطینی زبان میں لکھا تھا - (ع - ح) -

(۸) غرائب اللغات

یہہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری - عجائب اللغات (دیکھو نمبر ۹ فہرست هذا) کے دیباچے سے صرف یہہ پتا چلتا هے کہ اِس کے مؤلف فاضل اجل مولوي عبدالواسع هانسوي هیں اور نوادرالالفاظ (دیکھو نمبر ۱۰ فہرست هذا) کے دیباچے سے یہہ معلوم هوتا هے کہ اِس لغت میں وہ هندی الفاظ جمع کر دیے گئے هیں جن کے عربی یا فارسي یا ترکي مترادفات لوگوں کو بالعموم معلوم نہ تھے - مؤلف نے هندي لفظوں کو اصل لغت قرار دے کر اُن کے معنی فارسی میں اور مترادفات عربي فارسی یا ترکی میں دیے هیں -

(۹) عجائب اللغات

مؤلف نے دیباچے میں اِس لغت کی تالیف کا حال یوں لکھا هے

"میگوید اضعف عباداللہ العلي متعلم ناصرالفهم احسیری دلولي کہ چوں بعضے از معانی و مضامین کہ لسان هندی از زبان مردم شنیده میشد و اکثر از مستفیدان در جستجوے فرس آنها حیران و سرگردان می گشتند - بنابران - بقدر فهم خود فارسي آنها از نسخۂ جہانگیری و فرهنگ طب شهابی - و غرائب اللغات تصنیف افاضت پناهي مولوي عبدالواسع هانسوی حفظه الله تعالیٰ عن الآفات والدواهی انتخاب نموده در ایں اوراق معدوده مندرج ساختم و ابواب مطابق اوائل حروف هندي جدا جدا بر داختم و استشهاد بعضے لغات از اشعار معتبر از هر جا بهزار تگاپو بر منصۂ بیان انداختم و نام این عجائب اللغات نهادم'' -

اس عبارت سے معلوم هوتا هے کہ یہہ لغت غرائب اللغات کے بعد اور نوادرالالفاظ سے پہلے تالیف کیا گیا تھا ورنہ مؤلف خان آرزو کی تحقیق سے

بھی فائدہ اُٹھایا - مؤلف نے مولوی عبدالواسع کے نام کے بعد جو دعائیہ فقرہ لکھا ہے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عجائب اللغات کی تالیف کے وقت زندہ تھے -

میرے کتب خانے میں اِس لغت کا جو نسخہ موجود ہے وہ مکمل کتاب نہیں ہے - بلکہ اصل کتاب کا انتخاب منتخب عجائب اللغات کے نام سے ہے اور صرف ۴۶ صفحوں پر ختم ہوگیا ہے - ہر صفحے میں سترہ اٹھارہ سطریں ہیں -

(۱۰) اُردو لغت مؤلفہ خان آرزو

یہ لغت علامۂ شہیر سراج الدین علی خاں آرزو کی تالیف ہے اِن کی علمی و ادبی قابلیت اور اِن کی جلالت قدر کے جاننے والے ابھی اِتنے موجود ہیں کہ اُن کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں - مگر ان کے اُردو لغت کے سلسلے میں صرف اِتنی بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خان آرزو - میر تقی میر کے ماموں اور اُستاد تھے - مرزا رفیع سودا کو بھی اُن کی شاگردی کا شرف حاصل تھا -

مؤلف نے دیباچے میں اِس کتاب کا "سبب تالیف" یہ لکھا ہے - "میگوید فقیر سراج الدین علی آرزو تخلص کہ یکے از فضلائے ہندوستان کتابے در فن لغت تالیف نمودہ مسمیٰ بہ غرائب اللغات و لغات ہندی کہ فارسی یا عربی یا ترکی آں زبان زد اہل ایں دیار کمتر بود در آں با معانی آں مرقوم فرمودہ - چوں اکثر در بیان معنی الفاظ تساہلے و سہوے بہ نظر آمد لہذا نسخۂ در ایں باب بقلم آمد - در ہر جائے کہ سہو و خطائے معلوم کرد اشارت بداں نمود - نیز آنچہ بطبع ناقص ایں کمال دوست در آمد بر آں افزود - و چوں در غرائب اللغات رعایت حرف ثانی نبود بر آوردن لفظ قدرے مشکل می نمود ازیں باعث مراعات مذکور بعمل آمد" -

اِس لغت کا جو قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں ہے وہ ۱۲۴۰ ھ کا نقل کیا ہوا ہے اِس کا حجم ۳۰۲ صفحے ہے اور ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں - خاتمہ پر یہہ عبارت لکھی ہوئی ہے - "تمام شد کتاب غرائب اللغات من تصنیف سراج الدین علی خان المتخلص بہ آرزو بہ دارالسلطنت لکھنؤ بتاریخ بست دہم شعبان المعظم روز پنجشنبہ سنہ یک ہزار و دو صد و چہل" - مگر دیباچے کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اِس کتاب کا نام غرائب اللغات نہیں ہے نہ مسلم ہے کہ خان آرزو نے الفاظ ہندی کا ایک لغت نوادرالالفاظ کے نام سے لکھا تھا - اغلب ہے کہ یہہ وہی لغت ہو - خان آرزو اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں ۳۰۰ روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے تھے اور یہیں سنہ ۱۱۶۹ ھ میں کوئی ۷۸ برس کی عمر میں انتقال کیا - اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ لغت اتھارویں صدی عیسوی کے نصف اول میں لکھا گیا تھا -

(۱۱) ڈیوڈ مِل کا لغت

ڈیوڈ مل کے مضا مین کا مجموعہ سنہ ۱۷۴۳ ع میں شائع ہوا تھا اُس میں لاطینی - ہندستانی اور فارسی کا ایک مختصر سا لغت بھی شامل تھا - (ع + ح) -

(۱۲) فرگسن کا ہندوستانی لغت

یہہ ہندوستانی انگریزی لغت پہلے پہل سنہ ۱۷۷۳ع میں شایع ہوا تھا - (ع + ح) -

(۱۳) شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان

یہہ کتاب مرشد آباد کے نواب امیرالملک شمس الدولہ سید احمد علی خان

بہادر ذوالفقار جنگ کی فرمایش سے مرزا جان طپش نے ۱۲۰۷ ھ
میں تالیف کی تھی - اِس تالیف کی غرض دیباچے کی اِس عبارت سے ظاہر
ہوتی ہے کہ "نسخه مشتمل بر توضیح اصطلاحات دیار دهلی و زود
مرهٔ فصحاے اُردو ے معلیٰ ابدہ در بعضے اشعار منظوم می گردد و فہم
دور و ستاں و هر آنانکه در امصار بعید واقع اند بادراک کُنہش نمی رسد
زیور تالیف آراستگی یابد تا مطالعهٔ آں انواع کنایت را صراحت بخشد
و بر طالبان این فن کار آساں گردد" -

مؤلف نے اُردو محاوروں کے معنی فارسی میں بیان کیے هیں اور هر
محاورے کی سند میں اساتذہ کے شعر پیش کیے هیں - یہہ کتاب نہایت
قابل قدر هے اِس میں بہت سے ایسے محاوروں کے معنی دیے هوئے هیں
جو متقدمین کے کلام میں موجود هیں مگر اب متروک هو گئے هیں
اور جن کے معنی سمجھنے میں دقت هوتی هے مثلاً کسی کی آس پڑنا -
آنکھوں میں آنی - سرام لینا - بوجھہ پکڑنا - درخت کا پانوں آ لگنا
پانوں چل جانا وغیرہ - میرے کتب خانہ میں اِس کتاب کا جو نسخہ
هے وہ ۱۲۲۶ ھ میں مطبع آفتاب عالمتاب - مرشدآباد میں چھپا
تھا اور سو صفحوں میں تمام هوا هے -

کتاب الفہرست کے مؤلف نے اِس لغت کے مؤلف کا نام مرزا جان طپش
کی جگہ مرزا جان عیش لکھہ دیا هے - تذکرہ طور کلیم میں لکھا هے کہ مرزا جان
کا اصلی نام اسمعیل تھا - لکھنؤ میں مرزا جہاندار شاہ کی رفاقت میں رهتے تھے
اس کے بعد بنگالہ میں نواب شمس الدولہ کی سرکار سے متعلق هوگئے تھے -
سنسکرت زبان خوب جانتے تھے - میر درد کے شاگرد تھے اور زیادہ تر قطعے کہتے تھے -

(۱۴) انگریزی ھندوستانی لغت مولفه ڈاکٹر گلکرسٹ

یہ لغت اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھا گیا اور فورٹ ولیم
کالج کے مطبع میں چھپا - (ع + ح) -

(١٥) هندی عربی آئینه

اِس کتاب میں اُن عربی لفظوں کی جدولیں دی گئی ہیں جن کا ہندستانی زبان سے تعلق ہے - یہہ کتاب بھی فورٹ ولیم کالج کے مطبع میں سنه ١٨٠٢ ع میں چھپی تھی - (ع+ ح) -

(١٦) کپتان جوزف تیلر اور ڈاکٹر ہنٹر کا هندستانی انگریزی لغت

کپتان تیلر فورٹ ولیم کالج کلکته میں هندستانی زبان کے پروفیسر تھے - انھوں نے اپنے استعمال کے لیے ایک هندستانی انگریزی لغت مرتب کیا تھا - ڈاکٹر هنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے فاضل هندستانیوں کی مدد سے اس لغت پر نظر ثانی کر کے اس کو پہلی مرتبه سنه ١٨٠٨ ع میں کلکته میں چھپوایا -

(١٧) انگریزی هندوستانی لغت مرتبۂ ڈاکٹر هیرس

ڈاکٹر هیرس کا یہه لغت سنه ١٨١١ ع سے پہلے تالیف هو چکا تھا اس لیے که کپتان تامس روبک نے اپنے لغت کی تالیف میں اس سے مدد لی تھی اور ان کا لغت سنه ١٨١١ ع میں شائع ہوا تھا - اس لغت کے علاوہ ڈاکٹر هیرس نے هندستانی اور دکھنی کا ایک نہایت ضخیم لغت تیار کرنے کا سامان کیا تھا - نہایت محنت اور کوشش سے قابل هندستانیوں اور دکھنیوں کی مدد سے اس لغت کے لیے مودا فراهم کیا تھا مگر اس کام کو تکمیل تک پہنچانے نه پائے تھے که موت آ گئی - جتنا مواد وہ فراهم کرچکے تھے وہ کئی ضخیم جلدوں میں سما سکا تھا - یه قلمی جلدیں انڈیا هاوس کے کتب خانے میں رکھه دی گئی تھیں -

جان شیکسپیر نے اپنے لغت کی تالیف میں اس مواد سے بہت فائدہ اٹھایا ۔ ڈاکٹر ہنٹر کا قیام مدراس میں تھا ۔

(۱۸) فرہنگ اصطلاحات جہازرانی

اس فرہنگ کے مؤلف کپتان تامس روبک ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے اسسٹنٹ سکریٹری تھے ۔ اس میں جہاز کے مختلف حصوں کے نام ۔ جہازرانی کے اصطلاحات اور بحری فوج کے قواعد کے الفاظ دیے گئے ہیں ۔ یہہ کتاب سنہ ۱۸۱۱ ع میں چھپي تھی ۔ (ع + ح) ۔

(۱۹) ہندستانی انگریزی لغت مؤلفہ کپتان تامس روبک

اس میں وہ الفاظ و محاورات جمع کیے گئے ہیں جو ہندستانی زبان کي مروجہ کتابوں میں موجود تھے مؤلف نے اس کتاب کی تدوین میں گلکرسٹ ، ہنٹر اور ہیرس کے لغتوں سے بھی مدد لی ہے ۔ یہ کتاب بھي سنہ ۱۸۱۱ ع میں چھپی تھی ۔ (ع + ح) ۔

خزینۃ الامثال

یہ عربی ، فارسي اور اردو مثلوں کا مجموعہ سید حسین شاہ حقیقت کا مرتب کیا ہوا ہے ۔ اس کي ترتیب یوں ہے کہ ہر حرف کے تحت میں پہلے عربي پھر فارسی اور پھر اردو مثلیں لکھی گئی ہیں ۔ عربی مثلوں کا ترجمہ بھی فارسی میں مولوي تراب علي نے کر دیا ہے ۔ یہہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع نظامی ، لکھنؤ ، میں شاہی زمانے میں چھپي تھي ۔ میں نے اس کا جو نسخہ دیکھا ہے وہ مطبع نولکشور ، کانپور ، میں سنہ ۱۸۹۲ ع میں چھپا تھا اور اس کا حجم ۲۵۵ صفحے ہیں ۔

اس کتاب کی تالیف کا زمانہ ٹھیک معلوم نہیں - لیکن حقیقت کی یہ کتابیں اور میرے کتب خانے میں ہیں یعنی صنم کدۂ چین - جذب عشق اور ہشت گلزار جو ۱۲۰۹ ھ ۱۲۱۱ ھ اور ۱۲۲۵ ھ میں ترتیب وار لکھی گئی ہیں - اس سے یہہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خزینۃالامثال تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں یعنی اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری یا انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی چند سالوں میں تالیف ہوئی -

(باقی آیندہ)

تذکرۂ خسرو کے تمہیدی صفحات

۱ جہانگیر کی پیدائش

(از مولوی مقبول احمد صمدنی ' صاحب جنات جلیل)

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد

ورنہ این بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نہ داشت

بندہ جاوید مورخ ، لالہ سبحان رائے جو بہادر شاہی دربار سے بندرابن داس کے ممتاز خطاب سے سرفراز تھے ، اپنی مستند و نفیس کتاب خلاصۃالتواریخ[۱] میں لکھتے ہیں کہ ہندو راجاؤں سے قرابت و یگانگی پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے ہمایوں کو پیدا ہوا تھا - یہہ عظمت و سطوت والا بادشاہ جب شیر شاہی افواج سے

---

۱ " منشی المناسی لالہ سبحان رائے بھنڈاری " لکھے جاتے ہیں - شاہزادہ محمد معظم (شاہ عالم) کے معروف و معتمد دیوان تھے ، تلوار اور قلم دونوں کے دھنی - ۱۰۹۵ ھ (۱۶۸۴ ع) میں کول کنڈے کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے - حسن لیاقت کی وجہ سے شاہزادہ اُن کو بہت عزیز رکھتا تھا - عالمگیر کے یہاں بھی اُن کو شرف و امتیاز حاصل تھا ذات کے کھتری تھے ، بٹالہ ملک پنجاب کے رہنے والے - (امرائے ہنود صفحہ ۳۷۹ - ۱۱۰۷ ھ (۱۶۹۵ ع) میں فوت ہوئے - منتخب اللباب جلد دوم (ص ۲۱۱) اور قاموس المشاہیر جلد اول (ص ۱۳۲) میں بندرابن داس بہادر شاہی کے نام سے ان کا ذکر ہے - مجموعہ رقعات عالمگیر (مطبوعہ ۱۹۳۰ ع) میں ان کی سکونت پٹیالہ تحریر ہے - در اصل اس غلطی کی ذمہ داری ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہند (جلد ہشتم صفحہ ۵) اور قاموس المشاہیر (جلد اول صفحات ۲۸۲ و ۲۸۳) پر ہے - پروفیسر ڈرسن نے سجان (س ، ج ، ا ، ن) کو سبحان (س ، ب ، ح ، ا ، ن) لکھ دیا ہے - سبحان اللہ -

۱ اس کے متعدد قلمی نسخے ہماری نظر سے گزرے ہیں [illegible] اختتام یا خاتمہ کتاب میں شامل مگر منکسر مزاج مصنف نے اپنا یا کتاب کا نام کہیں نہیں لکھا جن کتابوں میں اس کا حوالہ ہے اِس کو " خلاصۃالتواریخ " لکھتے ہیں - دیباچہ مآثرالامرا (صفحہ ۴) میں بھی اِس کا نام خلاصۃالتواریخ اور عہد عالمگیر کی تصنیف بتایا ہے - مسٹر بیل ، اورینٹل بیاگرفی کا ذکر ، صفحہ ۷۳ ،

شکست کھاکر شکستہ حالی میں، ایران پہونچا ہے تو شاہ طہماسپ صفوی نے اس مملوک الحال و غریب الدیار مگر عظیم المرتبت مہمان کی بڑی تعظیم و تکریم کی - شایان شان خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا - زیادہ قیام سے بے تکلفی بڑھی تو اثنائے گفتگو میں شاہ کی زبان سے یہ نکلا کہ جب بابر نے ہندستان فتح کیا تھا تو اگر اُسی ہنگامہ اور اُسی سلسلہ میں وہاں کے بڑے بڑے عمائد اور زمینداروں سے رشتہ و پیوند کسی طور سے قائم

میں "بندراس" کی کتاب کا نام "لب التواریخ" لکھتے ہیں - یہ دوسرے بندراس تھے، دوارا مل کے بیٹے - جو دارا شکوہ کا دیوان تھا اور جس کو شاہ جہاں نے "راے" کا خطاب دیا تھا - باپ کے مرنے پر بیٹے کو عالمگیر نے بھی اعزاز بخشا - اُس کی "لب التواریخ" میں شہاب الدین غوری سے لے کر ۱۱۰۱ ھ (سنہ ۱۶۸۹ ع) تک کے حالات مندرج ہیں - یہ "لب التواریخ ہند" بھی کہلاتی ہے - غلط فہمی سے بچنے کے لئے، اس قدر اور لکھ دینا چاہتا ہوں کہ "لب التواریخ" دو اور بھی ہیں - ایک امیر یحیی بن عبداللطیف الحسینی کی، جو سنہ ۹۲۸ ھ (سنہ ۱۵۳۱ ع) میں تالیف ہوئی اور جس کا تذکرہ مآثرالامرا اور حاجی خلیفہ میں ہے - دوسری، مدرس سکندر فرار تنلر کی یادگار ہے -

منشی سبحان راے نے آئین اکبری کے طرز پر ابتدائے آفرینش یا آغاز عالم و عالمیان سے لے کر سال چہلم جلوس عالمگیر یعنی ۱۱۰۷ ھ تک ہندستان کی نہایت اچھی تاریخ لکھی ہے - صوبوں، علاقوں، شہروں، اور قصبوں کے حالات بھی بہتر صورت لکھے ہیں - یہ اس عہد کا خاصا "امپیریل گزیٹیر" ہے جو دو برس کی سعی و محنت سے تیار ہوا تھا - خلاصۃالتواریخ کا ترجمہ یا خلاصہ جان گلکرسٹ صاحب کی فرمایش سے میر شیر علی افسوس نے اردو میں کیا تھا - آرایش محفل نام ہے - انگریزی میں بھی مسٹر هنری کورت کے قلم سے آراستہ ہوا - خلاصۃالتواریخ مطبوعہ (دہلی سنہ ۱۹۱۸ ع) میں باوجود سعی و اہتمام بعض قلمی نسخوں کے کچھ باتیں رہ گئی ہیں -

منشی صاحب کے خطوط (۱۱۰۷ ھ تک) کا مجموعہ خلاصۃالمکاتیب ہے -

* صفحہ ۳۶۰ - نسخہ قلمی کتب خانہ عالیہ صدیقیہ مولوی حکیم سید مقبول احمد صاحب مرحوم -

کر لیتا تو خوب ہوتا - نازک موقعوں پر اس سے امداد و اعانت ہوتی ؟
امور سلطنت میں خلل نہ آنے پاتا - ضرورت کے وقت یہی ناتے
رشتے مضبوط طنابیں بن جاتے - بدلمہ کی صحبت تھی اور دل در
حوت - ہمایوں نے آنکھ سے دو تین قطرے ٹپکائے اور کچھ جواب
نہ دیا - ایک مدت بعد وہ لوٹ کر ہندستان آیا اور اپنے باپ
کا فتح کیا ہوا ملک خاندان سوری سے چھین لیا مگر یہ خیال
اُس کے دل و دماغ پر ہمیشہ مستولی رہا - تمام موت آچکا تھا -
کتب خانہ کے زینہ سے پھسلا اور جان عزیز جان آفرین کے سپرد
کی - جس عزم کو کہ ہمایوں قلت فرصت اور ناگہانی موت کی وجہ سے عمل
میں نہ لا سکا تھا اُس کو اُس کے سعادت مند اور صاحب تدبیر
جانشین اکبر نے پورا کیا - وصیت کے موافق تخت نشین ہونے کے
بعد ہندستان کے دو بڑے زمینداران کو وصلت و پیوند کے لیے
سوند بھیجے - اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ تسلیم و اقبال کی صدائیں
ہر طرف سے بلند ہوئیں -

تم جسے یاد کرو ؟ پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا ؟ نہ خدا یاد رہے

---

* خان بہادر سید محمد لطیف - تاریخ آگرہ - صفحات ۲۰۷ و ۲۸۴ -
و تاریخ ہند از مسٹر ڈی لاوش صفحہ ۹۸ - ''آگرہ مس تیں دن'' از لیفٹنٹ کرنل
اج اے نیویل - صفحہ ۲۹ -

فارسی مورخوں نے خواہ مسلمان ہوں خواہ ہندو ؟ کمال راستی و درستی سے
کام لیا اور اس تصویر کے دونوں رخ دکھا دیے ہیں - جہاں وہ یہہ لکھتے ہیں کہ :--

(۱) سال بست و نہم دختر عمت سرست راجہ بھگونت داس را با شاہزادہ سلیم
پیوند بیوگانی دادند - مآثرالامرا جلد دوم - صفحہ ۱۳۰ -

(۲) اودے سنگھہ عرف موتہ راجہ (مارواڑ) کی ایک بیٹی ؟ (بال متی)
نامی لڑکی سلیم کے عقد میں آئی - جس سے سلطان خسرو متولد ہوا - مادر جلد
دوم - صفحہ ۱۸۱ -

آزاد دهلوی نے دربار اکبری میں اسی گفتگو کو "هندوؤں کے ساتھ عنایت" کے عنوان سے اپنے شعریں انداز اور دلکش عبارت میں به تبدیل درداز نقل کیا هے - امرائے هنود میں† بھی پیرایه بدل کر ایسا هی لکھا هے -

---

(۳) رائے کلیان مل زمیندار بیکانیر، صبیه برادر خود را داخل پرستاران محل سرائے خسروانی ساخته سر رشته اختصاص بدست آورد - مآثر جلد دوم - صفحه ۱۴۸ -

(۴) سال سی و یکم صبیه رائے رائے سنگھه بیکانیری بعقد ازدواج شاهزاده سلیم در آمده بر منزلت او افزود - ایضاً - ص ۱۵۱ -

(۵) ۹۸۴ ھ (سنه ۱۵۷۶ ع) میں اکبر نے راجه بیر برادر رائے لون کرن کو راجا ڈونگر پور کے پاس بھیجا - راجا اپنی بیٹی حرم سرائے شاهی میں داخل کرنا چاهتا تھا مگر بعض وجوه سے رکا هوا تھا - اُن کے پہونچتے هی رانی کو خوش خوش روانه کر دیا - دربار اکبری - صفحه ۲۹۷ -

(۶) سال سوم جلوس جهانگیری میں راجه مها سنگھه ولد راجه جگت سنگھه پسر کنور مان سنگھه کچھواهه کی بہن کے لئے آسی هزار روپیه ساچق (تحائف قبل شادی) بھیجکر داخل محل کی گئی - راجه مان سنگھه نے ساٹھه هاتھی بطریق جهیز پیش کئے - مآثر ج ۳ - ص ۱۷۵ -

(۷) سال چهارم راجه رام سنگھه دیو بندیله کی بیٹی اُس کے عرض کرنے پر خسروی (بادشاهی) محل میں داخل هوئی - ایضاً - ص ۲۱۳ -

مؤلف مآثر کو اُس کے ساتھه اُن کو یهه تحریر کرنے میں بھی باک نهیں هوتا که راجگان اودے پور نے مسلمانوں کو لڑکی دینے کا ننگ گوارا نهیں کیا - یه بھی لکھے هیں "گویند که صبایائے راجهائے راٹھور و کچھواهه داخل محل بادشاهان تیموریه شده اند اما از قوم سیسودیه این نسبت را هیچ کس قبول نه کرده" - اس اجمال کی تفصیل یه هے که جهانگیر نے بعد تخت نشین هونے کے خواهش کی تھی که جگت سنگھه پسر راجه مان سنگھه کی لڑکی کو داخل شبستان محل شاهی کرے مگر رائے بھوج پسر رائے سرجن هادا جو اُس کا نانا (پدر مادر) تھا راضی نه هوا - بادشاه کو نا گوار بھی گزرا - خیال تھا که واپسی کابل پر اُس کی تنبیه کی جائے گی مگر قضائے الهی سے رائے بھوج اسی سال فوت هو گیا - مآثر جلد دوم - صفحه ۱۴۱ -

* صفحه ۶۱ -

† صفحه ۳۸ -

چنانچہ سب سے پہلے خود اس کے مسکوے عالی میں اس ملک کے حکمران خاندانوں میں کی دو شاہزادیاں داخل ہوئیں - ایک حسن خاں* میواتی کی دختر بیگ اختر - دوسری - راجہ بہارا مل† کچھواہہ والی جےپور کی خوش سلیقہ اور باتمیز بیٹی‡ - اسی راجہ کے نسبت جہانگیر اپنے ترک§ میں کہتا ہے "اول کسے کہ از راجپوتان کچھواہہ شرف بندگی پدر من دریافت ؛ راجہ بہارا مل بود - در راستی و درستی اخلاص و نسبت شجاعت از قوم خود امتیار تمام داشت" -

---

* یہہ خلاصۃالتواریخ کی روایت ہے - مآثرالامرا میں لکھا ہے کہ حسین خاں میواتی کے چچا زاد بھائی جمال خاں نے اپنی بیٹی اکبر کو خود اکر بیاہ دی تھی - "جمال خاں عمزادہ حسن خاں میواتی کہ از زمینداران معتبر ہندوستان بود درصوبہ داشت - چوں بملازمت رسید کلاں را بادشاہ در حبالہ عقد خود آوردہ ، دوم را بہ بیرام خاں تزویج نمود" - (جلد اول - صفحہ ۶۹۳) صبیۂ بہ نمی دختر (غیاث)

† بہارا مل' بہاری مل اور پورن مل بھی کہلاتا تھا - اس نے ۹۳۳ ھ (سنہ ۱۵۲۷ ع) کے قریب بابر کے دربار میں حاضر ہو کر عہد کیا تھا - اکبر سے بھی دربارہ اور خیرخواہانہ مراسم و تعلقات تھے - مورخین لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی نے اپنی بیٹی کی شادی اکبر سے کر دی تھی (تاریخ ہند از ذکا اللہ ؛ صفحہ ۹۸ - نیز دیگر تواریخ مندرجہ بالا و ما بعد) بہارا مل اور اُس کا بیٹا بھگوان داس یکساں اعلیٰ مراتب فوجی و ملکی پر پہونچ گئے تھے اور سلطنت کے معزز و بارسوخ امیر تھے - مسٹر بیل راجہ کا نام بہاری مل بتاتے ہیں - امراے ہنود (صفحہ ۷۴) میں بہارا مل لکھا ہے - دربار اکبری (ص ۲۳۰) میں تحریر ہے کہ راجہ بہارا مل راجہ ابتیر اُس وقت کچھواہہ خاندان کا خراج رساں کرنے والا تھا -

‡ مریم زمانی کہلاتی ہے - اصلی نام کسی مورخ نے نہیں لکھا - مفتاح التواریخ (ص ۲۰۹) میں سلطانہ رقیہ بیگم تحریر ہے ۹۶۹ ھ (سنہ ۱۵۶۱ ع) میں زینت نقش محلات ہوئی تھی آگرہ میں اپنے بیٹے جہانگیر کے عہد میں سنہ ۱۰۳۲ ھ (سنہ ۱۶۲۳ ع) میں وفات پائی - جہانگیر نے اُس کی قبر در بہشت آباد سکندرہ میں' بیرون مقبرہ اکبر' گنبد و عمارت بنوائی جو ' روضۂ مریم'' کے نام سے مشہور ہے - اِس میں پادریوں کا چھاپہ خانہ مدت سے ہے (گرہ ہینڈبک از کین - صفحہ ۴۸) -

§ صفحہ ۷ نسخہ مطبوعہ قدیمہ علی گڈھہ -

شاہ نواز خاں* لکھتے ہیں کہ "در قصبہ سانگانیر راجہ بہارا مل بابسرے از خویشاں بہ تقبیل بساط سرافراز گشتہ بانواع عواطف پایہ قدرش افزود راجہ از درست فکری و دور اندیشی خواست کہ خود را از زمرہ زمینداران بر آوردہ در مخصوصان درگاہ بادشاہی انسلاک دہد خواہش نمود کہ صبیہ خود را داخل حرم سرا نماید - بادشاہ قبول فرمود - راجہ بسر انجام اس نسبت دستوری بگرفت - و ہنگام معاودت در منزل سانبھر صبیہ عفت سرشت را بہ ترک تمام بدولت سرائے بادشاہی فرستاد و خود در منزل رتن با بھگونت داس پسر و کنور مان سنگھہ نبور او بشرف ملازمت اختصاص یافت"-

[قصبہ سانگانیر میں، راجہ بہارا مل اپنے بہت سے عزیز و اقارب کے ساتھہ حاضر ہوا - اس کے ساتھہ بڑی مہربانیاں کی گئیں عزت و مرتبہ بڑھا - راجہ نے عقل مندی اور دوراندیشی سے خواہش کی کہ زمینداروں کے طبقہ سے نکل کر بادشاہی لوگوں کے حلقہ میں آجاؤں - بیٹی دینا چاہی - بادشاہ نے قبول کی - راجہ نے اس نسبت کی انتظام دہی کے لیے اجازت پائی - واپس آکر سانبھر کے مقام پر پورے اہتمام و احتشام کے ساتھہ لڑکی کو بادشاہ کے دولت‌خانہ بھیج دیا - اور لشکرگاہ رتن میں خود معہ بھگونت داس اپنے بیٹے اور کنور مان سنگھہ پوتے کے حاضر ہوکر سلام و آداب بجالایا -]

نامور مورخ استینلے لین پول کا بیان ہے کہ "سنہ ۱۵۶۲ع میں بھگوانداس کا باپ راجہ بہاری مل، والی امیر و مورث مہاراجگان حال جے پور بادشاہ کے حضور میں بجا آوری آداب کے لیے حاضر ہوا تو اُس کی بڑی عزت و تکریم کی گئی اور اُس کی بیٹی کو جو بڑی عالی منش لڑکی تھی جہاں پناہ نے قبول فرمایا - وہ محل سرائے سلطانی کی خواتین میں داخل ہوئی - اگر

---

* ماثرالامرا - جلد دوم - صفحہ ۱۱۳ -

اپني اعمام زاديوں ؟ رقيه و سليمه ؟ سے شادی کر چکا تھا مگر اس راجپوت شاهزادي کے ساتھه شادی کرنے سے ایک نئي مصلحت سیاسي (پالسي) کا آغاز هوا - * ان کے بعد حسب ضرورت و مصلحت اکبر نے اور راجپوتنیوں سے بھي شادي کی - مثلاً راجه بیکانیر کي لڑکی وغیرها - †

کون کہه سکتا هے که اس راءے پر عمل کرنے میں دانشمند اکبر نے غلطي کي یا غفلت فرمائي - اُبھرنے والي قوموں اور جماعتوں کو اس قسم کے تعلقات بغیر چارا نہیں هوتا - دنیا کی تاریخ بتاتی هے که میدان ترقي میں قدم رکھنے والے اور عروج پانے والے انسان؟ جن کی زبان پر "ملک خدا تنگ نیست؟ پاے مرا لنگ نیست" هوتا هے؟ اپني اولاد کو مختلط النسل هونے سے بچا نہیں سکتے - هندستان ؟ کے سات کرور مسلمانوں میں کے بہت سے معزز اور محترم خاندان ایسے هی مسلمان و هندو یا ملکي و غیر ملکي قرابتوں کي یادگار هیں - همارے زمانه کی وه هونہار جماعت جو اینگلو انڈین کہلاتي هے ؟ دو مختلف قوم اور رنگ کے انسانوں کے اتحاد کا نتیجه هے - اکبر کیا کرتا - "بابر جب هندستان آتا هے تو مسلمانوں کي حرم سرائیں هندستاني عورتوں سے بھری هوئي تھیں اور مسلمانوں کي ظاهري کثرت پر "دوغلے" یا "ادھه ذات" یا "دوسلا" هونے کا اطلاق هوتا تھا - ‡ "ملک و ملت کي پابندیاں یا جماعتي خصوصیات مانع نه تھیں - اکبر کہنے کو "مغل؟ تھا جو عربي زبان میں "منگول؟ کو کہتے هیں - هندستان آکر یه لفظ اُس کے لیے یا اُس کے اُن بھائیوں کے لیے رہ گیا تھا جو بابر کے اخلاف و اولاد تھے - یه شاخ تورت میں بعض اوقات "بابری" کہلاتي هے -

---

* هندستان کي قرون وسطی کي تاریخ - از اسٹینلے لین پول - صفحه ۲۵۱ -

† - صفحه ۲۵۷ -

‡ - صفحه ۱۸۹ -

بابر بھی ''مکسچربرس'' یا مخلوط النسل تھا یعنی باپ کی طرف سے 'ترک' اور ماں کی جانب سے 'منگول' - وہ مُغل کے نام سے حد درجہ نفرت کرتا بلکہ چڑھتا تھا - *

سر ولیم سلی مین† لکھتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو یہہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ''ہندوستان میں ہماری سلطنت پر زوال اس وجہ سے آگیا کہ ہمارے سلاطین کی رگوں میں راجپوتی خون باقی نہیں رہا تھا'' - اس میں شبہہ نہیں کہ ہندستان کے راجپوتوں کے خون سے بہتر کوئی خون ہی نوع آدم کی رگوں میں موجزن نہیں رہا ہے - '' یہہ وہی بات ہوگی اگر بالفاظ دیگر یہہ کہدیا جائے کہ کوئی قوم خود یا جس کو اُس سے سابقہ پڑتا ہے' کسی خون کو اپنے سے بہتر نہیں مانتی - یہہ اختلاف محض تخیل پر مبنی ہے اور تخیل کی قوت تمام اقوام نیز افراد میں یکساں دائر و سائر ہے - برٹن لوگوں کو دیکھہ لیجئے کہ اپنے خون کو دنیا میں سب سے اچھا سمجھتے رہے جب تک کہ رومن' اسکاٹ اور سیکسن لوگوں کے ہاتھہ سے مغلوب نہ ہوئے - سیکسن ڈین کہتے تھے کہ ہمارا خون دنیا بھر سے بہتر ہے - اُن کے اس زعم کو اور نارمن لوگوں نے توڑا - نسل انسانی کی تاریخ بھی ہے -

مسٹر ونسنٹ اِسمتھہ کا خیال اس بارہ میں یہ ہے — ‡

''یہہ تو تسلیم ہو سکتا ہے کہ راجپوتی خون کے ملنے سے دھلی کے شاہی خاندان کی جسمانی تربیت ضرور سنبھل گئی تھی -

---

* - ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ - از اِسٹینلے لین پول - صفحہ ۱۹۷ -

† - سیاحت و تذکرے (رمبلس اینڈری کلکشنس) - صفحہ ۴۲۱ -

‡ - نوٹ - صفحہ بالا -

لیکن دودمان تیمور کی شکست و زوال کو فرمانروا سلاطین کی رگوں سے راجپوتی خون کے رخصت ہو جانے پر محمول یا منسوب کرنا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا - سلطنت تو اورنگ زیب کی وفات سے بہت پہلے رخصت ہونا چاہتی تھی - حالانکہ اورنگ زیب نے خود دو ہندو بیبیاں بیاہی تھیں* اپنے بیٹے معظم (بہادر شاہ) کی شادی ایک ہندو شاہزادی سے کی تھی اور یہی اس کے آبا و اجداد کا دستور تھا -

لین پول نے بھی اپنی "ہندوستان کے مغل شہنشاہوں اور اُن کے سِکوں کی تاریخ" میں یہی لکھا ہے -

آزاد دہلوی دربار اکبری† میں دانایان فرنگ کا یہ قول نقل کرتے ہیں "انسان کی طبیعت میں داخل ہے کہ جس خون سے خود پیدا ہوا ہے اسی خون کی نسل پر وہ شوق کا جوش اور رغبت کا ولولہ نہیں ہوتا جو غیر خون پر ہوتا ہے - دیکھو خچر میں گھوڑے سے زیادہ زور ہوتا ہے -"

امرائے ہنود‡ میں لکھا ہے "اکبر مورخین کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کا اپنی مفتوح قوم کو امورات سلطنت میں دخل کر کے محکومیت کے درجے سے بڑھانا اُن کی سلطنت کی تباہی و بربادی کا باعث ہوا -"

اس بارہ خاص میں مسٹر ونسنٹ اسمتھ کا قول فیصل§ ہے - "یہ حیرت نہیں ہے کہ سلطنت دہلی کو زوال آیا - حیرت تو یہ ہے کہ وہ اتنے دن کیسے ٹھہری" -

---

* صفحہ ۱۸ -
† صفحہ ۷۸ -
‡ صفحہ ۳۶ -
§ مباحث و تذکرے (ارسلی میں) نوٹ صفحہ ۲۲۱ -

اس موقع پر میں فرانس کے ہمہ‌دان و ہمہ‌گیر مصنف، مشہور مستشرق و فلسفی، نامور مورخ ڈاکٹر گستاولی بان کی رائے بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں جو عربوں کے تنزل و زوال کے اسباب میں سے ایک قومی سبب اُن کا غیر اقوام کے ساتھ میل جول اور شادی بیاہ بتاتے ہیں ۔ فرماتے ہیں ـــــ :

"ان مختلف اقوام . ازدواج و امتزاج کی وجہ سے عربی خون کی خاصیت بہت جلد بدل گئی "

"ایک ہی ملک میں مختلف اقوام کا گُھل مل جانا ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے ۔ تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ حکومت کے قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ فاتح قوم مفتوح قوم سے ازدواج و امتزاج نہ کرے ۔ عربیوں نے اس کا کبھی خیال نہ کیا ۔ رومیوں نے کچھ دنوں اس کا خیال رکھا اور اُن کا تنزل اُسی دن سے شروع ہوا جس دن اُنھوں نے اس امر کا ملحوظ رکھنا چھوڑ دیا ۔"

"عرب برابر اُن اقوام سے جن کے ساتھ رہتے رہے ازدواج و امتزاج کرتے رہے اس ازدواج و امتزاج سے اُن کے قومی خصائص کا تلف ہو جانا ایک لازمی امر تھا محض یہہ امتزاج اقوام اُن کے تنزل کے لیے کافی تھا ۔"

ان اقتباسات میں 'عربوں' کی جگہ آپ 'مغلوں' پڑھیں اور دیکھیں کہ کیا یہہ کلیہ حرف بہ حرف ماوراءالنہر کے نہیں ' ہندستان کے مغلوں پر صادق نہیں آتا ۔ ان کے مٹنے اور زوال کا باعث کیا ہوا ۔ ؟ یہی غیر قوموں سے ازدواج و امتزاج ' نسلی خصوصیات کا مٹ جانا یا حکیمانہ زبان میں "فساد خون" ۔

---

۱ تمدن عرب ۔ صفحات ۴۴۹ ۔ ۵۲۰ ۔ ۵۵۱ بالترتیب ۔

اُسی مردم‌خیز* علم دوست سر زمین کے ایک دوسرے شرق نوار عالم موسیو سدیو کی مشہور "تاریخ عرب" سے واضح ھے کہ بنی اسرائیل کا طرز تمدن اور آئین معاشرت اس کا مانع تھا کہ مغلوب و فاتح اقوام کی عورتوں سے تناسلی اختلاط قائم کیا جائے - اس بارہ میں یہود کی تاریخوں کو مطالعہ فرمائیے اور اُمت موسوی کے عروج و زوال سے سبق حاصل کیجئے -

فلسفہ تاریخ کا یہہ ایک سادہ مگر ضروری مسئلہ ھے جو حوالہ قلم کر رھا ھوں - تاھم اندیشہ ھے کہ بعض نازک اور تفریح پسند دماغ اس دماغی ورزش کے متحمل نہ ھو سکیں گے - اس بحث سے سرگراں ھوں گے - مجھے معذرت کی ضرورت نہیں - تذکرہ و سیرت کو تاریخ سے وھی نسبت ھے جو افراد کو اقوام سے یا ارکان و اعضا کو جماعت سے ھوتی ھے - شاھزادہ خسرو ایسے ھی ازدواج و امتزاج کا نتیجہ تھا - اِس لئے یہ بحث یہاں ناگزیر تھی - ع - گر تو نمی پسندی معذور دار ما را -

بار آمد - سر ولیم کی روایت| ھے کہ یہہ جے پوری ملکہ بڑی دوراندیش و ھوش‌مند تھی - شوھر کے نزدیک اسکے مشوروں کی بڑی وقعت تھی - مسٹر ونسنٹ اسمتھ اس پر† اضافہ کرتے ھیں "کچھہ شبہہ نہیں کہ ھندستان کے باشندے زیر بار منت و احسان رھیں گے کہ اکبر کے عہد دراز میں اُن کو جو فلاح و رفاہ نصیب ھوئی وہ اسی انتہا درجہ کی پاکیزہ عورت کی بدولت تھی - اس کا اثر نہ صرف شوھر پر تھا بلکہ دوراندیش و مدبر وزرا بھی اس کے فاضلانہ مشوروں اور صلاحوں سے متمتع و مستفید ھوئے تھے -

---

* صفحہ ۳۷۰ -

| سیاحت و تذکرے (ریمبلس اینڈ ری‌کلکشنس) - صفحہ ۳۲۹ -

† سیاحت و تذکرے (ریمبلس اینڈ ری‌کلکشنس) - صفحہ ۳۲۹ - نوٹ

حسب امید یہ مراد خوب پھلی پھولی - اس سے ایسی بہت سی شاخیں پھوٹیں جنھوں نے ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کی بنیاد کم از کم ایک صدی آیندہ کے لیے راسخ کر دی - مغلوں کے محترم حرم میں آکر اس نیک نہاد رانی نے اپنا رنگ ڈھنگ نہیں بدلا تھا - لیکن اپنے تاجدار سرتاج اور اُس کی نسل کے لیے صفحۂ دہر پر بہت سے گہرے نقش اور نہ مٹنے والی یادگاریں چھوڑ گئی ہے - مورخین اس کا نام بتانے سے قاصر ہیں تاریخ و آگاہی کی دنیا اُس کو 'مریم زمانی' کے خطاب سے جانتی ہے - یہ صحیح ہے کہ کچھ دن تک اس کی آغوش بھی اولاد کی دولت سے خالی رہی - دو بچے* ہوئے اور جاتے رہے - کبھی کبھی یہ آرزو یا حسرت خود اکبر کو بھی بہت ستاتی تھی - وہ بارہا خدا کے مقبول اور برگزیدہ بندوں کی خدمت میں حاضر ہوا - قدمبوسی کی - نذریں دیں - التجائیں کیں - دعائیں کرائیں - مرادات در جاروب کشی کی - مگر ہر بات کے لیے وقت مقرر ہے - ۹۷۶ھ (سنہ ۱۵۶۸ع) میں آگرہ کے قریب سیکری فتح پور‡ کے

---

* نساء اور پذمل بیاگر دی کل ذکمری - صفحہ ۱۷۲ -

† ہنڈبک آگرہ و تاج از ہیویل - صفحہ ۱۰۸ -

‡ مشہور سیکری ضلع آگرہ میں ایک مشہور مقام ہے - صاحب مآثرالامرا (جلد دوم - صفحہ ۵۵۴) لکھتا ہے کہ یہ جگہ پہلے بیانہ کے متعلق تھی - جب ہمایوں نے اس علاقہ میں رانا سانگا پر فتح پائی تو اظہار شکر میں سکری (سین کے ساتھ) نام بدل دیا - جہانگیر کی پیدایش کے بعد اس جگہ کی مقبولیت اور خوبی و عظمت کا معتقد ہو کر اکبر نے اس کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا - شیخ کی درگاہ اور مسجد و شہرپناہ اور عظیم الشان رفیع و وسیع عمارات و محلات تعمیر کرائیں - آب و ہوا ناسازگار ثابت ہوئی - پورے طور پر آبادی کی نوبت کبھی نہیں پہنچی - یہ عمارتیں اب سیّاحان عالم کی زیارت گاہ رہ گئی ہیں - خالی پڑی ہیں اور سرکار عالیہ برطانیہ کی توجہ اور نظر التفات سے اچھی حالت میں ہیں - ترک جہانگیری کے دیباچہ (صفحہ ۲) میں لکھا ہے کہ قصبہ سیکری اکبرآباد (آگرہ) سے بارہ کوس ہے -

اللہ - اللہ! کبھی اسی مقدور سے کہتے گاتے جاتے تھے - شیخ فیضی وغیرہ غزلیں کہتے تھے

نسیم خوش دلی از فتحپور می آید - کہ بادشاہ من از راہ دور می آید

ایک مرتاض و خدا رسیدہ بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتی کی دعا کی برکت سے شجر مراد بار آور ہوا - قرار داد کے موافق† وضع حمل کے زمانہ

---

* ترک کا دیباچہ نگار (صفحہ ۴) لکھتا ہے کہ شیخ سلیم بڑے خدا پرست اور درویش تھے لوگ اُن کی مقبولیت دعا کے قائل تھے - اُن کا نسب نامہ سات واسطہ سے شیخ فرید شکر گنج تک پہونچتا تھا جو پنجاب میں پاک پٹن کی خاک میں آرام فرما رہے ہیں اِنہیں کے پوتے شیخ علاءالدین کو دربار جہانگیری سے اِسلام خاں خطاب عطا ہوا تھا - جو ۱۰۱۷ھ (سنہ ۱۶۰۸ع) میں گورنر بنگالہ مقرر ہوئے تھے - شیخ سلیم نے ۲۴ حج کئے تھے - ”شیخ الاسلام“ لقب تھا - ۲۹ رمضان ۹۷۹ھ (۱۵ فروری سنہ ۱۵۷۲ع) کو رحلت فرمائی - باوجود اختلاف مذہب و عقائد اکثر مورخین نے اِن کی بڑی تعریف کی ہے شمس العلما آزاد دہلوی کی دربار اکبری (ص ۷۹۴) اور ترک جہانگیری کے انگریزی ترجمہ پر بوریج صاحب کا نوٹ (ص ۸۱) اور کرنیل نیویل کی تحریر (آگرہ میں تین دن - صفحات ۸۷ و ۸۸ و ۱۱۰) نیز مسٹر تنسلے لین پول کی بابر (ص ۳۷۱) ملاحظہ طلب ہے -

شیخ سلیم نے دیار عرب میں مدتوں سیاحت کی تھی - وہاں ”شیخ الهند“ کے لقب سے مشہور و معروف تھے - ہندوستان واپس آئے تو موضع سیکری میں بالائے کوہ - بابر سے متصل مسجد و خانقاہ بنواکر مجاہدہ و ریاضت میں مصروف ہو گئے - اِتفاق وقت یہ پیش آیا کہ اکبر کے (جو چودہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا تھا اور چودہ برس اور گزر چکے تھے یعنی اٹھائیس سال کی عمر ہو گئی تھی) - کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا - شیخ کے حالات سن کر اور دیکھ کر آرزوے فرزند ظاہر کی اور ہمت و دعا کا طالب ہوا - شیخ نے اسکو تین بیٹوں کے پیدا ہونے کی بشارت دی - اسی زمانہ میں آثار حمل نمایاں ہوئے اور آپ کی کرامت و خوشخبری پوری ہوکر رہی - ”شیخ ہندی“ سے سال وفات (۹۷۹ھ) نکلتا ہے - (مآثرالامرا جلد دوم ۵۵۵ - و - دربار اکبری ص ۷۹۲) - سر ولیم سلیمن اپنی کتاب (کے صفحات ۴۲۲ لغایۃ ۴۲۴) میں شیخ سلیم کو بڑی تعظیم و ادب سے یاد کرتے اور لکھتے ہیں کہ اس ”نہایت متبرک عمر رسیدہ بزرگ“ کا سن اُسوقت چھیانوے سال کا تھا - مسٹر بوریج (اپنے نوٹ صفحہ ۷۱ میں) لکھتے ہیں کہ شیخ کی رحلت کے وقت جہانگیر دو برس سات مہینہ کا تھا - وہ بیل صاحب اور خزینۃالاصفیا (جلد اول ص ۴۳۶) کا حوالہ دیتے ہیں -

† آگرہ میں تین دن - از کرنیل نیویل - صفحہ ۸۸ -

کے قریب خوش اعتقاد ہندو ملکہ، اس مسلمان ولی کے دائرہ
قدس میں بکمال عقیدت و اخلاص بھیجدی گئی† - شیخ کی

---

* مسٹر بیورج کا خیال ہے کہ جہانگیر کی ماں غالباً ایک مسلمان خاتون سلیمہ سلطان بیگم تھی - جو ہمایوں کی بہن کی لڑکی اور بیرام خاں کی بیوہ تھی - مسٹر بیورج ہمارے زمانہ کے مستند اور محتاط تاریخ نویس گزرے ہیں - معیرل ہیدرداں و ہیج میرز اور اُس سے متعدد مباحث پر مراسلت رہی ہے - مآثرالامرا کے انگریزی ترجمہ میں موصوف نے میری ناچیز خدمات کا حوالہ دیا ہے میں نے اُن کی تحقیق اور اُن کی رایوں کو اکثر صحیح اور قرین قیاس پایا ہے - مگر اس موقع پر یہ عرض کرنا ناگزیر ہے کہ اُن کو غالباً "سلیمہ" اور "سلیم" دونوں ناموں کے التباس سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے - ورنہ فارسی کی تمام پرانی تاریخیں اسی جےپوری ملکہ "مریم زمانی" کو جہانگیر کی ماں بتاتی ہیں - سلیمہ سلطان کے بطن سے اکبر کے صرف دو بچے ہوئے تھے - ایک شاہزادہ خانم بیگم، دوسرا سلطان مراد - مسٹر ولیم بیل نے مفتاح التواریخ (ص ۹ . ۳) میں لکھا ہے کہ "ولادت جہانگیر از بطن سلطانہ رقیہ بیگم صبیہ راجہ بہاری مل بوقوع آمدہ" - ظاہر ہے کہ یہاں حمیدۃالزمانی رقیہ سلطان بیگم سے مراد نہیں جو مرزا ہندال کی بیٹی اور اکبر کی سب سے پہلی بیوی تھی (تاریخ ہندوستان - جلد ہفتم از شمس العلما (مولوی ذکاءاللہ خاں بہادر - ص ۳) قرینہ چاہتا ہے کہ "دیلا رکیا" ہندی کی "رکیا" ہوگی یا کوئی اور بگڑا ہوا نام ہوگا - مسٹر ونسنٹ اسمتھ بھی اشتباہ ظاہر کرتے ہیں - (نوٹ زیر تحریر سلی مین صاحب - ص ۴۳۰) - سر ولیم سلی مین "ملکہ جو دہ بائی" کو جہانگیر کی ماں بتاتے ہیں (؟) - (سیاحت نامہ اور تذکرے صفحات ۴۲۳ و ۴۲۹ جلد اول مسٹر ہیول، ہینڈ بک آگرہ و تاج (ص ۱۰۸) اور لفٹننٹ کرنیل نیویل' آگرہ میں تیس دن، (ص ۲۹) اور خاں بہادر سر محمد لطیف، سی - آئی - ای، اپنی تاریخ آگرہ (انگریزی صفحہ ۲۹) میں اسی "مریم زمانی" یا جودھ پوری شاہزادی کو جہانگیر کی ماں لکھتے ہیں - پکٹورل آگرہ (آگرہ مصور - ص ۵) اور "آگرہ میں تین دن" صفحہ ۸۸ اور ڈتکن صاحب کی مرمت و مختصر ہینڈ بک آگرہ، صفحہ ۱۹ میں بھی یہی تحریر ہے -

† دیباچہ ترک - ص ۲ - خلاصۃالتواریخ صفحہ ۳۶۱ -

منزل گاہ کے قریب* اس کے قیام و راحت کے شایاں مکان تعمیر ہوا جو اب تک موجود اور رنگ محل سے موسوم ہے - ۱۷ ربیع الاول† ۹۷۷ ھ ‡ (یکم ستمبر سنہ ۱۵۶۹ع) کو بدھ کے دن شیخ کی چلہ گاہ کے پیچھے وہ بچہ پیدا ہوا جس کے اِنتظار میں نہ صرف دودمان تیمور بلکہ سارے ہندستان کی نگاہیں بےچین و مضطرب تھیں - یہ ہمایوں کا پوتا تھا - راجہ بہارا مل کچھواہہ کا نواسا ؛

شاہ نواز خاں بتاتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر ہنود مکان اچھا شگون سمجھا جاتا ہے - (مآثر - ج ۲ ص ۵۵۴) -

اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ مآثرالامرا (جلد دوم - صفحہ ۵۷۳) میں مرقوم ہے جو اِس وقت یاد آ گیا -

شیخ ضیاءاللہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے پوتے بڑے عالم و فاضل اور درویش جامع و کامل تھے - بادشاہی نوکری یا دربار کا تعلق پسند نہیں کیا - گوشہ میں سکونت اختیار کرلی تھی - خانقاہ و ساتعاہ تعمیر کرائی تھی - اکبر لاہور میں ہرنوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا کہ کسی ہرن کا سینگ اُس کے ایک نازک مقام پر لگ گیا - اس سے سخت تکلیف و اذیت تھی - اطراف و جوانب سے معتقد و اکابر عیادت کے لیے آئے مگر شیخ ضیاءاللہ نے خبر نہ لی - بادشاہ نے ابوالفضل سے اسکا تذکرہ یا شکوہ کیا - ناچار بیچارے لاہور پہونچے - اتفاق وقت کہ شاہزادہ دانیال کی ایک حرم حاملہ تھی - بادشاہ نے فرمایا کہ وضع حمل کے وقت شیخ کے مکان پر پہونچا دی جائے - ہرچند شیخ صاحب نے عذر کیا - پذیرا نہ ہوا - اور اِس عفیفہ کو وہاں لے آئے - شیخ کا تیر اِس بارہ میں سچا اور نفس الامری تھا - اُنہوں نے زندگی سے بیزار ہو کر ایک ہفتہ میں جان دیدی -

* - مآثرالامرا - جلد دوم - صفحہ ۵۷۱ -

† - خلاصۃالتواریخ - ص ۳۶۱ - و تزک جہانگیری صفحہ اول -

‡ - میرے تزک کے نسخہ میں غلطی سے ۹۹۷ھ چھپا ہے - ملا عبدالقادر نے بادشاہ نامہ میں سنہ ۹۷۷ھ صحیح لکھا ہے -

راجہ بھگوانداس کا بھانجا اور مان سنگھ کا پھوپھي زاد بھائی
ان بزرگ کے اصرار و ارشاد سے اُن ھي کے نام نامي پر

---

* - شیخ سلیم چشتي کو تمام مورخوں نے ' مسلماں ھوں یا ھندو ' یا اینگلو اِنڈین ' بڑی عظمت و توقیر سے یاد فرمایا اور اُن کي کہن‌سالي گوشہ نشیني اور خداداني و خدا پرستي کا سچے دل سے اعتراف کیا ھے - مگر بعض ممتاز یوروپین اھل قلم ایسے بھي ھیں جنھوں نے افسوس ھے کہ اس ولادت کے بارہ میں ناپاک و ناشایستہ خیال ظاھر کیے ھیں - اِن کو نقل کرکے اپنے قلم کو گندہ کرنا کون پسند کریگا - جن حضرات کو ایسے جذبات تعصب و آلودگي سے بدمزہ ھونا گوارا ھو ' مسٹر ایچ‌جي کین ' سي - آئي - اي - ایم اے کي آگرہ ھینڈ بک صفحات ۵۸ و ۹۰) اور جنرل گاڈفریے چارلس منڈے ' گورنر جنرل کا در سالہ سیاحت نامہ ھند (سنہ ۱۸۲۷ و سنہ ۱۸۲۸ع) موسوم بہ ھندوستان کے قلم اور پنسل کے نقوش (صفحہ ۳۰) ملاحظہ فرمائیں - قلم اور تلوار کا دھنی جنرل اس بد گمانی و کج انکاری کا الزام اوروں کے سر رکھہ کر بظاھر اپنی برأت مگر حقیقة دبی زباں سے اُس کی تائید کرتا ھے - کسی تاریخ نویس کا نام نہ لینے سے خود اُس کے دل کا چور کھل جاتا ھے - سایہ ' وطن سے دور ' مگر وطن کی محبت سے چور ' دور اندیش منڈے کا دھیاں باھر کے کسی خاندان قصر و ایواں کی جانب گیا ھوگا - ورنہ بدنصیب ھندوستان تو شایستگی و تمدن کی ان برکتوں سے آج بھی محروم ھے - اس خشک سرشت سر زمین کی تاریکی اور یہاں والوں کی کوتہ نظری جو چار سو برس پہلے رھی ھو گی ' روشن ھے - میں یقین نہیں کر سکتا کہ کوئی باھوش ' ذی فہم شخص حقیقة شیخ سلیم کو " جہانگیر کا حقیقی باپ " سمجھتا یا باور کرتا ھو گا لیکن اگر کوئي ایسا نابینائے مادر زاد مورخ ھو تو یاد رکھے کہ ترانوے چورانوے برس کے بوڑھے کے اولاد ' اگر ھو سکتي ھے تو خالص روحاني قوت سے ھو سکتي ھے - انسان کے ظاھري قوا اس عمر میں معطل اور ارکان رفتہ ھو جاتے ھیں - ایسے پیر فاني کو جواں ' اور اپني جواني کي قدرداں ' راجپوت جوں والي ' ھندوستان بھر کي ملکہ ' سوائے ادب و عظمت ' احترام و عقیدت کے اور کس نگاہ سے دیکھے گي -

مسٹر ونسنٹ اسمتھ اپنے نوٹ (مندرجہ سیاحت نامہ ' تذکرہ سلیمن صاحب - حصہ اول - صفحہ ۴۳۲) میں بجا لکھتے ھیں "مسٹر کین کي ھینڈ بک اگرچہ ایک فاضل شخص کي تالیف ھے ' پھر بھي وہ گائڈ بک ھے - ھمیشہ صحیح اور ٹھیک نہیں

مرزا سلیم * نام رکھا گیا -

یمن و برکت کے لیے حضرت شیخ نے اپنی بیٹی سے دودھ† پلوایا - اکبر نے خوشی خوشی اپنی سب منتیں پوری کیں - حتی کہ سلطان الہند خواجہ اجمیر کے مزار پر انوار پر پیادہ پا ‡ گیا اور وہ تمام بندگانہ اور حسن

ہو سکتی - البتہ اس قسم کی جدید کتابیں معمولاً ہوتی ہیں اُن سے زیادہ معلومات کی ہے -"

میں آگاہ ہوں کہ با خبر انگریز و سیاح اس کتاب کی "ثقاہت" پر قدغن فرماتے ہیں - مگر اسکا کیا علاج ہے کہ ایسی ہی کتابیں عوام کے ہاتھوں میں جاتی اور بجائے گائیڈ اور رہنما ہونے کے لوگوں کی گمراہی اور غلطی میں پڑنے کا ذریعہ ہوتی ہیں

* خلاصۃالتواریخ قلمی - صفحہ ۳٦۱ - ترک جہانگیری صفحہ اول - سیاحت نامہ سلیمین - ص ۴۲۳ -

جہانگیر لکھتا ہے کہ قیاصرہ روم (سلاطین ترک) میں بھی سلیم نام کا ایک بادشاہ تھا - اس لیے اشتباہ سے بچنے کے لئے یہ دور کر دیا گیا تھا ترک میں لکھا ہے کہ شاہزادہ کا نام "سلطان سلیم" رکھا گیا تھا (صفحہ اول)

† دربار اکبری - صفحہ ۷۹۳ -

‡ شاید ہمارے زمانہ کے نازک طبع و نفس مزاج لوگوں کو اس کے متعلق کچھ تامل ہو ؟ اس لئے کسی قدر صراحت کر دینا ضروری ہے

طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ "بادشاہ جمعہ کے دن ۱۲ شعبان ۹۷۷ ھ (۲۰ جنوری سنہ ۱۵۷۰ ع) کو آگرہ سے اجمیر پیادہ پا روانہ ہوا - روزانہ سات آٹھ کوس طے کرتا تھا" - (اس کو ڈرسن صاحب نے بھی ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہندستان، جلد پنجم میں صفحہ ۳۳۴ پر نقل کیا ہے) - سر ولیم سلیمین کہتے ہیں کہ "وہ ہر روز تیں کوس چلتا تھا" (سیاحت نامہ اور تذکرے - صفحہ ۴۲۳) -

کوس کی مسافت عموماً مختلف پائی جاتی ہے - صوبہ جات متحدہ میں دو میل کے برابر سمجھا جاتا ہے - ممالک مغربی و شمالی کے گزیٹیر (صفحہ ۵٦۸) کے مطابق آگرہ کا کوس بقدر پورے دو میل کے ہوتا ہے - اس لیے تیں کوس کے صرف سوا پانچ میل ہوئے - مگر مسٹر ونسنٹ اسمتھ (زیر تحریر سلیمین) تائید کرتے ہیں کہ طبقات اکبری کا لکھنا بلا شبہہ بالکل صحیح و درست ہے - اکبر غایت درجہ مستعد و جفاکش تھا - اس کے لیے چودہ میل روزانہ چلنا کچھ مشکل نہ تھا وہ کچھ دن

کام انجام دیے جن کی ایسی جلیل‌القدر هستی سے توقع نہیں کی جاتی تھی - اولاد سے محبت کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے مگر سلیم کے ساتھ اکبر کی اُلفت عشق و جنون کی حد تک پہونچی ہوئی تھی - جہانگیر لکھتا ہے ، کہ میرے باپ نے نہ کبھی حالت مستی* نہ کبھی هوشیاری میں* میرا نام بھول کر بھی نہیں لیا - محمد سلیم یا سلطان سلیم کہہ کر کبھی نہیں پکارا* بلکہ وفور‌شفقت سے همیشہ "شیخو بابا" یا "شیخو جی†" هی کہا کرتا تھا - خیال رہے کہ تیموری خاندان کے ارکان (بادشاہ اور ولی عہد کو چھوڑ کر) معمولاً "سلطان" کہے جاتے تھے - حتیٰ کہ مجازاً‡ ایک کو بھی "سلاطین" کہہ دیتے تھے اگرچہ لفظاً جمع کا صیغہ ہے -

خافی خاں§ راوی هیں کہ شفیق باپ نے ولیعہد مقرر کیا تو "شاهنشاہ" کا خطاب عطا کیا اور جملہ$ لوازمات بادشاهی و اسباب و سامان سلطانی مرحمت فرمائے - قلعہ آگرہ¶ کے دیوان خاص میں تخت سنگ سیاہ پر جو قطعہ تاریخ ۱۱۰۱ ھ (۰۳۶۱ع) کا منقوش ہے* اس اعلان کی تجدید یا مکرر تصدیق کی یادگار ہے -

---

اجمیر میں ٹھہرا - رمضان کے مہینے میں دهلی پہونچا - یہہ سفر ۷ فروری سے ۸ مارچ تک رہا - اکبر ضرور وسط فروری کے قریب اجمیر پہونچا هوگا - اس حساب سے اس نے تقریباً تیس ماہ پیادہ روی میں گزارے تھے -

* ترکی جہانگیری صفحہ اول -

† دربار اکبری - صفحہ ۷۹۳ -

‡ دربار اکبری - نوٹ - صفحہ ۱۰۰

§ منتخب‌اللباب خافی‌خاں - حصہ اول - صفحہ ۲۳۰ -

$ دربار اکبری - صفحہ ۹۳ -

¶ مغل امپایر از کس صاحب - صفحہ ۱۱۶ - و آگرہ هند تک صفحہ ۳ -

تاج و تخت پانے کے بعد شاهانہ آداب و معمول پر کار فرما هوکر سلیم
نے اپنا نام و لقب* "ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ
غازی" رکھا اور اس دارفانی سے انتقال کے بعد جنت مکانی کہلایا -
مغلوں کی تاج میں جہانگیر هندستان کا چوتھا شاهنشاہ تھا -

---

* تزک جہانگیری ص ۲ - و - دیباچہ تزک ص ۲ -

قومی سیرت کی تشکیل

(از خواجہ غلام السیدین ایم - ای - ڈی)

هندستانیوں کی قومی سیرت سے بحث کرنا اور اِس کی تشکیل اور تربیت کے مسئلہ کو حل کرنا ایک مشکل اور ذمہ‌داری کا کام ہے - کیونکہ صحیح معنوں میں کسی جماعت کی ذہنیت اور سیرت سے اسی وقت بحث کی جا سکتی ہے جب وہ اِس درجہ منظم ہو گئی ہو کہ اِس کو ایک "قوم" کہا جا سکے - قوم کا لفظ بجائے خود بے شمار اختلافات کا مرکز رہا ہے اور صاحبان فکر نے اِس کے لئے مختلف معیار اور شرائط قرار دیے ہیں - اور اپنے اپنے معیار کے مطابق بعض جماعتوں کو قومیت کے حقوق سے محروم رکھا ہے اور بعض کی قومیت کو تسلیم کیا ہے - مثلاً پروفیسر ریمزے میور (Ramsay Muir) نے جو انگریزی مورخین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اپنی کتاب "قومیت اور بین‌الاقوامیت" میں قومیت کے لیے سات شرطیں بتائی ہیں جن میں سے پہلی چھ لازم نہیں ہیں لیکن ساتویں لازم ہے - اِن شرائط میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں - "کسی خاص جغرافی علاقہ کی سکونت - اتحاد نسل - اتحاد زبان - اتحاد مذہب - ایک کافی عرصہ تک کسی مستحکم اور منظم سلطنت کا قیام - اقتصادی مفاد کا اشتراک جس سے مشاغل اور افکار میں یگانگت پیدا ہوتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اِس قوم کے افراد کی مشترک روایات ہوں جو دُکھ درد سب نے مل جل کر جھیلے ہوں اور کامیابیاں حاصل کی ہوں اِن کی یاد جو افسانوں اور راگوں میں، اِن بڑے بڑے آدمیوں کے محبوب ناموں میں جنہوں نے گویا تمام قوم کی سیرت اور نصب العین کو اپنی ذات میں جمع کر کے دکھا دیا، اور اِن مقدس مقاموں کے نام میں محفوظ ہوں جن میں قومی

یادگاریں دفن ہیں ،، ۔ پروفیسر موصوف کے بیان میں یہ بات قابل غور ہے کہ وہ ابتدائی شرائط میں سے کسی کو قومیت کے لیے لازم قرار نہیں دیتے ۔ بلکہ اِس کو ایک نفسی اور ذہنی امر سمجھتے ہیں جس کا تعلق صرف خارجی اسباب، یعنی مذہب، نسل اور زبان وغیرہ کے اتحاد پر نہیں بلکہ قوم کی سیرت، افراد کے باہمی تعلق اور نفسی نظام پر ہے ۔ میرے خیال میں انسان کی کوئی جماعت قوم اُس وقت بنتی ہے جب اس میں ذماغی اتحاد اور یک جہتی ہو، جب ایک ہی آب و ہوا اور سیاسی اور معاشرتی ماحول میں رہتے رہتے اُن کے نقطۂ نظر اور فلسفۂ زندگی میں ایک حد تک یکسانیت اور یک رنگی پیدا ہو گئی ہو ۔ میرا یہہ مطلب نہیں کہ اِس کے افراد میں اختلاف طبائع اور انفرادیت نہ رہے اور وہ سب ایک دوسرے کی نقل بن کر رہ جائیں ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اِس اختلاف طبائع میں، جو بجائے خود ترقی اور تنوع کی بنیاد ہے، ایک وحدت کا رنگ پایا جائے اور جو کچھہ اختلافات ہوں وہ قومی سیرت کے بنیادی اصولوں پر قائم اور انہیں کا اظہار ہوں ۔ ان کے خیالات اور فکر کی دنیا میں جو کچھہ تمدنی اور دیرپا پیداوار ہو یعنی اُن کا ادب، اُن کا فلسفہ، اُن کا آرٹ، اُن کی تہذیب، اور ان کا نظام قدرو، اس کا اثر اور رنگ تمام افراد کی زندگی میں کم و بیش نمایاں ہو ۔ یہ ممکن ہے کہ خود اس قوم کے افراد کو ایک دوسرے میں یہ مشابہت اور ذماغی اتحاد نظر نہ آوے لیکن ایک طرف تو اس یک جہتی کا احساس ضروری ہے کہ ،، ہم ایک دوسرے کے اعضا ہیں ،، اور دوسری طرف دیگر اقوام کے مقابلے میں ان میں ایسی شخصیت اور خصوصیات پائی جائیں جو ان کو تمدنی اور ذہنی اعتبار سے ممتاز کریں ۔ مثلاً ایک ہندوستانی یورپ یا امریکہ یا چین یا عرب میں صاف طور پر پہچان لیا جائے نہ بوجہ شکل اور رنگ کے اختلافات کے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنی ذات میں بعض خاص

قدور کا حامل ہے جو اس ترکیب اور تناسب سے اور کسي ملک کے باشندے میں پہیں پائي جاتیں - کسی خاص شخص میں ان صفات کا بہت زیادہ نمایاں ہونا یا نہ ہونا اُس کي ذاتي طبیعت اور تربیت پر منحصر ہے لیکن جب قوم بحیثیت ایک منتظم جماعت کے کسي مسئلہ پر غور کرے ، یا کسي معاملہ میں قدم اٹھاءے تو یہ خصوصیات اپنا اثر ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں - اس کي ایک عمدہ مثال انگریزوں کي قوم ہے جن میں قومی سیرت کي خصوصیتیں اس قدر نمایاں ہیں کہ ایک باخبر آدمي بالعموم تھوڑے سے تجربہ کے بعد بتا سکتا ہے کہ فلاں شخص انگریز ہے - امریکن یا جرمن یا روسي نہیں - مجھے یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ انگریزوں کي یا کسي قوم کي مخصوص سیرت بجاءے خود قابل تعریف ہے یا نہیں - اور قومي خصوصیات کا اس قدر نمایاں ہونا کہ کوءي فرد یا قوم وسیع تر انساني حقوق اور ہمدردی کو فراموش کردے اچھي بات ہے یا بری - اس جگہ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کسی بڑی انساني جماعت کي سیرت یا ذہنیت کی صحیح تصویر اسی وقت کھنچي جا سکتی ہے جب وہ جماعت اشتراک مقاصد اور قدور کي وجہ سے ایک "قوم" بن جاءے -

اس لئے قومی سیرت سے بحث کرنے سے قبل ، ہمارا فرض یہہ ہے کہ ہم یہہ دریافت کریں کہ ہندستاني ایک "قوم" ہیں یا نہیں - آیا ان بتیس کروڑ بندگان خدا میں جو اس زبردست بر اعظم میں زندگی بسر کر سکتے ہیں ، اغراض و مقاصد کا وہ اتحاد اور زندگی کے نظام اور جذبات کی دنیا میں وہ ہم‌آہنگی پاءی جاتی ہے یا نہیں جو انہیں قوم کے خطاب کا مستحق بنا سکتی ہے - آیا حیات انساني کی بعض قدور ایسی ہیں جن کو انہوں نے مدتوں سے عزیز اور محترم سمجھا ہے اور جن کا اثر براہ راست یا بالواسطہ ان کی زندگی پر ہوتا

رہا ہے - یا بے شمار انسانوں کی آبادی محض بہت سے مختلف خیال اور مختلف مقاصد گروہوں اور جماعتوں پر مشتمل ہے جو بعض اسباب کی وجہ سے ایک ہی جغرافی ماحول میں جمع ہو گئے ہیں اور برخلاف ان مختلف جانوروں کے گروہوں کے جو اپنی صلح پسندی اور رواداری کی وجہ سے "خوش باش گھرانے" کہلاتے ہیں یا فطرتاً ایک دوسرے کے ساتھ جنگ و جدل اور کشمکش کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ؟

(۲)

مختصر یہ کہ ہندستانیوں میں کوئی مخصوص قومی سیرت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ ان کی قومی خصوصیات کیا ہیں جو ان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں ؟ ان کی ذہنیت میں کون سی ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام کے پیچھے رہ گئے ہیں؟ اور کون سے ایسے امکانات ہیں جن کی صحیح تربیت سے ان کی خفتہ قوتیں بیدار اور مردہ ہمتیں زندہ ہو سکتی ہیں ؟ میرے خیال میں یہ کہنا غلط ہے کہ ہندستانی ایک قوم نہیں ہیں - کیونکہ یہ دعویٰ ان کی ارتقائی تاریخ کے سکھائے ہوئے سبق کو نظر انداز کرتا ہے - ہندستان میں، اور ہندستانیوں میں خود کو ڈھالنے کی، واقعات اور حالات زمانہ کے ساتھ مطابق اور ہم آہنگ بنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے - ہندستان نے ان تمام قوموں اور نسلوں کو یکے بعد دیگرے ضم کر لیا جو دور دراز کے مختلف ملکوں سے اِس کی مہمان نوازی کی تلاش میں یہاں پہونچیں اُس نے آریوں کو اپنے قدیم باشندوں کے ساتھ باوجود اِن کی ذات پات کی تمیز کے، اِس طرح ملا جلا دیا کہ ایک نیا اِنسانی ٹائپ دنیا کی تاریخ میں نمودار ہوا - اِس کے بعد اور جو حملہ آور وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے وہ بھی فاتح بننے کے بعد اِس کے حلقہ بگوش غلام ہوکر رہ گئے - ہزار برس گزرے ایک بالکل مختلف نسل اور مذہب کے

لوگوں نے عرب اور ایران اور ترکستان وغیرہ سے آ کر یہاں ڈیرہ جمایا اور وہ بھی باوجود اختلاف طبائع اور اختلاف مذہب کے ہندستانی بن گئے - یعنی اُن کی ابتدائی طبیعت اور سطحۂ نظر پر ایک اور رنگ چڑھ گیا جو ہندستان کے ساتھ مخصوص تھا - اُن کی طرز معاشرت اُن کے فلسفۂ زندگی ، اُن کے ادب اور آرٹ بلکہ اُن کے مذہب تک پر یہاں کا گہرا اثر پڑا - اور وہ باوجود اپنی وسیع تر ہمدردی اور اسلامی رشتۂ اخوت کے ، باوجود اصولاً "، پاک ہے گرد وطن سے سر داماں میرا "، کے قائل ہونے کے ، ایسے ہی صحیح معنوں میں ہندستانی بن گئے جیسے وہ آریا جو ان سے ہزاروں برس پیشتر آئے تھے - جو لوگ اِس بات کے منکر ہیں وہ تاریخ اور واقعات پر خاک ڈالتے ہیں - اور سطحی اختلافات اور عارضی اثرات کے پردے میں اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے -

اِن دونوں مختلف اور زبردست نسلوں اور تہذیبوں کے ملنے سے جو تہذیب اور ذہنیت پیدا ہوئی اِس کو موجودہ زمانے کی ہندستانی تہذیب اور ذہنیت کہہ سکتے ہیں ، جیسا کہ آگے چل کر بتاؤں گا ، اِس میں بعض ایسے خارجی اثرات داخل ہوئے ہیں جنھوں نے توازن کو متزلزل کر دیا ہے اور جن کی وجہ سے تبدیلی اور اِختلاف کی گرد میں آج کل ہندستانی ذہنیت کا اصلی چہرہ دکھائی نہیں دیتا - مگر بہر حال ہندستان کی جو کچھ تہذیب اور دماغی کارنامے اب موجودہ ہیں وہ نہ ہندوؤں کی تنہا جد و جہد کا نتیجہ ہیں نہ محض مسلمانوں کا عطیہ - وہ اِن دونوں کے باہمی اشتراک عمل اور تاثر پذیری کا ثمر ہیں - نہیں بلکہ اس زبردست رو میں ان بےشمار چھوٹی چھوٹی ندیوں کا قابل قدر خراج بھی شامل ہے جن کا آغاز ان دونوں تہذیبوں کے علاوہ اور کسی سرچشمہ سے ہوا ہے - مثلاً بدھ مت کا فلسفہ زندگی ، جینیوں کا احترام حیات ، یونانیوں کی صنعت اور سپاہگری ، آریوں کا سیاسی اور معاشرتی نظم و نسق - ابتدائی باشندوں

اور خصوصاً دراوڑوں کی دستکاری اور منظم قبیلہ دار زندگی ۔ اور پھر یہہ چھوٹے چھوٹے الفاظ "ہندو تہذیب" اور "مسلمان تہذیب" خود کیسے کیسے زبردست اور متنوع اثرات اور کارناموں کے حاصل ہیں ! اِن میں اِنسانی ارتقاء کے تاریخ کے کیا کیا شگوفے اور اِنسان کے ہاتھہ اور تخئیل کی کیا کیا گلکاریاں نہیں بھري ہیں ! "ہندو تہذیب" کا ذکر ہمارے خیال کو ایک ایسے سادات اور متنوع باغ کی سیر کراتا ہے جس میں ایک طرف ویدوں کے زمانہ کي سیدھي ' سادھي لیکن خوش باش زندگي کا نظارہ دکھائي دیتا ہے رامائن اور مہابھارت کے معرکے ہیں اور اِن کے ساتھہ اِنساني جدو جہد کا وہ فلسفہ جو بھگوت گیتا کے صفحات میں بھرا ہوا ہے ۔ دوسري طرف ہندوؤں کے دور عروج کي وہ بھري متحملیں جن پر وکرماجیت صدارت کرتے تھے اور اِن کے نورتن اپني خیال افرینیوں اور بذلہ سنجیوں سے تمام دربار بلکہ تمام ملک میں علم و ذوق کي شمع روشن رکھتے تھے ۔ اسي باغ میں کہیں کالیداس کے ڈرامے ہو رہے ہیں کہیں تان سین کي موسیقي دنیا کو رقص میں تحلیل کر رہي ہے ۔ اِس میں راجپوتي شجاعت کي داستانیں بھي مدفون ہیں ۔ مدفون نہیں پوشیدہ ہیں اِس طرح جیسے ستار کے تاروں میں موسیقي جو مضراب کا انتظار کرتي رہتي ہے ! اور وہ تمام علوم و فنون اور دستکاریاں جو اِس تہذیب کا پھل تھیں لیکن اِس کے ساتھہ مردہ نہیں ہوئیں میرا یہہ مطلب نہیں کہ اِس تہذیب میں خامیاں نہیں تھیں ۔ تھیں اور بہت زبردست تھیں ۔ اِس میں اخوت مساوات اور معاشرتي عدل کي کمي تھي ۔ جماعتوں کي اٹل تقسیم افراد کي قوتوں کو دبائے ہوئے تھي ۔ برہمنوں نے اپنے اقتدار اور قوت کو مستقل بنانے کے لئے مذہب کو چند رسوم میں تبدیل کر دیا تھا اور خود اِنسان اور اِس کے بنانے والے کے درمیان حائل ہوگئے تھے ۔ لیکن ؟ باوجود اِن تمام خرابیوں کے کس قدر قابل قدر تھا وہ تمدن (اور ہے

وہ نتیجہ) جو "ہندو تہذیب" نے ہندوستان کی "تہذیب نو" کی خدمت میں پیش کیا تا کہ وہ اِس کے اچھے عناصر کو اپنے میں جذب کر کے انسانی زندگی کا ایک حسین تر مرقع بنائے -

اور پھر "اسلامی تہذیب" کا پُر سحر لفظ جو ایک چشم زدن میں عرب کے صحراؤں، ایران کے مرغزاروں، وسط ایشیا کی مہیب گھاٹیوں اور روم اور قاف اور اٹلی اور ہسپانیہ کی خوبصورت وادیوں کو تخیل کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے - اِس کی قائم کردہ جماعتوں میں خدا کی خدائی کا سکہ جما ہوا ہے - اور سب انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں کیونکہ خدا سب کا ایک ہے اور اُس کی مشیت سب پر یکساں طریقے سے حاوی ہے - اِس میں جماعتوں اور فرقوں اور قبیلوں میں، امیر اور غریب میں، کالوں اور گوروں میں سب میں مساوات ہے - خدا اور انسان دونوں کی نظر میں سب کے حقوق برابر ہیں - سب کو ایک سے مواقع حاصل ہیں - سب کا رشتہ براہ راست اپنے خالق سے ملا ہوا ہے - اس میں جہاں ایک طرف علم و ادب کا چرچا اور ہمت افزائی ہے وہاں دوسری طرف عملیت اور جہانگیری اور جہانبانی کی قابلیت ہے - اس میں جوش اور ولولہ اور جراءتِ عمل ہے جو دنیا کو اور فطرت کی بے چین اور رام نہ ہونے والی قوتوں کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں - میں پھر یہ نہیں کہتا کہ یہ سنگینگی اور سادگی اسلامی تہذیب میں ہمیشہ قائم رہا یا جب یہ تہذیب ہندوستان پہنچی تو اس میں یہ سب چیزیں موجود تھیں - بلکہ اس میں سے بعض چیزیں زائل یا کمزور ہو چکی تھیں - شخصی قوت اور استبداد کو سوسائٹی کے مفاد اور افراد کی آزادی پر ترجیح دی جاتی تھی - روح مذہب کے بجائے الفاظ کا زیادہ احترام ہونے لگا تھا - لیکن باوجود اُن نقائص کے اس تہذیب کے تصادم نے ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک دی - کیونکہ اس کی تہذیب بجائے متحرک اور

جاندار ہونے کے ساکن اور جامد ہو چلی تھی اور اس کے اعضا میں سستی پیدا ہو گئی تھی ۔ اس نے سیاست اور معاشرت اور مذہب میں نئے معیاروں اور نئے قدور کو ہندستان کی خدمت میں پیش کیا تا کہ وہ ان کی مدد سے اس نئی قومی سیرت اور قومی تہذیب کی تشکیل کرے جو ہماری اُمیدوں کی جولاں گاہ ہے ۔

اِس لیے ہندوستان میں جو لوگ اس وقت آباد ہیں ان کی زندگی اور تہذیب کی جڑیں زمانہ ماضی میں بہت دور تک چلی گئی ہیں ۔ ان کی تربیت ان روایات میں ہوئی ہے جو علم و فن، ادب و فلسفہ، سیاست و مذہب سے مالا مال ہیں ۔ وہ اس ماضی کے بوجھ سے، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبکدوش نہیں ہوسکتے ۔ ہم اہل امریکہ کی طرح نہیں جو ماضی کی روایتوں سے آزاد اپنے لئے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنا سکتے ہیں ۔ ان کی ہدایت اور ہمت افزائی کے لیے کوئی تیرتھ اور دیر نا چشمے ایسے نہیں جن سے ان کو ہمیشہ استقلال اور ارادہ کے لیے امداد حاصل ہوتی رہے ۔ ہماری جو نئی نسل دنیا میں آتی ہے اس کو ایک نظام تمدن، ایک معیار قدور، ایک فلسفۂ زندگی اپنے چاروں طرف نظر آتا ہے جو اس کو مخصوص طریقے سے متاثر کرتا اور اپنے قالب میں ڈھالتا ہے ۔ ہر بچہ اس کو اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے اور ہوا کے ساتھ ساتھ اس میں بھی سانس لیتا ہے ۔ اس لیے باوجود ان اختلافات کے جو ہندستانیوں میں، مختلف صوبوں اور مذہبوں اور نسلوں کے متعلق ہونے کی وجہ سے پائے جاتے ہیں "وہ ہندستانی" تہذیب و تمدن کے رنگ کو قبول کرتا ہے اور جب بلوغ کو پہنچتا ہے تو اس کی سیرت ایک مخصوص شکل اختیار کر لیتی ہے جو بعض نمایاں لحاظ سے مختلف ہوتی ہے ۔ یہ سوال آگے چل کر پیدا ہوگا کہ یہ سیرت کس حد تک قابل تعریف ہے ۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ سیرت مختلف ہوتی ہے ۔

اس ہندوستانی تہذیب نے اپنے دوسرے دور عروج یعنی مغلوں کے زمانے میں (جو ہم سے قریب تر ہے اور اسی وجہ سے اس کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں) مادی اور علمی کارناموں کی جو تاریخ چھوڑی ہے وہ ہر طرح قابل فخر ہے - میں ہرگز یہہ نہیں چاہتا کہ دور ماضی کو "عہد زریں" بناکر دکھاؤں، نہ میری بعض وطن پرستوں کی طرح یہہ خواہش ہے کہ اپنے ملک کی ہر چیز کو اچھا اور مکمل بنا کر پیش کروں - صداقت کا مطالبہ اٹل ہے اور وہ حب وطن اور اظہار خودی وغیرہ سب کے مطالبوں پر بھاری ہے - لیکن اس دور کے کارناموں کا ذکر کرنے سے میرا مقصد یہہ ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کے تاریخی ارتقا اور پس منظر پر روشنی پڑے مغلوں کے عروج کے زمانے میں ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت کے تعاون نے جو ہندوستانی تہذیب پیدا کی اس کا اظہار مادی زندگی میں اس خوش حالی کی صورت میں ہوا جو عام لوگوں کو اس وقت کے مقابلہ میں، نسبتاً حاصل تھی - ان بے نظیر عمارتوں میں ہوا جو ہندوستان میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک موتیوں کی طرح ٹکی ہوئی ہے اور جن کا شاہ کار اور سرتاج، تاج محل ہے جس میں ایک نہایت اور زبردست اور حسن شناس قوم کی تخلیقی قوتوں نے اپنا انتہائے کمال دکھایا ہے - اور ان مفاد عامہ کے انتظامات میں ہوا جنہوں نے شہروں اور دیہات کی زندگی کو متمدن اور دور دراز کے سفروں کو آرام دہ بنا دیا تھا، تہذیب و تمدن کی ترقی کے ان لوازمات میں ہوا جو خوراک، لباس، طرز بود و باش، گفتگو اور آداب مجلس میں نئی نئی ایجادات کی شکل میں نمودار ہوئے - فنون لطیفہ اور صنعت و حرفت خصوصاً انتہائی باریکی رکھنے والی دستکاریوں میں انہوں نے جو کام کیا وہ اب بھی مبصرین اور ماہرین فن سے خراج تحسین وصول کرتا ہے - علم و فکر کی جد و جہد برابر جاری رہی - اور اگرچہ سائنس میں

انھوں نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی کیوں کہ اس کے لیے ابھی اسباب بھی پیدا نہیں ہوئے تھے، جیسے اس کے کچھ ہی بعد یورپ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ادب اخلاق اور فلسفہ، مذہب اور تصوف، تاریخ اور سیرت نگاری کے میدان میں انھوں نے قابل قدر تصانیف چھوڑیں - ان کا ادب فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں ساتھ ساتھ ترقی کر رہا تھا - اور اس میں کوئی مخاصمت پیدا نہیں ہوئی تھی - سیاست مدن اور انتظام سلطنت میں انھوں نے بہت زبردست ترقی کی - کیوں کہ ہندستان جیسی وسیع مملکت کو ایک حکومت کے ماتحت لاکر اس کا یہہ نظم و نسق کرنا بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی - غرض یہہ خیال کرنا کہ حکومت برطانیہ کے اقتدار سے قبل ہندستان ایک نیم وحشی، نیم مہذب حالت میں تھا، اور اس کی تمام گذشتہ تاریخ اور کارناموں کو محض موجودہ عہد کی تمہید سمجھنا ایک سخت غلطی اور ظلم ہے - یہہ غلطی تاریخی اعتبار سے اس نوعیت کی ہے اور صداقت کے اعتبار سے اس سے بدتر جو کہ مسٹر ایچ - جی - ولز نے اپنی "تاریخ عالم" میں کی ہے یعنی یہہ کہ ابتداے آفرینش انسان سے تماشاگاہ عالم میں جو تماشا ہوتا رہا ہے وہ محض اسی لیے تھا کہ اس کا تتمہ اور کمال عروج "مجلس اقوام" کی شکل میں ظاہر ہو -

(۳)

لیکن تہذیبیں بھی افراد کی طرح پیدا ہوتی ہیں، نشو و نما پاتی ہیں، اور اپنا پورا عروج حاصل کرنے کے بعد یا تو فنا ہو جاتی ہیں یا ایک قسم کی معلق، "چہ خفتہ چہ بیدار"، حالت ان پر طاری ہو جاتی ہے - تاریخ میں جو زبردست اور کمال آفریں تہذیبوں کی یادگاریں محفوظ ہیں وہ سب اسی اصول کی شہادت دیتی ہیں - یہہ خیال غلطی نہیں ہے کہ کوئی تہذیب ایسی عمدہ بنیادوں پر قائم ہو، اور اس کی علمبردار نسلیں اور قومیں اس قدر پاک اور جذبات پرور خون رگوں میں رکھتی

هوں کہ وہ نمو اور زوال کے اس دائرہ سے نجات پاکر ایک مستقل اور پائدار صورت اختیار کر لے ۔ لیکن یہ ابھی تک محض ایک امکان عقلی ہے ۔ اس کی کوئی عملی مثال موجود نہیں ۔ اسی عام قاعدہ کے بموجب ہندستان کی تہذیب پر بھی سترھویں صدی کے بعد سے سُستی اور زوال طاری ہونا شروع ہوا ۔ اس کے اعضا اور عناصر کمزور ہونے لگے اور لوگوں کی تخلیقی قوتوں اور معاشرتی نظام دونوں نے جواب دینا شروع کیا ۔ کہیں کہیں مقامی اور عارضی سگفتگی اور زندگی ضرور ظاہر ہوئی ۔ لیکن وہ بعض مقامی حالات پر مبنی تھی اور تمام ملک کی علمی اور معاشرتی زندگی کے اثر اور قوت بخش رد عمل سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے وہ دیرپا نہیں ہو سکتی تھی ۔ یعنی وہ ایک موج تھی جو "بیرون دریا" تھی ۔ اس لیے اس کی کوئی مستقل ہستی نہ ہو سکتی تھی ۔ مثلاً دکن کی بعض ریاستوں کی مادی خوش حالی اور علمی بیداری ۔ مغلوں کے آخری دور میں اردو ادب کی ترقی وغیرہ ۔

ہمیں اس وقت عبرتناک زوال کے اسباب سے مفصل بحث کرنی مقصود نہیں ۔ وہ بجائے خود ایک مستقل اور غور طلب مسئلہ ہے ۔ اور جب ہندستان کی تاریخ جنبہداری کے اثرات سے آزاد ہوکر انصاف اور صداقت کے ساتھ لکھی جائے گی اس وقت سنجیدہ مورخ اس پر روشنی ڈالے گا ۔ تاہم یہاں اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ محض طوائف الملوکی اور سیاسی جتھا بندی کے بکھرجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک کی علمی اور اخلاقی زندگی بھی متزلزل ہو جائے ۔ سیاسی انقلابوں کے زمانے بعض ملکوں کی تاریخ میں نہایت زبردست علمی اور ادبی جد و جہد کے زمانے ہوئے ہیں ۔ انقلاب فرانس اس کی ایک مثال ہے ۔ انقلاب روس سے کچھہ ہی پہلے، جب گویا اس معرکۃالآرا زلزلے کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی، روسیوں نے جو ادبی جدو جہد کی اور جو نامور ادیب پیدا کیے وہ سب بھی

اس بات کی شہادت ہیں کہ محض ملکی بد نظمی کسی قوم کی زندگی کے اعلیٰ تر مظاہر کو برباد نہیں کرسکتی - ہندستان میں بھی ملکی بدنظمی نے اہل ہند کے تہذیب و تمدن اور علمی جد و جہد کو نقصان ضرور پہنچایا - لیکن ہندستانیوں کے علمی زوال اور عام انتشار کا تنہا سبب قرار نہیں دی جاسکتی - اس کے اسباب کو تلاش کرنے کے لیے زیادہ گہری نظر اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے -

کسی ملک کی تہذیب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ نئے خیالات کو پیدا کریں ؟ ان کو جانچیں اور پرکھیں اور اگر وہ ایک وسیع افادی معیار پر پورے اتریں تو ان کو اپنے نظام زندگی میں راہ دیں - حرکت زندگی کی جان ہے اور قوموں کی زندگی میں یہ حرکت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس میں علمی تخلیق کا مادہ ہو اور وہ برابر مصروف کار رہے اور اسی حالت میں ممکن ہے جب ملک کا نظام تعلیم اور سماجی نظام دونوں بالارادہ جدت؟ اجتہاد اور تخلیق کی قوتوں کو نشو و نما کریں اور ان کو اظہار کا موقع دیں - اگر کسی ملک کا نظام معاشرت جامد اور ساکن ہوکر رہ جاءے جس میں نہ افراد کی حرکت کی گنجایش ہو نہ نئے اور زندگی بخشنے والے خیالات کو سر سبز ہونے کا موقع ملے تو اس کی ہر قسم کی ترقی رک جاتی ہے - اس میں ہر نئی تحریک کو شبہہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے کیوں نہ قائم شدہ صورت حالات کو بدلنے کی دھمکی دیتی ہے - افراد کو اظہار خودی کا موقع نہیں دیا جاتا - انفرادی اختلافات کو دبایا جاتا ہے - لوگ بجاءے اس روشنی کو ظاہر کرنے کے جو ان میں ودیعت کی گئی ہے؟ بجاے بے خوف ہوکر ان قدرتی صلاحیتوں اور عطیوں کو کام میں لانے کے جو ان کے حصہ میں آئے ہیں سوسائٹی کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں اور محض

ایک دوسرے کی نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ۔ ان کو بجائے رواداری کے کے تعصب، بجائے وسعت خیال کے تنگ نظری، بجائے جدت اور اجتہاد کے تقلید اور کم ہمتی اور بجائے نقد و تنقید کے ادعا کا مرض لاحق ہو جاتا ہے ۔

گذشتہ دو صدیوں سے یہی کیفیت تھی جو رفتہ رفتہ ہندستان میں پیدا ہونی شروع ہوئی اور جس نے ملک کی زندگی میں جمود، اور سُستی، اور نا امیدی کو غالب کردیا ۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے سے جوں جوں علمی افلاس زیادہ ہوتا گیا عام لوگوں میں، خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا عدم تعلیم یافتہ، تقلید پسندی اور قدامت پرستی کی ذہنیت بڑھتی گئی ۔ اور بجائے اس کے کہ وہ نئے سیاسی اور اقتصادی حالات سے متاثر ہوکر اپنے لئے زندگی کے تمام شعبوں میں نئی شاہراہیں نکالتے وہ نئے علوم و فنون سے منہ موڑ کر ماضی کی مدح سرائی میں مصروف ہو ہوگئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے بغیر ماضی کو اچھی طرح سمجھے محض جذبات سے متاثر ہوکر اس کو عہد زریں تصور کر لیا ۔ اور بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اس امید میں زندگی بسر کرنے لگے کہ وہ زمانہ کبھی نہ کبھی عود کر آئے گا ۔

اِس ذہنیت کا اظہار بہت نمایاں طرح اس مخالفت کی صورت میں ہوا جو ہندستانیوں نے بالعموم ان تحریکوں کے ساتھ کی جو راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں کے نام کے ساتھ منسوب ہیں دونوں نے اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کیا کہ قومی زندگی پر بہت سے ایسے تعصبات اور ترقی کو روکنے والے اثرات حاوی ہو گئے ہیں جن کو دور کرنا ضروری ہے ۔ بعض اثرات مذہب کی آڑ پکڑ کر کام کر رہے تھے، بعض سماجی زندگی پر رسوم اور پابندیوں کی شکل میں حاوی تھے، اور بعض ہر اس تحریک کی مخالفت کرتے تھے، جس کا کوئی تعلق موجودہ

زمانے سے یا مغرب کی تہذیب سے ہو - اور ان کا جواز یہ پیش کیا جاتا تھا کہ یہ تمام تحریکیں ہمارے قدیم تاریخی تہذیب و تمدن اور مذہب و علوم کی جڑوں کو کھوکھلی کردیں گی - یہی وجہ تھی کہ جب ان مصلحین نے اپنے اصلاحی خیالات کو ملک کے سامنے پیش کیا تو مختلف طبقوں اور گروہوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کو مذہب اور قوم کا دشمن اور کافر وغیرہ قرار دیا - لیکن چوں کہ ان کی باتیں سچی تھیں دل سے نکلی تھیں اور ان کی شخصیت میں اثر اور زور تھا اس لیے وہ رفتہ رفتہ اس مخالفت کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان کے خیالات کو کچھ عرصہ کے بعد عام طور پر قبول کرلیا گیا -

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ماضی کو پوجنے اور حال کی طرف سے بیزاری کی ذہنیت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی - اس کے بہت سے اسباب ہوئے - لیکن اس کا غالباً سب سے بڑا سبب مغربی تہذیب کا تصادم تھا - جس طرح گذشتہ زمانے میں نئی تہذیبوں کے امتزاج سے ہندوستانی تہذیب کو استحکام پہنچتا رہا اور اس میں حیات بخش عناصر جذب ہوتے رہے اسی طرح اس وقت ایک نئی تہذیب جس کی نشوو نما بالکل مختلف حالات میں ہوئی تھی بطور ایک چیلنج کے ملک کے سامنے آئی - اور چوں کہ وہ تہذیب ایک حکمراں قوم کی تہذیب تھی اس لیے اس میں قوت اور اثر کرنے کی صلاحیت تھی اور اس نے رفتہ رفتہ باوجود قدامت پسندوں کی مخالفت کے ہندستانیوں کی ذہنیت اور ان کے عادات و اخلاق ان کی بود و باش پر اثر ڈالنا شروع کیا اور جب اس تحریک کے ساتھ اقتصادی ضروریات بھی شامل ہوگئیں تو اس کا اثر اور وسیع ہوتا گیا - سرکاری نوکریوں کے لیے انگریزی زبان سیکھنا اور انگریزی مدارس میں تعلیم پانا لازمی ہوگیا - حکمراں قوم کی نگاہ میں عام لوگوں کی پوزیشن کا معیار یہ

ہو گیا کہ وہ کس حد تک انگریزی بود و باش اور طرز زندگی کو قبول کرتے ہیں ۔ اس صورت حال کا اثر وہی ہوا جو ہونا تھا ۔ ایک طرف اپنی تہذیب کا نظام زوال آمادہ ہو چکا تھا ۔ دوسری طرف ایک نئی تہذیب اپنے نئے اور انوکھے خیالات سے ، اور دنیاوی فائدوں کی ترغیب سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی ۔ ردّ عمل ہونا ضروری تھا ۔ ملک میں ایک کافی بڑی جماعت ایسی پیدا ہو گئی جس نے زیادہ تر مغربی تہذیب کے صرف بیرونی اور سائنسی پہلوؤں سے خیرہ ہو کر اس کی اندھی تقلید شروع کردی اور اپنی قومی روایات اور تاریخی تہذیب کو نہ صرف فراموش کر دیا بلکہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگی اس میں کچھ اثر اس بالارادہ پروپگنڈا کا بھی تھا جو مدرسوں کی تعلیم اور ہندوستان کی تاریخ کے متعلق غلط بیانیاں کر کے طلبا میں پھیلایا گیا ۔ لیکن اس کی وجہ زیادہ تر یہی تھی کہ نئی نسل کے نوجوان اپنی تاریخ سے ناواقف تھے اور مغرب کی تہذیب اور اس کے فائدوں سے سطحی طور پر مرعوب ہوگئے تھے ۔ یہہ زمانہ وہ ہے جب نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں بالعموم ، انگریزی لباس ، انگریزی طرز معاشرت انگریزی زبان کا شوق خبط کے درجے کو پہنچ گیا تھا ۔ یہاں تک کہ وہ اول تو اپنی زبان کو بولنا ہی ہتک سمجھتے تھے اور اگر بولتے بھی تھے تو اس میں انگریزی الفاظ کی بھر مار ہوتی تھی اور بعض اوقات اردو کے الفاظ کو بھی بگاڑ کر اس طرح تلفظ کرتے تھے جس طرح ناواقف غیر ملکی اپنے ہندوستانی نوکروں سے زبان سیکھہ کر بولتے ہیں ۔ یہہ وہی طبقہ تھا جس کا مذاق اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص اور ناقابل تقلید انداز میں جا بجا اپنی نظموں میں اُڑایا ہے —

مگر وہ جرگہ جسے چڑ گئی ہے انگریزی
نہ واں خدا کی ضرورت نہ انبیا درکار !

ہندستانی ذہنیت پر یہ ملمع بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا ۔ مغربی تہذیب کے تعلق اور تصادم نے بہت سی ایسی قوتوں اور تحریکوں کو بیدار کر دیا تھا جو دوبارہ ایک نیا ردّ عمل پیدا کر رہی تھیں اور "قومیت" کے احساس کو از سر نو ابھار رہی تھیں ۔ یہ احساس محض سیاسی نہ تھا بلکہ اس میں تہذیب و تمدن ، تعلیم و معاشرت کا خیال بھی شامل تھا ۔ اپنی حالت کی خرابی کا احساس ، مغرب کے سیاسی خیالات کا مطالعہ ، تہذیب مغرب کی سطحی چمک کا زائل ہونا اور اس کی کمزوریوں اور نقائص کا اظہار ، تمدن قدیمہ کا تاریخی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور اس کی اہمیت کی پہچان اور سب سے زیادہ سیاسی بیداری اور احساس قومیت کا احیا ، ان سب چیزوں نے مل جل کر مغرب پرستی اور تقلید کے دور کو جلد ہی ختم کر دیا اور خود موجودہ تعلیم پائے ہوئے طبقہ نے اس رجحان کی مخالفت کی جو انیسویں صدی کے آغاز تک ہندستانیوں کو ہندستانی تہذیب سے دور ہٹاتا چلا جارہا تھا ۔ اس کا اظہار زمانہ حال کے بہت سے صاحبان فکر کے خیالات اور تحریروں اور تصانیف میں ملے گا جن میں مہاتما گاندھی ، ٹیگور ، اقبال جیسے مختلف نقطہ نظر کے لوگ شامل ہیں ۔ اس جدید ترین تحریک کا بہترین اظہار اس خواہش کی شکل میں ہوتا ہے کہ ہندستان اپنی حقیقی اور اصلی روح کو دوبارہ پائے اور اپنی قومی نصاب اور مستقبل کی تشکیل کے لیے ایک فقیر کی طرح دوسروں کی دریوزہ‌گری نہ کرے ، اقبال اس مطلب کو جا بجا اپنے اشعار میں خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے :—

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست

تجلیٔ دگرے در خورِ تقاضا نیست !

اس میں شک نہیں کہ اِس "حقیقی اور اصلی روح" کے صحیح معنوں میں لوگوں کو اختلاف ہے اور اس اختلاف کا قائم رہنا کوئی تعجب کی بات نہیں - کیونکہ قومیت کی تعبیر ہر شخص کے مخصوص نقطۂ نظر اور فلسفۂ زندگی پر منحصر ہے اور جب تک زندگی کی اہم قدروں کے متعلق لوگوں میں اختلاف رہے گا وہ اجتماعی زندگی کے نصب‌العین کو بھی مختلف صورتوں میں پیش کریں گے - تاہم بجائے خود اس اصول کا تسلیم ہو جانا ایک اہم بات ہے کہ ہر قوم کی ترقی اور نجات خود اپنی مخصوص صلاحیتوں اور امکانات کی تربیت میں پوشیدہ ہے - دنیا میں مجموعی ترقی تہذیب و تمدن کے لئے یکسانیت کی ضرورت نہیں فطری اختلافات کو نشو و نما کرنے کی ضرورت ہے اور وہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہر قوم اپنی مخصوص روح اور اپنی مخصوص جینئس (Genius) کو تلاش کرے اور تعلیم اور اداروں کی تنظیم کے ذریعہ اُن کو مکمل بنانے کی کوشش کرے - یہ اصول ابھی تک دنیا میں تمام قوموں نے تسلیم نہیں کیا یعنی اس معنی میں کہ ان کے سوا دوسری قوموں کو بھی یہ حق ہے کہ اپنے اپنے راستوں پر چل کر اپنی تہذیب کی نشو و نما کریں - اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جاتا تو غالباً وہ تمام کوشش جو ایک تہذیب دوسری تہذیب کو مغلوب کرنے کے لیے بالارادہ کرتی ہے وقوع میں نہ آتیں - بہر حال کم از کم نظری طور پر کوئی انصاف پسند اور سلیم‌العقل انسان اس اصول سے انکار نہیں کر سکتا - عملاً اس کو رہبر زندگی بنانے میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں اور بہت سی قدیم اور مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئیں جبلّتوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے - اور جوں جوں اس کوشش میں کامیابی اور قوموں میں مناسب رواداری اور انصاف پسندی پیدا ہوگی یہ اصول زیادہ مضبوطی کے ساتھ بین‌الاقوامی تعلقات میں اہم کار فرمائی دکھائے گا -

ہندستان میں اس تحریک کے حامیوں نے بعض اوقات اپنے نقطۂ
نظر کو بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور یہ کوئی تعجب کی
بات نہیں کیوں کہ ہر ردّ عمل کے ساتھ مبالغہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے -
مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستانیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی قومی
تہذیب اور مستقبل کے اداروں اور نظام زندگی کی تشکیل میں نہ داہنی
طرف دیکھیں نہ بائیں طرف - بلکہ اپنی نظر کو قدیم ترین
ہندستانی تہذیب مثلاً ویدک تہذیب کی طرف پھیر دیں اور ایک
گم شدہ زمانے کو دو بارہ زندہ کرنے کی کوشش کریں - بعض نے اس
تحریک کے اثر میں آ کر یہ کوشش کی ہے کہ ماضی کی ہر چیز کو کسی
نہ کسی طرح صحیح یا غلط "علمی تحقیق" کے ذریعہ اچھا کر کے
دکھائیں اور تاریک گوشوں کو اپنے فاضلانہ علمی دلائل کی روشنی سے منور
کردیں - ایک گروہ ایسا ہے جو عہد جدید کی تمام ایجادات اور ترقیوں
کو اس بنا پر رد کرنا چاہتا ہے کہ وہ انسان کی روحانی ترقی میں
سد راہ ہوں گی اور اس لیے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے درمیان
کوئی مفید اور نتیجہ خیز سمجھوتہ قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے -

(۴)

ہم نے ابتدا میں ہندستانی تہذیب کے متعلق جو نظریہ پیش
کیا ہے اس سے ایک نہایت اہم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندستانی دماغ
اور فطرت دونوں بہت روادار اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں -
ہندستانیوں کی طبیعت میں ابتدا سے یہ صلاحیت رہی ہے کہ وہ
بیرونی اثرات اور بیرونی خیالات وغیرہ کو اپنے میں ضم کر کے اُن کو اپنا
بنا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو قومیں ہندستان پر حملہ آور ہوئیں
اور اپنی تہذیب کو بحیثیت ایک فاتح قوم کے اس ملک میں لے کر
آئیں وہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد خود اس ملک کی آب و ہوا میں

رس بس گئیں - اور ملک کی عام تہذیب کے ساتھ مل کر ان کے امتزاج سے ایک نئی اور زیادہ وسیع اور گہری تہذیب پیدا ہوئی - سید راس مسعود صاحب (وائس چانسلر علیگڈھ مسلم یونیورسیٹی) نے اپنے ایک تعلیمی خطبہ میں لکھا ہے کہ جاپانیوں نے گذشتہ سو سال کے عرصہ میں جو غیر معمولی ترقی کی اور خود کو مغربی قوموں کے دوش بدوش پہنچا دیا اس میں ایک حیرت انگیز اور قابل غور بات یہہ تھی کہ انہوں نے اہل مغرب کی تمام چیزوں کی اندھی تقلید نہیں کی بلکہ ان کی تہذیب و تمدن سے اُن چیزوں کو انتخاب کر کے لیا جو ان کی طبیعت اور قومی روایات کے ساتھہ ہم آہنگ ہو سکتی تھیں - یہہ بالکل صحیح ہے لیکن فطرتاً اِس لحاظ سے ایک ہندستانی کسی جاپانی سے گھٹا ہوا نہیں ہے - ہندستانیوں میں بھی بدرجہ اتم یہہ صلاحیت ہے کہ وہ فراخ دلی اور وسعت نظر کے ساتھہ باہر کے خیالات اور تہذیب و تمدن کو قبول کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ اِس کو اس طرح ڈھالتے اور بدلتے ؟؟ ہیں کہ وہ بغیر کسی ناگواری کے ان کی اپنی تہذیب کا جزو ہو جاتے ہیں - ممکن ہے اس خیال کی تردید میں میرا اوپر کا بیان پیش کیا جائے جہاں میں نے بتایا ہے کہ کس طرح ابتدا میں ہندستانیوں نے انگریزی تہذیب کی تقلید بغیر سوچے سمجھے کی اور اپنی تاریخ اور روایات کو پس پشت ڈال دیا - لیکن یہہ اعتراض صحیح نہیں کیوں کہ وہ اِرتقائی سلسلہ کی محض ایک عارضی منزل تھی جس میں سے گزرنا کوئی تعجب کی بات نہیں - قوموں کی زندگی میں، خصوصاً بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں، تمام باتوں کے متعلق پہلے سے کوئی مفصل پروگرام نہیں بنایا جا سکتا جس کی پیروی کرنا سب افراد کے لئے ممکن ہو - چھوٹی اور بہت منتظم قومیں البتہ ایک حد تک اس بات پر قادر ہو سکتی ہیں کہ سوچ سمجھہ کر ایک قومی

پروگرام بنایا جائے اور اس پر بہت احتیاط کے ساتھ عمل کیا جائے جیسا
جاپان میں یا جرمنی میں کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن
ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ، جس کے ساتھ نسل انسانی کے
ایک پانچویں حصے کی قسمت وابستہ ہے ، ایسا نہیں ہو سکتا ۔
اس کی مجموعی زندگی اور ارتقاء کی مثال ایک سمندر کی ہے جو آگے
کو بڑھتے ہوئے اپنے لیے جا بجا نئے اور مختلف قسم کے راستے نکالتا رہتا
ہے ۔ بہر حال اسی وجہ سے اول اول ، جب ہندوستان کو مغربی تہذیب سے
سابقہ پڑا اور ابتدائی تعصب جو راہ میں حائل تھا دور ہو گیا تو نئی
تعلیم یافتہ جماعت کا زور اور جوش ان کو ایک طرف بہا کر لے گیا اور
انہوں نے اس کی تقلید اور اس کو اختیار کرنے میں اعتدال اور سلامت
روی کے حدود کو بھلا دیا ۔ لیکن اب جب کہ ہم اس منزل سے نکل گئے
ہیں اور ردّ عمل کا اثر شروع ہوگیا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم رواداری اور جود
داری کے ساتھ فیصلہ کریں کہ اس نئی تہذیب میں ، جو بعض لحاظ
سے ہمارے بنیادی اصولوں اور قدور کو چیلنج کر رہی ہے ، کیا چیزیں اس
قابل ہیں کہ ہم ان کو قبول کریں اور کن چیزوں کو مسترد کرنا چاہیے ۔

بیان بالا سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میں موجودہ دور کی مغربی
تہذیب کو ، بعض صاحبان فکر کی طرح ، بالکل ناقابل قبول سمجھتا
ہوں میرا اعتراض محض اس اندھی تقلید کے خلاف ہے جو اکثر
ہندوستانیوں نے مغربی تہذیب کی اختیار کی تھی ۔ اور یہ طریقۂ
عمل کسی قوم کے لیے بھی مفید یا پسندیدہ نہیں ہو سکتا ۔ لیکن
اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی چیز کو بلا سوچے
سمجھے مسترد کر دینا بھی ہندوستانی تہذیب کے منافی ہے ۔ مغربی
تہذیب اگرچہ ایک مختلف اور اجنبی ماحول میں پیدا ہوئی
ہے لیکن اس میں ایسے مفید اور قابل قدر عناصر موجود ہیں جن

سے سبق حاصل کرنا ، جن کو سمجھنا ، اور اسے مٹی میں جذب کرنا بہت ضروری ہے - مجھے معلوم ہے کہ ملک میں ایک موثر فرقہ ایسا موجود ہے جو اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتا - اس فرقہ کا سر گروہ غالباً مہاتما گاندھی ، کو سمجھنا چاہئے اور ان کی رائے توجہ ان کے خلوص اور قوت فکر و تدبر کے اس قابل ہے کہ اس پر احتیاط کے ساتھ غور کیا جائے - سنہ ۱۹۰۹ ع میں "جو اپنے عقیدہ کا اعتراف" انہوں نے شائع کیا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں -

"مغربی یا یورپی تہذیب کوئی چیز نہیں ہے - البتہ ایک تہذیب موجودہ زمانہ کی ضرور ہے جو سراسر مادی ہے - جب تک مغرب کے لوگوں پر موجودہ تہذیب کا اثر نہیں ہوا تھا ان میں اور اہل مشرق میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں ہندوستان پر انگریزی قوم کی حکومت نہیں ہے بلکہ موجودہ تہذیب کی حکومت ہے جو ریلوے اور تار برقی ، ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعہ حکومت کرتی ہے مشرق و مغرب کا امتزاج صرف اس حالت میں ہو سکتا ہے جب مغرب موجودہ تہذیب کو تقریباً یک سر مسترد کردے - بظاہر ان کا ملاپ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ مشرق موجودہ تہذیب کو اختیار کرے - لیکن وہ ملاپ ایک طرح کی مسلح صلح ہوگی جیسی کہ انگلستان اور جرمنی کے درمیان آج کل ہے جب کہ وہ دونوں "موت کی گھاٹی" میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس اندیشہ سے کہ کہیں ایک دوسرے کو نگل نہ جائے یہ بات بطور ایک عام اصول کے بیان کی جاسکتی ہے کہ مادی ضروریات اور آسائشوں کے زیادہ ہونے سے اخلاقی نشو و نما کو مدد نہیں ملتی ہندوستان کی نجات اس امر پر منحصر ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں ہندوستان نے جو کچھ سیکھا ہے اس کو بھول جائے - ریلوے ، تار ، اسپتال ، وکیل ، ڈاکٹر اور اس قسم کی سب چیزوں کو ختم کر دینا

چاهئے اور ان لوگوں کو جو اعلیٰ طبقے کے کہلاتے ہیں بالارادہ ؟ سوچ سمجھ کر اور مذہبی خلوص کے ساتھ کسانوں کی سادہ زندگی کی طرف رجوع کرنا چاہئیے اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ یہی ایک زندگی ہے جو سچی خوشی کا سرچشمہ ہو سکتی ہے عقلمند تھے ہمارے رشی جنہوں نے زندگی کی تنظیم اس طرح کی تھی کہ لوگوں کی مادی زندگی اور ضروریات محدود رہیں ۔ اسی میں نجات ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایسا عظیم الشان انقلاب ان لوگوں میں ہو سکتا ہے یا نہیں جو خوشی اور اطمینان کو موجودہ زمانے کی مجنونانہ دوڑ دھوپ اور یورش میں تلاش کر رہے ہیں ۔ ""

ان الفاظ پر ؟ جیسا کہ میں نے کہا ہے غور کرنے کی ضرورت ہے نہ صرف اس لئے کہ وہ ایک نہایت دور رس اور روشن دماغ سے نکلے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ہندوستانی تہذیب کے ایک رخ کو ؟ اور ایک اہم رخ کو ؟ بہت وضاحت سے بیان کرتے ہیں اس خیال کے مطابق مغربی تہذیب کی بنیاد مادی خواہشات پر ہے اور اس کا انتہائی کمال مادی آسائشوں میں اضافہ کرنا اور نئی نئی چیزوں کی ایجاد ۔ یہ تمام نئی ایجادیں اور اشیا نہ صرف ہمارے بازاروں کو بھر دیتی ہیں بلکہ ہماری روحانی ترقی کے راستہ میں بھی حارج ہوتی ہیں اور ہماری خوشی اور اطمینان کے معیاروں کو بدل کر خراب کر دیتی ہیں ۔ ہم اپنی زندگی کی تکمیل اور مسرت کو ان خارجی اشیا میں تلاش کرتے ہیں اور فطرت کی اٹل اور دائمی قوتوں اور مناظر ؟ اور خود قلب انسانی کی گہرائیوں اور بلندیوں کو بھول جاتے ہیں اور روح ان مادی بھول بھلیوں میں پڑ کر اپنے سیدھے راستہ سے بھٹک جاتی ہے ۔ لہذا ہمیں اس ؟ حال سے بچ کر دوبارہ اس زمانہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے جب ہماری ضروریات کم اور زندگی سادہ تھی اور ہماری توجہ اضافی اور عارضی

چیزوں نے بجائے ذاتی اور اہم مسائل اور حقائق پر رہتی تھی۔

اِس میں شک نہیں کہ اگر مغربی تہذیب کے اِس وقت تک کے رجحان کو دیکھا جائے اور اُس کے سطحی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو اِس زبردست الزام اور تبصرہ میں بہت کافی صداقت ہے ۔ لیکن کسی تہذیب سے متعلق فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھنا کافی نہیں کہ اِس کے تاریک پہلو کس قدر تاریک ہیں کیونکہ ہم اِس کو تمام وکمال حذف کرنا نہیں چاہیے ۔ ہمیں یہ بھی دیکھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے کہ بحیثیت مجموعی وہ کس قدر کی حامل ہے اور دنیا کے سامنے کن قابل قدر چیزوں کو پیش کرتی ہے ۔ اِس امر پر تو موجودہ زمانہ میں نہ صرف مشرق کے صاحبان فکر کا اتفاق ہے بلکہ مغرب کے مفکرین بھی اِس امر کے قائل ہیں کہ اُن کی تہذیب پر مادیت کا رنگ غالب آگیا ہے اور آسائش جسمانی اور قوت کے حصول کی کوشش میں گزشتہ سو برس میں انھوں نے اِس قدر جد و جہد کی ہے کہ دوسری اہم اور اعلیٰ تر قدریں فرو گذاشت ہو گئی ہیں اور اگر اِس میلان کا انسداد نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ انسانی زندگی بالکل مسخ ہوکر رہ جائے گی ۔ میں اِس خیال کی تائید میں ٹیگور کی چند سطریں پیش کرتا ہوں :—

" مغربی تہذیب کا جو رخ مغرب اور مشرق کے باہمی تعلقات میں سب سے زیادہ نمایاں ہوا ہے وہ نہ صرف ہمارے لیے شک آمیز ہے بلکہ خود مغرب کی توہین ہے ۔ انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ بدنصیبی کی بات اور کچھ نہیں ہوسکتی تھی - کیونکہ دراصل مختلف قوموں کے باہمی تعلقات اور میل ملاپ کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہونا چاہئے کہ کسی بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہو جو ہمیشہ کے لیے یادگار رہے جیسا کہ زمانہ قدیم میں ہندستان اور چین کے باہمی ارتباط کا نتیجہ ہوا تھا

ہم اہل ایشیا کے لیے سب سے زیادہ بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے براعظم

میں مغرب کے ورود کے ساتھ ساتھ نہ صرف سائنس آئی ہے جو حق کا اظہار ہے اور جس کا ہم خیرمقدم کرتے ہیں بلکہ خود غرضی اور نفس پرستی کے مقاصد کے لیے سائنس کا ناجائز استعمال بھی جو اِس کو ایک تباہ کُن قوت بنا دیتا ہے ۔ جن ملکوں میں اِس کا زور ہے وہاں ایک ایسی غلط ذہنیت پیدا ہو رہی ہے جو اخلاقی اعیان کو مسترد کرتی ہے اور انہیں ایسے لوگوں کے لیے غیر مناسب سمجھتی ہے جن کو حکومت کرنے کی تمنا ہے یا جن کو محض تنازع للبقاء کے لیے تیاری کا جنون ہے ۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ زندگی کا یہ فلسفہ جو جبروں کی دنیا کے لیے موزوں ہے انسانوں کی زندگی میں سوائے تباہی و بربادی کے اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا ۔ وہ اِن لوگوں سے سخت ناراض ہو جاتے ہیں جو اِس خیال کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ انہیں یہ خوف ہے کہ مبادا اِس مخالفت کی وجہ سے اِن کی خواہشات میں کسی آجائے جس کو وہ دائمی طور پر زندہ رکھنا چاہتے ۔ ۲۲

اِس تنقید میں جو کافی وضاحت سے مغربی تہذیب کے ایک مجرد رخ کو ظاہر کرتی ہے اِس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ مغربی تہذیب کا صرف ایک رخ ہے اور ہم اہل مشرق کو اِس سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے ۔ لیکن اِس کو مغربی تہذیب کی مکمل تصویر سمجھ لینا ایسی ہی غلطی ہے جیسی انگریز اور امریکن سیاح کرتے ہیں ۔ جب وہ ہندستان یا چین کے لوگوں کی زندگی کا کوئی تاریک یا قابل اعتراض پہلو دیکھ کر تمام تہذیب و تمدن کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتے ہیں ۔ جہاں ہمارے صاحبانِ فکر پر یہ فرض ہے کہ وہ ہم کو اِن خطرات سے آگاہ کریں جو مغربی تہذیب کے تعلق کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں وہاں اِن کو یہ بھی لازم ہے کہ وہ اِس کی عمدہ اور سبق آموز باتوں کو بھی سمجھائیں تا کہ مستقبل کے تمدن اور معاشرت کی تعمیر میں ہم

اِن سے فائدہ اُٹھا سکیں ۔ موجودہ زمانے کی سائینٹیفک ایجادوں اور مکان و زمان کی تسخیر نے دنیا کو غیر معمولی سرعت کے ساتھ ایک بنا دیا ہے ۔ ملک اور قومیں جو پچاس سال پہلے تک باہمی فاصلوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ زندگی بسر کر رہی تھیں اور ایک حد تک ایک دوسرے کے مسائل اور کامیابیوں اور کارناموں سے ناواقف تھیں، ابھی ابھی اجتماعی زندگی کی تشکیل کر رہی تھیں اب تار برقی، لاسلکی، اخباروں، تصویروں اور ریلوں، ہوائی جہازوں وغیرہ کی وجہ سے ایک انوکھے طریقہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی ہیں اب کوئی قوم یہ نہیں کرسکتی کہ بین الاقوامی تحریکوں کی طرف سے منہہ موڑ کر بالکل تنہائی اور علیحدگی میں اپنی تہذیبی یا عملی زندگی کی نشو ونما کرے علم، خیال، سائنس سب جغرافیائی حدوں کے پر لگ گئے ہیں اور جو علمی تحقیق آج دنیا کے ایک گوشہ میں ہوتی ہے اس کی خبر کل اخباروں کے ذریعہ دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ جاتی ہے ۔ اِس لیے نہ یہ ہمارے لیے ممکن ہے نہ مفید کہ ہم از سر تا پا مغربی تہذیب کے عطیّوں کو مسترد کر دیں اور اپنی اِس پرانی تہذیب کو بھول جائیں جس نے ماضی کے مختلف زمانوں میں اِن تمام تہذیبوں سے عناصر حاصل کیے اور جذب کیے جو آریوں کے زمانے سے لے کر آج تک ہندستان میں آتی رہیں ۔

(٥)

اب ہم مختصراً یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اپنی بہترین شکل اور اظہار میں مغربی تہذیب کن عمدہ اور مفید خیالات کی ترجمان ہے اِس ضمن میں غالباً سب سے پہلے مغرب کی سائنٹفک ترقی کا ذکر کرنا چاہیے ۔ دور حاضرہ میں سائنس کی ترقی کا سہرا مغرب کے سر رکھنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم دوسری قوموں کی تاریخی کوششوں کا اعتراف نہ کریں یا یہ بھول جائیں کہ سائنس کی ترقی اِن بے شمار شخصوں کی کوششوں کا ثمر ہے

جنھوں نے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں اکثر گمنامی اور مفلسی کی حالت میں محض تلاش حق کے جذبہ سے متاثر ہو کر عملی تحقیق و تفتیش میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں ۔

ایسی احسان ناشناسی روح سائنس پر ایک صریح ظلم ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ گذشتہ دو سو برس میں سائنس کی جو باقاعدہ اور منتظم ترقی ہوئی ہے اس کی سرکردگی اور اس میں سب سے زیادہ جد و جہد یورپ ہی نے کی اور اب بھی یورپ اور امریکہ ہی اس میں پیش پیش ہیں ۔ اگر سائنس کو محض انفرادی قوت کے بڑھانے کا ایک ذریعہ سمجھا جائے تو اس کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدور میں شمار کرنا غلطی ہوگی ۔ لیکن سائنس در اصل انسانی طبیعت کے اس بےچین جذبہ کی پیداوار ہے جو اپنے ماحول کی تمام قوتوں کو مسخر کرنا چاہتا ہے ، جو خدا کے اس مقصد میں معین اور آلۂ کار ہے کہ انسان تمام عالم فطرت پر حاوی ہوکر اس کو اپنے اعلیٰ ترین روحانی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے ۔ اگر مشیت الٰہی کا مقتضا یہہ ہوتا کہ جہاں تک ہوسکے انسان اپنے ماحول سے بے تعلق اور الگ تھلگ رہے تو اس کی روح کو جسم کے ساتھہ مربوط اور اسکی زندگی کو قوانین فطرت اور عالم فطرت کے ساتھہ مشروط نہ کرتا ۔ سائنس کی ترقی بجائے خود انسان کی روحانی ترقی ہے اور معرفت الٰہی کو زیادہ کرتی ہے ۔ یہہ ایک علحدہ بات ہے کہ اس کے غلط اِستعمال کی وجہ سے اس نے اِنسان کو مصیبتوں اور جرائم میں پھنسا دیا ہے ۔ مغرب کے بہترین دماغ خود اس بات کے قائل ہیں کہ گذشتہ دو سو سال میں سائنس کی ترقی اس قدر حیرت ناک سرعت کے ساتھہ ہوئی ہے کہ اِنسان اپنے روحانی ارتقاء ، اپنے سماجی نظام اور اپنے احساس تعاون کو اس کے ساتھہ ہم آہنگ نہیں کر سکا ۔ اس کی وجہ سے ناصبر اور عاقبت ناشناس اِنسان کے ہاتھہ میں بعض

بہت زبردست قوتیں آگئی ہیں جن کے جائز اِستعمال کے لیے مناسب ذہنیت اس میں پیدا نہیں ہوئی ـ ضبط نفس، رواداری، باہمی اخوت اور انحصار کا احساس، اخلاقی اصولوں کی پختگی، یہ سب چیزیں جب تک بہت زیادہ عام ہوکر قوموں کی سیرت کا جزو نہ بنیں اُس وقت تک ہم کو یہ اِطمینان نہیں ہو سکتا کہ قومیں بےوقوف بچوں کی طرح اس ہتھیار سے خود اپنے ہاتھ نہ کاٹ لیں گی ـ لیکن اس صورت حال کو تعلیم اور معلّمین کے لیے ایک بیدار کن چیلنج سمجھنا چاہیے ـ ان کو چاہیے کہ مدرسوں اور اعلیٰ درس تعلیم گاہوں میں اس قسم کی ذہنیت پیدا کریں کہ آئندہ نسلیں سائنس کی قوتوں کا صحیح اِستعمال کریں ـ اِس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہیے کہ چونکہ سائنس کی ترقی سے جنگ بہت زیادہ مہلک اور نقصان دہ ہوگئی ہے اس لیے ہمیں سائنس سے دستبردار ہو جانا چاہیے ـ قابل اعتراض وہ ذہنیت ہے جو چیزوں کی ماہیت کے علم کو ناروا بنانے میں صرف کرتی ہے وہ ذہنیت نہیں جو ماہیت دریافت کرتی ہے ـ علاوہ بریں بقول پیغمبر اِسلام صلعم کے علم و حکمت (جس میں سائنس اور فلسفہ وغیرہ سب شامل ہیں) ایک ایمان والے کی کھوئی ہوئی پونجی ہیں ـ جہاں کہیں بھی وہ ملیں ان کو حاصل کرنا چاہیے؟ ان چیزوں میں مشرق و مغرب کی تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ سائنس (اِنسانی حدود کے اندر ایسے یقینی اور منظم علم کا نام ہے جس کا اطلاق ہر جگہ اور ہر موقع پر ہو سکتا ہے ـ وہ ابدی حقائق کی حامل ہے اور ہم کو اس سے فائدہ اُٹھانے کا اتنا ہی حق اور ہم پر اس کی خدمت کرنے کا اتنا ہی فرض ہے جس قدر اہل مغرب پر ـ زمانہ ماضی میں بعض علوم میں ہندوؤں نے خواہ کتنی ہی ترقی اور جد و جہد کی ہو اور اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں؟ جب باقی تمام دنیا میں علمی تاریکی چھائی ہوئی تھی؟

مسلمانوں نے سائنس کی خواہ کتنی بھی خدمت اور علمبرداری کی ہو؟ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں ہمارے ملک میں سائنس کی طرف سے بہت غفلت کی گئی ہے ۔ اس کا ایک دلچسپ ثبوت یہ بھی ہے کہ اگر ہمارے ملک کا کوئی ماہر سائنس کوئی علمی تحقیق کرکے اہل مغرب سے خراج تحسین وصول کرتا ہے جیسے بوس یا رامن تو ہم اور ہمارے اخبار فخر کے مارے پھولے نہیں سماتے ۔ گویا خود ہمیں تعجب ہے کہ ہمارے یہاں ایسے آدمی کیونکر پیدا ہو گئے! اور ہم یہ نہیں سمجھتے کہ دوسرے مغربی ملکوں میں جہاں کی آبادی نسبتاً بہت کم ہے لیکن ہمارے ہی جیسے انسان بستے ہیں سینکڑوں آدمی ایسے ہیں جو اس قسم کی علمی تحقیقات کرتے ہیں اور اعلیٰ ترین اسناد اور اعزاز حاصل کرتے ہیں ۔ قوم کی علمی زندگی میں سائنس کے عنصر کی کمی کی وجہ سے ہماری ذہنیت میں بھی ایک مخصوص کمزوری اور نقص پیدا ہوگیا ہے ۔ تنقید؟ صحت عمل؟ پر اسرار معاملات کے ہر پہلو کو سوچنا غور کرنا اور تولنا؟ جذبات اور ذاتی میلانات کو علم اور دماغ کے تابع کرنا؟ ۔ یہ تمام علمی صفات جو ایک مکمل سیرت کے لئے ضروری ہیں ہمارے ہاں بحیثیت مجموعی اور مقابلۃً کم ہوتی جا رہی ہیں ۔ نئی تعلیم جو ہندوستان میں قومی ضروریات کے لحاظ سے مشکل ہوگی وہ عام تعلیم میں سائنس کو؟ ایک اہم جگہ دے گی اور اعلیٰ تعلیم میں اس ذہنیت کی صحیح قدر کو تسلیم کرے گی جو سائنس کے صحیح اور پُر احترام مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے ۔

دوسری قابل قدر خصوصیت مغربی تہذیب کی یہ ہے کہ اس نے سائنس کو انسانی مفاد کے حصول کے لئے استعمال کیا ۔ اور مختلف اقتصادی؟ صنعتی، طبعی اور آمد و رفت وغیرہ کے مسائل کو حل کرنے اور آسان کرنے کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا ۔ علم اور حق کی

محض تلاش کی خاطر بھی ایک نہایت ضروری چیز ہے اور اکثر ، خصوصاً گذشتہ زمانوں میں علمی ترقی ایسے لوگوں کی بدولت ہوئی ہے - جنہوں نے بغیر کسی فائدہ یا دولت کے خیال کے اپنی زندگی تلاش حق کے لیے وقف کردی تھی - بقول پروفیسر میکنزی کے —

"بالخصوص ہم دنیا کی تمام چیزوں کے متعلق صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہیں نہ صرف اس لیے کہ علم قوت ہے ، نہ صرف اس لیے کہ وہ دوسری چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے بلکہ اس لیے کہ ہماری فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ ہم تلاش حق کریں اور بغیر جاننے کے ، بغیر علم کے خود شناسی ممکن نہیں - اور شاید اس وجہ سے بھی ، کہ ہم کو یہ پختہ عقیدہ ہے کہ یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں ، باوجود اپنی بہت سی مشکلات اور خرابیوں کے اس قابل ہے کہ ہم اس کو سمجھیں اور جانیں - "

لیکن سائنس کی ترقی ، محض بطور ایک کتابی علم کے ، کافی نہیں - اس کا تعلق ہمارے آب و گل سے ہے اور اس کی طرف اس کو اپنی توجہ پھیرنی چاہیے ، اس کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے اس کو اپنی قوتیں صرف کرنی چاہئیں - اہل مغرب نے جہاں سائنس کا استعمال بارہا اور جا بجا محض تخریبی یا خود غرضانہ طریقے سے کیا ہے وہاں یہ بھی تسلیم کرنا لازمی ہے کہ انہوں نے اس کو مفاد عامّہ کے لیے ، انسانی زندگی کی تکلیفوں کو کم کرنے کے لیے ، اس کی آسائشوں کو بڑھانے کے لیے بھی استعمال کیا ہے - اقتصادی پیداوار کے طریقوں اور اور صنعت و حرفت کے نظام میں انقلاب پیدا کر کے انہوں نے اس امر کو ظاہر کر دیا ہے کہ اگر سماجی زندگی کی صحیح تنظیم کی جائے تو فرصت اور اس کے تہذیبی مشاغل نہ صرف دولتمندوں کی زندگی کا جزو بن سکتے ہیں بلکہ دنیا کے ہر غریب مزدور کے حصہ میں

آ سکتے هیں - وسائل آمد و رفت اور تبادلۂ خیالات کی تکمیل کر کے انھوں نے اس خیال اور جذبہ کی پرورش کے لیے ماحول مہیا کر دیا ہے کہ تمام نسل انسانی بمنزلہ ایک خاندان کے ہے اور اس کی اجتماعی ترقی کے لیے سب کا اشتراک عمل ضروری ہے - بہت سی بیماریوں اور متعدی امراض کے لیے حیثی علاج دریافت کر کے انھوں نے لاکھوں انسانوں کو ایک ایسی زندگی سے نجات دلائی ہے جو موت سے بدتر تھی - شہروں قصبوں اور گاؤں کی صفائی اور حفظان صحت کا بہتر انتظام ؛ طباعت کی آسانیوں اور کفایت کی بدولت علم اور علمی ذخیروں کو معمولی استطاعت کے لوگوں تک پہنچانا ؛ قدرتی ذرائع کو انسان کا محکوم بنانا اور قدرتی تباهیوں سے انسان کی حفاظت ؛ یہہ سب باتیں سائنس کے صحیح اور جائز استعمال سے حاصل ہوئی ہیں - اور ہم لوگوں کو جن کے سامنے ایک وسیع اور عظیم‌الشان ملک کی تنظیم کا مسئلہ درپیش ہے اپنے اکثر مسائل کے حل کے لیے سائنس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا هندستان کے افلاس کا ایک بہت بڑا سبب یہہ ہے کہ ہم اپنی قدرتی دولت اور ذرائع سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھاتے ؛ ہمارے جنگلوں اور کانوں اور پہاڑوں اور بہتے ہوئے دریاؤں اور زرخیز زمین میں جو خزانے دولت کے پوشیدہ هیں وہ سر بمہر رکھے ہوئے ہیں ؛ ہم ان کو استعمال نہیں کرتے ؛ اس کے لیے جس قسم کی صنعت و حرفت اور انجینری وغیرہ کی تعلیم کی ضرورت ہے وہ ہمارے ہاں بہت کم ہے - اس طرح ہمارے دیہات کی ناگفتہ بہ حالت ؛ ہمارے صحت کی خرابیاں اور روز بروز جسمانی قوت اور مدت حیات کا کم ہونا یہہ سب مسائل اس بات کے محتاج ہیں کہ ہم بہت وسیع پیمانے پر سائنس کو قومی ضروریات اور قومی زندگی کی بہتری کے لیے استعمال کریں - ماحول کو بہتر بنانا اور مادی اور جسمانی آسائشیں فراہم کرنا بجائے خود کافی

نہیں - لیکن جو لوگ موجودہ فلسفہ اور خیال کی روش سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جسم اور دماغ ، مادہ اور روح بالکل جداگانہ یا متضاد چیزیں نہیں ہیں اور زندگی میں اعلی قدور کو راہ دینے کے لئے اس کے مادی ماحول کا بہتر بنانا بھی ایک ضروری امر ہے - اگر انسان کی تمام توجہ اور وقت اپنے مریض جسم کی نگہداشت میں صرف ہو یا گرد و پیش کی کیفیت اور ناصاف فضا کسی شہر یا قصبہ کی تمام آبادی کی صحت خراب کردے یا صنعت و حرفت کے نئے طریقوں سے ناواقفیت آبادی کے ایک بڑے حصے کو ایسے بھکانے والے کاموں میں مصروف رکھے جو زیادہ عمدگی اور کفایت سے مشین کے ذریعہ ہو سکتے ہیں تو ہم کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ وہ قوم علمی ، اور اخلاقی اور تمدنی جد و جہد میں اپنی قوتوں کو استعمال کر سکے گی ؟

تیسری چیز جو ہم کو مغربی تہذیب سے اخذ کرنی ہے وہ ان کا نظم و نسق ہے - یہہ کہنا کہ خود ہمارے عہد ماضی میں ، مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے علحدہ علحدہ بھی ، اور مشترک طور بھی ، ملکی نظم و نسق میں بہت بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں میرے خیال کی تردید نہیں ہے - - اس میں شک نہیں کہ ہم کو اپنے ماضی کے کارناموں سے عبرت اور ہمت دونوں چیزیں حاصل کرنی چاہیئں اور ماضی کی مثالوں سے قوت اور سبق لینا چاہئے - لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ ہم کو بہت زیادہ فائدہ ان قوموں کے ملکی اور معاشرتی انتظام کے مطالعہ سے ہوگا جو آج کل کے حالات میں اور کم و بیش ہمارے جیسے مسائل میں گھرے ہوئے بہت بڑے پیمانے پر اپنی اجتماعی تنظیم کر رہی ہیں - میرا خیال ہے جیسا کہ میں آگے چل کر زیادہ وضاحت کے ساتھہ ذکر کروں گا ، کہ ہمیں اپنے لئے نصب العین اور اخلاقی اصول تلاش کرنے کے لئے کسی اور ملک یا تہذیب کی طرف رجوع کرنے کی

ضرورت نہیں - کچھہ تو اس وجہ سے کہ ان کا تعلق قومي خصائص سے اس قدر گھرا اور قریبی ہے کہ ان کو کہیں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا - وہ قومي فطرت سے پیدا ہوئے ہیں اور اس کے ساتھہ ساتھہ نشو و نما پاے ہیں - اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ ہندستان میں جن تہذیبوں کا امتزاج ہوا ہے ان کے بنیادي اصولوں اور اعیان میں ایسے اٹل اخلاقي اصول اور نصب العین موجود ہیں جو ہمارے آئندہ زندگي کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے ہیں - مگر اُصولوں کو بحیثیت اصولوں کے تسلیم کرنا اور اُن کا احترام کرنا اور چیز ہے اور ان کو افراد کی روز مرہ زندگی میں اور قوم کي مجموعی زندگي میں عملي شکل دینا اور بات ہے ہماري ایک بڑی کمزوري یہہ ہے کہ ہم اپنے اکثر اصولوں اور خیالات کو منظم کوشش کے ذریعہ عملی جامہ نہیں پہنا سکتے - اور اس کے لیے جس نظام کي ضرورت ہے وہ مہیا نہیں کر سکتے - ہر باقاعدہ اور کامیاب "نظام" کے لیے ؛ جیسا کہ اس کے اصطلاحي معنوں سے ظاہر ہے ؛ نظم و ترتیب کي ضرورت ہے - افراد میں "ضبط نفس" کی ضرورت ہے - اور یہہ ضبط نفس جس کو انگریزی میں ڈسپلن کے لفظ سے ادا کرتے ہیں ہماری انفرادی اور قومي زندگی میں بہت کچھہ مفقود ہو گیا ہے - ذاتي خواہشات اور مفاد کو مفاد عامّہ کا تابع کرنا ؛ سماجی زندگی کے لیے باہمی رعایت اور رواداری ؛ اشتراک عمل کی صلاحیت ؛ تجاویز اور اور پالیسی پر استحکام کے ساتھہ عمل کرنا اور وقتي ناکامی سے شکست نہ کھانا ؛ یہہ وہ صفات ہیں جو قوموں کو طاقتور اور منظم بناتی ہیں - اور ہمیں تعلیم کے ذریعہ ان صفات کی نشوونما کرنی ہے - جب تک یہہ صفات قومی سیرت کا جزو نہ بنیں گی ہم کسی بڑے پیمانے پر اپنے اصولوں اور نصب العین کو حاصل نہیں کر سکتے - اسلام نے دنیا کو سب سے پہلے اخوت اور مساوات کا سبق نہایت صاف اور واضح الفاظ

میں بڑھایا اور اپنے ابتدائی دور میں ان اصولوں کو جمہوریت کے سیاسی جامہ میں ملبوس کر کے دکھا دیا ۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے اس اصول کو سیاسی زندگی کا رہبر نہیں بنایا اور خود مختار خاندانی بادشاہتیں قائم کر دیں ۔ برخلاف اس کے یورپ کے پاس اخوت اور مساوات کا اصول اپنی موجودہ سیاسی شکل میں انقلاب فرانس اور اس کے ذہنی پیش رو اور لیڈروں کے پاس سے آیا تھا اور اس کی بنیاد کسی مستحکم مذہبی یا عقیدت یا گہرے اندرونی احساس پر قائم نہ تھی ۔ تاہم یورپ اور امریکہ نے رفتہ رفتہ اس کو موجودہ سیاست کی سب سے زیادہ زوردار اور منظم قوت بنا دیا اور اس کے لیے مناسب ادارے اور قوانین بنا دئے جنہوں نے اس کو ایک پائدار شکل دے دی ۔ اگرچہ یورپ میں کہیں کہیں اس جمہوریت کو ناکامی ہوئی ہے اور بعض لوگ اس کے عقائد سے منحرف ہیں تاہم اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ موجودہ زمانہ کی نہایت زبردست سیاسی قوت ہے ۔

اسی طرح ہندوؤں کے مذہب میں اور مسلمانوں کے مذہب میں نہایت وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ اقتصادی زندگی کی ہدایت کے لیے ایسے اصول وضع کیے گئے ہیں جن سے امیروں اور غریبوں کے درمیان ایسے تعلقات قائم نہ ہوں جو انسانیت کی شان کے خلاف ہیں اور سماجی نظام کو درہم برہم کر دیں دولت کو ایک امانت بتایا گیا ہے جس کو بہت ذمہ داری اور سمجھ کے ساتھ صرف کرنا چاہئے ۔ اس میں سے غریبوں کا حصہ نکالنا چاہیے اور ہر طرح کے بے بس اور بیکس لوگوں کی امداد کرنی چاہئے ۔ امیروں کو بھی کبھی دولت اور دنیاوی عیش اور آسائشوں کے معاملہ میں ضبط نفس اور ریاضت سے کام لینا چاہئے ۔ ان امور کی تاکید دونوں تہذیبوں کے اصولوں کا جزو ہے ۔ یہاں تک کہ ہندو مذہب

میں اس نے دان پن کی وہ مبالغہ آمیز شکل اختیار کر لی ہے جو مستحق
اور غیر مستحق میں بھی تمیز نہیں کرتی اور سماجی زندگی کے
مصلحتوں کو ناراض کرتی ہے - اسی طرح اسلام نے زکوٰۃ اور خمس اور
خیرات کے نہ صرف اصول بیان کیے بلکہ ان کی عملی شکلوں کو بھی واضح
اور معین کردیا تا کہ زود فراموش اور کمزور انسانوں کو آسانی کے
ساتھ ان حقوں کو بھولنے کا موقع نہ ملے - لیکن اجتماعی زندگی
کے انتشار نے اسلامی جماعتوں میں اس مفید اور قابل قدر نظم کو قائم
نہیں رہنے دیا اور تمام ہندستان میں بالعموم کوئی ایسے ادارے، وسیع
اور قومی پیمانے پر قائم نہیں ہیں، جو مختلف قسم کے محتاجوں،
اپاہجوں، بوڑھوں اور بے بسوں کی نگہداشت کریں، افراد اپنی اپنی
جگہ پر غیر منتظم طریقے سے کوشش کرتے ہیں لیکن وہ اس عظیم الشان
مسئلہ کا خاطر خواہ حل نہیں کر سکتے - اس کے لیے جس مجتمعہ قومی
پالیسی اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے وہ ناپید ہے - برخلاف اس کے
مغربی ممالک میں، زیادہ تر اقتصادی اور عملی مشکلات سے مجبور
اور ایک عام انسانی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہوکر، اس معاملہ کو بہت
زیادہ اہتمام اور کامیابی کے ساتھ اٹھایا گیا ہے حکومت، یعنی قوم
بحیثیت مجموعی نے بے روزگاروں کو روزگار سے لگانا اپنی ذمہ لیتی ہے -
بیواؤں اور بوڑھوں کو پنشن دیتی ہے، بچوں کی تعلیم کا نہ صرف انتظام
کرتی ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ان کے اور اخراجات بھی برداشت
کرتی ہے اور مختلف طریقوں سے اقتصادی زندگی کی بے انصافیوں اور
مظالم کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہے - یہ صحیح ہے کہ ہندستان میں
اس قسم کی، دور رس اور عالم گیر تحریکوں اور سود مند تجاویز کی کمی
کی ذمہ داری بڑی حد تک گورنمنٹ پر عاید ہوتی ہے جو قومی گورنمنٹ
نہیں ہے - لیکن ملک اور قوم بھی بہ حیثیت مجموعی اس الزام اور

ذمہ‌داري سے بري نہيں ہو سکتي کہ ان مسائل کو حل کرنے کي کوئی بہت کامياب اور منظم کوشش نہيں کی گئی - اور يہ امر بھي ياد رکھنا چاہيے کہ علاوہ ان حروي انتظامات کے، جو اقتصادي نا ہمواريوں کو درست کرنے کے ليے مغرب ميں کيے گئے ہيں، جو منظم تحريکيں موجودہ نظام سرمايہ‌داری کے مد مقابل ہوکر آج کل دنيا ميں اپنا اثر پيدا کر رہي ہيں مثلاً سوشلزم يا روس کا اقتصادی نظام وہ بھی زيادہ تر مغرب کے خيالات اور قوت تنظيم کا نتيجہ ہيں - اور جب تک ہماري تعليم اجتہاد اور جدت خيال کی قوت اور اس کے ساتھ ساتھ يہ فعاليت پيدا نہيں کرے گی اس وقت تک ہم اپنے کو بہ حيثيت ايک قوم کے دنيا کے نئے حالات اور ماحول کے ساتھ ہم‌آہنگ نہيں بنا سکيں گے -

(۲)

اميد ہے کہ مندرجہ بالا بيان سے يہ خيال پيدا نہيں ہوگا کہ ميں مغرب کی اندھی تقليد کا قائل يا مغرب کی ہر چيز کا معترف ہوں ميں اب تک يہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ قومی سيرت کي تشکيل جو ہميں درپيش ہے دنيا کے موجودہ حالات اور واقعات سے جاہل رہ کر نہيں ہوسکتی بلکہ ہم کو عمداً يہ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کن لحاظ سے ہميں اپنے کيرکٹر کو خاص طور پر مضبوط کرنا چاہيے - اس غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانے کی ضروريات کے خيال سے ہم کو بعض ان خصائص پر توجہ کرني چاہيے جو آج کل مغرب کي ترقي يافتہ اقوام ميں زيادہ نماياں ہيں يعني سائنس کا حصول اور اس کے ذريعہ فطرت کی تسخير، انساني مسائل کے حل کے ليے سائنس کا استعمال، عمليت اور نظم و نسق جو بڑے پيمانے پر قوم کي منتشر قوتوں کو ايک شيرازہ ميں پرو دے اور اجتماعي تحريکوں کو قابل بنا دے - ليکن ان کے ساتھ ساتھ ہميں بعض ان قدور کو دوبارہ زندہ کرنے کي

ضرورت ہے جو زمانہ ماضی میں ہماری خصوصیات میں شامل رہی ہیں لیکن اب کچھ مغرب کے خراب اثرات کے اور کچھ عام انتشار کی وجہ سے قومی زندگی سے مفقود ہو گئی ہیں یا ہوتی جاتی ہیں -

ان قدور میں ایک اہم حیثیت علم کو حاصل ہے جو ہندوؤں ور مسلمانوں دونوں کی تہذیب میں ہمیشہ ایک مقدس اور روحانی برکت سمجھا گیا ہے - اور اس کو ہمیشہ مذہب اور مذہب کے معاملات سے ایک خاص قریبی تعلق رہا ہے - یہاں تک کہ بعض مذہب مثلاً ہندو مذہب میں ہر علم کو صرف مذہبی پیشواؤں یعنی برہمنوں کی جماعت تک محدود کردیا گیا تھا بر خلاف اس کے اسلام نے ہر علم کو خواہ وہ دینی ہو یا دُنیوی انتہائی اہمیت اور عزت دی اور بقدر استطاعت اس کا حاصل کرنا ہر شخص پر فرض کر دیا لیکن اُس زمانہ میں لوگ علم کو علم کی خاطر حاصل کرتے تھے یعنی اس کی اتنی قدر کرتے تھے کہ اس کے حصول میں عمریں صرف کردیتے تھے - ملکوں ملکوں ماہرین علم کو تلاش کرتے پھرتے تھے - اور ان کو صرف ضروری یا مفید باتیں بتانے والا ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ در حقیقت ان کو اپنا گُرو یا مرشد مانتے تھے اور ان کا غیر معمولی حد تک احترام کرتے تھے - یورپ میں از منہ متوسط کے بعد مختلف سیاسی اور معاشرتی اثرات کی وجہ سے تعلیم کا تعلق رفتہ رفتہ مذہب سے ٹوٹ گیا - دُنیوی علم اور دینی علم میں بہت وضاحت کے ساتھ تمیز کی گئی اور علم کا مادی یا اقتصادی پہلو غالب آنے لگا - جب مغربی تعلیم ہندستان میں رائج ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان قرار پائی تو یہی خیالات زیادہ نمایاں شکل میں یہاں بھی پھیلنے لگے -

اول تو عربی، فارسی، سنسکرت جو تہذیب و تمدن اور مذہب و علوم کی زبانیں تھیں اور لوگوں کے ذہن میں ان کا مذہبی احترام تھا وہ رفتہ رفتہ تعلیم کے نظام سے کم ہونی شروع ہوئیں اور ایک غیر ملکی

زبان جس کے ساتھ کوئی اسے عمدہ یا احترام کے تعلقات قائم نہیں تھے ان کی جگہ پر مسلط ہو گئی ۔ دوسرے اس نئی تعلیم کے حاصل کرنے کا مقصد، بلکہ اس کا اعتراف شدہ نصب العین یہی تھا کہ نئی حکومت کے لئے سرکاری ملازم اور عہدہ دار تیار کرے جو مختلف طرح کے دفتری کاموں کو انجام دے سکیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم اور تعلیم دونوں محض افادی اور دنیوی ہوکر رہ گئے اور عام طور پر لوگوں کے ذہن اور دل سے یہ بات محو ہو گئی کہ تعلیم کے اصل مقاصد اور اعیان اس سے بہت بلند ہیں اور علم کا حاصل کرنا بجائے خود ایک قدر مستقل ہے جس کو فراموش کرنا نہایت مہلک غلطی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جو تعلیم ہمارے مدارس میں دی جا رہی ہے اس کا کوئی دیرپا اثر قومی اخلاقی اور قومی سیرت پر نہیں پڑتا ۔ اور ملک کا علمی معیار کم ہوتا چلا جاتا ہے یہ صورت حال اصلی ہندستانی ذہنیت کے منافی ہے اور اس کا تدارک کرنا ماہرین تعلیم کا فرض ہے ۔

دوسرے ہندستان کے تعلیمی اور سماجی نظام کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ حصول علم میں افلاس کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا ۔ طلب صادق اور استقلال اور قابلیت کا ہونا کافی ہے ۔ جو طالب علم ان صفات کو لے کر علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلتا تھا اس کے لیے ہر طرف دروازے کھلے ہوئے تھے ۔ بڑے بڑے اساتذہ اپنی اپنی جگہ، بالعموم عبادت گاہوں میں درس دیتے تھے اور وہ چشمہ سب علم کے پیاسوں کے لیے کھلا ہوتا تھا ۔ فیس، داخلہ، عمر کی قید، اس قسم کی رکاوٹیں نہ ہوتی تھیں ۔ لیکن جوں جوں تعلیم زیادہ منتظم ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کے راستے میں بندشیں پیدا ہوتی جاتی ہیں ۔ چنانچہ اس وقت ہندستان میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے بچوں کی ملے گی جن کو نہ صرف آگے تعلیم پانے کی خواہش ہے بلکہ دماغی قابلیت کے لحاظ سے وہ

اس کے اہل بھی ہیں لیکن مفلسی کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کو پورا نہیں کر سکتے بلکہ بعض مرتبہ تعلیم شروع ہی نہیں کر سکتے - اس میں شک نہیں کہ تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی وجہ سے بہت سی دقتیں اور مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے بعض تدلیس سے بچنا نا ممکن ہے - لیکن مدرسوں کی تعلیم کو محض ایک اقتصادی خرید و فروخت بنا دینا تعلیم کے روحانی عنصر کو نظر انداز کرنا ہے - اگر اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ معمولی مدارس کے مدرسین کی تنخواہیں کس قدر قلیل ہیں اور ان کی سماجی حیثیت کس قدر کم سمجھی جاتی ہے تو یہ بات ظاہر ہوجائے گی کہ نہ صرف موجودہ نظام تعلیم بہت سے ذہین طلبا کو اپنے حلقۂ اثر سے باہر رکھتا ہے بلکہ جن طلبا کو داخل بھی کرتا ہے ان کے لیے بھی بہت ستی قسم کی تعلیم فراہم کرتا ہے - ہمارے ماہرین تعلیم کو ایسے ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے کہ وہ نظم و نسق کی پیچیدگیوں کے باوجود تعلیم کی قدر روحانی کو قائم رکھیں اور ذہنی اور علمی لحاظ سے مستحق طلبا کو تعلیم کے کسی درجہ سے بھی محروم نہ کریں -

تیسری خصوصیت جس کا ذکر ضمناً اوپر آچکا ہے تعلیم اور مذہب کا قریبی تعلق ہے - یہ مسئلہ ہمیشہ صاحبان فکر کے درمیان اختلاف کا باعث رہا ہے کہ تعلیم کا مذہب سے کیا رشتہ ہونا چاہیے - اور بالعموم مذہبی اور ملکی حکام میں جو کشمکش اس بارے میں رہی ہے اس کا نتیجہ گذشتہ سو سال میں ملکی حکام کے حق میں ہوا ہے - دنیا کے بیشتر ممالک میں اس وقت تعلیم تمام تر یا زیادہ تر مذہبی گروہ کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں چلی گئی ہے - یہ امر ایسا نہیں جس پر افسوس کیا جائے کیوں کہ زمانہ ماضی میں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ مذہب کے پیشواؤں نے تعلیم کو اپنے قبضہ میں لاکر ذہنی

آزادی کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ علم کی ترقی کے راستے میں حائل ہوئے ہیں - لہذا اصولاً یہی بہتر ہے کہ تعلیم مذہبی گروہ کے غلبہ اور تصرف سے آزاد رہے - لیکن یہ بات اس معنی میں صحیح ہے جس معنی میں یہ کہنا صحیح ہے کہ تعلیم کو سیاسی اثر سے آزاد رہنا چاہیے یعنی کسی خاص حکومت یا پارٹی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تعلیمی وسائل اور ذرائع کو ان کے اصل مقصد سے ہٹاکر اپنے محدود مقاصد کے لیے استعمال کرے جیسا اکثر تاریخ میں ہوچکا ہے - اس کے یہ معنی نہیں کہ تعلیم کو روح مذہب سے، مذہبی نقطہ نظر سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے - تعلیم اور مذہب میں اس طرح کا تفرقہ پیدا کرنا کسی قوم کے لیے مفید نہیں ہو سکتا اور خود دانایان مغرب جنہوں نے بہت کوشش سے تعلیم کو پادریوں کے اثر سے نکالا تھا اب یہ محسوس کر رہے ہیں کہ تعلیم کا رشتہ مذہب سے منقطع کر دینا ایسا ہے جیسا کسی طوفانی سمندر میں کشتی کے رسوں کو کاٹ دینا یا اس کے قطب نما کو ضائع کر دینا - اس کا اثر یہی ہوگا کہ کشتی بالکل بے مہار ہو کر ہچکولے کھانے لگے گی - زندگی کو کسی مستقل فلسفہ اور نصب العین کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے لازم ہے کہ معلم مذہب کی روح کو سمجھے اور مطالعہ کرے اور وہ احترام اور ابدی قدروں کے ساتھ وابستگی جو مذہب کا مخصوص عطیہ ہے اپنے طلبا میں پیدا کرے - پروفیسر میکنزی اپنی کتاب "زندگی کے بنیادی مسائل" میں مذہب اور زندگی کے تعلق سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"در اصل یہ نا ممکن ہے کہ ہم دنیا میں انسانی زندگی کے بنیادی مقاصد کو سمجھے بغیر سماجی زندگی کے مسائل کو خوبی کے ساتھ حل کر سکیں - انسانی زندگی کے تمام مسائل ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی ہم اچھی طرح نہیں سمجھ

سکتے جب تک یہہ نہ سمجھیں کہ انسان کیا ہے؟ کیا ہونا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے - انسانی زندگی ایک ملاپ ہے بہترین چیزوں کی؟ خواہ ہم اس کو اچھی طرح سمجھ کر کریں یا پوری طرح نہ سمجھیں" - یہہ سوال کہ ہم کیا ہیں؟ کیا بننا چاہتے ہیں؟ کیا کرنا چاہتے ہیں ایسے ہیں کہ ان کا تسلی بخش جواب صرف سائنس یا فلسفہ سے نہیں مل سکتا - اس کے لئے انسان کو اس وجدانی احساس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جو اس کو مذہب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے - کیونکہ کسی سمجھ دار انسان کے لئے یہہ ممکن نہیں کہ وہ کائنات کے دو مکمل تصور بنائے ایک علمی اور دوسرا مذہبی اور وہ ایک دوسرے سے بالکل علحدہ اور مختلف رہیں - پروفیسر اسپرانگر جو برلن یونیورسٹی میں تعلیم اور فلسفہ کے استاد ہیں اپنی معرکۃالارا تصنیف "نفسیات عنفوان شباب" (مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب) میں لکھتے ہیں —

"نفس انسانی کا جو نقطہ تصور کائنات کا جزو ہے وہی معرفت الہی کا سرچشمہ بھی ہے - فلسفہ کے حقائق و معارف اصل مذہب تو نہیں لیکن مذہب کی داخلی بنیاد ضرور ہیں - نظام عالم کے مقصد و منشاء کا احساس؟ خواہ وہ ہمارا دائمی سرمایہ حیات ہو یا کبھی کبھی بجلی کی طرح چمک کر ساری کائنات کا بھید ہم پر کھولے؟ مذہبی واردات کی جز ہے - اور چونکہ یہی احساس مافوق الطبعیات کا سرچشمہ بھی ہے اس لیے مافوق الطبعیات بھی مذہبی ہی پر مبنی ہے - یہہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے ذہن میں دو تصور کائنات ہوں ایک مذہبی اور ایک علمی - بلکہ جب کبھی علم آخری اور یقینی نتائج تک پہونچتا ہے تو مذہبی وجدان سے علمی تفکر؟ اور علمی تفکر سے مذہبی وجدان پیدا ہوتا ہے - وہی ایک چیز ہے جس میں اگر

ایک عنصر عالم ہے جو مذہب کہلاتی ہے اور دوسرا عالم ہے جو مافوق الطبعیات"۔

"نظام عالم کے مقصد و منشا کا احساس" پیدا کرنا اور انسان اور اس کی زندگی کو اس عظیم انسان مقصد سے مربوط کرنا ہی مذہب کا کام ہے اور اگر تعلیم کا تعلق مذہب سے اس معنی میں ٹوٹ جائے کہ طالب علموں میں یہہ احساس پیدا نہ ہو اور وہ اپنی انفرادی زندگی کو اس کے وسیع تر ماحول کائنات کے ساتھہ ربط نہ دے سکیں تو تعلیم کا کام محض یہہ رہ جاتا ہے کہ وہ بعض ہنر مثلاً لکھنا پڑھنا' اور بعض علوم مثلاً تاریخ و جغرافیہ طلبا کو پڑھا دے - ایسی تعلیم قومی سیرت پر کوئی عمدہ اور مستقل اثر نہیں ڈال سکتی کیونکہ وہ نوجوانوں کو ان قدور سے رو شناس نہیں کرتی جو زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کر کے اس کو بلندی کی طرف لے جاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انگریزی تعلیم سو برس سے زیادہ سے رائج ہے لیکن اس نے قومی سیرت کی تشکیل میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا - بلکہ یہہ کہنا چاہیے کہ اس نے لوگوں کے ذہن میں تعلیم کو محض اقتصادی مفاد اور نفس پروری کے مقاصد کے ساتھہ متعلق کر کے قومی سیرت پر بہت برا اثر ڈالا ہے - گذشتہ زمانے کی تعلیم اب سے کم منظم تھی اور مقابلتاً تھوڑی تعداد لوگوں کی اس سے بہرہ یاب ہوتی تھی - لیکن لوگوں کے دل میں اس کی خاص وقعت تھی جو موجودہ تعلیم کی نہیں - اور یہہ وقعت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اقتصادی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھہ ساتھہ موجودہ تعلیم مذہب' قومی تمدن' قومی ادب اور قومی فلسفہ زندگی کی مستحکم بنیادوں پر قائم نہ ہو اور اپنے لئے انہیں سر چشموں سے ہدایت اخذ کرے -

ایک اور قابلِ قدر عنصر ہندستانی تہذیب میں اس کا جذبۂ خدمت رہا ہے اور وہ مروت اور باہمی رواداری، جو اپنی سب سے زیادہ مضبوط اور عمدہ شکل میں خاندانی زندگی کے اندر ظاہر ہوتی تھی - ایک فقیر جو خود باوجود فاقہ‌کشی اور ضروریاتِ زندگی سے محروم ہونے کے سرِ راہ بیٹھ کر مسافروں کو پانی پلانا اپنا فرض سمجھتا ہے، خاندان کا ایک کمائی کرنے والا فرد جو اپنی محدود کمائی کو صرف اپنے نفس تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اس کو خاندان کے ان تمام افراد کے لیے صرف کرتا ہے جو رشتہ داری یا محض ناداری کی وجہ سے اس کے ساتھ متعلق ہیں، ایک عالم یا مُعلّم جو ریاضت اور نفس کُشی کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن اپنے علم کی روشنی سے طالب علموں کے دیے جلاتا رہتا ہے، یہ سب اُس تہذیب قدیم کی قابلِ احترام یادگاریں ہیں جو اب روز بروز مٹتی جاتی ہیں - منشی پریم چند نے ایسے قابلِ قدر ناول "چوگانِ ہستی" میں جو سیرت سور داس کی دکھائی ہے یا اپنے دوسرے ناول "گوشۂ عافیت" میں پریم شنکر کی دکھائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیب کے بہترین نمونے کس قدر اعلیٰ اخلاقی معیار رکھتے تھے اور اُن میں خدمت نوع کا جذبہ کس قدر سچا اور مضبوط تھا کہ اس کو نہ اپنوں کی احسان ناشناسی دبا سکتی تھی، نہ بیگانوں کی مخالفت، نہ ناکامی اس کو شکست دے سکتی تھی، نہ حکومت کی تمام قوتیں! اور ہندستان کی گذشتہ سو برس کی تاریخ میں بھی جو لوگ خدمت کا ایسا ہی سچا اور مضبوط جذبہ لے کر پیدا ہوئے مثلاً حالی، سر سید وہ تہذیب قدیم کی گود میں پلے تھے اور اس کی روایات کے حامل تھے - موجودہ دور میں اس جذبہ کا پیکر مجسم مہاتما گاندھی کی ذات ہے

لیکن اس میں بھی یہہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ اُنھوں نے تعلیم انگریزی پائی ہے لیکن ان کی سیرت کی تشکیل جن اثرات میں ہوئی وہ تقریباً سب کے سب گذشتہ تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ خود اپنی ہدایت کا سرچشمہ قدیم مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت گیتا ، بائبل اور قرآن شریف کو بتاتے ہیں اور اسی لیے گذشتہ تاریخی روایات سے روشنی تلاش کرتے ہیں - قابل افسوس ہے یہہ امر کہ موجودہ تعلیم کی بدولت یہہ جذبۂ خدمت لوگوں میں آئے دن کم ہوتا چلا جاتا ہے — مقابلہ کے امتحانات ، نوکریوں کے لیے جدّو جہد خاندانی مراسم اور مراعات میں کمی ، خدمت نفس کی فکر ، یہہ سب چیزیں اس اخلاقی کمزوری کے شواہد ہیں جس نے قوم میں سب سے زیادہ خرابیاں پیدا کی ہیں - جب زندگی کا مقصد محض تن پروری اور انفرادی آرام اور آسائش قرار پا جائے تو قوم میں یک جہتی ، سلوک ، رواداری کا پیدا ہونا نا ممکن ہے کیوں کہ پھر کوئی ایسا اصول زندگی باقی نہیں رہتا جو مختلف جماعتوں اور افراد کو ایک مرکز پر لاکر جمع کر دے - ہندوستان میں آج کل چند جماعتیں ایسی ہیں جو خدمت کے نصب العین کو پیش نظر رکھہ کر کام کر رہی ہیں - لیکن ان کی تعداد اور ملک کی آبادی کو دیکھتے ہوئے - بہت ہی تھوڑی ہے - اور دوسرے ان میں بھی اکثر نفسانی اغراض شامل ہو جاتے ہیں جو اصل مقصد کو ضائع کر دیتے ہیں - علاوہ بریں اصل خرابی تو یہہ ہے کہ یہہ جذبہ عام طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کی اخلاقی اور علمی قدروں میں شامل نہیں اور ان کی زندگی پر اثر نہیں ڈالتا - مقابلةً گاؤں کے قابل لوگ آپس میں زیادہ میل جول ، رواداری اور باہمی خدمت گذاری کے ساتھہ زندگی بسر کرتے ہیں - اور تعلیم یافتہ لوگ اپنا تمام وقت ذاتی اغراض کے لیے جد و جہد یا ایک دوسرے سے

جنگ و جدل میں صرف کرتے ہیں ۔ وہ یہہ نہیں جانتے کہ زندگی ایک بہت بڑی امانت اور عطیہ ہے اور ہم اس کی قیمت اسی طرح ادا کر سکتے ہیں کہ اپنی تمام قوتوں کو نئی نوع کی خدمت کے لیے وقف کر دیں ۔ اس خدمت کے لیے یہہ ضروری نہیں کہ انسان لازماً کسی بڑے عہدہ پر ہو یا خاص اثر اور رسوخ رکھتا ہو ۔ خدمت ایک ایسا نصب‌العین ہے جس کو ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر ؟ اپنے اپنے مخصوص حلقۂ اثر میں پورا کر سکتا ہے ۔ گذشتہ زمانے میں تمام قوموں اور ملکوں میں جو مصلح اور پیغمبر ہوئے ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو خدمت قوم کے لیے وقف کر دیا تھا "قوم کا سردار ان کا خادم ہوتا ہے" اور اسی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی بدولت انہوں نے اثر پیدا کیا اور قوم کے اخلاق اور سیرت کو بہتر بنایا ۔ بر خلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر وہ شخص جو روپیہ جمع کر لیتا ہے یا جوڑ توڑ یا خوش قسمتی یا اتفاق سے کسی اونچی جگہ پہونچ جاتا ہے وہ لازماً قابل احترام سمجھا جاتا ہے اور ہر معاملہ میں اس کو گوشہ نشین لیکن سچے خادموں پر ترجیح دی جاتی ہے ۔ یہہ نظریہ جو مغرب کے موجودہ دور مادیت سے ہندستان میں آیا ہے ۔ ہندستان کی اصلی روح کے سراسر منافی ہے ۔ اور ہمیں اس کو قطعاً مسترد کرنے کی ضرورت ہے ۔ کیوں کہ دولت کو خدمت پر مقدم قرار دینے سے ہمارا سارا نظام قدور درہم و برہم ہو رہا ہے اور ہو جائے گا اور انجیل مقدس کے الفاظ میں "کیا فائدہ ہے اس سے کسی انسان کو کہ وہ اپنی روح کھو دیتا ہے اور تمام دنیا کو پائے ۔

ایک اور نہایت بلند اور مقدس اصول جو ہندستان نے اپنے گذشتہ زمانے میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا وہ احترام حیات کا اصول تھا ۔ یعنی جان یا زندگی خدا کا عطیہ ہے اور کسی انسان کو یہہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس عجیب و غریب عطیے کو کسی دوسرے شخص سے

جھین نے کیوں کہ یہہ ایک ایسی چیز ہے جس کو انسانی کوشش حاصل نہیں کر سکتی - اس اصول کا اطلاق نہ صرف انسانوں کی جان تک تھا جو اُصولاً تقریباً تمام متمدن مذاہب میں قابل احترام شمار کی جاتی ہے بلکہ چھوٹے سے چھوٹے حیوان مثلاً مچھر اور ہوا اور پانی کے جراثیم کی زندگی بھی اس اصول کے ماتحت مقدس سمجھی جاتی تھی هندو مذہب اور اس سے زیادہ بدھہ مذہب اور جین مذہب نے اس امر پر زور دیا - یہاں تک کہ بہت سے لوگ ؟ خصوصاً جین مت کے پیرو اب بھی منہہ پر کپڑا باندھے رکھتے ہیں تاکہ جراثیم ہوا کے ساتھہ ان کے منہہ میں جاکر تلف نہ ہو جائیں ! اور وہ موذی جانوروں کو مار نا بھی جائز نہیں رکھتے - یہہ قرین عقل ہے کہ ہم کو اس خیال کی ان انتہائی شکلوں سے اتفاق نہ ہو اور ہم احترام حیات کے اصول میں تو اس قدر غلو نہ کریں - لیکن ان باتوں کے بنیادی اصول پر ہنسنا اور اس کا مضحکہ اُڑانا ایک نہایت اہم اور قابل قدر نصب‌العین کی توہین ہے - اور اس کے اثرات نسل انسانی کے لئے بہت خطرناک ہیں - موجودہ زمانے میں "کشمکش حیات" اور "تنازع‌للبقاء" (Struggle for existence) جیسے الفاظ کی آڑ میں جو ذہنیت اور تصور زندگی پیدا ہو رہا ہے اس کے اندیشہ‌ناک نتائج دنیا ایک حد تک جنگ عظیم میں دیکھہ چکی ہے اور اگر اُن کو روکا نہ گیا تو ابھی اس سے زیادہ ہولناک مستقبل دنیا کے لیے آنے والا ہے - یہہ اصرار کہ ایک دوسرے کی جان اور مال اور حقوق کو تلف کرنا ؟ اور زندگی کو مقابلہ اور جنگ و جدل اور رقابت کے اصول پر چلانا قوانین فطرت میں شامل ہے فطرت اور انسانی طبیعت دونوں کے ساتھہ نا انصافی ہے - ان حیوانات میں بھی جہاں فطرت کے قوانین کی کار فرمائی بغیر کسی روک ٹوک کے جاری ہے اور تعلیم و تمدن نے طبائع پر کوئی فرق نہیں

ڈالا ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ ایک ہی نسل کے جانور ایک دوسرے کو جان سے ماریں اور کھائیں - اور ان میں جہاں ضروریات زندگی کے اُصول کے لیے باہمی کشمکش کا نقشہ نظر آتا ہے وہاں باہمی اشتراک عمل، امداد اور تقسیم کار بھی موجو ہے - اگر دو گدھے ایک مکان میں نہیں سما سکتے تو ہزاروں چیونٹیاں مل جل کر امن و امان سے زندگی بسر کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی نہیں ہوتیں - لیکن انسان کو اپنے لیے شاہراہ عمل اور اصول قائم کرنے کے لیے کم تر حیوانات کی زندگی سے سبق لینے کی ضرورت نہیں - اس میں سیکھنے، سمو و نما پانے، زندگی کو اخلاقی اصول اور قدور کے ماتحت منتظم کرنے کی صلاحیت و ودیعت کی گئی ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی جبلّتوں کے پیچھے لے جانے والے میلانوں کو زیر کرکے بلندی کی طرف پرواز کرتا رہے - اس کے لیے باعث ننگ ہے یہہ بات کہ وہ زندگی کو محض نفسانی اغراض کے حصول کے لیے استعمال کرے اور ان کی طلب میں باہمی مروت، محبت، اشتراک عمل اور حیات انسانی کے احترام کو بھول جائے - مختلف اثرات کے ماتحت ہندستانی کیرکٹر سے یہہ چیزیں کم ہوتی جا رہی ہیں اور خود ہم لوگ وہ سبق بھول گئے ہیں جو ہم نے دوسروں کو پڑھایا تھا اور عجب بات یہہ ہے کہ وہ لوگ جو اب بھی اس اصول کی لفظی اور ظاہری پیروی کرتے ہیں مثلاً مکھیوں اور مچھروں اور بھنگوں کی جان لینے سے احتراز کرتے ہیں اس کے اصل معنی اور روح کو بُھلا بیٹھے ہیں - اور ذرا سے پروپگنڈے یا جذبات کی یورش سے بے قابو ہو کر اپنے ہم وطنوں سے لڑنے لگتے ہیں یہانتک کہ بعض اوقات ان مجنونانہ جنگوں میں جن کو اجتماعی خود کشی کہنا بیجا نہ ہوگا اکثر جانیں تلف ہو جاتی ہیں - ایک لحاظ سے یہہ بات حیرت انگیز نہیں بھی ہے - فطرت انسانی کا تقاضہ ہے کہ وہ اکثر روح مذہب سے غافل

هو کر محض اس کی رسوم اور علامات یعنی اس کے جسد بے جان سے تعلق پیدا کر لیتی ہے لیکن تعلیم کا یہہ فرض ہے کہ وہ اس جسم میں دو بارہ روح پیدا کرے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ پر لائے جہاں ان کا دماغ اور ان کے جذبات اور ان کے بہترین آئیڈیل سب ہم‌آہنگی کے ساتھہ کام کریں - دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لیے اور موجودہ تخریبی ذہنیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ قوموں میں احترام حیات کے احساس اور عقیدہ کو مستحکم کیا جائے تاکہ ہر شخص نہ صرف اپنی زندگی اور اپنے مفاد کو عزیز اور قیمتی جانے بلکہ اور سب کی جانوں اور مفاد کو بھی احترام اور رواداری کی نظر سے دیکھے - ہندستانیوں پر بالخصوص یہہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس اصول کو دوبارہ صحیح معنوں میں مضبوطی کے ساتھہ پکڑ لیں اور خود کو اپنی کوشش سے اور دنیا کو اپنی مثال سے ایک بہت بڑے خطرہ سے نجات دلائیں -

(۷)

اس مضمون میں ہم نے یہہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندستانیوں کی قومی سیرت کی تشکیل میں بہت سے اثرات اور تہذیبوں کا حصہ ہے ہندستانی طبیعت کا یہہ خاصّہ رہا ہے کہ وہ بیرونی اثرات کو قبول کر کے ان کو اپنا بنا لیتی ہے اور اب بھی ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ ہم اس اصول کو ہاتھہ سے نہ دیں - لیکن قبول کرنے کے یہہ معنی نہیں کہ ہم بغیر غور اور فکر کے ، بغیر تنقید اور تبصرہ کے ، بغیر انتخاب کے ان اثرات کو جذب کرلیں - ہمیں اپنی بہترین قدور اور اقدار کو زندہ اور اپنے فلسفہ زندگی کو قائم رکھنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ ہم کو یہہ بھی غور کرنا چاہئے کہ موجودہ زمانہ کی ، جس میں بہت سے لحاظ سے زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں مخصوص ضروریات

کیا ہیں اور ان کو پورا کرنے کے لیے ہمیں قومی سیرت میں کن چیزوں پر خاص طور پر توجہ کرنے اور زور دینے کی ضرورت ہے ـ ماحول کی تبدیلی ؟ جو خود بڑی حد تک انسانی جد و جہد کا نتیجہ ہے ؟ انسانی تعلیم و تربیت میں ترمیم اور تبدیلی چاہتی ہے اور ہمیں اپنی آئندہ نسلوں کو اس نئے ماحول کے لیے تیار کرنا ہے ـ اس تیاری میں عام سماجی اداروں اور تمدنی انتظامات کا بھی دخل ہے جو اپنے غیر محسوس اثر سے لوگوں کے مزاج اور طبیعت کو آہستہ آہستہ بدلتے اور ڈھالتے رہتے ہیں ـ لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ہمارے پاس سب سے زبردست اور موثر ذریعہ تعلیم ہے جو بچپن اور بلوغ کے پُر شوق اور ولولوں اور اُمنگوں سے بھرے ہوئے زمانے میں دی جاتی ہے ـ قومی سیرت اور قومی زندگی کی تشکیل تو اسی طرح ہوسکتی ہے کہ ماہرین تعلیم ایک طرف بچہ کے مخصوص رجحانات اور جبلتوں کو سمجھیں اور دوسری طرف تہذیب و تمدن کے عالی شان نظام کا مطالعہ کریں اور ان میں مدرسہ کے ماحول اور مشاغل کے ذریعہ اس قسم کا نتیجہ خیز تعلق پیدا کریں کہ بچہ تعلیم کی منزل سے گذرنے کے بعد تمدنی زندگی میں مکمل طریقہ سے حصہ لے سکے ـ اگر زندگی کے جدید مسائل اس بات کو چاہتے ہیں کہ ہم مغرب سے سائنس کو لیں تو ہمیں اس سے باک نہیں ہونا چاہئے ـ اگر دنیا میں ترقی کرنے کے لیے بچوں میں جدت ؟ اجتہاد اور عملیت پیدا کرنے کی اور قسمت پرستی اور قناعت کے اصولوں میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے تو تعلیم کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہیے ـ اگر دنیا کو باہمی جنگ و جدال اور رقابت کے خطرناک نتائج سے بچانے کے لیے ہمیں احترام حیات اور خدمت کے قدیم اور دائمی اصولوں کے ساتھ از سر نو رشتہ جوڑنے کی ضرورت ہے تو ہمیں ماضی کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور تعلیمی نظم و نسق کے ذریعہ

اس نصب العین کو عملی جامہ پہنانا چاہیے - کہیں تعلیم کا کام زمانہ کے رجحانات کو امداد دینے کا ہے اور کہیں اس کا فرض ہے کہ ان رجحانات سے دنیا کو محفوظ اور مامون کرے کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے انسان بجائے ارتقاء کی قوتوں کا تابع ہوجانے کے ان کو اپنے ارادہ اور عمل کے راستے پر چلا سکتا ہے -

موجودہ زمانہ نے انسان کے سامنے جو مسائل اور ماحول پیدا کر دیے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم کو کس قسم کی سیرت اور ذہنیت تیار کرنے کی ضرورت ہے ؟ اس سوال کا جواب ضمناً بیان بالا میں آچکا ہے - یہاں ہم مختصر اور صاف الفاظ میں ان نتائج کو پیش کرتے ہیں جو اس بیان سے نکلتے ہیں اور جن پر ماہرین تعلیم کو دیر یا سویر غور کرنا پڑے گا اگر وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم اور حیات قومی میں کوئی ربط ہو اور اس کے معنی محض نوشت و خواند یا واقفیت حاصل کرنے تک محدود نہ سمجھے جائیں -

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سائنس نے دنیا میں نہایت زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے - اور یہ انقلاب نہ صرف مادی دنیا تک محدود ہے بلکہ ہماری علمی اور اخلاقی زندگی پر بھی اس کا بہت گہرا اثر پڑا ہے - ہمارے بہت سے پرانے طریقے اور خیالات جو کم علمی پر مبنی تھے بالکل باطل ثابت ہو چکے ہیں اور علمی تحقیق و تفتیش جو برابر جاری ہے آئے دن نئے اور بعض مرتبہ انقلابی حقائق کا انکشاف کرتی جاتی ہے جن کی طرف سے منہہ موڑ لینا یا غفلت برتنا نہ صرف ذہنی خودکشی ہے بلکہ قومی ترقی کے لیے نہایت زبردست رکاوٹ ہے - اس لیے سائنس کی ترقی میں حصہ لینا ہمارا قومی فرض ہے اور ہماری تعلیم اس کو نظر انداز نہیں کرسکتی - لیکن سائنس جو صحیح معنوں میں انکشاف حقائق کا نام ہے ایک خاص ذہنیت کی طالب ہے - تعصب ؟

جمود ، تو ہم پرستی کا اور سائنس کا ساتھ نہیں ہو سکتا - اس کے لیے ایسے دل و دماغ کی ضرورت ہے جو صداقت اور محض صداقت کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور مصلحت ، رر درستی ، پرانے لیکن غلط خیالات ، قدیم تعصبات کو صداقت کی خاطر ترک کرنے کے لیے تیار ہو - جو کسی شخص کو اس لیے قابل دار نہ سمجھے کہ وہ کہتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے حالانکہ تمام دنیا کا یہ عقیدہ ہے کہ سورج دنیا کے گرد گھومتا ہے - جو کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ نئے حقائق کا استقبال کرے اور اپنی غلطیوں کا ایمانداری سے اعتراف کرے اور ان کو اتار پھینکنے کے لیے تیار ہو خواہ وہ مصاحبت کی وجہ سے کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو گئی ہوں - یہ ذہنیت دنیا کے کسی ملک میں بھی عام نہیں - متمدن امریکہ میں انتہائی ذہنی تعصب اور سچ کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کی مثالیں حال ہی میں فاش ہو چکی ہیں ہمارے ملک میں اس قسم کی ذہنیت خاص طور پر مفقود ہے - ہم اپنی معاشرتی اور علمی زندگی دونوں میں پرانے بتوں کو پوجتے ہیں عام اس سے کہ ہمیں ان سے کوئی فیض پہنچتا ہے یا نہیں - اور جب کوئی صاحب نظر شخص کے قائم شدہ رواج یا ادارہ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو تمام قوتیں جو رسم و رواج کی پابندی کے ساتھ وابستہ ہیں اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہیں لہذا سائنس کی تعلیم دینے سے مقصد صرف یہی نہیں کہ لوگ طبیعیات اور کیمیا اور علم نباتات اور علم حیوانات وغیرہ پڑھ لیں بلکہ اس سے زیادہ اہم اور قومی تعمیر کے لیے زیادہ فوری ضرورت یہ ہے کہ لوگوں میں یہ سائنٹفک نقطہ نظر پیدا کیا جائے - اس کوشش میں کامیابی کا اثر محض ہماری علمی زندگی تک محدود نہ ہوگا بلکہ اس کا ردّ عمل ہماری معاشرتی اور تمدنی زندگی ، ہمارے سیاسی مسائل پر بھی نمایاں ہوگا -

ہم بیان کرچکے ہیں کہ سائنس نے انسان کے قبضہ قدرت میں بے انتہا قوت دیدی ہے جس کے جائز استعمال کے لیے بےحد ضبط نفس اور احساس ذمہ داری کی ضرورت ہے - سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان میں ابھی تک یہ احساس پوری طرح پیدا نہیں ہوا اس وجہ سے وہ بسا اوقات قدرت کی ان مہیب قوتوں کے ساتھ اس طرح کھیلتا ہے جس طرح کوئی نادان بچہ کسی خطرناک ہتیار کے ساتھہ جس کے خطرہ کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھتا - اس کی مادی اور اخلاقی نشوونما میں توازن اور ہم آہنگی نہیں - اس صورت حال سے جو خوفناک نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ تمام دنیا کو معلوم ہیں اور خود مغرب کے صاحبان فکر جانتے ہیں کہ ان سے کہیں مہلک نتائج آئندہ چل کر پیدا ہوسکتے ہیں اگر سائنس کی دریافت کی ہوئی طاقتوں کو انسانی بہبود کے بجائے باہمی ہلاکت اور تخریب کے لیے استعمال کیا گیا - اس لیے تعلیم پر یہ ذمہ‌داری عاید ہوتی ہے کہ وہ صلح پسندی اور امن جوئی کی خواہش قوموں میں پیدا کرے - ان کو مادی علمی اشتراک عمل کے فوائد اور باہمی مخالفتوں اور رقابتوں کے نتائج سے آگاہ کرے اور ان اخلاقی اور روحانی اُصولوں کی سلطنت کو مستحکم کرے جو متمدن مذاہب کی بنیاد ہیں؟ جو سائنس کی غیر محدود تخریبی قوت کو روکنے اور قابو میں لانے کا تنہا ذریعہ ہیں - یہ موقع نہیں کہ میں بتاؤں کہ اس اعلیٰ اور مشکل مقصد کے حصول میں معمولی ابتدائی ثانوی مدارس کس طرح مدد دے سکتے ہیں لیکن ماہرین نفسیات اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ جو طبیعت اور جذبات بچپن کے زمانے میں مدرسہ اور گھر کے روز مرہ مشاغل سے پیدا ہوتے ہیں ان کا مجموعی اثر آئندہ عمر میں بہت دور تک پہنچتا ہے -

سائنس نے صنعت و حرفت اقتصادی نظام اور پیشوں اور کام کی نوعیت میں جو انقلاب پیدا کیا ہے ان کی وجہ سے بھی قومی سیرت کی تشکیل اور تعلیم کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے - مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں بہت زیادہ ، اور ہندستان میں مقابلتاً کم ، کام کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی ہے - دستکاری کے بجائے مشین کے کارخانے ، چھوٹے چھوٹے دستکاروں کی برادری کے بجائے بڑے پیمانے پر خرید فروخت ، اشیا کی تجارتی اور پیداوار ، شہروں میں مزدوروں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کا اجتماع ، تخلیقی کام کے بجائے محض مشین کے پرزوں کی طرح گھنٹوں ایک مقررہ حرکت کا انجام دینا ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہاتھ سے کام کرنے والوں کے لئے ایسے کام میں کوئی دل‌چسپی یا تعلیمی مواقع یا جذب کے اظہار کا امکان نہیں رہا اور ان کی حیثیت مکمل انسانوں کے بجائے محض مشین کے پرزوں کی سی ہوگئی - اب تعلیم پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کمی کی تلافی کرے اور ان میں زندگی سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کرے - ان کو ان کے کام کی وسیع تر معاشرتی اور قومی اہمیت سے واقف کرنا ، محنت کی عظمت اور اعزاز سمجھنا ، اقتصادی نظام میں ان کی حیثیت سے ان کو آگاہ کرنا تعلیم کا کام ہے - اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس طرح تربیت کرنی چاہیے کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں تہذیبی مشاغل اور دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ہو سکیں - ان کی زندگی کولھو کے بیل جیسی نہ ہو جس کو نہ کچھ دکھائی دیتا ہے ، نہ سمجھ میں آتا ہے ، جو ہر وقت ایک چکر میں گھومتا رہتا ہے اور فرصت کے وقت کو محض گھاس اور چارہ کھانے میں گذارتا ہے - تہذیب جدید کا ایک نہایت نقصان اور مضر اثر یہ ہوا ہے کہ اس نے لوگوں کے کام کو اس قدر روح فرسا حد تک "میکانیکی"

بنا دینا ہے کہ آٹھ یا دس گھنٹے تک اس میں مصروف رہنے کے بعد
ان میں اعلیٰ قسم کی انسانی دلچسپیوں، آرٹ، فطرت، تہذیب،
معاشرت" کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی -
وہ اپنی فرصت کے وقت نہایت ادنیٰ درجے کی دلچسپیوں میں گذارتے
ہیں جو کسی طرح سیرت اور مذاق کو بہتر نہیں بنا سکتیں - معاشرت
اور صنعت و حرفت کے مفکرین کا یہ فرض ہے کہ وہ جہاں تک ممکن
ہو کام کی نوعیت میں تبدیلی کریں تا کہ اس میں کام کرنے والوں کو اپنی
شخصیت اور اپنی ذہنی اور جذباتی دلچسپیوں کی تربیت کا موقع
ملے - اور تعلیم کی یہہ ذمہ داری ہے کہ وہ طلبا کو ایسے
شوقوں اور مشاغل سے روشناس کرے جو آئندہ زندگی میں ان
کی فرصت کے رفیق اور اظہار خودی کا ذریعہ ثابت ہوں - لیکن یہہ
ظاہر ہے کہ دنیا کے کام کا ایک کافی حصہ ایسا غیر دل‌چسپ اور
" میکانیکی " ضرور رہے گا اس میں معلم یا مصوّر یا کسی حاذق‌دست
کاریگر کے کام کی طرح اظہار خودی اور شخصیت کی تربیت ممکن نہ
ہوگی اس لیے انسانی روح کی عظمت اور احترام کا تقاضہ ہے کہ مدرسے
ہر فرد میں تخیل کی نشوو نما کریں اور تعلق کے جذبہ کو فروغ دیں
اور فرصت کے مشاغل کے ذریعہ جہاں تک ممکن ہو؛ شخصیت اور
سیرت کی تشکیل کریں - " ہم اُس دن کا خواب دیکھتے ہیں جب
ہم ان کے جسم اور دماغ اور روح کی اس طرح تربیت کریں گے کہ ہم اُن کو
اطمینان خاطر اور بے خوفی کے ساتھ دنیا کی کشمکش میں حصہ
لینے کے لیے جاتا دیکھیں گے اور ہر نو عمر کام کرنے والے میں انفرادی
قوت کا ایک ایسا پوشیدہ چشمہ ہوگا جس کو نہ صنعت و حرفت کا
مشینی نظام خشک کر سکے گا نہ زندگی کی نا انصافیاں خراب
کر سکیں گی - خواہ اس کا کام محض یہہ ہو کہ وہ زمین میں ہل

چلائے لیکن اس کا دماغ دنیا کے دور دراز حدود تک پہنچے گا - خواہ مادر گیتی کو کھودے اور اُس کا سینہ چیرے میں اپنی عمر صرف کرے لیکن اس کے تخیل کی رسائی ستاروں تک ہوگی - مشینوں کا شور اور تجارت کی منڈیوں کی چیخ پکار اس کے کانوں کو موسیقی کی شیریں اور خوبصورت الفاظ کے ترنم کی طرف سے بہرا نہ کر سکےگی اگر ہم ان چیزوں کو اس کی زندگی کا "بابا بابا بغادس" - یہہ اندرونی قوت جو انسان کو بجائے خود ایک عالم خیال بناتی ہے اور اس کو ایک حد تک شخصیت کو مغلوب کرنے والے اثرات سے محفوظ اور سوسائٹی کے غلبے سے بے نیاز کردیتی ہے - تہذیب نفس اور تربیت کامل کے لیے لازم ہے اور اس دور میں جب کہ چار طرف مشینوں' بڑے پیمانے پر کاروبار ' ادنی اور سستی قسم کے اسباب تفریح اور جمہوریت کے ہموار کرنے والے اثرات کا زور ہے اس قوت کی خاص طور پر ضرورت ہے - کوئی فلسفہ تعلیم جو قومی سیرت کی تشکیل کو ضروری سمجھتا ہے اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا -

موجودہ دور کا تیسرا رجحان جو ہندستان میں بہت واضح طور سے ظاہر ہو رہا ہے جمہوریت ہے - یہاں موقع نہیں کہ میں اس کے ارتقاء یا اس کے فوائد اور کمزوریوں سے بحث کروں - ہمارے لیے اس وقت صرف یہہ غور کرنا کافی ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں یہہ فلسفہ سیاست اپنا سکہ جما چکا ہے اور اگرچہ آج کل بعض ملکوں مثلاً اٹلی اور روس میں مختلف وجہ سے اس کی مخصوص شکل مسترد کر دی گئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس خیال اور طریقہ نظم کا نشو و نما جاری ہے اور مشرق کے اکثر ملکوں مثلاً چین ' ترکی ' ہندستان وغیرہ میں یا تو جمہوریت قائم ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے - بہر حال خواہ دوسرے ملکوں کی سیاسی تاریخ کوئی صورت اختیار

کرے اس امر سے کسي شخص کو انکار نہ هوگا کہ هندستان کا سیاسي مستقبل جمهوري نظام حکومت کے ساتهہ وابستہ هے - ممکن هے کہ بعض صاحبان فکر اپنے نقطہ نظر سے اس نظام حکومت کو ملک کے لیے بہترین نظام تصور نہ کریں لیکن عملی سیاست دانوں کا اس امر پر اتفاق هے کہ اور کوئی طریقہ نہ قابل عمل معلوم هوتا هے نہ لائق ترجیح - اس لیے موجودہ زمانہ میں جو تعلیم رائج کی جائے اس کے لیے ضروري هے کہ وہ نئي نسل کو ان فرائض اور ذمہ داریوں کے لیے تیار کرے جو بحیثیت جمهوری شہریوں کے اس پر عائد هونے والي هیں - اس لحاظ سے تعلیم کا سیاسي نظام سے بہت گہرا تعلق هے - جو خوبیاں اور قومی سیرت کے خصائص ایک مطلق العنان بادشاہ کی حکومت میں مفید هوں گے وہ ایک خود مختار جمهوری حکومت میں مفید نہیں هو سکتے - وهاں سب سے بڑي خوبی یہہ سمجهی جائےگی کہ هر باشندہ حکام بالا کے سامنے هر معاملہ میں سر تسلیم خم کر دے ؟ سیاسي اور ملکي معاملات میں اپني شخصیت کو بالکل حکومت کے ماتحت بنا دے اور مشین کے پرزے کی طرح دوسرے پرزوں کے ساتهہ مل کر کام کرے تاکہ مشین چلانے والوں کے جو مقاصد هوں وہ کامیابی کے ساتهہ پورے هو جائیں - بر خلاف اس کے ایک آزاد جمهوري شہري میں دوسری قسم کی صفات درکار هوں گي - اس میں غور و فکر کي صلاحیت هوني چاهیے ؟ ملکی معاملات کو سمجهہ کر ان پر رائے دینے اور اس رائے کی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے آمادگی هوني چاهیے - جدت اور اجتہاد عمل اور اُپج هوني چاهیے تا کہ وہ خود سوچ کر ایسی تدابیر نکالے اور دوسروں کے سامنے پیش کرے جو اجتماعی ترقی میں معین هوں - مختصر یہہ کہ جمهوریت کے لیے فعالیت کی ضرورت هے ؟ مجہولیت کي نہیں - هندستانی سیرت میں ان خصائص کا پیدا

کرنا لازمی ہے - اس میں غلط قسم کی قناعت ؟ غلط قسم کی تقدیر]
پرستی ؟ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی عادت ؟ حوصلہ اور
ہمت کی کمی جو پیدا ہو گئی ہے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے -
جمہوری ذمہ داری کا احساس ایک طرف تو ذہنی بیداری چاہتا ہے
اور دوسری طرف عملی قوت کا طالب ہے اور تیسری طرف جذبات کی
ایسی تربیت کہ ہر شخص اپنے مفاد کو عام ملکی مفاد کا جز و سمجھے ؟
ان کا رقیب نہ خیال کرے - اور ہر تدبیر اور کام کے متعلق یہ سوچے
کہ علاوہ میری ذات کے ؟ دوسرے لوگوں کی زندگی اور حقوق پر اس سے
کیا اثر پڑے گا - ہندستانی سیرت ان تینوں پہلوؤں سے توجہ کے قابل
ہے- تعلیم کی کمی کی وجہ سے لوگوں میں عام طور پر اتنی ذہنی بیداری
نہیں ہے کہ وہ ان مسائل کو سمجھ سکیں جو ملک کو در پیش ہیں
گذشتہ دس سال میں سیاسی تحریکوں نے بڑی حد تک عوام‌الناس
کو بیدار کیا ہے لیکن ابھی وہ منزل مقصود بہت دور ہے جب ہر بالغ
آدمی معاملات کے عام پہلوؤں کو سمجھ کر ان کے متعلق رائے دے
سکے‌گا - جذباتی رخ اس سے بھی زیادہ توجہ کا محتاج ہے - وہ
انسانیت "جو سیدن ار سپ ہمسائگاں" کے ہم معنی ہے ہم میں سے
بحیثیت قوم کے بہت کم ہو گئی ہے - اور ہم اکثر بجائے قومی مفاد
کے اپنے ذاتی یا جماعتی مفاد کو مستقل ہدایت بنا لیتے ہیں اور یہی
وجہ ہے کہ ہندستانیوں میں باہمی اختلافات چھوٹی باتوں میں
پیدا ہو جاتے ہیں اور قوم کی قوتیں اکثر بڑے بڑے تعمیری کاموں میں
صرف ہونے کے بجائے ان اختلافات کی نذر ہو جاتی ہیں - لیکن
شاید سب سے زیادہ کمی ہمارے قومی سیرت میں قوت عمل کی ہے -
ہم نے یہ بھلا دیا ہے کہ انسانی کوشش اور محنت کس قدر زبردست
جوہر ہے اور وہ اس دنیائے آب و گل میں کیسے عظیم‌الشان انقلاب

پیدا کر دیتی ہے - ہم میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تقدیر کو غلط معنی پہنا کر اپنی سستی اور غفلت کو ایک گمراہ کن فلسفہ کی آڑ میں چھپاتے ہیں - قوم میں حوصلہ، ہمت، اپچ، بڑے بڑے کاموں کو کرنے کا جوش اور ولولہ پیدا کرنا چاہیے تا کہ ہمارے اوپر مثلاً بدنامی کا یہہ ٹیکہ نہ رہے کہ کوہ ہمالیہ پر چڑھنے کے لیے بھی غیر ملکی بہادروں کی ضرورت پڑی - خود ہمارے سیّاحوں میں اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ اپنے ملک میں پوری طرح سیّاحت کرے اور جان جوکھوں میں ڈال کر علم کی خدمت کرے - ہمارے ہاں علمی قابلیت یا تکلیفیں سہنے کی قوت کی کمی نہیں - صرف حوصلے اور ہمتیں افسردہ اور پست ہیں - اور جب تک ان میں زندگی اور حرارت پیدا نہیں ہوگی جمہوری حکومت پوری کامیابی کے ساتھہ نہیں مل سکتی ہندستانیوں کو ایک ایسی قوم کی ضرورت ہے جس میں ہر شخص کی استعدادیت کی پوری طرح نشو و نما کی گئی ہو اور وہ خندہ پیشانی اور بے خوفی کے ساتھہ ان تمام ذمہ داریوں کا بوجھہ اپنے شانوں پر اٹھانے کے لیے تیار ہو جو اس کے حصہ میں آئیں - جو اپنے خیالات کو خلوص اور قوت کے ساتھہ دوسروں کے سامنے پیش کر دے اور اپنے عقائد اور اصولوں کے لیے قربانی کرنے کو تیار ہو - جس میں اپنی روح اور اپنی شخصیت کی عظمت کا احترام ہو لیکن اس کے ساتھہ ساتھہ دوسروں کی روح اور شخصیت کا احترام بھی ہو اور اس بنیاد پر وہ ان کے ساتھہ مل جل کر کام کرنے یا ان کے دکھہ درد اور خوشیوں کو بٹانے کے لیے تیار ہو - یہہ نصب العین الفاظ میں نہایت مشکل اور شاید نا ممکن الحصول معلوم ہوتا ہے لیکن نصب العین کو ہمیشہ اتنا بلند ہونا چاہیے کہ اس کی طرف اٹھنا ممکن ہو اس تک پہنچ جانا ممکن نہ ہو - اور تعلیم اگر قوم کے ہر فرد میں یہہ صفات پیدا

نہیں کر سکتی تو اتنا ضرور کر سکتی ہے کہ بحیثیت مجموعی یہہ رجحانات قوم میں پیدا ہو جائیں اور اس کی سیرت میں نسبتاً معاملات پر جرأت اور ایمانداری کے ساتھہ غور اور اظہار خیال کرنے کی، ذاتی اغراض کو بلند تر قومی اغراض میں جذب کرنے کی، اور ہمت اور دلیری کے ساتھہ اپنے پُر خلوص عقائد پر عمل کرنے کی زیادہ صلاحیت نمایاں ہو جاۓ ۔ ایسی سیرت کا خوبی اور وضاحت کے ساتھہ نقشہ کھینچنے کے لیے میں ڈاکٹر جیمس وارڈ کی چند سطریں نقل کرتا ہوں جنہوں نے تھوڑے سے الفاظ میں آزاد جمہوریت کے ایک مکمل شہری کی صفات بیان کر دی ہیں —

"کوئی مرد یا عورت جس کا دماغ تعصبات سے پاک ہو، جس کا فیصلہ آزادانہ ہو، جس میں اخلاقی جرأت ہو، جس کو دلائل کے ذریعہ قائل کرنے کی ضرورت ہو لیکن خوشامد اس پر کوئی اثر نہ کر سکے، جو عقل کے سامنے سر تسلیم خم کرے، دنیوی وجاہت کے سامنے نہ جھکے، جس کو محض یہہ کاوش ہے کہ وہ سچائی اور حق پر رہے اور یہہ فکر نہ ہو کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے، جو خود اپنی ذات سے سچا اور پُر خلوص ہو اور اِس لیے کسی کے ساتھہ بھی دھوکہ یا جھوٹ کا برتاؤ نہ کرے، ایسے ایک مرد یا عورت کی قدر کا اندازہ لگانا نا ممکن ہے ۔ اگر ایسے افراد کی کوئی قوم ہو تو وہ تمام دنیا کو نئی زندگی بخش سکتی ہے" ۔

ایک مکمل تعلیم یافتہ انسان کی اگر ہم تعریف کرنا چاہیں تو مندرجۂ بالا عبارت تقریباً اِس مقصد کو پورا کرتی ہے ۔ اور ہمیں جس آئیڈیل کو سامنے رکھہ کر ہندوستان کی قومی سیرت کی تشکیل کرنی چاہیے اس کو تقریباً واضح کر دیتی ہے ۔ تقریباً، لیکن پوری طرح نہیں ! اِس لیے کہ اس تعریف میں انسان کے انفرادی پہلو پر زور دیا گیا ہے اور بحیثیت ایک

آزاد اور بے پہار روح رکھنے والے کے اِس میں جو صفات ہونی چاھئیں اُن کو پیش کیا گیا ھے - لیکن اِس کے معاشرتی تعلقات اور فرائض کی پوری اھمیت کو بیان نہیں کیا گیا اِس میں شک نہیں کہ ھندستان جیسے ملک میں، جہاں صدیوں کی رسوم اور قدیم اداروں کی جکڑبند نے شخصیت کو مقید کر رکھا ھے اور لوگ ایک دوسرے کی نقل بن کر رہ گئے ھیں، انسانی سیرت کے اس رخ کو نمایاں کرنے کی کافی ضرورت ھے - لیکن ھم یہہ نہیں چاھتے کہ گزشتہ صدی کی تاریخ یورپ کا اعادہ کریں اور انفرادیت کے رجحان پر کسی قسم کی روک توک نہ کریں یہاں تک کہ وہ نفسی نفسی کی کیفیت قوم پر طاری کردے اور لوگوں کو اپنے سیلاب میں بہا کر لیجاۓ - ھماری قومی سیرت میں اِس وقت خاص طور پر دوش بدوش کام کرنے کی اتفاق کی قوت سے مشکلات کو رفع کرنے کی، اتحاد عمل اور یک جہتی کی کمی ھے اور اِس عنصر کو اھمیت دینے کے لیے ھمیں خدمت اور احترام حیات کے قدیم اصولوں کو دوبارہ مضبوطی کے ساتھہ پکڑنا چاھیے تاکہ ایک طرف تو ھم میں امن پرستی کی ذھنیت پیدا ھو جو صرف دوسری قوموں سے جنگ نہ کرنے ھی کا نام نہیں (کیوں کہ وہ تو محض ایک نفی عمل ھے) بلکہ اِس سے یہ مراد ھے کہ ھم اپنی تمام قوتوں کو اسی جوش اور تنظیم کے ساتھہ امن کی فتوحات حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں جس طرح اِن کو جنگ کے مہلک اور تباہ کن مقصد کے لیے استعمال کرتے ھیں - دوسرے ھم یہ محسوس کریں کہ کوئی زندگی اپنے پورے کمال اور خود یابی کو نہیں پہونچ سکتی جب تک اِس کا مقصد محض اپنی ذات تک محدود ھو اور وہ خودی کے محدود تصور سے گزر کر دوسروں کو بھی اِس میں شامل نہ کرے - گزشتہ سو سال میں جو تعلیم یافتہ طبقہ ھندستان میں پیدا ھوا ھے اس کے متعلق یہ شکایت ھے اور بجا شکایت ھے کہ اس نے خدمت کے نصب العین کی صحیح اھمیت کو نہیں سمجھا

ع

اور اپنے ملک کے کم نصیب لوگوں تک اِس روشنی کو پہونچانے کی کوشش
نہیں کی جو تعلیم کے ذریعہ اِن کو حاصل ہوئی تھی نہ وہ اُن کے دکھ درد ،
اُن کے روز مرہ کے مسائل اور مشکلات ہی میں شریک ہوئے نہ انہوں نے
اُن کی اقتصادی اور معاشرتی حالت کو درست کرنے کی کوشش کی
لوگوں نے فرداً فرداً کہیں کہیں اِس قسم کی کوشش ضرور کی اور
گزشتہ بیس سال میں تعلیم یافتہ طبقہ نے مقابلتاً ملک کی عام حالت
کی طرف زیادہ توجہ بھی کی - لیکن انفرادی کوشش اِس امر کا بدل
نہیں ہو سکتی کہ تعلیم نے اِس اعلیٰ نصب‌العین کو قومی سیرت کا
جزو نہیں بنایا - موجودہ تہذیب کو خواہ وہ ہندستان کی ہو یا
انگلستان کی ، چین کی یا امریکہ کی ، زندگی کی اعلیٰ ترین قدور پر
ایمان نہیں رہا - اِس لئے اِس کے پاس ایسے محرکات موجود نہیں جو
جذبات کو اُبھاریں اور قوت عمل کو جوش میں لائیں - جو انسانی
زندگی کی غیر محدود اہمیت اور قیمت اور انسانی روح کے بہترین
امکانات کا احساس ہر فرد میں پیدا کر سکیں - اِس زمانہ کا سب سے
بڑا مطالبہ یہی ہے کہ لوگوں کی سیرت اِس طرح تشکیل کی جائے
کہ اُن کا ایمان تازہ ہو اور وہ سمجھیں کہ اُن کے ہر کام اور ہر خیال کی ایک
غیر فانی زندگی ہے جس کا اثر اُن کے بعد قائم رہےگا ، کہ اِنسان کی زندگی
نہ ایک سراب ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی ، نہ ایک غول
بیابانی ہے جو اندھیرے میں چمکتا ہے اور چمک کر غائب ہو جاتا ہے
نہیں اِنسان دنیا میں خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے تا کہ وہ خود
کو اخلاقِ الٰہی کے ساتھ متصف کرے اور اپنے تمام امکانات کو نشو و نما
دے کر اُن کو آزادی کے ساتھ مشیت الٰہی یعنی تکمیل اعلیٰ ترین
روحانی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرے - اور یہ یاد رکھے کہ
اگر نیک نیتی کے ساتھ اور اصولِ معاشرت اور اصولِ اخلاق کو مد نظر

رکھہ کر وہ سائنس کی مدد سے فطرت کی تسخیر اور حصول ذرائع کے لیے کوشش کرے گا تو یہہ تمام "دنیوی" جد و جہد بھی انہیں "روحانی" مقاصد کے حصول میں مدد دے گی - اور اگر وہ زندگی اور مذہب کا باہمی رشتہ منقطع کر کے دنیا کی جد و جہد اور معاملات سے منہہ موڑ کر محض تارک الدنیا اور راہب بن جائے گا اور عبادات میں اپنی زندگی بسر کرے گا تو اُس کو نہ صرف دنیا ہی حاصل نہ ہوگی بلکہ وہ اپنے پیش نظر مقصد میں بھی کامیاب نہ ہوگا - زندگی اپنی گوناگوں مشکلات اور امکانات کامیابیوں اور ناکامیوں بلندیوں اور پستیوں روحانیت اور حیوانیت کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہم میں سے ہر ایک سے سوال کرتی ہے : کیا تم مجھے لینے کے لیے مجھے قبول کرنے کے لیے تیار ہو ؟ جو لوگ اِس چیلنج سے خوف زدہ ہوکر اپنا منہہ پھیر لیتے ہیں وہ شکست خوردہ ہیں اور مستقبل کی تشکیل میں حصہ نہیں لے سکتے - جو لوگ اِس چیلنج کو مردانہ وار قبول کرتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ اپنی تہذیب و تمدن اپنے اخلاق و مذہب کے بہترین اصولوں کی روشنی میں اِس زندگی کو بہتر اور خوب تر بنائیں تا کہ وہ امکانات جو اِس میں پوشیدہ ہیں روز بروز ظاہر ہوتے چلے جائیں اور مشیت اِلٰہی پوری ہو -

مشو نومید زیں مشت غبارے   نرنساں جلوۂ نا پائیدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را   تمامش می کند در روزگارے!

اداریہ

اکیڈیمی

پانچویں صدی قبل مسیح، یونان کی تاریخ میں انتہائی اقتدار اور عظمت کا زمانہ ہے - جب کہ شہر ایتھنز کی ریاست جمہور کے ہاتھوں میں ہے، ہر شہری بلا لحاظ دولت و پیشہ، حکومت کے اداروں کا ذمہ دار رکن بننے کی حیثیت رکھتا ہے - ایک روز اگر وہ رسّا بنانے میں مشغول ہے، تو دوسرے روز فوج کا اعلیٰ کماندار منتخب ہو سکتا ہے، آج مشعلچی ہے، تو کل کسی جہازی بیڑے کا امیرالبحر - ہر شہری کو اپنے شہر کی عزت اور حرمت کا احساس اور ہر مرد اور عورت کا دل اس کی خدمت کے ولولے سے سرشار ہے - ایتھنز کی حکومت ایک بڑی سلطنت میں پھیلی ہوئی ہے، ایشیائے کوچک اور بحر اسود کے سواحل پر، بحیرۂ روم میں پھیلے ہوئے جزیروں اور بندرگاہوں میں ایتھنز کے عمّال انتظام حکومت کر رہے ہیں اور ماتحت ریاستوں سے خراج وصول کرتے ہیں -

ایتھنز دولت، علم و ادب اور فنون کا مرکز بنا ہوا ہے، شہر عالیشان عمارتوں اور خوبصورت بتوں سے سجا ہوا ہے اور مصوّروں، مورّخوں، شاعروں اور ڈرامانویسوں کے کارناموں کے باعث دنیا سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے - عین اسی زمانۂ عروج میں اپنے رقیب سپارٹا سے اس کی لڑائی چھڑ جاتی ہے - اور جنگ میں اپنے سرداروں کی بےعنوانیوں اور دشمنوں کی کثرت کے باعث ایسا پسپا ہوتا ہے کہ اس کی وسیع سلطنت چشم زدن میں سپارٹا کے قبضے میں چلی جاتی ہے، زوال اس قدر تیزی کے ساتھ آتا ہے کہ طاقت اور حکومت تھوڑے ہی دنوں میں افسانہ

ہو جاتی ہے اور سپارٹا سے شکست کھانے کے نصف ہی صدی کے اندر ایتھنز آزادی تک سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے -

ایتھنز کی تاریخ میں اس زوال کی ابتدا سے ایک دوسرا مگر پہلے سے بھی زیادہ شاندار دور شروع ہوتا ہے - اب تک ایتھنز کا انسانوں کے جسموں پر تسلّط تھا؟ اب اُن کی ذہنیتوں پر اس کی حکومت و فرمانروائی ہے - پہلی حکومت عارضی اور چند روزہ تھی دوسری دائمی اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہوتی ہے -

ایتھنز سے چار میل کے فاصلے پر قیفیسوس ندی بہتی ہے اُس کے کنارے اکادیموس کا باغ تھا - ایتھنز کے انحطاط کے زمانہ میں شہر کے ہنگاموں سے بچنے کے لیے افلاطون اس باغ میں پناہ لیتا ہے ؟ اور اپنی طولانی عمر کے پچاس سال اپنے رفیقوں اور شاگردوں کے ساتھہ حقیقت کی تفتیش میں گذار دیتا ہے - یہیں وہ مکالمے تیار ہوئے ہیں جن میں انسان کی روح اور ذہن ؟ عالم کی اِبتداء و اِمکان کے متعلق دین و دنیا کے تمام مسئلوں پر ایسی سنجیدہ اور پُر مغز بحثیں ؟ ہیں کہ آج تک دنیا اُن کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے - یہی وہ علمی صُحبت تھی جس کے فیض سے ارسطو کا دماغ منور ہوتا ہے اور آئندہ وہ " اُستاد زماں " کا لقب حاصل کرتا ہے یہی وہ پہلی اکیڈیمی ہے جس کا تتبع دو ہزار برس سے یورپ کا ہر ملک اور دنیا کی ہر قوم آج تک برابر کر رہی ہے افلاطون نے اُس کی بنیاد کچھہ ایسے طور پر رکھی کہ نو برس تک یہہ اکیڈیمی قائم رہی اور کم سے کم سِرو کے وقت تک اس کے زاویۂ نگاہ میں اور اس کے فلسفہ کے بنیادی اصولوں میں ایک خاص شان نظر آتی رہی -

یونان کے شہروں پر جب روم کا قبضہ ہوا تو یونانی فیلسوف اور ادیب اٹلی پہونچے اور اہل روما ان کے شاگرد ہوئے - یونانیوں نے اپنے فاتحوں کو مفتوح کیا - اور یونانی تہذیب کا تسلط سلطنت روما کے وسیلہ سے مغربی

دنیا پر بحر اوقیانوس سے دجلہ و فرات تک قائم ہوگیا آخر اس سلطنت کا آفتاب بھی ڈھلا اور یورپ کی تہذیب چھٹی صدی عیسوی میں طوائف الملوکی ہلاکت اور جہل کی تاریکی میں روپوش ہو گئی ـ ایسے زمانہ میں عرب کی زمین سے ایک سر چشمۂ حیات جاری ہوا جس نے وادیٔ سندھ سے وادیٔ الکبیر تک کے ممالک کی آبیاری کی اور علم و ادب کی بُجھی ہوئی شمع کو از سر نو روشن کیا ـ قرطبہ، اسپیلیہ، طلمسان، قاہرہ، دمشق، بغداد، بصرہ وغیرہ میں علوم کے چرچے پھیلے ـ

ہندستان اور یونان کی علمی کتابوں کا ترجمہ ہوا قیصر جسٹینین کی عصبیت سے اکیڈیمی کے اراکین شہر بدر کردیے گئے اور افلاطونی اکیڈیمی تباہ و برباد ہوگئی ـ لیکن عربوں کی رواداری کی بدولت ان یونانی فلیسوفوں نے عربی علوم کی ترقی میں بہت حصہ لیا شاگرد بھی اُستاد سے فہم و ذکا میں کم نہ تھے ـ فارابی، ابن سینا اور ابن رشد نے ارسطو کے گُم شدہ فلسفے کو دوبارہ زندہ کیا ـ ابن خلدون اور البیرونی نے فلسفۂ تاریخ اور مذہب پر حیرت انگیز مقالے لکھے ـ

الخوارزمی، قزوینی ابن ہشام نے ریاضی پر اور ابوالفدا، مسعودی، ادریسی وغیرہ نے جغرافیہ پر کتابیں تصنیف کیں، یورپ کی قومیں جو پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک عالم تاریکی میں حیران و سرگرداں تھیں اس زمانہ میں عربوں کے علمی اداروں سے بہرہ ور ہوتی رہیں ـ آخر کار جب اسلامی تہذیب زوال پذیر ہوئی تو اُنھوں نے اُس شمع علم کو جسے اپنے اُستادوں سے حاصل کیا تھا سنوارا اور فروغ دیا ـ اٹلی کے علم دوست، عیش پسند، حسن پرست، اور شوخ طبیعت باشندے یورپ کے اس نشاۃالثانیہ کے عَلَم بردار بنے ـ فلارنس کے میڈیچی خاندان کے حکمرانوں نے اکیڈمیا پلاتونیکا (افلاطونی اکیڈیمی) کو قائم کیا ـ اور یہ اکیڈیمی اٹلی کی علمی تحقیق اور ادبی سرگرمی کا ماوا اور

ملحا ٹھہری - فرانس کی دیکھا دیکھی اور شہروں اور ملکوں میں بھی اکیڈمیوں کا قیام ہوا - سترھویں صدی میں فرانس نے اندرونی جھگڑوں اور مذہبی فسادوں سے فراغت حاصل کی، ملک میں امن و امان اور حکومت کو استحکام حاصل ہوا - تہذیب کو زمانہ کی ہوا راس آئی - ریشلو کا سا غیر معمولی صاحب مصلحت وزیر بر سر کار ہوا - اس نے فرانس کی مشہور اکیڈیمی کی بنیاد ڈالی اور سنہ۱۶۳۵ع میں ایکیڈیمی فرانسیز کو زبان کی اصلاح کے لیے قائم کیا شاہی سند میں اس کی غرض یہہ بیان کی کہ فرانسیسی زبان، عوام کی بولیوں، وکیلوں کی بےباکیوں، درباریوں کی بے عنوانیوں اور پادریوں کی مبہم دوروں سے آلودہ ہے اور اسے پاک و صاف کرنے کے لیے لغت صرف و نحو علم بیان و عروض کی کتابیں تیار کرنے کی ضرورت ہے -

سنہ ۱۷۸۹ع کے انقلاب کے بعد اکیڈیمی کی دوبارہ تنظیم ہوئی اور اب اس کی آمدنی سرکاری اور غیر سرکاری ذرایع سے اس قدر ہے کہ اس کے انعامات کی چار دانگ عالم میں دھوم ہے -

خانہ جنگیوں کے خاتمے پر جب بادشاہ فریڈرک اعظم نے اپنی فتوحات اور جرأت دستی کے ذریعہ پروسیا کو بین الاقوامی برابری کا دعویدار ثابت کردیا تو ملکی استحکام اور سلطنت کے اقتدار کے اعلان کی غرض سے اپنے باپ کی قائم کی ہوئی ایکیڈیمی کو فروغ دیا - جرمنی کے پایہ تخت برلن میں اس نظام کی بنیاد پڑی جو آج تک علم و ادب کا مرکز ہے -

فرانس کی نقل انگلستان نے کی - سنہ ۱۶۶۱ع میں سیاسی اور مذہبی خانہ جنگیوں سے قوم کو فرصت ملی اور دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی تو چارلس دوم نے سائنس دانوں کی جماعت کو شاہی سند

عطا کي اور اس طریقے سے رائل سوسائٹي کي سنہ ۱۶۶۲ع میں ابتدا ہوئي اور سنہ ۱۹۰۲ع میں برٹش اکیڈیمي خاص طور پر ادبیات و لسانیات کي ترقي کے لیے قائم کی گئی -

اس ڈھائي ہزار برس کی تاریخ سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ ایکیڈیمي کا قیام قوموں کے نشو و نما میں خاص اہمیت رکھتا ہے - ہر قوم کي تاریخ میں ایک زمانہ آتا ہے جب رہنمایان قوم کو یہہ احساس ہوتا ہے کہ علم و ادب کي سر پرستي قومي مفاد کي حفاظت کے لیے ضروري ہے جذبۂ قومیت کے مظاہرہ کے لیے علم و ادب ایک ذریعہ ہے اس لیے جذبۂ قومیت کي استواری کے ساتھہ علم و ادب کي ترقی بھي وابستہ ہے - قوم کی شان صرف آبادی کے ہجوم و دولت کی کثرت تجارت و صنعت کی گونا گوني پر منحصر نہیں ہے - بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ علم و ادب اور فن کے ارتقا میں نمایاں ہوتي ہے - اُن سے قوم کی ظاهری تر و مذہبي اور اس طرح اس کے روحانی خودداری کا اظہار ہوتا ہے - ہر قوم ایک شخصیت رکھتي ہے جس میں اس کي زندگی کا راز پنہاں ہوتا ہے - اس شخصیت کو متعین کرنا اور قائم رکھنا اس لیے ضروري ہے کہ گلدستۂ اقوام کي سگفتگي اور بوقلموني اور عالم انساني کی آراستگي کا باعث ہو - علم ادب اور فن وہ وسائل ہیں جن کے ذریعہ حسن و صداقت کے مخشمات قوم کے افراد کی ذهنیتوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرتے ہیں ان مظاہروں میں ایک گرمي ہے جو اختلاف سوز اور ایک نور ہے جو یگانگت انگیز ہے - مشہور انگریزي ادیب کارلائل کا قول ہے اگر مجھہ کے پوچھا جاۓ کہ سلطنت برطانیہ ایک طرف اور شیکسپیر دوسری طرف ہو اور سوال ہو کہ ان دونوں میں سے ایک باقي رہے اور دوسرا فنا ہو جاۓ تو میں بلا تامل کہونگا کہ سلطنت کا تلف ہو جانا مجھے منظور ہے لیکن شیکسپیر کا نہیں -

علم و ادب اور فن کی حفاظت و اشاعت، قوم کی ان ضرورتوں کو پورا کرتی ہے - جن پر اس کے قیام و بہبود کا انحصار ہے ہندستان کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ جس جس زمانہ میں ہماری قوم کا نیّر اقبال بام فلک پر درخشاں ہوتا ہے اُسی زمانے میں ہماری تہذیب کا نور دنیا کی آنکھوں کو چکاچوندھ کردیتا ہے -

موریہ خاندان کی حکومت کا زمانہ ہے تو ورسنوں کی تنظیم، فلسفہ میں انہماک، اور اجنتا، ایلورا، سانچی بھاگیہ اور بھرھُت کے شاہ کار، مصوّری، بت تراشی اور تعمیر کی ترقی کا پتہ دیتے ہیں - گپتا خاندان کا عہد زرّیں ہے تو کالی داس کے ناٹک، سار ناتھ اور امراوتی کے بے نظیر سنوتاؤں میں فن کی کرشمہ سازی کا نشان ملتا ہے -

مغلیہ خاندان کی شمشیر ہیبت زا اور تدبیر جہاں بانی، ہند کی پراگندہ قوموں کو بدخشاں اور بخارا کی سرحد سے دکن کی گھاٹیوں تک ایک جھنڈے کے سایہ میں جمع کرنے میں کامیاب ہوتی ہے اور یہی وہ زمانہ ہے کہ بےپایاں دولت و ثروت کی کشش فرنگستان کے تاجروں کو سات سمندر عبور کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور صوبہ‌داروں کے درباروں میں تجارت کا پروانہ حاصل کرنے کے لئے عرض‌داشتیں گذارنے اور نذریں پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے - قومی زندگی کی ہما ہمی اور دلوں کے اُبھار کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ تلسی داس، سور داس، کبیر اور کیشو شاعری کے دریا بہاتے ہیں اور اپنے انمول رتنوں سے ادب کو مالا مال کرتے ہیں - اہل فن اور کلاونتوں میں دسونتھ، بساون اور عبدالصمد، کے سحر نگار قلم، حسن کے مجسمے تیار کرتے ہیں تان سین موسیقی میں وہ دلربا راگ الاپتا ہے جو آج تک دلوں کو مست کرتے ہیں - تعمیرات میں ہندستان کا کوئی صوبہ نہیں، کوئی بڑا شہر

نہیں جو مغلوں کے ذوق سلیم کا شاہد نہ ہو صرف ایک تاج محل اس داستان کو بقاے دوام بخشنے کے لیے کافی ہے - اس علم و ادب اور فن کا مدار ملک کے حکمرانوں اسوک، چندر گپت، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی سر پرستی اور بندہ نوازی پر تھا - اور اس سر پرستی کا راز قومی ضروریات کا احساس تھا - اورنگ زیب کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھرا وہ طلسم جس پر خیالستان تہذیب کا قیام تھا ٹوٹا، دل بجھے، ہمتیں پست ہوئیں لیکن عہد رفتہ کی یاد، ان تصورات کو نسیان کی اس خاموش لحد میں سلا نہ سکی جہاں سے صداے بازگشت بھی نہ آے -آ زمانہ کی سرد مہری اور زندگی کی تلخ کامی کی ٹیس میر اور غالب کو تڑپاتی ہے اِن کے دلوں سے جو آہ و فغاں نکلتی ہے اِس کی پر حُزن آواز اس وقت تک ہمارے کانوں میں گونجتی رہےگی جب تک ہندستانی زبان دنیا میں باقی ہے - اٹھارویں صدی کا آخری حصہ اور اُنیسویں صدی کے پہلے پچاس سال ہندستان کی تاریخ میں ایسے گزرے ہیں جن کے بیان میں مورخوں کے قلم خون کے آنسو بہائیں گے - لیکن "ہر سر اولاد آدم ہر چہ آید بگزرد" - زمانہ پلٹتا ہے - انگریزی تعلیم نئے خیالات اور نئے جذبات سکھاتی ہے قومیت کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے - ملک میں ایک نئی روح سرایت کرتی ہے - بیسویں صدی کا آغاز ہوتا ہے - تدراے کارناموں کی یاد، جاپان کی حیرت انگیز فتوحات، یورپ کی جاقہ جنگی، ہندستان کے نصف النہر پر امیدوں کے لامتناہی منظر کی جھلک نگاہوں کو لطف اندوز اور دلوں کو امنگوں سے سرشار کردیتی ہے قوم کی عزت و وقار اور قومی شخصیت کے تعین کے خیالات ذہنوں میں موجزن ہوتے ہیں - قدرتی طور پر لوگوں کے دل، قومی زبان اور ادب کی ترقی کی جانب مائل ہوتے ہیں اور ایسے ادارہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اِس غرض کے پورا کرنے میں مددگار اور معاون ہو -

ہندستان میں اردو اور ہندی زبانوں میں انیسویں صدی کی ابتدا سے مغربی باثرات کے باعث روز افزوں ترقی رہی ہے - دونوں زبانوں میں ادب کا معتدبہ ذخیرہ جمع ہو چکا ہے - مصنفین کی ایک خاص جماعت اِس خدمت میں مصروف ہے کہ علم و ادب کے ہر شعبے کو تصنیفات سے پُر کردے - لیکن ابھی تک علوم کی بہت سی شاخیں ایسی ہیں جن میں کتابیں نہیں ہیں اور جو کتابیں موجود ہیں اُن کی تعداد کم ہے اُن کا معیار اتنا بلند نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے - ادب کی ضروریات سے ہندی اور اردو سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص خوب واقف ہے - زبان کے بارے میں یہہ صحیح ہے "کہ گیسوے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" اُردو اور ہندی میں ایسے ناولوں ڈراموں افسانوں کی کمی ہے جو ادبی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ہوں - تنقید و تاریخ اور سِیَر کی صنفیں بھی بالکل تشنہ ہیں - نظم کی حالت یہہ ہے کہ گو غزل، مرثیہ، مثنوی اور قصیدہ میں کافی اور اعلیٰ پایہ کا مواد موجود ہے - لیکن اِس کی بنا پر یہہ نہیں کہا جاسکتا کہ زمانے کے مذاق کے مطابق نظم ہماری نئی زندگی کی ترجمانی میں کامیابی حاصل کر چکی ہے -

ملک کی آبادی کا خیال کرتے ہوئے یہہ کہنا نا مناسب نہ ہوگا کہ ایک نہایت محدود دائرہ علم و ادب کی اشاعت و توسیع میں دلچسپی لیتا ہے - ہمارے کروڑوں اہل وطن علم سے بے بہرہ ہیں اور ادب کی روحانی مسرت سے بے خبر - مگر اسے بھول نہ جانا چاہیے کہ قومی زندگی کا انحصار انہیں غریب جاکش صبر کیش انسانوں پر ہے جو اس وقت ان کے فیضان سے مستفید نہیں ہو سکتے جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب وہ اصرار کرینگے کہ انہیں علم و ادب سے لطف اندوز ہونے کا وہی فطری حق حاصل ہے جو معدودے چند انسانوں کو اس وقت ہے - اور ان کا مطالبہ انفرادی اور مجموعی مفاد کے لحاظ سے بالکل حق بجانب ہوگا -

ہندستانی اکیڈمی کے قیام کی غرض ان ضرورتوں کا پورا کرنا ہے - یعنی مختلف علوم پر کتابیں تحریر کرانا؟ ادب کی کمیوں کو پورا کرنا اور اس قسم کی تصانیف کا ملک کے سامنے پیش کرنا جو عوام کی تعلیم کا ذریعہ بن سکیں - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ منظم جماعتوں کے ذریعہ سے ادب کی ترقی ہو سکتی ہے یا نہیں - بعض اصحاب کا خیال ہے کہ ادب کا تعلق روح کی آزادی سے ہے - اس کی تخلیق کسی مصنوعی ترکیب سے نہیں ہو سکتی - یہ ممکن نہیں کہ بیرونی اسباب ذہن میں وہ کیفیت پیدا کر سکیں جن کا نتیجہ شعر و سخن کا حسن لطیف ہو - شاعر اور ادیب بنانے سے نہیں بنتے قدرت اپنے قوانین کے مطابق اُنہیں پردۂ مستور سے عالم ظہور میں لاتی ہے - یہ ایک حد تک صحیح ہے - لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے - ادب جن احساسات اور تخیلات کا حامل ہے وہ تمام انسانوں میں کم و بیش پائے جاتے ہیں - ایسا نہ ہوتا تو ادب کی سلطنت عالمگیر نہ ہوتی - اس کی دائرہ چند انسانوں تک محدود ہوتی - ان احساسات جذبات اور تخیلات کے اظہار کی قابلیت البتہ محدود ہے -

لیکن یہ حدود اتنے تنگ نہیں جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے - ترغیب کی کمی کی وجہ سے بہت سے انسان جن میں یہ قابلیت موجود ہے اس کے اظہار سے معذور ہیں - اس کی مثالیں ہر زمانہ اور ہر ملک سے مل سکتی ہیں اور تفصیل کی محتاج نہیں - اردو اور ہندی کی تاریخ خود اس کی گواہ ہے - گو اردو اور ہندی میں شاعری کم از کم چار سو برس پیشتر سے ہو رہی ہے - لیکن دونوں زبانوں میں گلکرائسٹ کے وقت سے پہلے جو نثر موجود تھی اس کی حالت ہرگز ادبی کہلانے کے مستحق نہ تھی - مگر گلکرائسٹ کی سر پرستی

میں پانچ سات برس ہی میں وہ نثر پیدا ہوئی جس پر ہمیں آج
تک ناز ہے۔ اس کی کوششوں سے للو لعل، بیدل مصر، لطف علی بیگ،
میر شیر علی افسوس، میر امن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری
وغیرہ ایسے ادیب کلکتہ میں جمع ہوئے جن کے شاہکاروں کے لیے
ہندوستان ہمیشہ اُن کا رہین منت رہے گا اگر عصر موجودہ میں ایک
ایسی جماعت ہو جسے علم و ادب کی ضرورتوں کا پورا احساس ہو۔
جس کے ارکان کا نصب العین ایک، مذاق صحیح اور نظر وسیع ہو،
جن کا دل ادبی تعصبات سے خالی اور اہل فن و ہنر کی ہمدردی
سے مملو ہو، جو ادب کی خدمت کے لیے نیک نیتی کے ساتھ مستعد
ہو، علم و ادب کی توسیع کے لیے کافی آمدنی کے ذرائع رکھتی ہو تو
یہ ممکن ہے کہ یہ جماعت وہ کام کر سکے جو گلکرائسٹ نے آج
سے سو برس پہلے انجام دیا تھا۔

کسی کا قول ہے کہ جماعت میں کرامت ہے۔ اکیڈیمی کو بھی
حسن خدمت کی توفیق ہو سکتی ہے اس حالت میں جب کہ اس
میں جماعت کی خوبیاں پائی جائیں۔ یعنی یہ کہ وہ محض
چند انفرادی ہستیوں کا مجمع نہ ہو جن میں کوئی خصوصیت
مشترک نہیں یا جن میں ہر شخص کا زاویہ نگاہ مختلف ہو جماعت
اس وقت تک جماعت کہلانے کی مستحق ہے جب کہ اس کے افراد
ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہوں ان کی ذہنیتیں ایک آئیڈیل کے
تابع کام کرتی ہوں اور ان کی مجموعی اور لگاتار کوششوں کا مقصد ایک
ہو۔ جس طرح مختلف پردوں کے چھیڑنے سے اور مختلف سُروں کے
میل سے ایک سُریلا راگ نکلتا ہے اسی طرح ایک اکیڈیمی کے مختلف
طبائع کے اراکین کے ملنے سے ایک لطیف ذہنیت پیدا ہو سکتی ہے
جن پر مذاق صحیح اور حسن ادب کی بنیاد قائم ہو۔

هندستانی اکیڈیمی کی کامیابي کا اندازہ کرنے کے لیے مقالات اور تصنیفات کي کثرت یا انعاموں اور عطیوں کی افراط صحیح معیار نہیں بلکہ یہہ دیکھنا ہوگا کہ کہاں تک اس نے افلاطون کی ابتدائی اکیڈیمی کي طرح ادبیات کے بارہ میں ایسے اصول قائم کیے جو امتداد زمانہ کے ساتھہ وسعت پذیر ہوں لیکن جن کي بنیادیں ہل نہ سکیں کہاں تک فرانسیسي اکیڈیمی کی طرح زبان کے سنوارنے اور ادب کی آرائش میں ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے ایک طرف تصنع اور رنگ نظری اور دوسری طرف بے ساختگي و بے اصولی سے بچ کر ادب میں روح قومی کے اظہار اور نقش کی صلاحیت پیدا ہوئي اور کہاں تک اس کي کوششوں کی وجہ سے ہمارے دلوں کے سامان انبساط اور ذہن کی قوت پرواز میں اضافہ ہوا -

تارا چند

گورنمنٹ صوبہ و متحدہ نے ہندستانی زبان و ادب کي ترقي و حوصلہ افزائی کے لیے سنہ ۱۹۲۷ ع میں ہندستاني اکیڈیمی ""قائم کی تھي جس کو کم و بیش ؟ دس سال ہو گئے - اس قلیل مدت میں کسي اکیڈیمی کا اندازہ یا جائزہ لینا قبل از وقت ھے ؟ تمدن اور علمي تحریکوں کی عمریں ؟ دو چار سال سے نہیں ؟ بلکہ قرنوں اور صدیوں سے لگائي جاتی ہیں - بایںہمہ اکیڈیمي نے اس مختصر دور میں جو عملي کار نامے پیش کیے ہیں (اور جو ایک رپورٹ کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں) اُن سے یہہ اندازہ ہو سکتا ھے کہ اکیڈیمی کا مستقبل کیا ہو گا ؟

اکیڈیمي کا تاریخی مفہوم کیا ھے ؟ اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں ، وہ کن حالات کے ماتحت ؟ عالم وجود میں آتي ھے ؟ ان اُمور کي تفصیل

ھمارے جنرل سکریٹری ڈاکٹر تارا چند صاحب ایم ۔ اے ۔ ڈی ۔ فل ۔ نے ایک مستقل مقالہ کی صورت میں پیش فرمائی ھے جس کو ناظرین انہیں صفحات میں ملاحظہ فرمائیںگے ۔

اب صرف رسالہ " ھندستانی " اور اس کی حیثیت و نوعیت کے بارہ میں کچھہ عرض کرنا باقی ہے ۔ یہہ رسالہ ھندستانی اکیڈیمی کے شعبۂ اردو کا آرگن ہوگا یہہ سال میں چار بار نکلے گا ۔ اس میں ادب و انشا ، لسانیات و تنقید ، آثار قدیمہ و تاریخ و نیز دیگر تحقیقی و علمی موضوعات پر مضامین ہونگے ۔

رہا اُردو زبان کا مسئلہ ، تو حقیقت یہہ ھے کہ وہ نہایت پیچیدہ ھے اور " کثرت تعبیر " سے پریشان ، اس لیے فی الحال اس کے بارے میں کوئی صاف ، مکمل اور قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ۔

آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ نے (جو اکیڈیمی کے بھی ایک ذمہ‌دار ممبر ھیں) ۱۹۲۸ع کے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اُردو کے بارہ میں یہہ خیالات ظاہر فرمائے ھیں —

" معمولاً جو زبان بولی جاتی ھے وہ بمقابلہ بلند هندی کے ، بلکہ اُردو ھے ، اس کی وجہ تلاش کرنے کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ، عربی اور فارسی زندہ زبانیں ھیں جو عرب ، عراق عرب ، ایران اور افغانستان کے کچھہ حصوں میں بولی جاتی ھیں خالص سنسکرت زبان کہیں نہیں بولی جاتی ۔ یہہ صرف پنڈتوں کے حلقوں میں محدود ھے اُردو کو یہہ فائدہ حاصل ھے کہ وہ ھندستان کے ھمسایہ ممالک سے رشتۂ اتحاد رکھتی ھے ۔ بین‌الاقوامی تعلقات

اور ہمسایہ ممالک کے لوگوں کے ساتھ آزاد میل جول یقینی ہے اِن ممالک سے لوگوں کی مسلسل آمد و رفت، اُردو کی قوت میں اضافہ، اور اس کی تدریجی ترقی میں اعانت کرے گی - ہندستان، جس کا تعلق مغرب کے ایشیائی ممالک سے تمدنی اور تجارتی دونوں حیثیتوں سے قریب تر ہوتا جارہا ہے، درآمد میں وہاں کے الفاظ و لغت کو بھی اپنی زبان میں لاکر جذب کرے گا - اس لیے یہ ایک خیالی اُمید نہیں ہے کہ کچھ زمانہ کے بعد ہندستانی زبان، عربی، ترکی، فارسی، اور پشتو زبانوں کے الفاظ سے مالا مال ہو جائیگی - یہ تمام فوائد، جو اُردو کو حاصل ہیں اس کے اعتبار سے اردو، تمام ہندستان کی "لنگوا فرینکا" ہونے کی مدعی ہو سکتی ہے"

پنجاب اور دکن کی اُردو میں، فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت و بہتات، بعید نہیں، اسی قسم کے خیالات کے باعث ہو لیکن صوبۂ متحدہ کی حالت مختلف ہے یہاں بعض لوگ اُردو میں اگر فارسی اور عربی کا عنصر غالب دیکھنا چاہتے ہیں تو بعضوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اُردو کو فارسی اور عربی سے نہیں بلکہ اُسے ملک کی ہندی بھاشا سے ہمآہنگ ہونا چاہیے -

ع - " ہر سو ہزار عقدۂ مشکل نہادہ اند "

اصل یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں اُردو کے متعلق، ابھی کوئی صاف اور قطعی پروگرام نہیں ہے لیکن جس طرح مختلف ذہنوں اور دماغوں میں کسی خبر کا خاکہ بار بار بنتا اور بگڑتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ کسی پُر سکون نقطے تک ہمیں یقیناً پہونچنا ہے ٹھیک اسی طرح اردو کے آئندہ پروگرام کے باب میں بھی، ہمیں، جلد یا بدیر، یہ

طے کرنا ہوگا کہ اس کو کس راستے اور کس طریقے پر چلنا چاہیے اور اُس کی صحیح منزل کیا ہے؟ فی الحال تو مسئلۂ زبان کے بارہ میں —

ع "اس قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید"

سے زیادہ نہ ہم کو معلوم ہے اور نہ شاید اس سے زیادہ معلوم کرنے پر ہم تیار ہیں۔

لیکن اردو زبان کے اِس وسیع تخیل سے قطع نظر، غالباً اِس سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ زبان کی حیثیت و نوعیت، بہت کچھ مقامی اور اپنے مخاطبین کی حیثیت و نوعیت پر موقوف ہے جس کا اندازہ ادیب کے طبعی رجحان اور اُن کے لب و لہجہ کے اختلاف سے بہ خوبی ہو سکتا ہے اسی کے ساتھ، ہر لکھنے والے کی یہ آرزو ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ اِس کے گرد و پیش، انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد، اُس کے خیالات سے مستفید ہو سکے —

اِس لحاظ سے ہمارے صوبے کے اہل قلم، زبان کی سنجیدگی و سنگینی کو نقصان پہونچاۓ بغیر، اگر کسی قدر صفائی و سادگی کو گوارا کر لیں تو کیا جو افادہ اِس سے مقصود ہے وہ اِس جمعیت سے ادبی جرم کی تلافی نہ کر سکےگا؟

کسی بلند نظر ادیب کے لیے زبان کی بلندی و پستی، لفظوں کی سختی و آسانی کوئی معنی نہیں رکھتی جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے ادبیت کا اصل راز یہ بتایا ہے —

"اصل میں یہ جزو زبان نہیں ہے جو صحیح، پُرزور، پاکیزہ اور نفیس ہوتی ہے — بلکہ یہ ذہن ہے جو اِس میں منتقل ہوتا ہے —"

بہر صورت ممالک متحدہ میں مفاہمے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی بیچ بیچ کا راستہ اختیار کیا جاۓ چنانچہ اکیڈیمی اور اُس کے کارکنوں کے نقطۂ نظر اور فرائض کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے،

سر ولیم میرس نے اُس تقریر کو پیش نظر رکھنا چاہئے جو موصوف نے اکیڈیمی کے افتتاح کے وقت بمقام لکھنؤ ؟ ارشاد فرمائی تھی - اُس کا خاص اقتباس یہہ ہے :—

"ہر ہندی لکھنے والے کے پیش نظر یہہ مقصد ہونا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے پڑھنے کے لیے کتاب لکھہ رہا ہے اور اسی طرح مسلمانوں کو خیال رکھنا چاہئے کہ اُن کی لکھی ہوئی کتاب کو ہندو پڑھیں گے - ممکن ہے یہہ امید پوری نہ ہو لیکن میں یہہ امید کرتا ہوں کہ اکیڈیمی کے اراکین اس پر بالکل تیار ہونگے کہ وہ کسی زبان میں فرقہ وارانہ شان پیدا نہ ہونے دیں گے اور زبانوں کو مخصوص جماعت کی زبان نہ ہونے دیں گے - مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر اردو لکھنے والے عربی جملے استعمال کریں جیسا کہ بعض پولیس کے روزنامچے لکھنے والے کچھہ دن پہلے کیا کرتے تھے یا ہندو مصنفین سنسکرت کے الفاظ خواہ مخواہ اپنی عبارت میں بھریں تو یہہ لوگ دوہری مصیبت لا رہے ہیں پہلا جرم یہہ ہے کہ وہ خود بھی دوسرے فریق سے دور ہوتے جاتے ہیں اور اپنے ناظرین کو بھی اُن سے دور کرتے ہیں اِس طرح یہہ ادبی جرم سے زیادہ معاشرتی جرم ہے - اِس کے علاوہ اِس طریقے سے وہ اپنی کتابوں کو نا قابل فہم بناتے ہیں جن کو عام آدمی نہیں سمجھتے اور یہہ ایک ایسا گناہ ہے جو وہ اکیڈیمی کے مقاصد کے خلاف کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اکیڈیمی کے اراکین اس کا خیال رکھیں گے -"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندی اور اردو میں شاید اتنا اختلاف نہیں ہے جتنا ہندی اور اردو کے پرستاروں میں ہے اس لیے اس مسئلے کا حل، اردو اور ہندی کی کتر بیونت سے اتنا ممکن نہیں ہے جتنا اردو اور ہندی کے علم برداروں کی ذہنیت کی اصلاح سے - یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہندستان کی تمام قومیں تو ہندستان کی ترقی میں متعدد قالب اور ایک جان ہو کر رہ سکتی ہیں لیکن ہندستان کی مختلف زبانیں اپنے اپنے مخصوص امتیازات کو قائم رکھ کر ترقی نہیں کر سکتیں! حالانکہ اردو اور ہندی، اپنی اصل کے اعتبار سے باہم اُتنی مختلف بھی نہیں جتنی خود یہ قومیں!

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ممکن ہے اردو اور ہندی کے کلّی مسئلے کا اس سے حل نہ ہو سکتا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشی حیثیت سے عماً اسر کا حل اسی طرح اسر اور آسرے کو برابر کرنے سے ممکن ہے - اس بنا پر بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے رسالے کی پالیسی اور اس کا پروگرام انہیں لائنس پر ہو -

دوسرے شعبہ ہائے علمی کے مانند، ملکی لٹریچر کی ترقی بھی ملک کی متحدہ ذہنیت کی تشکیل پر موقوف ہے - یہ مبارک کام ہندستانی اکیڈمی کے ماتحت (جس میں ہمارے صوبے کے بہترین دل و دماغ شریک ہیں) اگر انجام نہ پا سکا تو اس سے زیادہ ملک کی شامت اور بد بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟

رسالے میں جہاں ہر قسم کے علمی، ادبی، تنقیدی اور لسانیاتی مضامین کے نکالنے کا ارادہ کیا گیا ہے وہیں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ساتھ کے ساتھ تخلیقی لٹریچر کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی رہے -

س ذیل میں چونکہ افسانے اور نظمیں بھی آتی ہیں اس لیے اس کے
بارہ میں بھی کچھ عرض کر دینا غالباً بیجا نہ ہو —

یہ امر بے حد مسرت انگیز ہے کہ عام طور پر اردو میں ایسے لکھنے والوں کی کافی تعداد موجود ہے جو بدیع و جمیل انشا، اور خوبصورت طرز نگارش پر قدرت رکھتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ، علمی و ادبی چیز کے نام سے ایک ایسے "سراب" و "فریب" کی بھی زور پرور ارزانی ہوتی جا رہی ہے جس سے بچنا اور بچانا، ہر سچے خواہ اردو کا اولین فرض ہونا چاہیے - یہ وہ "ذہنستان خیالی" و "ژولیدہ بیانی" ہے جسے عام طور پر آرٹ سے متّہم کیا جاتا ہے - اصل یہ ہے کہ فکر و مطالعے کی زحمتوں سے بچ کر، اگر آسانی سے تحریروں کو بلند و رفیع کر کے دکھانا مقصود ہو تو عموماً اسی قسم کی ہوائی چیزیں تیار ہوتی ہیں - اسی لیے ادب کے ساتھ ساتھ ہمارے نوجوان طبقے کی زندگی بھی سر تا سر سطحی اور مصنوعی ہوتی جا رہی ہے حالانکہ ایک ترقی یافتہ زبان کی حقیقی عظمت، سنجیدہ غور و مطالعہ اور پُر فکر سائنٹفک خیالی پر منحصر ہے بغیر اِس کے نہ صحیح ادبی ماحول تیار ہو سکتا ہے اور نہ اعلیٰ قسم کا شاعر و ادیب - یہ صحیح ہے کہ اصلی شاعر و ادیب بنایا نہیں جاتا بلکہ وہ ہوتا ہے لیکن اِس باب میں ہم فطرت کی اِپنی اعانت ضرور کر سکتے ہیں کہ اِس کے لیے ایک اچھی زمین تیار کر دیں جس کے لیے سخت سے سخت احتساب از بس لازمی و ضروری ہے (چنانچہ اسی مصلحت سے اکیڈمی نے اپنے یہاں ریویو کا خاص اہتمام کیا ہے) اسی طرح شعر و نظم کے بارے میں بھی ہمارا آئیڈیل یہ ہے کہ نہ وہ کھتونی کی طرح بے کیف و بے روح ہو اور نہ پھر اِس درجہ پُر الم و رقیق کہ قدم قدم پر حرکت قلب بند ہونے کا احتمال ہونے لگے افلاطون نے اپنے آئیڈیل ریاست میں شاید اسی قسم کے شاعر و شعر کی گنجائش نہیں پائی تھی -

بہر صورت ہم احتیاطاً لیکن خلوص کے ساتھ یہہ آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ نظموں اور افسانوں میں جب تک حقیقی تخلیقی شان نہو اُس وقت تک رسالے کو اِن چیزوں سے مامون و مصئون رکھنے کی ہماری انتہائی کوشش ہوگی -

---

عام علمی و ادبی مضامین کے زبان و بیان اور اُن کے طرز ادا کے باب میں ہمارا نقطۂ نظر کیا ہوگا ؟ عرض ہے کہ اِس میں ہر ایسا مضمون درج کیا جاۓ گا جو معقول ہو، مفید ہو اور دلچسپ ہو - ہمارے نزدیک ہر اچھا مضمون معقول بھی ہو سکتا ہے اور مفید و دلچسپ بھی - مختلف طبائع مختلف قسم کی چیزیں پسند کرتی ہیں لیکن یہاں مختلف طبائع کے معنی، ادبی اور بد مذاق طبائع کے نہیں ہیں -

ہمارا یہہ معیار بظاہر بہت مختصر اور بیش پا افتادہ معلوم ہوگا لیکن اِس سے غالباً کسی کو انکار نہ ہو کہ اِس کا نباہنا کافی مشکل اور دشوار ہے -

ایڈیٹر

تبصرے

عرب و ہند کے تعلقات

مصنفہ جناب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی - تقطیع ۲۰×۲۶
صفحات ۴۰۹ - تائپ کی طباعت - کاغذ دبیز - شائع کردہ
ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد سنہ ۱۹۳۰ع - مجلد قیمت چار روپیہ -

(از ڈاکٹر زبید احمد پی - ایچ - ڈی - الہ آباد یونیورسٹی)

یو - پی کی ہندستانی اکیڈیمی محتاج تعارف نہیں - اس نے اپنے چند سالہ زمانہ حیات میں اردو اور ہندی کی جو خدمت کی ہے وہ اس کے کارکنوں کے لیے باعث فخر اور اردو ہندی کے خیرخواہوں کے لیے موجب مسرت ہے - ایک طرف ملک کے قابل قدر اہل قلم کو صلائے عام ہے کہ کسی مفید مبحث پر سلیس و سہل زبان میں تصنیف و تالیف کرکے اردو ہندی کے سرمایہ میں قیمتی اضافہ کریں چنانچہ اکیڈیمی کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور دوسری طرف ملک کے مایۂ ناز اصحاب علم و فضل کو دعوت دی جاتی ہے کہ ہندستانی اکیڈیمی کے سامنے اردو یا ہندی میں کسی اہم موضوع پر تحریر کرکے اپنے علمی تحقیقات کے نتائج سے قوم کو بہرہ‌مند کریں - چنانچہ اب تک اس قسم کی کئی ایک تحریریں ہو چکی ہیں اور ان کو اکیڈیمی نے آب و تاب کے ساتھہ شائع کیا ہے - منجملہ ان شائع شدہ تحریروں کے - کتاب زیر تبصرہ بھی ہے - جو مولانا سید محمد سلیمان ندوی کی پانچ تحریروں کا مجموعہ ہے - علامہ موصوف کی محققانہ و عالمانہ شخصیت اور موضوع کی تاریخی و افادی اہمیت اور پھر ہندستانی اکیڈیمی کی سرپرستی کتاب میں ان سب باتوں سے جائز طور پر بھی یہہ توقع کی جا سکتی تھی کہ

کتاب فی الواقع ایسی ہی بے نظیر ہوگی - اور ہم خوش ہیں کہ یہہ کتاب توقع سے بھی کچھ زیادہ کامیاب بلکہ لاجواب تصنیف ہے اور خلوص دل سے فاضل مصنف ؟ ہندستانی اکیڈیمی اور دنیائے اردو کو اس علمی کارنامہ پر مبارکباد دیتے ہیں -

کتاب پانچ حصوں میں منقسم ہے - پہلے حصہ میں آغاز تعلقات اور ہندستان کے عرب سیاحوں کا ذکر ہے اس میں ابتداءً بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی روایات میں عرب و ہند کا تعلق ہبوط آدم سے قائم ہے - اگرچہ یہہ روایتیں فن حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ ہیں - مگر مسلمانوں کی اس ذہنیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ ہندستان کو ''اپنا موروثی پدری وطن سمجھتے ہیں'' پھر عرب و ہند کے ابتدائی تجارتی تعلقات؟ لفظ ہند کی تحقیق؟ اور ہندستان پر عربوں کے حملہ کا ذکر ہے آخر میں - عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا ابن خرداذبہ المتوفی ۲۵۰ھ سے لیکر ابن بطوطہ سنہ ۷۷۹ تک مختصراً ذکر کیا گیا ہے - اور دوران ذکر میں بہت سی مفید اطلاعات درج ہیں -

دوسرے حصہ کا موضوع تجارتی تعلقات ہے اس میں خلیج فارس کے اور ہندستان کے مغربی بندرگاہوں - دریائی تجارتی راستوں اور ہندستان کی پیداوار اور بیوپار کا ذکر ہے اسی سلسلہ میں یہہ بتایا گیا ہے کہ زبان عربی بلکہ وہاں تک میں کون کون سے ہندی الفاظ داخل ہیں - مثلاً عربی میں مسالوں اور اکثر خوشبوؤں اور کئی دواؤں کے نام - مانند فلفل - قلقل - صندل - مسک - اطریفل ہندی الاصل ہیں - قرآن شریف میں تین ہندی لفظ زنجبیل مسک اور کافور آئے ہیں - پھر ہندستان کی بحری در آمد کا ذکر ہے اسی موقع پر اس سوال پر بحث کی ہے کہ آیا اہل ہند بھی جہازراں تھے - بعض انگریز مورخوں کا خیال ہے

که کُل هندو تو نہیں - لیکن کم از کم سندھ اور گجرات کے لوگ ضرور حکمرانی کرتے رہے -

تیسرے حصہ کا مبحث عرب و ہند کے علمی تعلقات ہے - ابتداءً مصنف نے اسے مآخذ کا ذکر کیا ہے پھر علمی تحقیقات کا آغاز برآمکہ سے کرتے ہیں - اسی ذیل میں برآمکہ کی اصلیت کی تحقیق کی ہے عام طور پر برآمکہ مجوسی الاصل سمجھے جاتے ہیں بلخ میں نو بہار نام آتش کدہ تھا - جس کے یہ لوگ پیر مغاں تھے - مولوی عبدالرزاق صاحب نے تاریخ البرامکہ میں برمک کی اصل برمغ بتائی ہے مگر مولانا ندوی کی تحقیق ہے کہ نہ یہ لوگ مجوسی الاصل تھے اور نہ نو بہار آتش کدہ تھا - بلکہ وہ بودھوں کا مندر تھا - بودھوں کے معبد کو وہار کہتے ہیں - اسی وہار کی خرابی بہار ہے - اس میں کچھ شک نہیں یہ خیال سب سے پہلے مولانا نے نہیں بیان کیا - کیوں کہ جیسا کہ خود موصوف نے لکھا ہے - زخاو نے کتاب الہند کے انگریزی ترجمہ کے مقدمہ میں نوبہار کی اصل نو وہار قرار دی ہے - اور اسی طرح انسائکلوپیڈیا آف اسلام کے مضمون برآمکہ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے - مگر اسی کے ساتھ اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مولانا ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس خیال کو نہایت خوبی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہونچایا ہے - اس کے بعد مولانا نے برآمکہ کی قدر دانی و علم پروری کی بدولت سنسکرت سے عربی میں جو ترجمے ہوئے ان کا مفصل ذکر کیا ہے - اسی ذیل میں یہ بھی بتایا ہے کہ بعض خاص سنسکرتی اصطلاحیں عربی میں جوں کی توں مستعمل ہیں - رقوم ہندسہ کی بابت لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے لیں - اس موقع پر لفظ ہندسہ کی تحقیق کی ہے عام طور پر اس کا تعلق لفظ ہندسے بتایا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ فارسی لفظ اندازہ کا معرّب ہے - آخر

میں البیرونی کے علمی کارناموں کا اور پھر نرد و شطرنج کا ذکر ہے جو ہندستان سے عرب پہونچے -

چوتھے حصہ کا عنوان عرب و ہند کے مذہبی تعلقات ہے - مآخذ کا ذکر کر کے ایک نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز بحث کی ہے - وہ یہہ کہ مسلمان عرب فاتحین ترک و افغان و مغل فاتحین ہند میں بڑا فرق تھا - آخرالذکر قوموں کو چونکہ مسلمان ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا - بلکہ غیر مسلم کی ایک کافی تعداد اُن میں موجود تھی - اس لیے وہ ہنوز اِسلامی روح سے محروم تھیں جس کا یہہ لازمی نتیجہ تھا کہ یہہ لوگ اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھہ وہ اِسلامی سلوک نہیں کرسکے جو عربوں نے اپنی مفتوح قوموں کے ساتھہ کیا - عربوں نے جن قوموں کے ساتھہ معاہدہ کیا اُنکی مذہبی آزادی بر قرار رکھی اور ان کے مذہبی عبادت‌گاہوں کو ٹھیس لگنے نہیں دی - ترک و افغان فاتحین نے ہندوؤں سے جزیہ تو لیا مگر اس کے عوض میں وہ حقوق نہیں دیے جو عرب مسلمان جزیہ لینے پر مفتوحین کو دیتے تھے - محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تو اس نے سندھ کے غیر مسلم لوگوں کو وہی حقوق دیے جو عربوں نے عراق و شام کے یہودیوں عیسائیوں اور پارسیوں کو دیے تھے اس نکتہ کو پیش نظر نہ رکھنے کا یہہ نتیجہ ہے کہ ان نو مسلم ترکوں - افغانوں اور مغلوں کے طریقہ ملک گیری و حکمرانی پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ اِسلام کے سر تھوپے جاتے ہیں حالانکہ ان کو اِسلام سے کچھہ تعلق نہیں -

اس بحث کے بعد فاضل مصنف نے مسلمانوں کی تحقیقات - ہندو مذہب کی تاریخ بیان کی ہے اور نہایت مفید دلچسپ معلومات پیش کیے ہیں - اسی ضمن میں لفظ سمنہ کی تحقیق کی ہے اور بتلایا ہے کہ اس سے بودھ مت کے لوگ مراد ہیں - اور لفظ بت کی اصل بدھ ہے - پھر یہہ

بتلایا ہے کہ مختلف تجارتی ـ معاشرتی و سیاسی تعلقات کی وجہ سے سندھ، گجرات، کارومنڈل و جزائر بحر ہند میں اسلام آہستہ آہستہ کیونکر پھیلتا چلا گیا ـ اسی ذیل میں یہ ایک حیرت‌ناک معلومات بیان کی ہے کہ آج سے ایک ہزار برس پہلے کسی ہندو راجہ کے حکم سے ہندی یا زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا گیا تھا ـ جیم نے مسئلہ وحدۃالوجود کے بارے لکھا ہے کہ ایسی کوئی بیّن دلیل موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ تخیل مسلمانوں میں ہندوستان سے آیا ـ ممکن ہے کہ یہ افلاطونی فلسفہ کا اثر ہو ـ البتہ منصور جس وحدۃالوجود کا قائل تھا وہ محتاط صوفیوں کا وحدۃالوجود نہیں وہ حلول کا قائل تھا ـ ممکن ہے وہ یہ عقیدہ ہندوستان سے لے گیا ہو ـ مولانا کا یہ خیال صحیح ہے کہ ہندوؤں میں وحدت تثریحی کا جو تخیل پیدا ہوا وہ اسلام کے اثر سے ہے ـ

پانچویں حصہ کا موضوع سراسر تاریخی ہے ـ اس کا عنوان " ہندوستان میں مسلمان فتوحات سے پہلے " ہے اور یہ سب سے بڑا حصہ یعنی نصف کتاب سے کچھ ہی کم ہے ـ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوئیں ـ اس علاوہ میں نہ صرف یہ ہوا کہ باہر سے مسلمان آکر آباد ہوئے بلکہ خود ملک کے باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا ـ یہ اثر دو طرفہ کوششوں کا نتیجہ تھا ایک تو عرب تاجروں کی آمدورفت کا اور دوسرے سراندیپ کے نقش قدم کی زیارت کے لیے آنے والے صوفیوں اور درویشوں کی کثرت کا ـ پھر اسلام کے چھ مرکز سرندیپ، مالدیپ، مليبار، کارومنڈل، گجرات اور سندھ کی اشاعت اسلام کا مفصل بیان ہے ـ گجرات کے ذیل میں ابن بطوطہ کے سفر نامہ سے تمام ساحلی مقامات کا حال لکھا ہے ـ اور سندھ کے ذیل میں وہاں کی مسلمان حکومتوں کے مختصر حالات لکھے ہیں اور عربی کتب تاریخ و جغرافیہ کے مفید

و دلچسپ افسانات کا ترجمہ دیا ہے - منصورہ کا مفصل تذکرہ ہے - عربی خاندانوں کی حکومتوں کے بعد سومری اور سمہ بادشاہوں کا حال ہے - اور پھر یہاں کے مشہور شہروں کا ذکر کیا ہے - اس کتاب کی زبان نہایت سنجیدہ - دلکش اور اکیڈیمی کے نصب العین کے مطابق ہے یعنی مغلق عربی الفاظ اور ثقیل فارسی تراکیب سے خالی ہے - نہ بالکل خشک ہی ہے نہ شوخ و رنگین - جہاں موقع آجاتا ہے تو مولانا نہایت بے تکلفی سے ایسے جوہر قلم دکھا جاتے ہیں کہ بار بار اُن سے لطف اندوز ہونے کو جی چاہتا ہے ذرا اس تشبیہ کی لطافت کو ملاحظہ کیجئے —

"مگر فتوحات کا یہ سلسلہ اس جوار کی طرح تھا جو اپنے زور میں سمندر کے سینہ کو چاک کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے - لیکن جیسے ہی وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے پیچھے پانی سمٹ کر ایسا ہو جاتا ہے کہ پانی کی سطح میں اس غیر معمولی شگاف کا نشان بھی نہیں ملتا" ایک جگہ اور لکھتے ہیں "[illegible] سندھ کا ایک ہاتھ اگر عربوں کے ارض حرم کا دامن تھامے ہے تو اس کا دوسرا ہاتھ ہندوؤں کے آریہ ورت کے قدم چھوتا ہے -"

مولانا نے لفظ "بندرگاہ" کو مونث استعمال کیا ہے - لفظ "بندر" تو یقیناً مذکر ہے مگر "بندرگاہ" کے بابت تامل ہے - میں نے اسے چند احباب و رفقائے کار سے دریافت کیا تو انہوں نے مذکر بتایا - فرہنگ آصفیہ میں اسے مونث لکھا ہے مگر نوراللغات میں مذکر ہونا درج ہے اور غالباً یہی صحیح معلوم ہوتا ہے - امید ہے کوئی اور صاحب اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر مزید روشنی ڈالیں گے -

طباعت اس کتاب کی ٹائپ کے حروف میں ہے اور سادہ کسادہ - مگر افسوس ہے کہ طباعت کی بے شمار غلطیاں رہ گئیں - اگرچہ آخر میں

جھہ صفحوں کا صحت نامہ لگا ہوا ہے تاہم اور بہت سی غلطیاں ہیں لیکن عموماً "سندھ" چھپا ہے - ابن خردادبہ ہر جگہ ابن خرداربہ (ر کے ساتھہ) ہے اول تو دال ہی سے ہونا چاہیئے تھا ورنہ زیادہ سے زیادہ ذال سے - فہرست مضامین کو نہایت مفید طریقہ سے مرتب کیا گیا ہے البتہ اپنی صاحب ضرور ہے کہ متن کتاب میں حصوں کے علاوہ - جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں اُن کو فہرست میں جلی طور پر نہیں دکھلایا گیا - اس لیے اہم اور ذیلی مسائل میں کچھہ فرق سرسری نظر میں معلوم نہیں ہوتا -

اب میں چند باتیں مشورہ عرض کرتا ہوں :-

شروع میں ابن حوقل کا بنایا ہوا گجرات اور سندھ کا جو نقشہ دیا گیا ہے - وہ غلط حدود اربعہ قائم ہونے کی وجہ سے کسی قدر مضحکہ خیز ہوگیا ہے اگر مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کو باہم بدل دیا جائے تو بہت زیادہ غلط نہیں رہتا "بحر ہند" ہندستان کے شمال مغرب میں ہے نہ کہ جنوب مشرق میں مولانا نے صفحہ ۳۷ اور ۳۹۷ پر اودھی قنوج کے علاوہ ایک اور قنوج کا سندھ کے قریب ہونا بتلایا ہے ترما کہ قیام لندن مجھے بھی یہہ خیال ہوا تھا کہ شاید قنوج دو ہیں لیکن جب میں نے کچھہ جستجو کی تو یہہ خیال غلط نکلا کینگھم وغیرہ کے قدیم جغرافیوں میں صرف ایک ہی قنوج کا ذکر ہے - ہندستان واپس آنے کے بعد معلوم ہوا کہ جناب مولوی سید مقبول احمد صاحب قنوج کی تاریخ لکھہ رہے ہیں - ان کی "حیات جلیل" کے بعد ان کی تحقیق و کاوش کا کون قائل نہ ہوگا - اُن کے نزدیک بھی قنوج ایک ہی ہے - مولانا سید سلیمان ندوی نے دو حوالے دیے ہیں - ایک مسعودی کا اور دوسرا بشاری کا - آخرالذکر کی احسن التقاسیم یہاں الہ آباد میں نہ مل سکی - مروج الذہب مطبوعہ پیرس کو پھر دیکھا - مولانا نے صفحہ ۳۷۲ کا حوالہ دیا ہے - اس پر یہہ عبارت ہے ــــ

"ملک الهند البلهری ۔ ملک قنوج من ملوک السند بوورہ هذا اسم کل ملک بلی القنوج وهنا مدینه یقال لها بوورہ باسم ملوکهم و قد صارت الیوم فی حیز الاسلام وهی من اعمال المولتان ....و بوورہ هذا الذي هو ملک القنوج هو ضد البلهري ملک الهند ۔"

ترجمہ — هندستان کا بادشاہ بلهری هے اور بادشاهاں سندہ میں سے قنوج کا بادشاہ بودرہ هے ۔ قنوج کے هر بادشاہ کو بودرہ کہتے هیں ۔ اور یہاں ایک شہر هے۔ جسے شاهان قنوج کے نام پر بوورہ کہتے هیں اور یہہ شہر آج کل مسلمانوں کے قبضہ میں هے اور ملتان کے متعلق هے ۔ بوورہ بادشاہ قنوج ۔ هندستان کے بادشاہ بلهری کا مخالف هے اس بیان سے صاف طور پر ظاهر هے کہ مسعودی قنوج نام شہر کو نہیں ؟ بلکہ بوورہ نام شہر کو مسلمانوں کے قبضہ میں بتاتا هے ۔ مولانا نے اس سے غلط نتیجہ نکالا کہ قنوج دو تھے ۔ مسعودي هندستان کے دو حصے کرتا هے ؟ ایک شمالي ۔ جسے وہ سندھ کہتا هے ۔ اور قنوج کے بادشاہ کو ؟ شاهان سندھ سے قرار دیتا هے ۔ دوسرا جنوبی ۔ جسے وہ هند کہتا هے اور یہاں کے بادشاہ کو بلهری بتاتا هے ۔ اور یہہ کہتا هے کہ ان دونوں بادشاهوں میں باهم سخت مخالفت و دشمني هے چنانچہ آگے چل کر بادشاہ قنوج کا ذکر کرتا هے کہ اس کے هر چار سمتوں میں لڑنے کے لئے چار لشکر هیں ۔ شمالي لشکر ۔ والیء ملتان سے لڑنے کے لیے هے اور جنوبي بلهري کي سر کوبي کے لئے ۔ اب رها یہہ کہ بلهري اور بوورہ در اصل کیا لفظ هیں ۔ اس کي بابت الفت نے صفحہ ۲۲ پر مفصل بحث کی هے ۔

صفحہ ٥۹ پر حاشیہ کے بعد بریکٹ میں عراق درج هے ۔ حاشیہ ؟ عراق میں نہیں شام میں هے ۔ (معجم البلدان یاقوت) ۔

صفحہ ۱٥۷ پر شاناق کی بابت مولانا نے تحریر فرمایا هے کہ خاص رهروں کے بیان میں اس کي اور کوئی کتاب تھي تھی ۔ جو ساتوس

صدی ھجری تک عربی میں موجود تھی - اس کتاب کا نام کتاب السموم ہے اور یہ اب تک موجود ہے - مجھے اس کے قلمی دو نسخوں کا پتہ معلوم ہے - ایک نسخہ برلن کے کتب خانہ میں ہے (دیکھو فہرست مخطوطات عربیہ برلن ۶۴۱۱ ع) اور دوسرا قاہرہ کے خدیویہ کتب خانہ میں (دیکھو فہرست جلد ششم مخطوطات المکتبۃ الخدیویہ) برلن والا نسخہ میں نے برلن میں دیکھا تھا - یہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے ۸۴ صفحات پر شامل ہے -

دیباچہ میں ہے کہ ابتداء ابو حاتم بلخی نے خالد برمکی کے لیے ۲۰۰ ھ میں زبان فارسی ترجمہ کیا اور پھر عباس بن سعید جوہر نے ۲۱۰ ھ میں اس کا عربی میں ترجمہ کیا - یہ رسالہ چار مقالات میں منقسم ہے - پہلا مقالہ بطور مقدمہ ہے - اس میں لکھا ہے کہ حکیموں نے مختلف قسم کے قاتل زہر بادشاہوں کی زندگی بچانے کے لیے بنائے ہیں - اُن کا استعمال سوائے بادشاہ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں - دوسرا مقالہ مختلف قسم کے زہروں کے علامات کی بابت ہے - تیسرے مقالہ میں مختلف قسم کے زہر بنانے کے نسخے ہیں -

صفحہ ۲۵۶ پر صفاریہ حکومت کو سامانیہ حکومت کے بعد ہونا لکھا ہے - یہ صحیح نہیں ہے صفاریہ خاندان پہلے ہوا ہے -

المختصر یہ کتاب مستطاب ادبیات اردو میں ایک بیش بہا اضافہ ہے فاضل مصنف نے جس علمی تفحص و تمدنی تجسس سے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ دنیائے اردو میں صرف انہیں کا حصہ ہے - مولانا کی اسی فضل کی ایک اور تصنیف ہے - جو فی الواقع اس کتاب کی طرح بے نظیر ہے - جس طرح وہ کتاب سر زمین قرآن پاک کی جغرافی و تاریخی معلومات کا بہترین ذخیرہ ہے اسی طرح یہ تصنیف تعلقات عرب و ہند پر جامع ترین کتاب ہے -

---

* حاشیہ دیکھو - ارض القرآن -

روزنامچه مقدس

مطبع مسلم یونیورسٹي علیگڈھه - ١٥ حر - قیمت ایک روپیه ٨ آنه -

حاجي اس - ایں علي صاحب ایڈیٹر و پروپرائٹر اخبار نیّر اعظم مرادآباد نے سنه ١٠٢ ع میں فریضهٔ حج و زیارت مقامات مقدسه کے سلسلے میں سفر کیا تھا "روزنامچه مقدس" انھیں سفر کے حالات پر مشتمل هے -

سفر نامه کی حیثیت تمام تر سیاح کے نقطهٔ نظر پر موقوف هے - حاجی اس - این علي صاحب کا سفر چونکه زیاده تر مذهبي اخلاص و عقیدت سے تعلق رکھتا هے اس لیے اس سفر نامے کے اکثر حصے دیني جذبات سے لبریز هیں -

طرز نگارش قدیم ؛ مگر صاف ؛ ساده اور دلچسپ هے- کتاب میں ایک فهرست مضامین کي بھی ضرورت تھي؛ تاهم اصل کتاب میں جلي سرخیوں سے اس ضرورت کو خفیف طرر پر پورا کر دیا گیا هے - لکھائی چھپائي معمولي مگر سر ورق رنگین و دیدهٔ زیب هے -

---

لغات سعیدي

مرتبهٔ مولوی عبدالعزیز صاحب - مطبوعه مطبع مجیدی ؛ کانپور -

حجم ٦٢٧ صفحات - قیمت درج نهیں -

ملنے کا پته — مطبع مجیدي ؛ کانپور -

یهه صحیح لغت عربي ؛ فارسي ؛ ترکي اور عبراني زبانوں کے الفاظ کا مجموعه هے ان الفاظ کی تشریح سلیس اُردو زبان میں کی گئي هے -

ترتیب میں ایک حد تک خوبی ملحوظ رکھی گئی ہے -
الفاظ پر اعراب لگا کر صحت تلفظ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے -
وہ الفاظ جو عام طور پر لکھنے پڑھنے میں رائج ہیں اس میں اکثر موجود ہیں - اس لیے یہہ کتاب طلباء کے لیے مفید ہو سکتی ہے -
البتہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے اس کو کسی قسم کا امتیاز نہیں ہے -
کاغذ اچھا، لکھائی چھپائی ؛ دیدہ زیب اور تایٹل رنگین ہے -

رسید کتب :

مخزن نجات - چہل حدیث کا ترجمہ مطبع معارف ؛ اعظم گڈھہ — قیمت ۳ آنہ -

منتخبات ہندی کلام - مرتبۂ ڈاکٹر جعفر حسین ؛ بی - ایچ ڈی - حیدرآباد بک ڈپو - چادر گھاٹ ؛ حیدرآباد دکن — قیمت دو روپیہ آٹھہ آنہ -

اعلان

ہندستانی اکیڈیمی نے خاص خاص ماہرین فن کے ذریعہ کتابوں پر ریویو کرانے کا اہتمام کیا ہے ؛ جن کتابوں پر ریویو کرانا مقصود ہو ان کی دو جلدیں اکیڈیمی میں روانہ کرنی چاہئیں - تا کہ ایک جلد اکیڈیمی میں رہے ؛ اور دوسری تبصرہ نگار کے پاس بھیجی جاے -

---

هندُستاني

هندستاني اکیڈیمي کا تماهي رساله

جلد ۱ | اپریل سنه ۱۹۳۱ع | حصه ۲

* رسم و رواج کا اثر زبان پر

(از مولوی نورالحسن نیّر ، بي - اے صاحب نوراللغات)

کسي نے خوب کہا ہے کہ ملک کي انشا پردازی اپنے ملک کي تاریخ اشاروں سے بتاتي ہے بول چال سے محاورے اور مثل سے ، لفظوں کا طریق استعمال ، اُسی طرح مقولے اور نصیحت سے فُصحا کا طرز گفتگو اور ان کے مذاق کا حال معلوم ہوتا ہے - بول چال محاورے مثل اور مقولے میں فرق ہے اور وہ کسي قدر وضاحت چاهتا ہے -

بول چال - کہتے ہیں ایک خاص قسم کی ترتیب الفاظ کو ، جو اہل زبان کي زبان پر ہو اور جس کے خلاف بولنا ٹکسال باہر ہو -

(الف) اس میں الفاظ اپنے حقیقي معنی دیتے ہیں مثلاً مجھے پانچ چھہ مرتبہ تمھارے یہاں جانے کا اتفاق ہوا - اگر اس پر قیاس کر کے تین پانچ کہیں تو غلط ہوگا - کیونکہ فُصحا اس معني میں "تین چار" "پانچ چھہ" اور "دس بیس" بولتے ہیں -

(ب) جو جملے کي ترتیب ، یا الفاظ کا طریقۂ استعمال اردو زبان میں مقرر ہے ، روز مرہ میں اس کي مطابقت لازم ہے مثلاً "کیا کہیے سال بھر میں ایک بار بھی لکھنؤ جانے کا موقع نہیں ملا" - اگر اس جگہ "موقع نہ ملا" کہیں تو غلط ہوگا -

* یہ مضمون اکیڈیمي کے گذشتہ کانفرنس میں پڑھا گیا تھا -

(ج) جس طرح خاص خاص موقعے اور محل پر اہل زبان بیساختہ
الفاظ یا فقرے کہہ جاتے ہیں ان کو اسی طرح استعمال کرنا
ضروری ہے :—

آتش — کیوں محبت بڑھائی تھی ہم سے
ہم گنہ گار بے گناہ ہو ہم

اس صورت میں فعل کا حذف کرنا اور مکرر نہ لانا فصاحت
کی جان ہے -

محاورہ - جب ایک یا کئی لفظ مصدر سے مل کر اور حقیقی معنی سے متجاوز ہوکر کچھہ اور معنی دینے لگتے ہیں تو اُس کو محاورہ کہتے ہیں - مثلاً آگ پانی میں لگانا - مزاج کو بھڑکا دینا ؟ جہاں لڑائی نہ ہوتی ہو وہاں لڑائی کرادینا - شرارت کرنا ؟ فتنہ اُٹھانا ؟ کے معانی میں مستعمل ہے - محاورے میں مصدر کے جملہ مشتقات استعمال ہوتے ہیں اور اصل محاورے میں کسی قسم کے تصرّف کرنے کا اختیار نہیں مثلاً "سر سہرا رہنا" کی جگہ "سر پر سہرا رہنا" ٹکسال باہر ہے -

مثل - ایک یا چند جملے جو عرصۂ دراز سے کسی خاص موقعے پر بطور مثال بولے جائے اور اپنی حقیقی معنی سے متجاوز ہوکر کچھہ اور معنی دیتے ہیں - مثلاً کوئی شخص ایسی سے بر بار یا فخر کرے جو اس کے ہاتھہ آنا دشوار تھی تو اس کی نسبت بولتے ہیں انوکھے گاؤں میں اونٹ آیا لوگوں نے جانا پرمیسر آیا - مثل میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر جائز ہے - لیکن مصدر کے تمام مشتقات کے ساتھہ استعمال جائز نہیں - مثلاً ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا کی جگہ ناچ نہ آنا آنگن ٹیڑھا بتانے لگے تو تصرّف بیجا ہوگا -

مقولہ - وہ فقرہ یا جملہ جو بوجہ عام کلیہ یا عمدہ نصیحت ہونے کے عام پسند ہو گیا ہو - اس میں الفاظ اپنے حقیقی معانی سے

متجاوز نہیں ہوتے اور نہ اس میں قدامت کی شرط ہے مثلاً
" بزرگی بعقل است نہ بسال " " با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب "

رسم و رواج - دو لفظوں سے مرکب ہے اور یہ دونوں لفظ بظاہر ہم معنی ہیں لیکن اِن میں فرق امتیازی ہے' ہر رسم کو رواج کہہ سکتے ہیں لیکن ہر رواج کو رسم نہیں کہہ سکتے -

رسم - خاص کر اُن افعال کے واسطے مستعمل ہے جس کو لوگ شادی غمی کے موقعوں پر دوسروں کی تقلید میں کرتے آتے ہیں - اور رواج صرف دستور اور چلن کے معنی میں مستعمل ہے - رسموں کی زندگی بے شبہہ خاص خاص زمانے تک رہتی ہے پھر اُن میں کمی بیشی ہوتی ہے - رسمیں امیر اور دولتمند عورتوں کا دل بہلاوا ہیں اور ضروری بھی نہیں ہوتی ہیں - متوسط درجے کے غریب لوگ اُن میں ترمیمیں کرتے رہتے ہیں میری نظر اُن رسموں کی طرف گئی جن سے محاورات بنے ہیں - اس میں شبہہ نہیں کہ بہت سی رسمیں ترک ہو گئیں اور ہوتی جاتی ہیں - لیکن جو محاورات اُن سے بنے ہیں وہ ہمارے اُردو لٹریچر کا ایک ضروری جزو ہوگئے ہیں متقدمین کے کلام نثر و نظم میں اُن کی تلمیحیں موجود ہیں لہذا اِس مختصر مضمون میں اُن رسموں کو لکھتا ہوں جن کے جاننے سے اصل محاورے کی حقیقت اور معانی واضح ہو جاتے ہیں - ہر رسم کو مختصراً بیان کر کے وہ محاورات لکھدیئے ہیں جو اُن سے بنے ہیں -

(واضح ہو کہ اس مضمون میں مسلمانوں کی رسموں کا ذکر ہے) -

حمل کے آثار میں امور ذیل ہیں :—

۱ - ہاتھ پاؤں ٹوٹنا - سستی اور کاہلی ہونا - سونے اور پڑے رہنے کو جی چاہنا -

محاورات ذیل حاملہ ہونے کے معانی میں مستعمل ہیں :—

پاؤں بھاری ہونا - دو جیا ہونا - پیٹ رہ جانا* - امید سے ہونا -

۲ - حاملہ عورت کو گوشت سے نفرت ہو جاتی ہے اور کھٹی میٹھی اور چٹپٹی چیز کو جی چاہتا ہے اِس لیے کہتے ہیں کہ جی چاہتا محاورہ ہوگیا-

۳- حمل کا ساتواں مہینہ جب ہوتا ہے میکے کی طرف سے سَدھوڑا آتا ہے (سدھوڑا ہندی میں سات چیزوں کو کہتے ہیں) جس میں سات طرح کی ترکاریاں میوے اور پکوان ہوتے ہیں - سہ پہر کے وقت حاملہ کی گود بھری جاتی ہے یعنی اُس کو دلہن کی طرح آراستہ کر کے مسند پر اُس کی گود میں کھانے کے پھل، میوے، ناریل وغیرہ ڈال دیتی ہیں گویا شگون ہے کہ ہمیشہ گود ہری بھری رہے اِس رسم کا نام گود بھرنا ہے - لکھنؤ میں بیگمات کی زبانوں پر سدھوڑا دہلی میں سَدَھوڑ سَدَھوڑا ہے قصبات میں اِس جگہ سدھوڑی معانی ذیل میں مستعمل ہے :-

۱ - وہ سات طرح کا پکوان جو ستواسے میں دلہن کے میکے سے میوے اور چند قسم کی ترکاریوں کے ساتھ آتا ہے -

۲ - حمل کے ساتویں مہینے حاملہ کا میکے سے سسرال آنا - ستواسا - اِسی گود بھرنے کی رسم کا نام ہے اور اُس بچے کو بھی کہتے ہیں جو ساتویں مہینے پیدا ہو - بعض خاندانوں میں نویں مہینہ گود بھرنے کی رسم ادا کیجاتی ہے اور اُس کو نوماسا کہتے ہیں - اور بعض خاندانوں میں گود بھرنے کی رسم ساتویں اور نویں مہینہ یعنی دو بار کیجاتی ہے -

۴ - نوماسے کے بعد حاملہ اپنے گھر یعنی میکے جاتی ہے اور اِسکو پاؤں پھیرنے جانا کہتے ہیں -

---

نوٹ—پیٹ رہ جانا مترادف الفاظ میں ہے - لیکن اس میں تحقیر کا پہلو ہوتا ہے -
حمل عربی میں بالفتح ہے - سودا نے بفتح اول و دوم کہا ہے اور زبانوں پر بھی اسی طرح ہے-
جانِ صاحب—دائی یقیں دل کو ہے گو جائیگا حمل - ننھا سا لڑکا خواب میں کل پیٹ مل گیا

۵ - اکثر بچے سر کے بھل پیدا ہوتے ہیں اور بعض پاؤں کے بھل، جو پاؤں کے بھل پیدا ہوتے ہیں اُن کو پایل کہتے ہیں - عورتوں کا عقیدہ ہے کہ ایسے شخص کے لات مارنے سے کمر کی چک دفع ہو جاتی ہے :—

خانصاحب—پایل ہے دو گانا ذرا ٹھوکر تو لگا جا
چک آئی ہے اُٹھا نہیں جا تا ہے کمر سے

۶ - بچے کے پیدا ہوتے ہی اُس کی نال کلاوے سے باندھکر چاقو سے کاٹ دیتے ہیں کلاوہ بچے کے گلے میں لٹکا دیتے ہیں - اور کٹے ہوئے نال کو بیشتر زچہ خانے ہی میں اور کبھی کبھی گھر کے کسی اور حصے میں دفن کردیتے ہیں عموماً یہ خیال ہے کہ مولود کو اُس جگہ یا مکان سے خاص تعلق اور اُنس ہوتا ہے جس میں اُس کا نال گڑا ہوتا ہے - چنانچہ نال گڑنا خاص تعلق ہونا، خصوصیت ہونا، کے معنی میں مستعمل ہے :—

منیر—اُسی ویرانے میں پھر پھر کے رہا کرتا ہے
دل میں کیا نال* گڑا ہے بت ہرجائی کا

امیر—نکلتے ہی نہیں مسجد سے واعظ
خدا کے گھر میں نال اُن کی گڑی ہے

نال - وہ لانبی سی آنت جو پیدا ہوتے وقت بچے کے ناف سے لٹکی ہوئی ہوتی ہے -

۷ - لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں دستور ہے کہ جس ٹھیکری میں اُسے نہلاتے ہیں آپس کی رضامندی سے اُسی میں لڑکے کی ماں ایک روپیہ ڈال دیتی ہے جس کا یہ منشاء ہوتا ہے کہ یہ لڑکی ہمارے لڑکے کی منگیتر ہوگئی -

۸ - جب سے بچہ ہوتا ہے زچہ کے سرھانے لوہے کی چیزیں جس میں

نوٹ—نال کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے - دہلی میں مؤنث اور لکھنؤ میں مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے - بیگمات لکھنؤ کی زبانوں پر تانیث ہی کے ساتھ ہے -

کجلوٹی بھی ہوتی ہے ضرور رکھتے ہیں اور عورتوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے بچہ بھوت پریت اور آسیب کے خلل سے محفوظ رہتا ہے -

۹ - بانگ دینا - جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے کان میں آہستہ آہستہ کلمات اذان کہتے ہیں اس فعل کا نام بانگ دینا ہے بانگ دینے والے کو قند دیتے ہیں -

۱۰ - بچہ جس روز پیدا ہوتا ہے اُس روز سے چھٹہ روز تک زچہ کو سونے نہیں دیتے اور اس غرض سے زچہ کے پلنگ کو اکیلا نہیں چھوڑتے' انگیٹھی پر انگیٹھی روشن رہتی ہے - چھٹہ روز تک باری باری سے متعدد عورتیں جاگتی اور زچہ گیریاں گاتی ہیں -

زچہ خانہ - وہ مقام جہاں بچہ پیدا ہوتا ہے -

ناسخ—بال گرتا ہے کبھی اور لاس گرتی ہے کبھی
جو زچہ خانہ ہے وہ اک روز ماتم خانہ ہے

زچہ - (فارسی میں بفتح تشدید حرف دوم ہے اردو میں فصحا بھی اسی طرح بولتے ہیں عوام بتشدید بولتے ہیں) وہ عورت جس نے بچہ جنا ہو - ایسی عورت کو چالیس روز تک زچہ کہتے ہیں - اور سات دن تک آلی زچہ

جانصاحب—زچہ کی جان کا رہنا ہے ڈر اے جان جنتے میں
خدا ہی کام ہے ربّی کے آیا ایسی مشکل میں

زچہ گیریاں - وہ گیت جو زچہ خانے میں گائے جاتے ہیں -

۱۱ - جس روز سے بچہ پیدا ہوتا ہے نکتی یعنی بلّی کو زچہ خانے میں نہیں آنے دیتے غالباً اِس خیال سے کہ وہ دفن کیے ہوئے نال کو نہ کھا جائے - یا اِس خیال سے کہ بلّی کی بھیس میں جن اور آسیب نہ ہوں -

۱۲ - بچے کو اول دن شہد - دوسرے دن گُھٹّی - تیسرے روز دودھ پلاتے ہیں بیشتر چھٹی تک پھوپھی سے دودھ پلاتے ہیں -

گُھٹّی میں پڑنا ـ کسی چیز کے استعمال کا بچپن سے عادی ہوجانا ـ سرشت میں داخل ہو جانا کی جگہ مستعمل ہے ـ

شاد ـــ چھڑاؤں واعظو کیا مے پڑی ہے میری گھٹی میں
وہ میخوار ازل ہوں دختِ رز کا جس نے سر ڈھانکا

ناسخ ـــ طفلی ہی سے ہے شوق شراب آب کے مانند
گُھٹی میری پیری میں بھی زنہار نہ چھوٹی

۱۳ ـ چھٹی ـ ولادت کے چھہ روز کے بعد چھٹی نہلاتے ہیں ـ زچہ نہا دھوکر سنہری پٹی سر سے باندھہ اور اعلیٰ درجے کی پوشاک پہن کر بچے کے سر کو قصابے سے باندھکر دلھن سی بنی ہوئی پلنگ پر بیٹھتی ہے ـ اور مبارک باد کے گیت گائے جاتے ہیں ـ اُس روز برادری کی تمام عورتیں جمع ہوتی ہیں تیسرے پہر کو میکے سے چھٹی جسے چھوچھک بھی کہتے ہیں آتی ہے ـ چھٹی میں سونے خواہ چاندی کے کڑے ـ بچے کے گھونگھرو ـ چاندی کے چٹّے بٹّے جُھنجھنا ـ جُھنجُھنے ؟ کرتا ؟ ٹوپی وغیرہ ہوتا ہے ـ بچے کے ماموں کی طرف سے ہنسلی ؟ کڑے؟ خالہ کی طرف سے کرتے ٹوپی کا رواج ہے ـ چھٹی کے روز ماں یا دایہ کا دودھہ بغیر پھوپھی کے دیا جاتا ہے جس کے اِس طرح پینے میں بچے کو دقّت ہوتی ہے ـ اس واسطے چھٹی کا دودھہ یاد آنا کمال دقت اور پریشانی میں گِھر جانے کے معنی میں مستعمل ہے ـ

رشک ـــ فکر بندش میں چھٹی کا دودھہ یاد آیا کیا
غوطے کھائے سیکڑوں مضمون جوئے شیر میں

چھٹی کا کھایا پیا نکلنا ـ گذشتہ آرام و راحت کی کسر نکلنا ـ
چھٹی کے پوتڑے اب تک نہیں سوکھے ـ ہنوز نا تجربہ کار ہے ؟ کی جگہ ـ
چھٹی نہانا ـ بچہ ہونے کے چھہ روز بعد کا غسل کرنا ـ

۱۴ ـ عقیقہ یا موئے ـ عربی میں وہ بال جو بچے کے سر پر پیٹ میں پیدا ہو جاتے ہیں ـ وہ قربانی جو بچّے کی پیدایش کے پہلے ہفتے

میں کی جاتی ہے - پیدایش سے ساتویں دن بچے کے بال منڈوائے جاتے ہیں اور اُن بالوں کے برابر چاندي خیرات کی جاتي ہے - اِسي تاریخ کو بچّے کا نام بھي رکھا جاتا ہے - بیٹے کے واسطے دو بکرے اور بیٹي کے واسطے ایک بکرا بطور صدقه ذبح کرتے ہیں -

۱۵ - زچه کا تارے دیکھنا - چھٹي کي رات کو زچه‌خانے کے پاس چوکي بچھاتے اور اُس چوکي پر زچه بچه دونوں کو لاتے ہیں زچه ، بچّے کو گود میں لے کر زچه خانے سے باہر آتی ہے دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لیے ساتھ ہوتی ہیں - دائي آتے کي چومک لیے آگے چلتی‌ہے- زچه بچے کو گود میں لے کر اور قرآن شریف سر پر رکھکر آسمان کي طرف دیکھتي اور چوکي پر کھڑي ہو کر سات ستارے گنتي ہے اُس وقت دونوں تلواروں کي نوک سے نوک ملا کر زچه کے سر پر قوس بناتي ہیں تا که اُوپر سے جن اور پري کا گزر نه ہو -

امیر—واہ کیا شکلیں ہیں قائل ہیں یه تصویروں کے
دیکھو نکلي ہے زچّه سایه میں شمشیروں کے

جس وقت زچه تارے دیکھتي ہے اُس وقت بچے کا باپ تیر کمان لے کر زچه کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پڑوسي بسم للہ کہکر چھت پر تیر لگا کر گویا فرضي مرگ مارتا ہے اِسي رسم کا نام مرگ مارنا پڑ گیا ہے-

اب یه دونوں رسمیں صرف شہزادوں میں باقي ہیں -

شاہ نصیر نے جب بہادر شاہ کے یہاں شہزادہ پیدا ہوا اِس رسم کا ذکر کیا ہے-
وہیں پھر شاہ نے یه رسم کي واں - چھپرکھٹ پر قدم رکھه ہو کے شاداں
ادا کر حرف بسم اللہ سارا - کمان و تیر لے کر مرگ مارا
نمودار اس طرح تھا سقف میں تیر - فلک پر کہکشاں کی جیسے تحریر

اب صرف تارے دکھانے کي رسم باقي ہے - اور مرگ مارنے اور زچه کي تلواروں کے ساتھه سایه میں لے کر چلنے کي رسمیں متروک ہیں -

۱۶ - رتجگہ - جسے لکھنؤ میں خدائی رات کہتے ہیں ، چھٹی ، دودھ چھٹائی ، سالگرہ ، بسم اللہ ، اور بیاہ کے موقعوں پر ہوتا ہے - رات بھر گلگلے دئیے جاتے ہیں اور اللہ میاں کا رحم بٹھایا جاتا ہے اور مسجدوں کے طاق بھرے جاتے ہیں -

رحم - ایک قسم کا چاولوں کا کچا حلوا ہوتا ہے - جس کو لڈو کی شکل کا بھی بنا لیتے ہیں گلگلوں اور رحم پر نیاز دلوائی جاتی ہے -

۱۷ - چہ پا چھلا - بچہ کا چالیسویں دن کا نہان جس کو بڑا چلہ بھی کہتے ہیں عموماً اِس تقریب میں چھٹی سے زیادہ دھوم دھام ہوتی ہے -

۱۸ - عورتیں بچے کے بہلانے کے لئے چاند کو چندا ماموں کہتی ہیں -

۱۹ - عورتیں اکثر رات کو بچوں کے بہلانے اور کھلانے کو اپنا ہاتھ چراغ کی لو کی طرف لے جاتی اور اُدھر سے ملتا کر وہی ہاتھ بچوں کے منھ پر پھیرتی ہیں اور یہ الفاظ بطور دعا زبان سے کہتی جاتی ہیں ، اَکّھو مَکّھو میاں کو اللہ رکھو ،

شعر—دیکھ منھ تک ہتیلی آتی ہے
اکھو مکھو سبھی کو بھاتی ہے

۲۰ - بِہائی - بچہ اگر سوتے میں ہنستا ہے تو کہتی ہیں کہ بِہائی ہنساتی ہے -

بہائی - سنسکرت میں وہ روح جو خوشی اور غم کی باتیں کہہ کے دودھ پیتے بچوں کو سوتے جاگتے ہنساتی رلاتی ہے - اُردو میں وہ خوف جس کو دیکھ کر بچے سوتے میں ہنسنے لگتے ہیں —

شعر—افسوس بہائی نے بھی مجھکو
طفلی میں نہ عشق کی خبر کی
طرفہ غمگین ہوں کہ روتی گئی وہ آہ شعور
آتی طفلی میں بِہائی جو ہنسانے مجھکو

قلق نے سہواً بہائی کی جگہ بے حیائی کہا ہے -

روتے رُوئے جو ہنسد آتی تھی

بے حیائی اُسے ہنسائی بھی

۱۲---دانتوں کے نکلنے کی رسم - جب بچے کا پہلا دانت نکلتا ہے خسخاس کی میٹھی گُھنگُھنیاں تقسیم کرتے ہیں اور اُسکو دانت گھنگھنی کہتے ہیں -

جب دودھ پیتے بچے کے دانت نکلنے کے قریب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بچہ دانتوں پر ہے - دودھ کے دانت ٹوٹتے ہیں - تو اُن کو چوہے کے بل میں ڈالتے ہیں تا کہ بچے کے دانت بھی چھوٹے چھوٹے چوهیا کی دانتوں کی طرح خوشنما نکلیں -

دودہ کے دانت - وہ ملائم دانت جو شیرخوارگی کے زمانے میں نکلتے ہیں -

دودہ کے دانت نہیں ٹوٹے ہیں - نادان اور ناتجربہ‌کار ہونے کا کنایہ ہے -

شوق قدوائی---سمجھا ہے میرے اسکوں سے جو رخ چھوٹے ہیں

دودہ کے دانت ابھی ستم کے نہیں ٹوٹے ہیں

۲۲---سالگرہ - جس روز بچہ سال بھر کا ہوتا ہے تو ایک کشتی میں شیرینی اور کلاوہ کسی بڑے بوڑھے کے آگے رکھتے ہیں وہ نیاز دیکر اور بسم‌اللہ کہہ کے کلاوے میں ایک گرہ لگا دیتا ہے -

سلاطین و اُمرا عمر طبعی کے ہر نئے سال شروع ہونے کی تاریخ جشن کرتے ہیں - ہندستان میں بھی سالگرہ کے دن ہر سال ایک کلاوے میں گرہ لگا دیتے ہیں اور نذر و نیاز اور فاتحہ کے بعد شیرینی تقسیم کرتے ہیں -

۲۳---دودہ بڑھانا - کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ تین سال کے بعد دودہ چھڑاتے ہیں اور اس رسم کو دودہ بڑھائی اور فعل کو دودہ بڑھانا کہتے ہیں -

میر حسن—وہ گل جب کہ جوبھے برس میں لگا
بڑھایا گیا دودھ اُس ماہ کا

اوج—آب دیکاں سے ہوئی دودھ بڑھائی حس کی
خیمہ سے دست کے سرماں نکل آئی حس کی

اِس تقریب میں ننھیال اور ددھیال کے اعزا جمع ہوتے اور کھچوریں مَلتے اور بچے کو دیتے ہیں - دائی کھلائی کو انعام و اکرام اور جوڑے ناگے دئے جاتے ہیں -

۲۴—ختنہ - (عربی میں ختن بالفتح ختنہ کرنا) یہ رسم شرعی ہندستان کے مسلمانوں میں بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتی ہے یہ رسم سنہ یہر کو ہوتی ہے - اکثر ختنہ کرنا نائی کا کام ہے لیکن اب تو ڈاکٹروں سے ختنہ کرایا جاتا ہے جس میں اکثر خطا ہوتی ہے - جب بچہ کا زخم اچھا ہو جاتا ہے اُس کو دولہا بناتے اور گھوڑے پر چڑھا کر باجا بجاتے کسی بزرگ کی درگاہ میں لیجاتے ہیں - ختنہ کو سنت اور مسلمانی بھی کہتے ہیں -

۲۵ - ناک کان چھیدوانے کی رسم - بیشتر پانچ چھہ سال کی عمر میں لڑکیوں کے ناک کان چھیدے جاتے ہیں - ناک چھیدنے کے لئے بائیں جانب کا نتھنا کیل یا نتھہ پہننے کے واسطے چھیدا جاتا ہے - اور ہر ایک کان میں نیچے کیطرف تین تین سوراخ اور اوپر کی جانب چار چار بالے بالیاں بُندے پہننے کے لیے کیے جاتے ہیں -

۲۶ - بسم اللہ کی شادی - بچہ جب ساڑھےچار برس کا ہوتا ہے اسی تقریب سے مکتب نشینی کی ابتدا ہوتی ہے -

بچے کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھہ سورۂ علق کی آیتیں پڑھاتے ہیں بعدہ "مبارک سلامت" کی دھوم ہوتی ہے - اس تقریب میں

حیثیت کے موافق دھوم دھام کرتے ھیں اس کو مکتب بھی کہتے ھیں -

آمین - ھدیہ - بچہ قرآن شریف ختم کرتا ھے تو بڑی خوشی کرتے ھیں استاد کو انعام و اکرام و خلعت اور احباب اور اعزا کو شیرینی تقسیم کرتے ھیں - اُس کو دھلي میں ھدیہ اور لکھنؤ میں آمین اور آمین کی شادی کہتے ھیں -

۲۷ - روزہ - جب بچہ سات یا نو یا گیارہ سال کا ھو جاتا ھے تو اُسے روزہ رکھواتے ھیں اور وہ بھی ایک چھوٹی سی تقریب ھوتی ھے -

روزہ کشائی - دھلی میں بہ معنی افطاری ھے —

داغ—قسمت ھي میں زاھد کے ھیں دن رات کے فاقے
کیا پیر مغاں روزہ کشائي بھی دیتا

لکھنؤ میں روزہ کھلوانے کی تقریب کا نام ھے —

سحر—زاھدو دعوتِ رندان ھے شراب اور کباب
کبھي میخانے میں بھی روزہ کشائی ھو جائے

۲۸ - موچھوں کا کونڈا - بچے کا سن جب ۱۷ - ۱۸ سال کا ھوجاتا ھے اور اُس کی مسین بھیگنے لگتي ھیں تو موچھوں کا کونڈا کیا جاتا ھے - لڑکے کي موچھوں پر گھسا ھوا صندل انگلی سے نہیں بلکہ روپئے سے لگاتے ھیں - یہ تیار سونیوں پر ھوتی ھے - اِس رسم میں بھی نقد کي رقم نذر جمع کیے جاتے ھیں - مسین بھیگنا — سبزہ آغاز ھونا — وہ سبزي نمایاں ھونا جو ڈاڑھی موچھوں کے نئے بالوں کے نکلنے سے ظاھر ھوتی ھے -

جانصاحب—اُتھنی کونپل ھے جوانی کی نیا ھے انداز
ھونٹ نیلے ھیں مسیں بھیگنی سبزہ آغاز

۲۹ - بات - منگنی - نسبت -

ھندستان میں لڑکے والے کی طرف سے نسبت کا پیغام جاتا ھے -

جس جگہ پیغام دینا ہوتا ہے وہاں کے افسر خاندان کے پاس سبت کے رقعہ سے پہلے ایک سخ کاغذ در خاندانی حالات لکھ کر مشاطہ کے ذریعے سے بھیجتے ہیں - اِس کاغذ میں خاندانی حالات، چال چلن، آمدنی وغیرہ اور لڑکے کی علمی قابلیت درج ہوتی ہے - اِس کاغذ کو اِسم نویسی کہتے ہیں - اِسم نویسی کے جواب میں اگر رضامندی کا اشارہ معلوم ہوا تو رقعہ بھیجتے ہیں -

بات آنا - سبت کا پیام آنا :--

طلسم اُلفت--دھوم بستی بے یہ مچائی ہے
دختر ور کی بات آئی ہے

بات ٹھہرانا--سبت ٹھہرانا - بات ٹھہرنا - منگنی قرار پانا :--

طلسم اُلفت--بات بھی ٹھہری ہے کہیں اُن کی
آپ کو فکر کچھ نہیں اُن کی

بات جانا--منگنی کا پیام جانا -

شعور--فرحت عید کو سبت نہ رہی شادی سے
جس کے گھر رقعہ گیا اور بڑی بات گئی

۳۰ - فریقین کا اِطمینان ہو جاتا ہے تو منہ میٹھا کرنے کا دن مقرر کر کے دولھا کی طرف سے چند عورتیں دلھن کے گھر مٹھائی کے خوان اور چڑھاوا لے کر جاتی ہیں - مٹھائی کی مقدار حیثیت کے مطابق ہوتی ہے اِسی رسم کو منہ میٹھا کرنا کہتے ہیں -

چڑھاوا - اُس زیور کو کہتے ہیں جو منگنی یا برات کے روز دلھن کو دولھا والوں کی طرف سے دیا جاتا ہے اُس میں بیشتر سونے کی انگوٹھی یا چاندی کا چھلا ہوتا ہے -

نشان چڑھانا - منگنی کے روز انگوٹھی، چھلا وغیرہ منسوبہ کو پہنانا -

خان صاحب—انگوٹھی ایسی بنائے نہیں دمامیہ کی
چڑھانا سم نے ہے سمدھن بہت نسان حراب

۳۱ - بیاہ مانگنا - جب نکاح کرنے کا زمانہ آجاتا ہے تو دولہا کی طرف کی عورتیں امیروں میں باجے گاجے کے ساتھ مٹھائی کے خوان ساتھ لیکر اور غریبوں میں چپ چاپ منسوبہ کے گھر جاتی اور تاریخ ٹھیرا کر واپس آتی ہیں اس کو بیاہ مانگنا کہتے ہیں -

۳۲ - مانئوں بٹھانا - جب بیاہ کے سات یا گیارہ روز رہ جاتے ہیں تو قریبی رشتہ دار عورتوں کو جمع کر کے دلھن کا کرتا - پیجامہ - دوپٹا زرد رنگتے ہیں بینڈیاں بناتے ہیں اور اس روز منسوبہ کو زرد کپڑے پہناتے ہیں اور مکان کے کسی کوٹھے در بٹھاتے ہیں - اب اُس کی صحبت میں دن ساتھی ہمعمر لڑکیاں رہتی ہیں -

ملائی - (قصبات میں) برات سے دو روز بستر عروس کے نیل لگایا جاتا ہے - اس رسم کو ملائی کہتے ہیں (وغیرہ) آج ملائی کل سہاگ پرسوں برات ہے -

۳۳—شادی سے دو تین روز پہلے دولھا بھی علحدہ مکان میں بٹھایا ہے اُس کو مانجھے بیٹھنا کہتے ہیں دولھا دلھن کی گھر والیاں سہاگ گاتی ہیں -

سہاگ - (ھ - سو - اچھا - بھاگ - قسمت سنسکرت میں بمعنی خوش ؟ خوش قسمتی ہے) -

یہ لفظ معانی ذیل میں مستعمل ہے :—

۱ - خاوند کی حیات کا زمانہ -

۲ - ایک قسم کے خاص گیت جو شادی بیاہ میں گائے جاتے ہیں دھلی میں ان گیتوں کو سہاگ گھوڑیاں کہتے ہیں :—

میر حسن—اِدھر کا تو یہ رنگ تھا اور یہ راگ
محل میں اُدھر گھوڑیاں اور سہاگ

۳ - وہ تمام زیور اور چیزیں جو سہاگن ہونے کی حالت میں عورتیں پہنتی اور اِستعمال کرتی ھیں جیسے نتھ - مہندی - مسّی وغیرہ -

سہاگ رات—شب زفاف - اِس کو بیاہ کی رات بھی کہتے ھیں —

جان صاحب—آئی جب کلموھی وہ بیاہ کی رات
ناچی ھمسایہ نے سکھائی نہ بات

۳۴ - اُبٹن - ایک خوشبودار مسالا ھے جس کے اِستعمال سے رنگ نکھرتا اور بدن میں خوشبو دیر تک رھتی ھے یہ ھلدی اور جو کے بھنے ھوئے آٹے، کھلی، چھیل چھبیلے، ناگر موتھا، بچ، بالچھڑ اور بیر تات سے مرکب ھوتا ھے اور تیل ڈال کر پانی میں گھولا جاتا ھے - لکھنؤ میں اُبٹن دھلی میں بٹنا اور اُبٹنا ھے —

تسلیم لکھنوی—کیوں نہ غیرت سے مرا دل اے وفا دشمن ملے
روز تو نکھرے نہائے روز غیر اُبٹن ملے

داغ دھلوی—دامن سے رشک گل کی اُڑی باغ میں جو خاک
بٹنا وہ مل گئی ھے عروس بہار

مانجھوں بیٹھنے کے بعد دولہا دلھن کے اُبٹن روز ملا جاتا ھے -

اُبٹن کھیلنا - عموماً دولہا دولھن کے مانجھے بیٹھنے کے بعد اور خصوصاً ساچق کے روز اُبٹن بڑی بڑی لگنوں میں گھولتے اور دونوں گھروں میں عورتیں عورتوں کے اور مرد مردوں کے اُبٹن لگا کر بڑی گت بناتے ھیں - اُبٹن کھیلنے کا رواج بیشتر اُن لوگوں میں ھے جن میں آپس میں مذاق ھوتا ھو جیسے سالے بہنوئی - نند - بھاوجیں -

۳۵ - بَری - ساچق - (بری بر بمعنی شوھر) ساچق ترکی میں بکسر حرف سوم اُردو میں بفتح سوم ھوگیا ھے - بعض شہروں میں برات

سے ایک دن پہلے اور قصبات میں برات کے روز دولہا کی طرف سے دولہن کے یہاں کپڑے ، زیور ، میوہ ، مٹھائی ، ناریل رنگین سر بند تھیلیاں ، سہاگ پڑا ، پھل پھل ، دان اور کھلونے جاتی ہیں - تھالیوں میں سفید شکر چھوارے ناریل - کشمش - بادام - مہندی کوزہ نبات ہوئے ہیں - جوڑوں زیور اور میوے کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے - اپنے اپنے مقدور پر ہے جوڑے مع زیور واپس آتے ہیں باقی سب چیزیں عروس کے یہاں رہتی ہیں ایک جوڑا جو سب میں بہتر ہوتا ہے اور پاپوش عروس کو پہنا کر رخصت کرتے ہیں —

جان صاحب — جوڑا بری میں آیا بڑی دھوم دھام کا

سہاگ پُڑا - کاغذ کا خوشنما پُڑا جس میں خوشبو کی چیزیں رکھ کر ساچق میں دولہن کو بھیجتے ہیں -

ساچق چڑھنا - جب بری دھوم دھام سے باجے گاجے کے ساتھ جاتی ہے اُس کو ساچق چڑھنا کہتے ہیں -

شربت پلائی ۱ - وہ نقد رقم جو برات یا ساچق کے روز دولہا اور دولہا کے لا رستے دار شربت پینے پر شربت کی تھالی میں ڈالتے ہیں -

۲ - وہ نیگ جو دولہا یا دلہن کی طرف سے نائی کو دیا جائے -

شربت پلانا ۱ - ہنگام کا نکاح سے پیشتر سب براتیوں کو شربت پلانا -

۲ - نسبت کرنا - شربت کے پیالے پر نکاح کر دینا - عربوں کی طرح صرف شربت پلا کر نکاح کر دینا -

۳۶ - (برات بر وزن نجات - بر - شوہر - رات آتا ہے) عوام کی زبانوں پر بارات ہے - یہ لفظ معانی ذیل میں مستعمل ہے - (۱) شادی

کا دن (۲) شادي کا حلوس ۔ دولها کي سواري کا جلوس آرایش کے ساتهه ۔

برات اُترنا ۔ براتیوں کا تهہرنا کسي مقام پر —

محسن—خوشی میں بهرے مومن و مومنات

احاطے میں رضواں کے اُتری برات

برات جانا ۔ شادی کے جلوس کا جانا - مجمع کا روانه هونا :—

داغ—ساتهه حوروں کے هے شہید ترا ۔ کیا عدم کو برات جاتي هے

برات چڑهنا - برات کے حلوس کا عروس کے گهر کو دهوم دهام سے روانه هونا ۔

برات کرنا ۔ شادي کے جلوس میں شرکت کرنا -

برات لیجانا ۔ براتیوں کو دولهن کے گهر لے جانا ۔

براتی ۔ وه جو دولها کي طرف سے برات کے حلوس میں شریک هو -

جانصاحب—کیسے هوئے هیں جمع براتي برات میں

ذوق—پہونچے براتیوں کے نه هرگز هجوم کو

انجم سے لاکهه جمع کرے لشکر آسماں

دلهن - (هـ - بر ورن ختن) عروس —

جلال—کیا شرمگیں نگاه سے کہتا هے دل نه پوچهه

راز و نیاز یار یه دولها دلهن کے هیں

اس کي جمع دلهنیں هے ۔

انیس—گردان کے پهر آنکهوں سے سهرے کو لگاؤ

دو چاند سی گهر میں دلهنیں بیاه کے لاؤ

بعض شعرا نے دولهن بهي کہا هے —

نواب مرزا شوق—عطر دولهن کا نه اِس طرح ملے رهتے تهے

بند محرم کے نه اِس طرح کسے رهتے تهے

دولهن کا عطر ۔ عطر عروس ۔ عوام عطر دولهن کہتے هیں -

۳۷ ـ صحنک ـ (ف ـ صحن ـ بڑا پھال ـ صحنک اُس کی تصغیر ھے) یہ لفظ دو معنی میں مستعمل ھے ـ

۱ ـ حضرت فاطمہ کی نیاز ـ

۲ ـ فاطمہ کا طباق یا کونڈا ـ

یہ نیاز حسکے یا زردے پر دلائی جاتی ھے ـ

صحنک کی اِیجاد چودھا بائی نے کی ـ نور جہاں جس کا نکاح شیر افگن کے بعد جہانگیر سے ہوا تھا چودھا بائی کو نظر حقارت سے دیکھتی تھی ـ چودھا بائی نے اُس کے ذلیل کرنے کو ایک روز تمام بیگمات کی دعوت کی حضرت فاطمہ کی نیاز دلوائی نیاز کے لیے خشکہ پکوایا کورے کورے کونڈوں میں رکھا ساتھ ترکاریاں رکھیں اور جب سب بیگمات جمع ہوگئیں بآواز بلند کہا "اِس صحنک کو وھی بیوی کھا سکتی ھے جس نے دوسرا خاوند نہ کیا ہو" ـ یہ سن کر نور جہاں سرمندہ ہوئی ـ اب یہ نیاز ہر ایک تقریب اور شادی کے موقع پر ہوتی ھے ـ اِس کے کھانے کے واسطے پاکدامن اور پارسا عورتیں نامزد کی جاتی ہیں دوھاجو اِس کو نہیں چھو سکتی ھے ـ

۳۸ــــ براٴت ـ

حجام نوشہ کو نہلا دُھلا کر بدن کا جوڑا لیتا ھے اُس کے بعد شاہانہ جوڑا پہنایا جاتا ھے ـ نیچے کرتا ـ کرتے کے اوپر انگرکھا یا اچکن یا شیروانی ـ سر پر دستار ـ دستار پر گوشوارہ ـ شہزادوں میں موتیوں کا طرہ اور سہرا ـ متوسط درجے کے لوگوں میں پھولوں کا سہرا پھولوں کا طرّہ ـ پھولوں کی بدّھی ـ

نوشاہ آراستہ ہو گیا تو زرور سے آراستہ گھوڑا لایا گیا ـ دولہا سوار ہوا اُس کے پیچھے شہبالا (دولہا کا چھوٹا بھائی یا کسی اور قریبی رشتہ دار کا لڑکا جس کی عمر کم ہو) ـ

دولہا کے ایک ہاتھ میں لگام دوسرے میں رومال منہ سے ڈھکا ہوا ـ

دولھا آگے بڑھا تمام براتی پیچھے پیچھے سب سے آگے باجا اور سب سے پیچھے رتھی سواریوں کے مخافے اِس شان سے برات چڑھی -

راستے میں آتھنّاں - چونّاں - پیسے لٹائے جاے اور آتشبازی چھوٹتی ھے جس وقت یہ جلوس دلھن کے دروازے پہونچتا ھے لوگ پیشوائی کو آتے ھیں دولھا اور سب براتی مردانے میں اور رتھی سواریاں زنانخانے میں اُترتی ھیں -

دولھا مسند پر زر در صدر میں بٹھایا جاتا ھے رومال اُس کے منھہ پر رھتا ھے اُس کے ھمعصر پہلو میں بیٹھتے ھیں - دلھن کے طرف سے کسنیوں میں دولھا کا جوڑا آتا ھے جس کو پہنتا کر نکاح ھوتا ھے - بدن کا جوڑا نائی کا حق ھے - دلھن والے قاضی صاحب کو بلاتے ھیں - قاضی صاحب کے آنے کے بعد دلھن والوں کی طرف سے ایک وکیل اور دو گواہ آتے ھیں - قاضی صاحب پہلے دولھا کے قریب بیٹھہ کر خطبہ پڑھتے ھیں جس میں حمد و نعت ؟ توحید و رسالت کی شہادت ھوتی ھے - اور خدا سے ڈرنے اور اُس کے احکام پر عمل کرنے اور عہد و قرار پر قائم رھنے کی ترغیب ھوتی ھے - عروس کا ولی جلسۂ نکاح میں نہیں آتا اپنی طرف سے وکیل کردیتا ھے - اور اس وکالت کے دو گواہ بھی مقرر کردیتا ھے -

شرعاً بالغہ عورت کے لیے ضرورت ھے کہ بلا واسطہ اجازت وکالت کی دے - حنفانچہ اب بھی قصبات میں پہلے وکیل اور گواہ عروس کے پردے کے باھر جا کر باآواز بلند اجازت حاصل کرتے ھیں ؟ عروس ھاں ھوں نہیں کرتی بلکہ رو دیتی ھے اور اِس سے اجازت مراد لی جاتی ھے - قاضی وکیل سے عروس کا نام؟ ولدیت وغیرہ دین مہر کی تعداد آھستہ آھستہ دریافت کرتا ھے - اور پھر دولھا سے کہتا ھے کہ مسماہ فلاں بنت فلاں کو بعوض اتنے دین مہر کے تمہاری زوجیت میں دیا تم نے قبول کیا - اُس کے جواب میں دولھا بعد تھوڑے وقفے کے کہتا ھے "قبول کیا میں نے" -

قاضي صاحب یه مضمون تین مرتبه آهسته آهسته دولها سے کہتے هیں اور اُس سے "قبول کیا میں نے" هر بار کہلاتے هیں - یه مضمون اس قدر دهیمی آواز سے کہا جاتا هے که وکیل اور گواه سن لیتے هیں- بقیه اهل مجلس مشکل سے سن پاتے هیں - اسي سوال و جواب کا نام ایجاب و قبول هے -

ایجاب وقبول کے بعد قاضي اور تمام اهل مجلس دعا کے واسطے هاتهه اُتهاتے هیں - اور حاضرین مبارک باد دینا شروع کرتے هیں - نکاح کے ختم هوتے هی دولها کے سر پر چهوارے لٹائے جاتے هیں اور قاضي صاحب کو حسب حیثیت دولها کا باپ نذر دیتا هے - بعد نکاح کے عروس کا جوڑا دولها کے طرف سے جاتا هے -

نوشاه - نوشه -

سہرا - (ه - سر - موتث) وه پهولوں کي لڑیاں جو دولها اور دلہن کے سر پر سے منهه پر لٹکائي جاتی هیں - شہزادوں اور والیان ملک کے یہاں سونے اور موتیوں کا سہرا عروس کے باندها جاتا هے -

٢ - وه نظم جو شعرا سہرا باندهنے کی تقریب میں کہتے هیں :—

ریاض—دهوم مچ جائے بزم نوشه میں - سوز اُٹهے جوب هی کہا سہرا

سہرا باندهنا - سہرا سر پر رکهنا دولها بنانے کے لیے -

سحر—رات گذري همیں دولها کی طرح فرقت میں

صبح کو آنسوؤں کے تار نے سہرا باندها

سہرا بنانا - موتیوں یا پهولوں کي مسلسل لڑیاں بنانا که سہرے کی صورت هوجائے —

دُرِ خوش آبِ مضامیں سے بناکر لایا

واسطے تیرے ترا دوں ثناگر سہرا

سہرا بندهائی - سہرا باندهنے کا نیگ جو بہنوئي کو ملتا هے -

سہرا دکهانا - شادي دیکهنے کا موقع نصیب کرنا -

سہرا دیکھنا ـ بیاہ دیکھنا ـ بیاہ رچانا ـ

سہرا گوندھنا ـ موتیوں یا پھولوں کو پرو کر سہرے کی شکل بنانا ـ

جلوہ ـ عربی میں بالفتح دکھانا ؟ شادی کرنا ـ بالکسر اپنے آپ کو خاص انداز سے دکھانا ـ عوام کی زبانوں پر بالضم ہے ـ

سہرے جلوے کی ـ (جلوہ اردو میں آرسی مصحف کی جگہ مستعمل ہے ـ پہلی رخصتی کو دولہا دلہن کو آمنے سامنے بٹھا کر آرسی مصحف دکھاتے ہیں ـ بیاہتا بیوی :ـــ

جانصاحب ـــ کیوں سَوت کی میں آگ میں جل جل کے مروں گی
ہوں سہرے نہ جلوے کی جو بھرنا میں بھروں گی

سہرے کے پھول کھلنا ـ (کنایہ) بیاہ کا وقت آنا ـ بیاہ ہونا
منیر ـــ دونوں دولہا دلہن خوشی سے ملیں
کہیں سہرے کے پھول جلد کھلیں

سہرے کی لڑی ٹوٹنا ـ عورتیں اس کو منحوس سمجھتی ہیں :ـــ
جانصاحب ـــ ہو خیر دلہن دولہا کی ماتھا مرا ٹھنکا
اچھا نہیں یہ ٹوٹنا سہرے کے لڑی کا

نوشاہ نوشہ (ف ـ نو ـ نیا ـ شاہ ـ داماد)
دولہا ـ جوتھی تک یہ خطاب دولہا کا رہتا ہے ـ

بیاہ (سنسکرت میں وواہ ـ بواہ) اُردو نظم میں پر وزن راہ فصیح اور بر وزن سیاہ غیر فصیح ہے :ـــ

داغ ـــ کرے اللہ عمر و دولت و اقبال روز افزوں
خدا وہ دن دکھائے لوگ دیکھیں بیاہ کی شادی

۱۴ ـــ ریت رسم ـ بعد نکاح کے دولہا عروس کے مکان میں بلایا جاتا ہے دولہا سہرا لٹکائے گردن جھکائے منہ پر رومال رکھے شرمیلی چال سے

آهسته آهسته قدم اُٹھاتے ہوئے ڈیوڑھی پر آتا ہے یہاں سے دولہا کی بہنیں دولہا کے سر پر آنچل ڈال کر اندر لیجاتی ہیں -

۱ — اُس وقت دلہن والیاں دلہن کے پاس بٹھا کر کالے تل اور شکر دلہن کے ہاتھہ پر رکھہ کر دولہا کے منہ سے چٹواتی ہیں - دولہا کو بغیر ہاتھہ لگائے زبان سے چاٹنا پڑتا ہے - یہ ایک قسم کا ٹوٹکا ہے - اور منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مطیع اور تابعدار رہے - چنانچہ اسی ٹوٹکے سے کالے تل چاٹنا محاورہ ہو گیا ہے - اور یوں اِستعمال میں ہے " کیا ہم نے ایسے ہی تمہارے کالے تل چاٹے ہیں جو تم سے آنکھہ نیچی کریں" -

۲ — دلہن کی جوتی پر کاجل پار کے دولہا کے آنکھوں میں لگاتی ہیں تا کہ ہمیشہ بیوی کے جوتی تلے رہے -

۳ — دلہن کے پاؤں کے نیچے کا پان دولہا کو کھلاتے ہیں -

۴ — دولہا کے ایک ہاتھہ سے مروجہ پسوایا جاتا ہے - مروج ، بالچھڑ چھیل چھبیلے ، کپور ، کچری ، صندل ، مسک دانہ وغیرہ خوشبودار چیزوں کا نام ہے - ایک ہاتھہ سے اِن چیزوں کا پیسنا کارے دارد ، دولہا پسینے پسینے ہو جاتا ہے اُس وقت سات سُہاگنیں اُس کی کُمک کو آتی ہیں - اور مل کر پسوا دیتی ہیں جب یہ پس جاتا ہے تو دولہا اور سہاگنیں دلہن کی مانگ میں بھر دیتی ہیں - بعض جگہ مانگ سینڈور سے بھری جاتی ہے - اور دولہا کا باپ اُسردي سے مانگ بھرتا ہے -

۴۰ — تو تاپیں جنوانا - تو تاپ ، بتاشے سے بگڑا ہوا ہے - تو تاپیں ڈومنی جنواتی ہے - پہلے دلہن کے سر پر مصری کی ڈلی رکھتی ہے اور دولہا سے کہتی ہے اِس کو منہ سے اُٹھا کر کھا جاؤ - جب دولہا سر کے پاس اُٹھا منہ لے جاتا ہے وہاں سے ہٹا کر

دوسری جگہ رکھہ دیتی ھے - جب سر کی ڈلیں تمسکل دولھا کھا لیتا ھے تو دو ڈلیاں مونڈھوں پر اور پھر کُہنّے کُہنیوں اور گھٹنوں پر رکھہ کر اسی طرح ڈھکاتی ھے -

۴۱ — آرسی مصحف - دولھا دلہن کوآمنے سامنے سر سے سر ملا کر بٹھاتے اور سرخ دوسالہ یا دوپٹا دولہن کے سر پر ڈال دیتے ھیں آئینہ اور قرآن شریف سورۂ اخلاص کے مقام پر کھول کر بیچ میں رکھہ دیتے ھیں عورتیں دولھا سے اصرار کرتی ھیں کہ دیکھو اور کہو بی بی میں تمھارا غلام ؟ آنکھیں کھولو - دولھا کہنے میں اعماض کرتا ھے آخر اُس سے دھینگا دھینگی کہوا ھی لیتی ھیں - دلہن جب اس پر بھی شرم سے آنکھیں نہیں کھولتی ھے تو منت سماجت کر کے سمجھاتے ھیں کہ آنکھیں کھول کر بی بی آئینہ دیکھہ لو - جب دلہن ذرا ذرا آنکھیں کھول دیتی ھے دولھا کہہ اٹھتا ھے کہ آنکھیں کھولدیں اور اپنے ھاتھہ کی انگوٹھی دلہن کے ھاتھہ میں پہنا دیتا ھے :—

فلق—سو نہ عورتوں کا چار طرف
جلد دکھلاؤ آرسی مصحف

۴۲ - جہیز (عربی میں بکسر اول و دوم جہاز کا اِمالہ ھے) عوام دھیز اور داج دھیز کہتے ھیں - وہ اسباب جو لڑکی کو شادی کے وقت میکے سے ملتا ھے - بیشتر گھر بار کی ضروری چیزیں اور گھر داری کے سامان سے مراد ھوتی ھے جو ھر شخص اپنی حیثیت کے موافق بیٹی کو رخصت کے وقت دیتا ھے - اس میں سات سے لے کر اکیس تک بھاری بھاری جوڑے ڈھرے بھرے گہنے ھوتے ھیں - علاوہ ضرورت کے مال بچہ ھونے کا سامان ؟ یعنی طشت ؟ چوکی ؟ زچہ خانے میں باندھنے کا سرخ پردہ بھی ھوتا ھے -

۴۳ ـ بابل - جسے دھلی میں منڈھا کہتے ھیں ـ گھر کے چھوٹنے کا ایک درد انگیز گیت جو عروس کے میکے سے پہلی رخصتي کے وقت گایا جاتا ھے ـ

۴۴ ـ جب دلہن کی سواري دولہا کے گھر پہونچتي ھے تو دولہا کي بہنیں دروازے رہائے مکان کے بند کرلیتي ھیں اور اُس کا نیگ لیتي ھیں دلہن گود میں اُتاري جاتی ھے اور اُس وقت منہہ دکھائي دي جاتي ھے اور کھیر چٹائي جاتي ھے -

روسمائي - وہ نقدی جو خاوند کے رسمے دار دلہن کا منہ دیکھہ کر دیتے ھیں -

کھیر چٹانا - یہ رسم اس طرح ادا کي جاتي ھے کہ عروس کي ھتیلي پر کھیر بھکي رکھہ کر اس میں اندار سے شکر ملاتے ھیں بعض مقامات پر دستور ھے کہ دولہا اپنے ھاتھہ سے چکھہ لیتا ھے اور بعضوں میں صرف اپنا ھاتھہ وھاں تک لے جاتا ھے اور چکھتا نہیں پھر میراثن وہ کھیر ایک پیالے میں رکھہ لیتي ھے اور اسي طرح سات مرتبہ کھیر عروس کے ھاتھہ پر رکھي جاتي ھے - اور ھر بار اس کو میراثن اپنے پیالے میں رکھہ لیتی ھے ـ اس وقت میراثنیں گیت گاتي ھیں -

۴۵ ـ پاؤں دھونا ـ اس وقت لوٹا اور طشت جو جہیز میں عروس کو ملتا ھے سامنے لایا جاتا ھے اور دوشیزہ عروس کے پاؤں طشت میں اُسی لوٹے سے دھوتا ھے اور یہ دھوون گھر کے چاروں کونوں پر ڈال دیا جاتا ھے اُس کو پاؤں دھلانا ـ پاؤں دھونا کہتے ھیں -

پاؤں دھودھوکے پینا ـ پاؤں دھو کے پینا ـ کمال مطیع ھونا - فرمانبردار ھونا ؛ کمال محبت اور اطاعت ظاھر کرنے کے لیے مستعمل ھے :—

غالب—غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہو -
پیتا ھوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

بحر — پلا دے اپنے ہاتھوں ایک دن اپنا اُلش مجھکو
پیوں دھو دھو کے تیرے پاؤں اے پیر مغاں برسوں

۴۶ - چوتھی - دوسرے دن دلھن کے بھائی جو عمر میں اُس سے چھوتے ہوتے ہیں چوتھی لیکر آے ہیں - چوتھي میں متھائي اور کھاجوں کے متکے ہوتے ہیں - تیسرے پہر کو دولھا اور دلھن کے مکان پر جاتے ہیں - دولھا کي سالیاں نوشه کي جوتی چھپا دیتي ہیں - اور جب تک اس کا نیگ نہیں لے لیتیں اُس کي جوتي نہیں دیتیں - اُس وقت چوتھي کھیلنے کي رسم ادا کي جاتي ہے - سالیاں دولھا کو پھولوں کی چھڑیاں مارتی ہیں اور وہ بھي پھولوں کی چھڑي ؟ سبز ترکاري سے مارتا ہے -

۴۷ - چالے - چوتھي کے بعد چار چالے ہوتے ہیں -

پہلا چالا ماں - دوسرا خالہ یا پھوپھی ؟ تیسرا نانی ؟ چوتھا دادي کي طرف سے اگر اِن رشتہ داروں نے نہ کیا تو باپ کو یہ چاروں چالے کرنا پڑتے ہیں - چالے اکثر جمعہ یا دوشنبہ کو ہوتے ہیں جس کي طرف سے چالے ہوتے ہیں اس کے یہاں دلھن اور دولھا کے کل عزیز رشتہ دار عورتیں مہمان ہوتي ہیں - اب یہ چالے بیشتر نوشہ کے باپ کي طرف سے ہوتے ہیں -

۴۸ - سفر - اگر دولھا کو سفر کرنا پڑے تو اس کو لازم ہے کہ سسرالي رشتہ داروں کے واسطے سوغاتي لائے؟ سوغاتي میں مختلف قسم کي چیزیں کم قیمت ہوتي ہیں -

نوشاہ کي سفر سے واپسی پر بیل ؟ ماش سسرال سے آتا ہے - وہ اُرد کے چار دانے تیل میں ڈال دیتا ہے اور وہ تیل ماش حلال خورے کو دے دیا جاتا ہے ؟ اس کے بعد دیدار پیر کا کونڈا ہوتا ہے -

پیر دیدار - عورتوں نے ایک فرضی ولي قرار دے رکھا ہے عورتیں جب کسي کے آنے کي آرزو ہوتي ہے تو کونڈا مانتي ہیں -

لذت عشق ۔ کوئي بولي آئے مرا مہ لقا
تو کونڈا کروں بیر دیدار کا

۴۹ ۔ میت کی رسمیں ۔

نزع کا وقت آتا ھے تو پتلیاں پلٹ اوپر ھو جاتی ھیں سانس بے قاعدہ چلنے لگتي ھے ۔ نبض کي رفتار بھي بے قاعدہ ھو جاتی ھے ۔ اس کو محاورات ذیل سے ظاھر کرتے ھیں —

پُتلیاں بدل جانا ۔
پُتلیاں اُلٹ جانا ۔
پُتلیاں پھر جانا ۔

یعنی نزع کے وقت پُتلیوں کا پلٹ اوپر ھو جانا ۔—

جلال—جلوہ نقاب اُلٹ کے جو تم نے دکھا دیا
غش آگیا اُلٹ گئیں دو چار پُتلیاں

امیر—پُتلیاں بھي بدل گئیں دم نزع ۔ وقت پر کوئي آشنا نہ ھوا ۔

جلال—اب تو خدا کے واسطے منہ پھیر کر نہ بیٹھ
آنکھوں میں دم ھے پھر گئیں اے یار پُتلیاں

آنکھوں میں جان اٹکنا ۔ آنکھوں میں جان آ جانا ۔ آنکھوں میں جان ھونا ۔ آنکھوں میں دم آنا ۔ آنکھوں میں دم اٹکنا ۔ تمام جسم سے دم نکل کے حسرت دیدار سے آنکھوں میں رک رھنے کی جگہ —

بحر—اب تو آنکھوں میں جان اٹکی ھے
دیکھ جا آ کے ایک نظر مجھکو

شرف—اے یار کسي طرح یہ رخصت نہیں ھوتی
آنکھوں میں تیرے دیکھنے کو جان اڑی ھے

آتش—اک رشک مسیحا کے تصور میں ھے یہ حال
آنکھوں میں ھے جان اور فنا دم نہیں ھوتا

داغ—دم میری آنکھوں میں اٹکا ہے کہ دیکھوں تو سہی —
کیا مسیحا سے مرے درد کا درماں ہوگا

آنکھوں میں جی کھنچ آنا ۔ آنکھوں میں جی آنا ۔ روح کا بدن سے نکل کر آنکھوں تک آجانا ۔ مرنے کے قریب ہونا —

میر—مرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ کہتے
کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا

اب یہ دونوں محاورے قلیل الاستعمال ہیں ۔

دم اُکھڑنا ۔ سانس* اُکھڑنا ۔ سانس کا بے قاعدہ چلنا ۔

داغ—دیکھ لینے کو ترے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمار غم ہجر میں کیا رکھا ہے

دم اُلٹ جانا ۔ نزع کی حالت ہونا ۔

جرأت—نہ جانا یہ کہ جانے سے کہیں کیونکر جیے گا وہ
کہ جس کا دم اُلٹ جاتا تھا میرے روٹھ جانے سے

دم درود نہیں ۔ ذرا طاقت نہیں ۔ قریب مرگ ہے ۔

سرور—اب عیادت کو آئے سود نہیں
دمِ آخر ہے دم درود نہیں

دم دُگدُگی میں ہونا ۔ (دُگدُگی ۔ حلقوم سینہ اور گلے کے بیچ کا گڑھا) نزع کا عالم ہونا —

انیس—جھیدیں وہیں گلا یہ لعینوں کے جی میں تھا
یاں کنٹھ بیٹھ جانے سے دم دُگدُگی میں تھا

دم لب یا لبوں پر آجانا ۔ جاں بلب ہونا :—

راسخ—شکوہ کرتا ہے زبانِ حال سے بیداد کا
کھنچ کے لب پر آگیا دم خنجر جلاد کا

---

* سانس لکھنؤ میں بالاتفاق مؤنث ہے ۔ دہلی والے مذکر بھی بولتے ہیں ۔

دم نکلنا - جان نکلنا -

دمِ واپسیں - آخری سانس جو مرتے وقت نکلتی ہے -

دم دیکھنا - سانس دیکھنا - بیمار کی حالت ردی ہوتی ہے تو اُس کی سانس دیکھتے ہیں کہ مسلسل جاری ہے یا اُکھڑگئی یا نہیں آتی :-

شرف—منہ ڈھانکنا تھا کوئی کوئی دیکھتا تھا سانس
شب بھر یہ حال سن کے مری داستاں رہا

سانس گننا - سانس کا شمار ہونا - نزع کا وقت ہونا - جب سانسیں گنی جاتی ہیں -

اوج—ہو سانس کا شمار بس اب وقت ہے اخیر
گر شدت عطش سے ہوا جاں بحق صغیر

نبض اُبھرنا - نبض ڈوب کر پھر چلتی ہوئی معلوم ہونا -

نبض ڈوبنا - نبض کی رفتار کا جاتا رہنا —

رضا—نبضِ مریض ڈوب کے اُبھری نہ شام غم
امید دل نے زور لگایا تو کیا ہوا

نبض نہ ملنا - نبضیں نہ ملنا - نبض کی حرکت محسوس نہ ہونا -

نبضیں چھوٹنا - نبضوں میں حرکت نہ رہنا —

محسن رح—طبیب آئیں بالیں پہ تو دم گھٹتیں
مری نبض دیکھیں تو نبضیں چھٹیں

جان بحق ہونا - مرجانا -

۵۰ - جب دم نکل جاتا ہے اور سکتے کا شبہہ ہوتا ہے تو آئینہ منہ کے سامنے رکھہ کر دیکھتے ہیں اگر آئینہ پر سانس کا اثر معلوم ہوتا ہے تو سکتہ ہی سمجھتے ہیں —

شعور—کہیں سکتا نہ عاشق کو ہوا ہو - اُسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا

۵۱ - مرد کے جنازے پر سفید چادر ڈالتے ہیں عورت کے جنازے پر گہوارہ باندھہ کر چادر ڈالتے ہیں - بیوہ ہو تو سفید اور سہاگن ہو تو رنگین-

گہوارہ - چارپائی کے دونوں پٹیوں میں کھپچیاں باندھہ کر محراب سی بنادیتے ہیں اور اُس کو گہوارہ کہتے ہیں -

۵۲ - قبر پر مردے کے سرھانے اُس کا شجرہ اور جواب نامہ رکھتے ہیں -

جواب نامہ - سفید کپڑے پر پنڈول مٹی سے حکم لکھتے اور اُس کو جواب نامہ کہتے ہیں -

قبریں دو قسم کی ہوتی ہیں :—

(۱) بغلی* - ایک لمبا گڑھا کھود کر اُس کے پہلو میں جانب قبلہ اندر ہی اندر قبر بناتے ہیں -

(۲) صندوقی - میت کے قد کے برابر لامبی اور قد آدم گہری ہوتی ہے -

لحد - جس بغلی گڑھے میں مُردے کو رکھتے ہیں اُس کو لحد کہتے ہیں -

۵۳ - مُردے کو قبر میں رکھنے کے بعد تختے سے بند کر کے مٹی دیتے ہیں -

مٹی† دینا - میت کو قبر میں اُتارنے کے بعد حاضرین کا تھوڑی تھوڑی مٹی لے کر قبر میں ڈالنا :—

ناسخ—کل نہ دے گا کوئی مٹی بھی اُنہیں - آج ,, جو کہ دیا کرتے تھے

مٹی ٹھکانے لگانا - مُردے کی تجہیز و تکفین کو حسب قاعدہ سر انجام دینا :—

ریاض—لگا دیتا کوئی مٹی ٹھکانے - ریاض اِک آرزو مُردہ پڑی ہے

مٹی عزیز کرنا—کنایہ ہے کسی مردے کے دفن میں شریک ہونے اور اپنے ہاتھہ سے دفن کرنے سے :—

---

* بغلی بسکون دوم و بفتح دوم دونوں طرح صحیح ہے -

بحر—وہ رنج پائے کہ مر مر کے زندگانی کی - بغل میں دل بغلی گور کا عذاب رہا -

† یہ لفظ بالکسر اور بالفتح دونوں طرح مستعمل ہے لیکن بالکسر صحیح ہے -

آتش — قبول خاطرِ مردم ہو سوتیا کیطرح
عرس تیری کریں سبخ و برہمن مٹّی -

۵۴ - قُل کے ڈھیلے - دفن کرنے کے بعد ڈھیلوں پر قل ھو اللہ پڑھہ کر پھونکتے اور اُن ڈھیلوں سے قبر پاٹتے ھیں -

شعور — گنج زر جس نے لٹایا نام روشن ہوگیا
قبر میں ہر قل کا ڈھیلا سانپ کا من ہو گیا

۵۵ - ماتمدار عورتیں - جب کوئی پرسا دیتا ھے تو میت کے صفات بیان کر کے روتی ھیں اُس کو بیان کرنا اور بین کرنا کہتے ھیں -

پلّا لینا - (عو) منہ ڈھانک کر میت پر رونا - ماتم کرنا -

پُرسا دینا - ماتم پرسی کرنا -

داغ — دلِ غمگیں کا اس بیکسی میں
دیا پُرسا کراماً کاتبیں نے

پُرسا لینا - میت کے وارثوں کا صبر اور دلاسے کی باتیں لوگوں سے سننا -

منہہ ڈھانکنا - منہ ڈھانپنا - منہ پر کپڑا ڈال کر رونا - بین کرنا :—

شاد — منہ بھی ڈھانپا میتِ عاشق نہ جو
دیکھہ کر آنکھیں کُھلیں شرما گیا

دھلی میں منہ ڈھانکنا اور لکھنئو میں دونوں محاورے مستعمل ھیں :—

شاد — نہ نکلا جب کوئی گریاں مَرے پر مجھہ پُر ارماں کا
ھزاروں آرزوؤں نے مری میت نہ منہ ڈھانکا

۵۶ - میت کے گھر والے تین روز تک چولھا گرم نہیں کرتے - اُن کے واسطے رشتہ داروں کے یہاں سے کھانا آتا ھے -

حاضری - (ا) وہ کھانا جو مردے کے وارثوں کو بعد دفن میت بھیجتے ھیں :-

بھجواؤ گھر میں سحر کے اے جان حاضری
بھوکا تمھارے دید کا کچھہ کھا کے مر گیا

اس کو کڑوی کھچڑی اور کڑوی روٹی بھی کہتے ہیں -

(۲) - وہ نقد رقم جو قریبی رشتہ دار میت کے وارثوں کو دیتے ہیں -

۵۷ - سوم - پھول - تیجا - دفن کے تیسرے روز رسم فاتحہ ادا ہوتی ہے اعزا اور احباب جمع ہو کر قران شریف پڑھتے اور چنوں پر کلمہ پڑھتے ہیں جتنے دس بارہ سفر ہوئے ہیں - جب چنے اور قرآن شریف ختم ہو جاتا ہے تو چنے ایک چادر میں اکٹھا کر کے اُس میں الائچی دانے ملا دیتے ہیں ؟ جب فاتحہ شروع ہوتا ہے ؟ ارگجا چنوں کے پاس رکھدیتے اور لوبان یا اگر کی بتی جلادیتے ہیں -

ارگجا—(ہ - بمعنی خوشبو ہے) اردو میں ایک مرکب خوشبو کا نام ہے - برادۂ صندل - کافور کو عرق گلاب میں ملا کر ایک پیالے میں رکھتے ہیں اور اس پیالے کو پھولوں کی بھری ہوئی رکابی میں رکھہ کر ہر فاتحہ خوان کے سامنے لے جاتے ہیں - وہ ایک پھول پر سورۂ اخلاص یعنی قل ھواللہ پڑھکر اُسی پیالے میں ڈال دیتا ہے - یہ پیالہ مردے کی قبر پر بھیج دیا جاتا ہے -

پھول - ہندوؤں میں مردوں کی ہڈیاں جل جانے کے بعد چن کر گنگا جی میں بہانے کے واسطے بھیجتے ہیں - مسلمانوں میں سوم ؟ تیجا کے معنی میں مستعمل ہے - اور اس کا فعل جمع میں آتا ہے —

میر—جب سے عاشق کے ہوئے پھول بہننا کیسا

کپڑے وسواس سے پھولوں میں بساتے بھی نہیں

سوم - (ف - بکسر اول و ضم ہمزہ بشکل واو - مرکب ہے سہ - م سے یہ میم الفاظ عدد میں نسبت کے واسطے آتا ہے) - تیجا —

امیر—عاشق کا سوگ چاہیے رینت نہ کیجیے

جہلم تو کیا سوم بھی ابھی تو ہوا نہیں

اردو میں زبانوں پر سُیم ہے —

منیر—بلبلوں کا سُیم نہیں اے گل
کیوں ترے منہہ سے پھول جھڑتے ھیں

۵۸ - سوگ - یہ لفظ فارسي اور هندي میں مشترک ھے رشتہ دار عورتیں ماتم میں چالیس روز تک پان کھانا ؟ مسي ملنا ؟ مہندي لگانا - رنگین لباس اور چوڑیاں پہننا ترک کردیتي ھیں - بیوہ عمر بھر کے لیے سب زینت کي چیزیں ترک کر دیتي ھے اس کو سوگ کرنا - سوگ منانا - سوگ رکھنا - سوگ میں بیٹھنا کہتے ھیں - سوگ اُتارنا - سوگ بڑھانا - ماتم کرنا - موقوف کرنا

شرف—شہیدِ یار کا اب وہ شاید سوگ اُتاریںگے
طلب ھے آئینہ سرمہ بھي رکھا ھے حنا بھي ھے

سوگن—غمزدہ عورت جو کسي کا سوگ کرتی ھے -

رنڈاپا—وہ زمانہ جو عورت پر بیوہ ہونے کے بعد گزرے -

رنڈ سالہ—وہ لباس جو عورت کو بیوہ ہونے پر شوھر کے ماتم میں پہناتے ھیں جب کوئي عورت بیوہ ھوجاتي ھے تمام کنبے کي عورتیں جمع ھو کر سفید جوڑا پہناتي اور چوڑیاں وغیرہ جو سہاگ کي چیزیں ھیں توڑ ڈالتي ھیں -

۵۹ - سوم کے بعد دسویں روز فاتحہ ھوتا ھے اس کو دسویں کا فاتحہ اور جو بیسویں روز ھوتا ھے اس کو بیسواں اور جو چالیسویں روز ھوتا ھے اُس کو چالیسواں کہتے ھیں -

۶۰ - چہلم—عوام کي زبانوں در چِہلُم ھے - صحیح چِہلُم ھے -

ذوق—عشق جاں منتظر ھونٹوں پہ ھے وہ شوخ کب آتا
اگر چہلم کو بھي آیا تو ہم سمجھینگے اب آتا

۶۱ - سہ ماھي - چھہ ماھي - برسي - اُن فاتحوں کو کہتے ھیں جو تیسرے مہینے - چوتھے مہینے - چھٹے مہینے اور سال بھر بعد ھوں -

۹۲ - تبارک — جب کہ مہینے میں جمعہ یا جمعرات کو مُردے کی بخشش کے واسطے چالیس مرتبہ سورۂ تبارک الّذی (اُنتیسویں پارے کی سورۃ کا نام) پڑھی جاتی ہے اور میدے کی میٹھی تنوری روٹیاں جن پر سونف کلونجی جمی ہوتی ہے بطور خیرات تقسیم کرتے ہیں اُن کو تبارک کی روٹیاں اور تبارک کہتے ہیں -

۹۳ - دہسا — مرنے کے دو برس بعد خاص وفات کی تاریخ یہ فاتحہ ہوتا ہے -

---

گارساں دتاسی

(از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی)

گارساں دتاسی اُردو ادب کا ایک قابل وقعت محسن ہے ۔ اس کے احسان نہ صرف اس لیے یاد رہیں گے کہ اس نے ہندستان سے دور ایک غیر ملک میں بیٹھ کر ہماری زبان اور ادب کی عمر بھر خدمت کی بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے زمانے میں خود ہمارے ادیب اپنے علمی اور ادبی خزانوں کی صحیح قدر و قیمت سے ناواقف تھے ۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اُردو ادب پر تحقیقات شروع کی ۔ اس کے مصنفوں اور تصنیفوں پر نا قدرانہ نظر ڈالی اور فرانسیسی زبان میں ہندستانی ادب کی ایک مبسوط تاریخ لکھ کر تین جلدوں میں شائع کی ۔

یہ گارساں دتاسی ہی تھا جو اُردو کے مایۂ ناز قدیم شاعر ولی کے کمال سے سب سے پہلے واقف ہوا اور اس کے کلام کے متعدد نسخوں کے مقابلے کے بعد ایک قابل یادگار دیوان شایع کرایا ۔ نہ صرف یہی بلکہ بہت کم اُردو داں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس فرانسیسی محقق نے ہماری زبان اور ادب کے متعلق (۳۰) سے زیادہ کتابیں اور رسالے لکھے اور شایع کیے ۔ اُردو ادبیات کی تمام تاریخ چھان ڈالیے بہت کم ادیب آپ کو ایسے ملینگے جنھوں نے اپنی زبان اور ادب میں اس قدر کام کیا ہو ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک اُردو کے بعض رسالوں میں اس فرانسیسی محقق کی ایک دو کتابوں کا کچھ سرسری ذکر کیا گیا ہے ۔ حیدرآباد دکن کے ایک رسالہ "مکتبہ" میں چند سال قبل دتاسی کی معلومات کی بعض غلطیوں پر روشنی ڈالی گئی تھی اور انجمن ترقی اُردو کے رسالے میں اُس کے چند خطبوں کے اُردو ترجمے بھی

شایع ہوئے ہیں لیکن اس کی زندگی اور اُردو سے متعلقہ کارناموں کی نسبت اب تک کسی قسم کی معلومات اُردو تو اُردو کسی اور زبان میں بھی نہیں شایع ہوئی -

اُردو کی لسّانی ساخت پر عملی تحقیقات کرنے کے سلسلے میں ۱۹۲۹ع میں جب میں نے دوبارہ یورپ کا سفر کیا تو فرانس میں ایک سال سے زیادہ قیام کرنے کا موقع ملا - وہاں کے متفرق کتب خانوں کے اُردو مخطوطوں کا میں اپنے پہلے ہی سفر میں مطالعہ کرچکا تھا اور اسی ضمن میں گارساں دتاسی کی ہندستانی زبان کے متعلق اس قدر فرانسیسی کتابیں نظر سے گزری تھیں کہ ان پر کچھہ لکھنے کو بے اختیار جی چاھتا تھا - چنانچہ اس دوسرے سفر میں چھٹّیوں وغیرہ میں جس قدر موقع مل سکا فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی اور آخر کار اس قابل عظمت محقق کی نسبت جو کچھہ معلومات حاصل ہو سکیں ان کا ایک مختصر سا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :—

علمی نشو و نما

دتاسی فرانس کا مشہور بندرگاہ مارسیل میں سنہ ۱۷۹۴ع میں پیدا ہوا - علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد جب مشرقی زبانوں کا شوق اُبھرا تو بیئس سال کی عمر میں وہ سنہ ۱۸۱۷ع میں پیرس پہونچا جہاں موسیو سلوستر دی ساسی (M. Silvestre de Sacy) السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا - دساسی نے اس نوجوان کا پدرانہ شفقت کے ساتھہ خیر مقدم کیا اور اس قدر خلوص اور توجہ کے ساتھہ تعلیم دی کہ گارساں دتاسی نے بہت جلد عربی اور ترکی زبانوں پر دسترس حاصل کرلی - ان زبانوں سے اس نے فرانسیسی میں جو اعلیٰ درجے کے ترجمے کیے ھیں وہ اس امر کے شاھد ھیں کہ دساسی اپنے شاگرد

کو کامیاب بنانے میں کس خلوص کے ساتھ مصروف تھا ۔ اور یہي وجہ تھي کہ گارساں دتاسي کے دل میں اپنے اُستاد کي شفقت اور خلوص کی یاد آخر عمر تک تازہ رھي ۔

عربی اور ترکي زبانوں کي تحصیل ھي کے دوران میں دتاسي کو فارسی کا شوق پیدا ھو گیا ۔ اور فارسي ادب نے اس کو اِس قدر لُبھایا کہ اس زمانے میں اس نے دو تین فارسي کارناموں کا بھي فرانسیسي زبان میں ترجمہ کیا ۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر "منطق الطیر" کا ترجمہ ھے ۔ اس ترجمے کے ساتھ دتاسي نے اس کتاب پر ایک مقدمہ بھي شایع کیا جس میں اس نے "ایرانیوں کی فلسفیانہ اور مذھبي شاعري" پر بحث کی ھے ۔

غالباً فارسی کتابوں ھی کے مطالعہ سے دتاسي کو تصوف کا شوق پیدا ھوا اور یہ وہ شوق ھے جو ایک دفعہ پیدا ھوجانے کے بعد بہت کم دور ھوتا ھے ۔ چنانچہ دتاسي بھي اس میں اس قدر محو ھوگیا کہ تمام عمر صوفیاء کے عقائد اور انھی سے متعلقہ مسائل کا مطالعہ کرتا رھا ۔ اور شاید اس کا یہي شوق تصوّف تھا جس نے اس کو ھندستاني مضامین کي طرف متوجہ کیا اور جس کي وجہ سے اس نے نہ صرف ھندستانی سیکھہ لي بلکہ اس پر قابل وقعت کام کیے ۔

اُردوے شغف اور دیوان ولي

راقم نے دتاسي اور اس کے کارناموں کي نسبت جو معلومات بہم پہونچائی ھیں ان کے مطابق میر تقي میر کی مثنوی اژدر نامہ ان چند اردو کتابوں میں سے ھے جو ابتدا میں دتاسي کو پسند آئیں ۔ اور جن کا فرانسیسی زبان میں اس نے ترجمہ کیا ۔ میر کي اس مثنوي کا فرانسیسی

ترجمہ ۱۸۲۶ع میں " Conciles aux mauvaise poets " Paris (Doudey-Dupre) کے نام سے شایع ہوا -

جب دتاسی کے استاد سلوستر دساسي نے دیکھا کہ اسکا قابل فخر شاگرد هندستاني ادبیات کا ماهر هو کر اس میں اس قدر دلچسپی لے رها هے تو اس نے حکومت سے درخواست کی کہ مدرسۂ السنۂ مشرقیہ میں هندستانی زبان و ادب کے لیے بهي ایک پروفیسري کي جگہ قایم کی جاے چنانچہ موسیو دمارٹگ ناک (M de Martignac) کے مختصر سے عہد وزارت میں مشہور مستشرق کي یہ سفارش منظور کرلی گئي اور دتاسي سنہ ۱۸۲۸ع میں هندستاني کا پروفیسر هو گیا -

اس خدمت کو حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلے دتاسي نے اپنے شاگردوں کی سہولت کے لیے هندستاني زبان کا ایک قاعدہ مرتب کیا جو سنہ ۱۸۲۹ع میں Rudiment de la langue Hindoustanie کے نام سے شایع هوا - تین چار سال بعد دتاسي نے اس قاعدے کا ایک ضمیمہ لکھنے کي ضرورت محسوس کی چنانچہ یہ ضمیمہ بهي ۱۸۳۳ع میں شایع هوگیا -

طالبعلموں کي ضرورتوں کو پورا کرتے رهنے کے ساتھ ساتھ دتاسي اپنے ذوق کے مطابق اُردو شہ کاروں کے مطالعہ میں بهي مصروف تھا - چنانچہ اِنهیں دو تین برسوں میں وہ کلیات ولی پر کام کرتا رها - اس شاعر کا نام اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے هندستان سے اس کے متعدد قلمی نسخے منگائے - اُن کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا اور عرصۂ دراز کي محنت کے بعد ایک قابل قدر دیوان مرتب کیا جو سنہ ۱۸۳۴ع میں پیرس کے شاهی کتب خانے سے شایع هوا -

اس کام میں دتاسي نے جس توجہ اور دلچسپی کو ملحوظ رکھا اس کا اندازہ دیوان ولي کے اُن مخطوطوں کي طویل فہرست کے مطالعے سے

ہو سکتا ہے جو دتاسی نے جگہ جگہ سے منگا کر جمع کیے ہیں اور جن کا تذکرہ آیندہ صفحات میں دکّنی مخطوطوں کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے -

دتاسي کا کلیات ولی کئي حیثیتوں سے قابل قدر ہے اس کے ذریعہ سے دتاسی نے نہ صرف ایک حقیقي شاعر کو صحیح عظمت اور مقبولیت سے روشناس کیا بلکہ اُردو دنیا کے لیے قدیم شاعروں کے کلام کو سلیقہ سے مرتب دینے کا ایک لایق تقلید نمونہ بھي پیش کیا لیکن اس نمونے کے باوجود بھي اُردو کے بہت کم شاعروں کے کلام اس اِحتیاط اور توجہ کے ساتھہ شایع کیے گئے ہیں -

جہاں دتاسی ولی جیسے عظیم‌الشان شاعر کے کلام میں محو تھا ایک اور اُردو کتاب بھي اس کے زیر مطالعہ تھي - یہ تحسین‌الدین کي مثنوي ''کامروپ'' ہے - اس کتاب کی طرف دتاسی کي توجہ غالباً اسی سے مُنعطف ہوئي کہ وہ ایک طویل مسلسل نظم بھی اور یہ وہ چیز ہے جس کي ولي کے یہاں کمي تھي - چنانچہ دتاسی نے کامروپ کا فرانسیسي میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ بھي سنہ ۱۸۳۴ع میں شایع ہوا -

اس کام کی خوبي اور مقبولیت کا اس واقع سے اندازہ ہوگا کہ اس ترجمے کی اشاعت کے بعد ایک سال کے اندر دتاسي اصل اُردو کامروپ کو شایع کرنے پر مجبور ہوگیا - اس کے بھي اس فرانسیسی محقق نے کئي قلمی نسخے جمع کئے تھے - یہ کتاب پیرس کے شاهي کتب خانے سے سنہ ۱۸۳۵ع میں چھپ کر نکلي - اس سال دتاسی نے اُردو کي ایک اور مسلسل کتاب گُل بکاؤلي کا فرانسیسی زبان میں خلاصہ شایع کیا -

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی

ان ابتدائی کاموں کے بعد دتاسی کو اُردو ادب کا خاصا ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ اس اثنا میں اس نے ہندستانی مصنفین کی بہت سی کتابیں اور تقریباً جملہ تذکرے اپنے کتب خانے میں جمع کر لیے تھے۔ جو انگریز یا فرانسیسی ہندستان آتے تھے دتاسی ان سے مراسلت کر کے اُردو مخطوطے اور مصنفین کے حالات طلب کیا کرتا چنانچہ اس مضمون کے آخری حصے کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اس سلسلے میں اس زمانے کے تمام مستشرقین سے اس کی شناسائی ہوگئی تھی۔ نیز ہندستانی ادبیات کی ضمن میں تیس چالیس یوروپین افراد سے اس کو تعلق رہا ہے۔

خوش قسمتی سے دتاسی کی کاوشیں اکثر دفعہ کارگر ہوئیں۔ اس کا گھر ہندستان کے شاہی اور دوسرے عالی‌شان کتب خانوں کے بعض اچھے مخطوطوں یا ان کی نقلوں سے مالا مال ہوگیا۔ مطبوعہ کتابیں اس کے ہاں بطور تحفہ آنے لگیں اور بعض دفعہ اس کے لیے اس کے دوستوں نے خود مصنفین سے ان کے حالات دریافت کرکے روانہ کیے۔

ان تمام سہولتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دتاسی چار پانچ سال کی محنت کے بعد ہندستانی ادب کی ایک تاریخ مرتب کرنے میں کامیاب ہوگیا جو سنہ ۱۸۳۹ء میں "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی" کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں پیرس کے شاہی کتب خانے سے شایع ہوئی۔ یہ تاریخ نہ صرف یوروپی زبانوں میں اس موضوع پر اپنی قسم کی پہلی چیز تھی بلکہ خود اُردو میں بھی اس طرح کا کوئی کام اس وقت تک نہیں کیا گیا تھا۔ یہ واقعی ایک حیرت کی بات ہے کہ ایک غیر شخص ہماری زبان و ادب کی تاریخ لکھ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

دتاسی کا یہ کارنامہ دیوان ولی کی اشاعت سے بھی زیادہ اہم ہے۔

گو اس میں بعض جگہ غلطیاں دکھائی دیتی ہیں لیکن اس زمانے کی معلومات کے لحاظ سے ان غلطیوں کا پایا جانا ایک فطری بات تھی - جس قدر مواد اُردو تذکروں ، مخطوطوں کی اندرونی شہادتوں اور ادبیت مستشرقین کے بیانات سے حاصل ہو سکا اس کو دتاسی نے خاص سلیقے اور خوبی سے ایک کارآمد کتاب کی شکل میں پیش کردیا ہے - ہمارے تذکرہ نویسوں کے مبالغہ آمیز بیانات اور مُبہم اسالیب بیان اکثر دفعہ خود ہماری زبان کے اہل تحقیق ہی کو پریشان کردیتے ہیں گارساں دتاسی تو ایک بالکل غیر ملک اور غیر طرز تمدن کا پروردہ تھا - اس کو ان کتابوں سے اصل مطلب اور کام کی باتیں حاصل کرنے میں جو دقت حاصل ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہم اُردو داں بہت کم کر سکتے ہیں -

دتاسی کی کتاب کی سب سے زیادہ معتد خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک سائنٹیفک تاریخ ادبیات اُردو ہے - ہمارے تذکرہ نویس ، شاعروں کے اصل حالات زندگی اور خصوصاً ان کی تاریخ پیدایش و وفات یا کتابوں کے سنینی تصنیف کے اظہار میں ہمیشہ غافل رہے ہیں - دتاسی کو بھی اس کی بڑی سخت شکایت ہے - اس نے ضروری حالات اور معتبر تواریخ معلوم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور ان تاریخوں وغیرہ کے لحاظ سے تو دتاسی کا یہ کام بے حد قابل قدر ہے -

یہ کارنامہ ابھی اختتام تک نہیں پہنچا تھا کہ اِسکی اہمیت کا دتاسی کے ہم وطن ہم عصروں نے اندازہ لگا لیا - فرانسیسی علما اس کی مشکلات اور کام کی خوبی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندستانی" کی اشاعت سے ایک سال قبل ہی یعنی سنہ ۱۸۳۸ع میں گارساں دتاسی کو فرنچ اکیڈمی کا رکن بنا لیا - یہ وہ عزت ہے جو فرانس میں بہت کم ادیبوں اور محققوں کو اس عمر میں حاصل ہوتی ہے -

دتاسی کی تاریخ ادب صرف فرانس ہی میں نہیں بلکہ انگریز مستشرقین

میں بھي قدر کی نگاھوں سے دیکھي گئی چنانچہ اس کي اشاعت کے بعد هي أنھوں نے هندستانیوں میں اس کے ترجمے کا خیال پیدا کیا اور آخر دهلي کالج کے پروفسر مولوي کریم‌الدین نے اپني کتاب طبقات الشعراء اسی فرانسیسي تاریخ کے ایک آزاد ترجمے کے طور پر شایع کي -

اس سلسلے میں مولوي کریم‌الدین اور دتاسي کے درمیان مراسلت بھي جاري هو گئي چنانچه دتاسي کے مخطوطوں میں سے ایک دو ایسے بھي همارے نظر سے گزر تے هیں جن کو مولوي کریم‌الدین نے اس محقق کے یہاں بطور تحفه روانه کیا تھا -

هندی کا شوق اور افتتاحیه خطبے

تاریخ کی اشاعت کے بعد دتاسی کچھه عرصه تک درس و تدریس هي میں مشغول رها اور اس بات کي کوشش کي که هندستانی کی دوسری شاخ هندي پر اور زیاده مہارت حاصل کرلے - اس نے اپني تاریخ میں هندي مصنفین کا بھي ذکر کیا هے لیکن اب اس نے محسوس کیا که اس طرف اور بھی توجه کرنے کی ضرورت هے -

ساتھه هی گارساں دتاسی نے اردو کام کو بھي هاتھه سے نہیں چھوڑا چنانچه سنه ۱۸۴۵ع میں میاں مسکین کے ایک مرثیے کا فرانسیسی ترجمه شایع کیا اور اسي زمانه میں گورنر جنرل لارڈ ایلن برو کے اس فرمان کا بھی ترجمه چھپوایا جو مندر سومنات کے دروازوں سے متعلق شایع کیا گیا تھا -

پیرس کے مدرسۂ السنۂ مشرقیه میں هندستاني کے ساتھه ساتھه دتاسي هندي بھي پڑھایا کرتا تھا لیکن فرانسیسي زبان میں اس کا کوئي قاعده نہیں تھا - چنانچه یه کام بھي دتاسي هي کو کرنا پڑا - اور هندستاني قواعد کي اشاعت کے اتھاره سال بعد سنه ۱۸۴۷ع میں اس

نے "قاعدۂ زبان ہندوی" کے نام سے ایک کتاب شایع کی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل نئی اور کار آمد چیز تھی -

ان تمام کاموں کے بعد دتاسی کی شہرت ہندستان میں پھیل چکی تھی اور نہ صرف انگریز بلکہ ہندو اور مسلمان ادیب بھی اس کے یہاں اپنے کام تنقید و تبصرہ کے لیے روانہ کرنے لگے - اس طرح دتاسی کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہوگئی - اور بغیر زیادہ کد و کاوش کے اس کے گھر ہندستانی ادبیات کا ذخیرہ جمع ہونے لگا -

جب دتاسی نے دیکھا کہ ہندستان سے مستقل طور پر معلومات حاصل کرنے کے ذریعے پیدا ہوگئے ہیں - تو اس نے ہر تعلیمی سال کے آغاز پر اپنے معمولی درسوں سے پہلے ایک خطبۂ افتتاحیہ پڑھنا شروع کیا اس خطبے میں وہ سال گذشتہ کی جملہ ہندستانی ادبی اور علمی تحریکوں پر نظر باز گست ڈالتا تھا - اس قسم کا پہلا خطبہ غالباً سنہ ۱۸۵۰ع میں شایع ہوا -

دتاسی کے یہ خطبے تاریخی حیثیت سے بے حد قیمتی ہیں - ان سے ہندستانی زبان و ادب کی سالانہ ترقی سن وار محفوظ ہوگئی ہے اور محققین کے لئے ایک نہایت مفید مواد حاصل ہوگیا ہے - خوش قسمتی سے ان میں سے بعض مطبوعہ خطبوں کے اردو ترجمے انجمن ترقی اردو کے رسالے میں شائع ہوچکے ہیں - جن کے مطالعہ سے وہ لوگ جو فرانسیسی نہیں جانتے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں -

ان خطبوں نے دتاسی کے زمانے میں ہندستانی ادبیات کی حمایت و اشاعت کا بھی بہت کچھہ کام کیا ہے - چنانچہ دتاسی کی وفات کے بعد فرانسیسی اکیڈیمی کے صدر نے مجلس میں سرکاری طور پر جب اس کے اوصاف بیان کیے تو دوران تقریر میں ان خطبوں

کا بھی ذکر کیا ہے - اس کے الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے :—

"مدرسۂ السنۂ مشرقیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے دتاسی ہر سال اپنے لکچروں کو ایک خطبے سے شروع کرتے تھے جس میں وہ گذشتہ سال کی ادبی تحریکات ہند پر نظر ثانی کرتے - یہ تبصرہ اس قدر صحیح اور ثقہ ہوتا تھا کہ اس کو نہ صرف اہل فرانس ہی پڑھتے بلکہ انگلستان، روس اور ہر اس جگہ کے لوگ جہاں مشرق سے دلچسپی لی جاتی، اس تبصرہ کا غور و خوض سے مطالعہ کرتے تھے خود ہندستان میں ہمارے رفیق کار کی رائے کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا" -

اِس اثناء میں دتاسی کی نظر سے ایک اردو ڈرامہ گذرا، اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ اردو ادب میں اس صنف کی قابل افسوس کمی ہے اس لئے اس ڈرامے کو اس نے غور سے پڑھا، اور نہ صرف یہی بلکہ، اس کا فرانسیسی میں ترجمہ بھی کیا جو سنہ ۱۸۵۰ع میں شایع ہوا -

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ اس زمانے میں دتاسی ہندی کی طرف بھی متوجہ تھا - اس سلسلے میں یہاں یہ امر قابل اظہار ہے کہ سنہ ۱۸۵۲ع میں اس نے "شکنتلا ناٹک" کا ایک فرانسیسی ترجمہ شایع کیا -

دوسال بعد سنہ ۱۸۵۴ع میں دتاسی نے ایک اور دلچسپ کام ختم کیا یعنی "ہندستان کی عورت شعرا" پر اس نے ایک کتاب شایع کی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے واقعی نئی چیز تھی -

دوسرے ہی سال یعنے سنہ ۱۸۵۵ع میں دتاسی کی ایک اور قابل قدر کتاب شایع ہوئی - جس کا نام "ہندستانی مصنفین اور ان کے کار نامے" ہے - یہ کتاب گو صحیح نہیں - لیکن تاریخ ادبیات اُردو لکھنے والے کے لیے نہایت

مفید ہے - اور حوالہ جات کی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے -

اس کے بعد کے دو برسوں میں اگرچہ اس فرانسیسی محقق کی کوئی خاص کتاب شایع نہیں ہوئی لیکن یہ ملحوظ رہے کہ وہ ہرسال جو خطبۂ افتتاحیہ پڑھا کرتا تھا وہ ساتھہ ہی ایک رسالہ کی شکل میں شایع ہو جاتا تھا - اس موقعے پر اس امر کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ غدر سنہ ۱۸۵۷ع کے بعد اس نے جو خطبہ لکھا وہ اس زمانے کے قیامت خیز واقعات کا ایک ہم عصر تبصرہ ہونے کی وجہ سے نہایت قیمتی ہے -

اس عرصے میں دتاسی نہال چند لاہوری کی کتاب "تاج الملوک و بکاؤلی" پر بھی کام کرتا رہا تھا چنانچہ اس کا ترجمہ سنہ ۱۸۵۸ع میں شایع ہوا -

سنہ ۱۸۶۰ع سے سنہ ۱۸۷۵ع تک

اب دتاسی بہت بوڑھا ہو چلا تھا مگر اس کی علمی دلچسپیاں اور کام کاج برابر جاری رہے - اس کی عمر پینسٹھہ سے زیادہ تھی جب اس نے سر سید احمد خاں کی مشہور کتاب "آثارالصنادید" کا فرانسیسی ترجمہ کرنا شروع کیا - اس کتاب کی موجودہ ادبی اور تاریخی اہمیت سے اہل نظر نا واقف نہیں ہیں - لیکن ستّر برس پہلے ایک اجنبی پروفیسر کا اپنے بڑھاپے میں اس کے ترجمے کا ارادہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ اس کتاب نے اس کو کس قدر متاثر کیا تھا اور نہ بھی کہ دتاسی کا ذوق علم کس قدر اعلیٰ تھا کہ اس کتاب کو ترجمے کے لیے فوراً انتخاب کرلیا - یہ ترجمہ سنہ ۱۸۶۱ع میں پیرس کے شہنشاہی مطبع سے چھپ کر نکلا -

دوسال بعد سنہ ۱۸۶۳ع میں دتاسی نے اپنے قدیم "قاعدہ زبان ہندستانی" پر نظر ثاني کر کے اس کي دوسري طبع شایع کي - یہ کتاب پہلی دفعہ سنہ ۱۸۳۳ع میں شایع ہوئي تھي - اور تیس سال کا درمیانی عرصہ درس و تدریس کے عملي تجربوں کے لحاظ سے کافي سبق آموز تھا ؛ بعد کے چند مہینے اُردو "اخوان الصفا" کے اقتباسات کے ترجمے میں گزرے - اور یہ ترجمہ سنہ ۱۸۶۴ع میں شایع ہوا -

اس کے بعد پانچ چھہ برس تک دتاسی نے کوئي نیا کام نہیں کیا البتہ سالانہ افتتاحیہ خطبے تیار کرتا رہا جو ہر سال وسعت معلومات اور پختگي نقطۂ نظر کی وجہ سے زیادہ پُر لطف اور مفید ہوتے جاتے تھے -

اس عرصے میں "تاریخ ادبیات ہندي و ہندستاني" کو چھپے ہوئے تیس سال سے زیادہ گذر چکے تھے - اور درمیاني زمانے میں گارسان دتاسی کی معلومات طوفاني رفتار کے ساتھہ ترقی کرچکي تھیں اس لحاظ سے ضروري تھا کہ وہ اس پر نظر ثاني کرتا - چنانچہ خوش قسمتی سے پچھتّر برس کی عمر میں وہ یہ کام بھی کرسکا - اور اس کي تاریخ کي دوسري طبع ؛ اس دفعہ تین جلدوں میں ؛ سنہ ۱۸۷۰ع میں شایع ہوئي -

اس طبع کے وقت وہ پروفیسر اور محقق کی حیثیت سے بے حد مشہور ہوچکا تھا - دنیا کے ہر مہذب ملک میں اس کے قدردان پیدا ہو گئے تھے - بادشاہوں کے درباروں سے اس کو بڑے بڑے خطابات عطا کئے گئے تھے - اس کی جماعتوں میں طالب علموں کي کثرت تھی اور اکثر نوجوان مستشرق اس کے اسّي سال کے تجربوں اور معلومات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اس کي خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اس کي اس مقبولیت کا اندازہ اس مضمون کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے جو فرانس کے ایک مشہور رسالہ "صحیفۂ علماء" (Journal des Savants) کے مئی سنہ ۱۸۷۵ع

کے ستمبر میں شایع ہوا تھا ۔ اس مضمون نگار کا نام ، بار تھیلمی سان هلیر ؟ ۔ (B. Saint-Hilaire) تھا وہ اپنے مضمون کو جن الفاظ میں ختم کرتا ھے ان کا اُردو ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ھے تا کہ دتاسی کی نسبت اس کے ایک هم عصر کی رائے معلوم ہوسکے :—

"آج پچاس برس کا عرصہ گذر گیا کہ دتاسی اس کام (یعنی پروفیسری) کو نہایت خوبی اور کمال سے انجام دے رہے ھیں اور اُن کے شاگردوں کی تعداد خاصی ہوگئی ھے" ۔

آخری زمانہ

دتاسی کی زندگی کے آخری سال کچھہ کم مشغولیت میں نہیں گذرے ۔ وفات سے ایک دو سال پہلے یعنی سنہ ۱۸۷۶ع میں اس نے ایک اور اهم کام ختم کیا ۔ اس کی عمر بیاسی سال کی تھی جب اس کا یہ کارنامہ شایع ہوا ۔ یہ کتاب هندستانی ، عربی ، فارسی ، اور ترکی مقبول عام نظموں ، مقولوں ، اور تلمیحوں کے فرانسیسی ترجموں کا مجموعہ تھی ۔ اس کی خوبی اور اهمیت کا اندازہ اس امر کے اظہار سے ہو سکتا ھے کہ یہ ایک ایسے مستشرق کی مسلسل محنت اور حصول معلومات کا نتیجہ ھے جس نے اپنی زندگی کا کل بہترین زمانہ یعنی ساٹھہ ستّر سال اسلامی زبانوں ، تہذیب اور ادبیات کے مطالعے اور درس و تدریس میں گذار دیا ۔

اس دلچسپ کتاب کی ترتیب کے ساتھہ ساتھہ دتاسی ایک اور اهم علمی خدمت میں مشغول تھا ۔ چونکہ وہ خود بوڑھا ہو گیا تھا ۔ اس لیے اپنے شاگرد رشید ڈیلا نکل (F. Delancle) سے اس نے ایک "هندستانی فرانسیسی اور فرانسیسی هندستانی لغت" تیار کرنے کی فرمایش کی ۔ اور خود اس کام کی شروع سے آخر تک نگرانی کرتا رہا ۔ یہ اعلیٰ درجے کا کارنامہ بھی سنہ ۱۸۷۶ع میں شایع ہوا ۔

ان دو اهم کتابوں کي اشاعت کے کچھه عرصه بعد هي دتاسي نے میرامن کی "باغ و بہار" کا فرانسیسی ترجمه شروع کیا جو سنه ۱۸۷۸ع میں اُس کی وفات سے چند مہینے پہلے چھپ کر نکلا - لیکن یه کتاب دتاسي کا آخری کار نامه نہیں تھی - اس کی آخری کوشش "مسلمانوں کے نام اور خطاب" کے نام سے شایع هوئي اس کتاب کا موضوع بھی ظاهر کرتا هے که یه فرانسیسي محقق اپني آخري عمر میں اسلام اور مسلمان پر کام کرنے میں مشغول تھا - اور اسلامی تصوف کا وہ ذوق جس نے پچیس بیس برس کی عمر میں اس کو اسلامي زبانوں کی تحصیل کی طرف متوجه کیا تھا ؟ چوراسي برس کی عمر میں یعنے سنه ۱۸۷۸ع تک اس سے کام کراتا رها -

دتاسي ایک اَن تھک محنت کرنے والا انسان تھا - اس کي ساري عمر پُر خلوص علمي خدمت میں گذري - فرانسیسي زبان میں هندستانی کے متعلق اس نے جو معلومات منتقل کي هیں اتني معلومات هماري زبان کي نسبت خود انگریزی میں بھي اب تک موجود نہیں - حالانکه اس وقت تک کئی انگریز علماء اس موضوع پر کام کرتے رهے هیں اور انھیں دتاسي کے مقابلے میں هر طرح کی سہولتیں بھي حاصل رهیں -

دتاسی نے ایک کامیاب زندگي بسر کي - خوش قسمتي سے اس کے زمانه نے بھي اس کی وسعت معلومات اور غیر معمولی لیاقت سے فائدہ اُٹھانے کي کوشش کی - اور اس کي محنتوں کے بار آور هونے کے لئے هر طرح امداد پہونچائي -

فرانس میں اس کی کماحقه عزت افزائی هوئي - نه صرف استیٹیوٹ دي فرانس جیسی رفیع‌الشان مجلس کا وہ رکن بنایا گیا بلکه "شیوالیر دلا لیژزن دانر" (Chevalıar de la Legıon'

(d'honneur. جیسا اعلیٰ رتبہ بھی اس کو حاصل ہوا ۔ دوسرے ملکوں سے اس کو جو خطابات عطا ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے :—

۱ ۔ پرتگال ۔

"Commandeur del' ordra de saint jaques du Portugal"

۲ ۔ سویڈن ۔

"Chevalier de' l' E toile Polaire de Suede"

۳ ۔ ھندستان ۔

Knight of the Imperial order of the star of India"

ان درباری اور سیاسی ہمت افزائیوں کے علاوہ دتاسی کی حقیقی علمی قدر و منزلت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ وہ پیرس کی مشہور ایشیاٹک سوسائٹی کا نہ صرف بانی تھا بلکہ آخر میں اس کا صدر بھی منتخب ہوا تھا ۔ سینٹ پیٹرس برگ ، برلن ، ویانا ، فلارنس ، اسپال وغیرہ جیسے اہم مقامات اور دارالحکومتوں کی مشہور علمی اکیڈیمیوں اور مجالس اعلیٰ کا معروف رکن ہونے کے علاوہ دتاسی 'لندن' کلکتہ اور بمبئی کی ایشیاٹک سوسائیٹیوں کا بھی اعزازی رکن تھا ۔

لیکن ان تمام اعزازات اور رتبوں کے باوجود گارسان دتاسی ایک منکسر مزاج اور سادہ طبیعت آدمی تھا ۔ اس کی وفات کے بعد اکیڈیمی کے صدر نے اس کے اوصاف میں جو تقریر کی اور جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ۔ اس کے چند اقتباسات کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔ جس سے دتاسی کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہے ۔

"گذشتہ چہار شنبہ کو موسیو گارسان دتاسی کا جنازہ اُٹھایا گیا ان کی خواہش کے مطابق جس کو انھوں نے با ضابطہ ظاہر کیا تھا ، اکیڈیمی سرکاری طور پر ان کے جنازہ کے ہمراہی کے لیے شریک نہیں ہوئی یہ حیثیت دوستوں کے تھا جو ہم نے ان کے جنازہ کے ہمراہی کی

لاش مارسیلز کو روانہ کی گئي اور کوئی تقریر نہیں کي گئی - اس لیے اب اجازت دیجیے کہ اپنے کھوئے ہوے دوست کو الوداع کہوں -

ان کی شہرت ہندستان میں فرانس سے زیادہ تھی - ہندستاني صحیفوں میں ان کي تصویریں چھپیں اور نثر و نظم میں اس مغربی تنقید نگار کي مدح میں گیت گائے گئے

گارساں دتاسی کا نام ایک ان تھک کام کرنے والے ' ایک نکتہ مستشرق کي حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہے گا - لیکن جس چیز کي ہم (جو انھیں جانتے تھے) تعریف کرنے پر مجبور ہیں وہ ان کے اخلاق ' نرم دلي اور نا قابل قبول انکسار ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو چھوٹا سمجھنے کے لیے ہمیشہ تیار تھے - وہ علم سے سوائے اس کي خدمت کے اور کسي بات کے طلبگار نہ تھے -

اپنے آبا و اجداد کے مذہب عیسائیت کے وہ پورے معتقد تھے اور صبر و رضا کے ساتھ انتقال کیا - ''

گارساں دتاسي کے کتب‌خانے کے قلمي نسخوں کي فہرست

دکني مخطوطے

۱ - قصص‌الانبیا — محمد بن حسن‌الدینوری‌الحنفي کي فارسي کتاب "قصص‌الانبیا" کا دکّني ترجمہ از عبدالصمد عبدالوہاب خان ابن نصرت خان اصل فارسی کتاب سلمی کی عربی قصص‌الانبیا کا ترجمہ تھی -

خوبصورت مخطوطہ - نظام آباد یا ارکاٹ (تحصیل محمد نور)

میں سنہ ۱۲۳۳ھ (م ۱۸۱۷ع - ۱۸۱۸ع) نقل کیا گیا - ۲۱۱ ورق - کٹلاگ نمبر ۲۷۸۵ -

۲ - خزانۂ عبادت — طویل مثنوی مصنفہ شاہ محمد قادری سنہ تصنیف ۱۱۹۹ھ (م ۱۷۸۴ع) دکنی مسلمان اس کتاب کی بہت عزت کرتے ہیں -

مخطوطہ خوبصورت نستعلیق میں ، شہر مدراس میں سنہ ۱۸۴۸ع میں نقل کیا گیا - کاتب غلام قادر - گارسان دتاسی کو یہ نسخہ پانڈیچری کے موسیو اے سکے (M. E. Sice) نے دیا تھا - ۲۸۷ ورق کٹلاگ نمبر ۲۷۸۹ -

۳ - قصہ فیروز شاہ — مصنفہ محمد عاجز دکنی مصنف لعل و گوہر - یہ مخطوطہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی ملکیت رہ چکا تھا - کٹلاگ نمبر ۲۸۰۴ -

۴ - قصہ پیغمبران — ملا محمد باقر مجلسی کی فارسی کتاب " حیات القلوب " کا اردو ترجمہ - از ولی محمد بن حافظ میران - مخطوطہ پانڈیچری میں نقل کیا گیا - خط خوبصورت ، کٹلاگ نمبر ۲۷۸۴ -

۵ - دیوان ولی — شاہ محمد ولی اللہ - جہاں جہاں سمجھ میں نہیں آیا - یا جہاں الفاظ متروک نظر آئے کاتب نے وہاں اپنے زمانے کے الفاظ داخل کردیے ہیں - اس کے علاوہ اکثر دفعہ اس نے غالباً اپنے اشعار داخل کرکے اس میں ولی سے منسوب کردیا ہے - ۱۸۲ صفحات - (اس مخطوطہ کا نام دتاسی نے دیوان ولی مخطوطہ ای (M. E) رکھا تھا - کٹلاگ نمبر ۲۸۲۱ -

۶ - دیوان ولی - یہ مخطوطہ گارساں دتاسی کے مخطوطات دیوان ولی میں سب سے زیادہ مکمل ، صحیح ، قدیم ، اور قابل وثوق ہے -

اسي کے مطابق دتاسي نے اپنا ديوان ولي مرتب کيا تھا - اس کا نام مخطوطہ نمبر ا (M. A) تھا - اس کا کاتب غالباً سمجھدار اور محتاط آدمي ہوگا - ۱۲۵ ورق - کتلاگ نمبر ۲۸۲۲ -

۷ - ديوان ولي - مخطوطہ د (M. D.) قديم ، نہايت صحيح - ليکن کاتب نے وہ اشعار چھوڑ ديے جن کو وہ سمجھہ نہ سکا - يہ مخطوطہ متوفی ڈبليو پرائس کي ملکيت تھا - اور اسي سے اس مستشرق نے اپني " ہندستاني گرامر " ميں تين غزليں منتخب کرکے شائع کي ہيں - ۲۷۰ ورق - کتلاگ نمبر ۲۸۲۳ -

۸ - ديوان ولي - مخطوطہ سي (M C) مورخہ ۲۹ صفرسنہ ۲۲ھ جلوس محمد شاہ - لکھا نہيں کہ کس شہر ميں ، ليکن ظاہر کرتي ہے کہ شمالی ہند ميں نقل کيا گيا - ۲۰۲ ورق - کتلاگ دنمبر ۲۸۲۴ -

۹ - ديوان ولي - مخطوطہ ايف (M. F.) نہايت اچھا نسخہ - خوبصورت تحرير ليکن نا مکمل - صرف رديف (و) تک کي غزليں شامل ہيں - يہ مخطوطہ جے - ڈبليو رسل (J. W. Russel) کی ملکيت رہ چکا تھا - اور دتاسی کو مشہور مستشرق شکسپير نے ديا تھا - ۱۲۹ صفحات - کتلاگ نمبر ۲۸۲۵ -

۱۰ - ديوان ولي - مغل شاہنشاہ محمد شاہ کے کتب خانے کي ملکيت - نفيس تحرير ، صحيح اور بغير تغيّر و تبدّل کے - ۲۳۲ صفحات - کتلاگ نمبر ۲۸۲۹ -

۱۱ - ديوان ولی - مخطوطہ جی (M. G.) مکمل اور بہت اچھي حالت ميں - بغير تاريخ کتلاگ نمبر ۲۸۲۷ -

۱۲ - ديوان ولي - مخطوطہ آئی (M. I) ايس لی پريسان (S Lee Paraıssan) کي ملکيت مورخہ سنہ ۱۸۱۰ع مکمل - ليکن بعض جگہ غلط ، کتلاگ نمبر ۲۸۲۸ -

۱۳ - دیوان ولي - مورخه سنه ۱۷۸۰ع - کپتان فولیس (Faules) کي فرمائش پر نقل کیا گیا تھا - نہایت صاف لکھا ھوا اور مکمل - ۲۵۷ صفحات ، کتلاگ ۲۸۸۹ -

۱۴ - دیوان ولي - خود گارسان دتاسي کے ھاتھہ کا لکھا ھوا نسخہ اس سے کلیات ولي سنه ۱۸۳۴ع میں شایع کیا گیا - کتلاگ نمبر ۲۸۳۰ -

۱۵ - رسالۂ توحید یا کتاب التصوف - صوفیانہ موضوع پر دکنی زبان کي ایک مشہور نظم ، ۲۰۹ اوراق ، کتلاگ نمبر ۲۸۴۵ -

۱۶ - طوطي نامہ - نخشبي کي کتاب کا دکني نظم میں ترجمہ از مولانا غواصي - نسخہ نہایت قدیم اور خوبصورت خط نستعلیق میں لکھا گیا ھے - حمد و نعت کے بعد ایک فصل چار صفحے کي سلطان عبداللہ قطب شاہ کي مدح میں لکھي گئي ھے - ۲۰۰ صفحات کتلاگ نمبر ۲۸۴۹ -

۱۷ - لعل و گوھر از محمد عاجز دکني - ایک خوبصورت مجموعے میں شامل ھے - آخر میں سحرالبیان بھي نقل کي گئي ھے - کتلاگ نمبر ۲۸۶۲ -

۱۸ - قصہ لعل و گوھر - از محمد عاجز دکني - ایک مجموعہ میں شامل ھے - جس میں مفرح القلوب ترجمہ ھتوپدیش بھي منقول ھے - کتلاگ نمبر ۲۸۶۳ -

۱۹ - پنچھي باچھا - منطق الطیر فریدالدین عطار کا دکنی ترجمہ از وجیدالدین - مصنفہ سنه ۱۱۲۴ (۱۷۱۲ - ۱۷۱۳ع) یہ مخطوطہ پانڈیچری کے موسیو سکے کي ملکیت رہ چکا تھا - اور نظام حیدر آباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا تھا - ۱۷۶ اوراق کتلاگ نمبر ۲۸۶۷ -

۲۰ - معراج نامہ - از سید بلاقی دکنی - مکتوبہ سنہ ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ - ۱۸۰۵ع) کاتب شیخ احمد نے نظم کے آخر میں اپنی پسند کے اور شعر اضافہ کیے ہیں - یہ کتاب ایک مجموعہ میں شامل ہے - جس میں ۱۳ متفرق مثنویاں اور غزلیں ہیں - کتلاگ نمبر ۲۸۶۹ -

۲۱ - تزویج بی بی فاطمہ - از بلاقی یا نظام الدین یہ کتاب بھی متذکرہ بالا مجموعہ میں شامل ہے -

۲۲ - کھوپڑی نامہ از نظام الدین دکنی - یسوع مسیح کا ایک قصہ - یہ بھی متذکرہ مجموعہ میں شامل ہے - ہیر بلوٹ (D. Herbelot) نے ایک کتاب قصۃ الجمجمہ کا ذکر کیا ہے - جس میں یہی قصہ بیان کیا گیا ہے -

۲۳ - قصہ دحیا کبلی - ایک صحابی کا قصہ - ٹھیٹ دکنی زبان میں از عبیدی یا عابدی آخر میں دو قصیدے بھی ہیں - مکتوبہ سنہ ۱۲۲۱ھ ۱۳ صفحات ، یہ بھی متذکرہ مجموعہ میں شامل ہے -

۲۴ - مروی کے احوال ، یا مروی احوال سے ۲۸ صفحات کی مثنوی جس کو دتاسی نے وحید دکنی کے نام سے منسوب کیا ہے - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۵ - قصہ حضرت علی سیل - وحیدی دکنی مصنفہ ۱۲۱۸ھ اس کا اصل نام غالباً وہی ہے جو ایست انڈیا کمپنی کے کتب خانے کی فہرست پر لکھا ہے - یعنی قصہ در احوال خان محمد حنیف مکتوبہ ۱۲۱۸ھ ۳۷ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۲۶ - مجلس طفلی - یہ غالباً مرثیہ ہے ۳۳ صفحات - غم نامی شاعر سے منسوب ہے - جس کے متعلق کوئی معلومات نہیں - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۷ - قصہ چندر بدن و ماهیار - از میر حیدرشاہ دکنی ۳۱ صفحات - اِس کا ایک نسخہ چندري لال حیدرآباد کے کتب خانے میں تھا - متذکرہ مجموعہ میں -

۲۸ - مولد نامہ خاتون جنت - مثنوي ۱۵ صفحات - نام مصنف نا معلوم متذکرہ مجموعہ میں -

۲۹ - وفات نامہ خاتون جنت - نظم ؟ ۱۵ صفحات ؟ نام مصنف نا معلوم متذکرہ مجموعہ میں -

۳۰ - قصہ ملکہ بادشاہ - نظم از محمد بیر دکني - مصنف کہتا ہے کہ یہ کتاب فارسي کا ترجمہ ہے - در اصل اس یوناني ملکہ کا قصہ فارسي میں بھي موجود ہے جس کا ایک نسخہ پیرس کے قومي کتب خانے میں محفوظ ہے - ۳۴ صفحات ؟ متذکرہ مجموعہ میں -

۳۱ - قصہ ڈولی نامہ - مثنوی از شاہ محمد زمان یار دکني ۱۹ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۳۲ - قصہ ابوالعیص نوری - نظم نہایت دلچسپ قصہ ہے - از خاني دکني - ۳۰ صفحات متذکرہ مجموعہ میں -

۳۳ - قصہ ماہ منور سوداگر بچہ وشمشاد بانو دختر فرنگي - از دیدار دکني نامکمل نسخہ ۲۲ صفحات ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں قصہ رضوان شاہ فایز بھي داخل ہے کتلاک نمبر ۲۸۷۰ -

۳۴ - قصہ رضوان شاہ از فایز دکني سنہ ۱۱۸۳ع اشک نے اسي مضمون پر ایک قصہ نثر میں لکھا ہے - ۲۰۲ صفحات متذکرہ مجموعہ -

۳۵ - قصہ شیخ زا (ضیا؟) دکني میں ایک چھوٹي سي صوفیانہ مثنوی - بحر رمل میں لکھي گئي ہے نسخہ نہایت بے احتیاطي سے نقل کیا گیا ہے - اور مارسل کے کتب خانے کي ملکیت ہے جو قومي کتب خانے کا ناظم تھا - کتلاگ نمبر ۲۸۷۴ -

۳۶ - گلشن عشق - از نصرتي دکني (۱۶۵۸) یه نسخه لیڈن کي ملکیت رہ چکا تھا - مورخه سنه ۱۷۵۸ ع - از خط رمز علي چشتي ۳۶۸ صفحات کتلاگ نمبر ۲۸۷۶ -

۳۷ - کریما - پندنامه سعدی ' فارسي ' معه ترجمه زبان دکني اُردو ۳۳ صفحات - کتلاگ نمبر ۲۸۸۸ -

۳۸ - جنگ نامه سهراب و رستم - شاہ نامه کے ایک حصه کا ترجمه از منشي کاظم‌الدین دکني - سر ریوس شسلي هوٹن کي ملکیت ۴۵۰ ورق - کتلاگ نمبر ۲۸۹۱ -

۳۹ - ترجمه انوار سهیلی - زبان دکني - نام مصنف نامعلوم - خوبصورت مخطوطه مورخه سنه ۱۱۷۹ ھ (۱۷۰۵ع) آدم کلارک کي ملکیت کتلاگ نمبر ۲۸۹۲ -

۴۰ - ترجمه انوار سهیلي - نهایت خوشخط نسخه - هنری چنڈلر (Henry Chandler) کی ملکیت حاشیه پر انگریزی میں نوٹ هیں - ۱۸۰ اوراق کتلاگ نمبر ۲۸۹۳ -

۴۱ - دکني غزلیں - چھوٹا خوبصورت مخطوطه - دناسي کو موسیو اس سکے (M E. Sice) نے دیا تھا - کتلاگ نمبر ۲۹۱۳ -

۴۲ - ایک دکني قصه - دناسي کے هاتھه کا نقل کیا هوا - ۵۱ صفحات کتلاگ نمبر ۲۹۱۵ -

۴۳ - ایک دکني قصه - دناسي کے هاتھه کا نقل کیا هوا - نام مصنف نا معلوم کتلاگ نمبر ۲۹۱۷ -

۴۴ - ایک دکني قصه دناسي کے هاتھه کا نقل کیا هوا - مذکرہ بالا قصه کے ساتھه شامل هے -

قلمی اُردو تذکرے

۱ - تذکرہ فتح علي حسنئي گرديزي - ۱۱۵۳ھ (م ۱۷۴۰ - ۱۷۴۱ع)
شمال اور دکن کے سو شاعروں کے حالات - کندان ترویر (Troyer) نے تیپو سلطان کے ایک مخطوطہ سے نقل کیا - خوشخط - ۱۷۰ صفحات - اس کي اور نقلیں ایسٹ انڈیا ہاؤس - اوسلے (Ousley) کلکشن اور کتب خانہ وزیر نظام میں موجود ہیں کتلاگ نمبر ۲۹۲۱ -

۲ - تذکرہ شعراے ہندي از غلام ہمداني مصحفی (۱۷۶۰ - ۱۸۱۵ع)
محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۰ع) سے سنہ ۱۷۸۳ع تک کے شاعروں کے حالات ، فورٹ ولیم کے کتب خانے سے یہ نسخہ سنہ ۱۸۳۲ع میں نقل کیا گیا - ۱۵۴ صفحات کتلاگ نمبر ۲۹۳۸ -

۳ - گلزار ابراہیم - تین سو ہندستاني شاعروں کا تذکرہ ، مصنفہ علي ابراہیم امین‌الدولہ ناصر جنگ یہ کام سنہ ۱۷۷۲ع میں شروع کیا گیا اور ۱۷۸۳ع میں ختم ہوا - خط نسخ میں نہایت اچھا کے ساتھہ موسیو ترویر نے گارساں دتاسي کے لیے نقل کیا - کتلاگ نمبر ۲۸۱۰ -

۴ - گلزار ابراہیم - از علي ابراہیم - خوبصورت نستعلیق میں یہ نسخہ ترنر ما کن (Turner Macan) ایڈیٹر "شاہ نامہ" کي ملکیت رہ چکا تھا - ۱۵۲ اُورق کتلاگ نمبر ۲۸۱۱ -

۵ - گلشن ہند - از مرزا علي لطف فرزند کاظم بیگ خاں مورخہ ۱۲۱۵ھ(م۱۸۰۰ - ۱۸۰۱ع) لطف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اُس نے اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے - صرف پہلا حصہ جو ساتھہ بڑے شاعروں پر مشتمل ہے مکمل ہے - دوسرا ختم نہیں ہوا -

سید ذوالفقار علي تجلي نے بتاریخ ۱۲۲۳ھ (م۱۸۳۷ - ۱۸۳۸ع) وزیر نظام حیدرآباد کے نسخے سے نقل کیا - دتاسي کو کرنل سیتھووارڈ

(Steward) نے تحفہ دیا تھا ۔ ۴۰۰ صفحات ۔ کتلاگ نمبر ۲۸۰۷ ۔

۶ — مجموعہ نغز ۔ از ابوالقاسم دهلوی (۱۸۰۶ - ۱۸۰۷) تقریباً آٹھ سو شاعروں کے حالات لکھے ھیں ، نہایت خوشخط مخطوطہ - ۹۱۸ اوراق ، کتلاگ نمبر ۲۹۳۷ -

۷ — عمدہ منتخبہ ۔ از میر محمد خاں اعظم الدولہ سرور ابن نواب ابوالقاسم مظفر خاں بہادر بارہ سو شاعروں کے حالات ۔ ۱۲۲۱ ھ (م ۱۸۰۶ - ۲۸۰۷ ع) نواب حسین علی خاں بہادر نے ۱۸۴۹ ع میں نقل کیا ۔ ۷۴۲ صفحات ، کتلاگ نمبر ۲۹۳۹ -

۸ — دیوان جہان ۔ انتخاب کلام شعرائے هند ، از بینی نراین لاهوری ۱۸۱۴ ع - تی روبک (T. Robake) کے مشورے پر یہ کام کیا گیا مکتوبہ ۱۸۳۲ ع کتلاگ نمبر ۲۸۰۸ -

۹ — گلشن بے خار ، از محمد مصطفیٰ شیفتہ مصنفہ ۱۲۴۸ - ۱۲۵۰ ھ (م ۱۸۳۲ - ۱۸۳۴) چھہ سو شاعروں کے حالات - یہ کتاب دهلی میں ۱۷۴۵ ع میں شائع هوئی - یہ مخطوطہ ۱۸۳۵ ع میں نہایت احتیاط کے ساتھہ لکھا گیا ، دہاسی کومتوفی نوندوس دهلوی (نے دیا تھا - کتلاگ نمبر ۲۹۴۰ —

۱۰ — دستہ دلکشا ۔ یہ کتاب بابو راجندر لال متھرا کے تذکرہ شعراء کا دوسرا حصہ ھے پہلا حصہ کلکتہ میں ۱۸۷۰ ع میں شائع هوا - ۱۰۱ صفحات جس میں هندستانی مصنفین پر ۵۸۷ مضامین هیں ، یہ دوسرا حصہ ان شعرا سے متعلق ھے جن کے نام حرف ک سے شروع هوتے هیں - بہت هی خوبصورت مخطوطہ ۔ کتلاگ نمبر ۲۸۰۹ -

۱۱ — گلدستۂ حیدری ، مصنفہ حیدر بخش حیدری مصنف توتا کہانی ۔ یہ کتاب حیدری کی حسب ذیل تین کتابوں کا مجموعہ

ہے :— ا - مجموعہ تواریخ و سوانح ، (۲) - دیوان - (۳) - شعراے ہندستانی کا تذکرہ -

یہ تیسری کتاب اگر چہ ترتیب کے لحاظ سے اچھی ہے ، لیکن مصنف نے اسے تکمیل کو نہیں پہنچایا مخطوطہ نہایت اچھی حالت میں ہے ، اور خوشخط نستعلیق میں لکھا گیا ہے - ۴۹۳ ورق کٹلاگ ۲۸۱۲ -

اہم ہندستانی کتب خانوں کے مخطوطے

اس ضمیمے میں دتاسی کے اُن اردو مخطوطوں کی فہرست درج ہے - جو ہندستان کے قابل ذکر کتب خانوں یا اشخاص کی ملکیت تھی اور جو یا تو نسخہ دتاسی کے یہاں پہنچ گئیں یا جن کی نقلیں نہایت اہتمام کے ساتھ تیار کی گئی ہیں -

ا—محمد شاہ کا شہنشاہی کتب خانہ دہلی :—

"دیوان ولی اورنگ آبادی" اعلیٰ درجہ کا خط - صحیح ، اور بغیر تغیر و تبدل کے ، ۲۳۲ صفحات (۲۸۲۹) یہ شاہی کتب خانے کا اصلی نسخہ ہے -

۲—حضور نظام حیدرآباد کا کتب خانہ —

"پنچھی باچھا" منطق الطیر کا دکنی ترجمہ از وجیہ الدین مصنفہ ۱۱۲۴ھ - ۱۷۶ اوراق نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے غالباً موسیو سکے نے نقل کرایا (۲۸۹۷) -

۳—حضور نظام کے وزیر کا کتب خانہ :—

الف— "دیوان افسوس" میر شیر علی افسوس کا اردو دیوان شروع میں ایک فارسی مقدمہ ہے جس میں مصنف کی سوانح عمری لکھی ہے - خوبصورت مخطوطہ - ۳۴۲

صفحات فی صفحہ ۱۵ سطر؛ یہ وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے کا اصلی نسخہ ہے - (۲۸۱۶) -

ب — "گلشن ہند" از مرزا لطف مورخۂ ۱۲۱۵ھ کاتب سید ذوالفقار علی تحلی بتاریخ ۱۲۲۳ھ - غالباً کرنل استیوارٹ نے وزیر نظام کے نسخے سے نقل کرایا - اور دتاسی کو بطور تحفہ پیش کیا؛ ۳۰۰ صفحات (۲۸۰۷)

۴ — ٹیپو سلطان بادشاہ میسور کا کتب خانہ —

"تذکرہ گردیزی" از فتح علی حسینی ۱۱۵۳ھ - کپتان ترویر نے ٹیپو سلطان کے ایک نسخے سے نقل کرایا، خوشخط، ۱۷۰ صفحات، اس کتاب کا ایک ایک نسخہ وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے اور اُس کے کلکشن میں بھی موجود ہے (۲۹۴۱) -

۵ — مہا راجہ کالی کرشنا بہادر کے مخطوطے —

الف "قصہ کا مروپ" از تحسین الدین، کاتب لکھتا ہے کہ وہ اس کو ۲۷ اگھن (نومبر - دسمبر) کو ختم کرتا ہے، مگر سنہ نہیں لکھا ہے - یہ نسخہ خود مہاراجہ نے دتاسی کو تحفہ دیا تھا -

ب — "مصدر فیوض" اسی نام سے کتاب کا سنہ تصنیف بھی نکلتا ہے، از نذرالدین حسن شیخ قریشی ۱۸۱۵ع - مصنف لکھتا ہے کہ یہ کتاب بریلی کے فارسی سیکھنے والوں کے لئے نواب احمد یار خاں ابن محمد ذوالعقار کی فرمائش پر لکھی گئی، مہا راجہ کالی کرشنا کے لیے سید محمد علی صاحب نے ۱۸۲۹ع میں نقل کیا - ۲۲۴ صفحات، یہ مہا راجہ کا اصل مخطوطہ ہے (۲۹۰۳) -

۶ — کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال —

"ترجمۂ تاریخ آسام" ترجمہ میر بہادر علی حسینی (۱۸۰۵ع)

ایشاٹک سوسائٹي بنگال کے مخطوطہ سے پرنسپ نے نقل کرایا اور دتاسي کو تحفہ دیا (۲۸۰۵)۔

۷— فورٹ ولیم کالج کا کتب خانہ —

الف — "قصہ فیروز شاہ عاجز دکني" (دیکھو دکني مخطوطے) یہ اصل مخطوطہ فورٹ ولیم کے کتب خانہ میں تھا۔ نہ معلوم دتاسي کے یہاں کسي طرح پہنچ گیا (۲۸۰۴)۔

ب — "قصہ کامروپ" از تحسین الدین ' موسیو ترویر سکریٹري ھندو کالج کلکتہ نے نہایت اهتمام کے ساتھ کتب خانے فورٹ ولیم کے ایک نایاب نسخے سے نقل کرایا (۲۸۵۴)۔

ج — "قصہ یوسف زلیخا" از محمد امین دکني (دیکھو دکني مخطوطے) یہ مخطوطہ بھی ترویر کی فرمایش پر فورٹ ولیم کے اصل مخطوطے سے نہایت خوشخط نقل کیا گیا۔ ۲۹۹ صفحات (۲۸۸۱)۔

د — "تذکرہ هندي" از شیخ غلام همداني مصحفي (دیکھو دتاسي کے اردو تذکرے) یہ نسخہ فورٹ ولیم کے کتب خانے کے مخطوطے سے ۱۸۳۲ ع میں نقل کیا گیا۔ ۵۴۰ صفحات (۲۹۳۸)۔

یوروپین مستشرقین اور دیگر اشخاص

اس ضمیمے میں اُن یوروپي افراد کي مجملی فہرست پیش کي گئي ھے جنھوں نے اپنے اردو مخطوطے گارساں دتاسی کو بطور تحفہ نذر کئے یا جن کے کتب خانوں کے مخطوطے دتاسي نے خریدے تھے۔

ھر شخص کے نام کے آگے اس کے مخطوطوں کا بھي ذکر کر دیا گیا ھے تاکہ آیندہ اس ضمن میں تحقیقات کرنے والوں کو مدد مل سکے۔

اشخاص کے نام انگریزي حروف تہجي کے مطابق سلسلہ وار لکھے گئے ھیں اور قوسین میں اُن اردو مخطوطوں کے کتلاگ نمبر دے گئے ھیں جن کے ذکر کے سلسلے میں فہرست کتب خانہ دتاسي میں اُن کا نام آیا ھے -

۱ — آرنٹ (Sanford Arnot) اسکاٹ لینڈ کا مستشرق "ترجمہ گنج خوبي" از میر امن ۱۹۰۲ ع (۲۸۳۴)

۲ — بلنڈ (N. Bland) "کلیات سودا" مورخہ ۱۷۹۰ ع (۲۸۱۷) -

۳ — چینڈلر (Henry Chandler) "ترجمہ انوار سہیلي دکني" (۲۸۹۳) -

۴ — کلارک (Adarn Clarke) "ترجمہ انوار سہیلي دکني" مورخہ ۱۱۷۹ ھ (۲۸۹۲) -

۵ — فلکونر (M. Falconer)

(۱) - "دیوان شاہ رکن الدین عشق دھلوي (۲۸۱۵)

(۲) - "قصہ مہر و ماہ" از منسي علام اکي (Aki) (۲۸۷۵) -

۶ - فاربس (D. Forbes) -

(۱) - "حیدر نامہ" مورخہ ۱۲۲۰ھ (۲۷۹۹) -

(۲) - "مولد نامہ" مثنوی سیخ علام محي‌الدین رشت ملنگل پوری مورخہ ۱۲۱۹ھ مکتوبہ مصنف (۲۸۳۳) -

(۳) - "خیابان ریحان" از ریحان‌الدین نگال (۱۸۹۷-۱۸۹۸ع) (۲۸۷۹) -

(۴) - "منتخبات اردو" از میر افضل علي سنہ ۱۸۴۰ع (۲۹۰۰) -

(۵) - "مخزن‌الامثال" از محمد علی سنھاني (۲۸۹۹) -

۷ - فریزر (M. Fraser) مشہور سیاح ایران کے بھائي -

"مجمع داستان" از حکیم حکومت رائے سنہ ۱۲۴۳ع مکتوبہ مصنف (۲۸۴۳) -

۸ - گلکرائسٹ (Dr. Gilchrist) "قصہ کامروپ" از گُندن لال لاهوری - مکتوبہ مصنف (۲۸۵۱) -

۹ - هوٹن (Sir Chamnez Haughton) "دیوان ولی" از مرزا لطف علي دهلوي (۲۸۲۰) -

(۲) - "جنگ نامہ سہراب و رستم" از منشي کاظم‌الدین دکنی (۲۸۹۱) -

۱۰ - لیس (Nessan Lees) (۱) - "مرثیہ اول درِمہ" از سید آغاحسن موسوی امانت دهلوي (۲۸۳۱) -

(۲) - "چار مراثی" از مرزا سلامت علي دبیر لکھنوي (۲۸۳۲) -

۱۱ - ماکن (Turner Macan) ایڈیٹر شاہ نامہ -

(۱) - "گلزار ابراهیم" از علی ابراهیم خاں (۲۸۱۱) -

(۲) - "کلیات جرات" از قلندر بخش (۲۸۱۳) -

۱۲ - مارسل (Mercel) ببلیو تک نیشونل کا ڈائرکٹر - "قصہ شیخ ضیاء" دکني منثوی (۲۸۷۴) -

۱۳ - پریسان (S. Lee Paraisant) - "دیوان ولي" مورخہ سنہ ۱۱۸۰ع (۲۸۲۸) -

۱۴ - پرائس (W. Price) - مصنف هندستاني گرامر "دیوان ولي" مخطوطہ "د" (۲۸۲۳) -

۱۵ - پرنسپ (Prinsip) - "تاریخ شعر ساہ" مترجمۂ مظہر علي خاں ولا سنہ ۱۸۰۵ع - (۲۸۰۲) -

۱۶ - رویک (T. Roebuck) اسی مستشرق کے مشورے سے بیني نارائن لاهوري نے اپنے انتخاب دیوان جہان کا کام تکمیل کو پہونچایا - "کلیات قلندر بخش جرأت" مورخہ سنہ ۱۸۰۸ع (۲۸۱۳) -

۱۷ - رومر - (Romer) - " قصہ مادھو نل " از مرزا لطف علی ولا
سنہ ۱۲۱۵ (۲۸۷۱) -

۱۸ - رسل - (J. W. Russel) - " دیوان ولی " مخطوطہ ب - (۲۸۲۵) -

۱۹ - شکسپیر - (G. Shakespeare) - " نو طرز مرصع چہار
درویش " از میر محمد عطا حسین تحسین مورخہ سنہ ۱۷۸۸ع (۲۸۹۰) -

(۲) - " دیوان ولی " مخطوطہ ب (۲۸۲۵) -

۲۰ - سکے - (M. E. Sice) مقیم پانڈیچری -

(۱) - " خزانۂ عبادت " از شاہ محمد قادری ۱۱۹۹ھ (۲۷۸۹) -

(۲) - " خلاصہ تاریخ بادشاہ " حیدری کے ترجمہ سے اس کو کوئی
تعلق نہیں (۲۷۹۹) -

(۳) - " پنچھی با چھا " از وجیہ الدین ۱۱۲۴ھ نظام حیدرآباد کے
کتب خانے سے نقل کیا گیا - (۲۸۹۷) -

(۴) - " دکنی غزلیں " (۲۹۱۳) -

۲۱ - سٹیوارڈ - (Col. Steward) - " گلشن ہند " از مرزا علی
لطف وزیر نظام حیدرآباد کے کتب خانے سے نقل کیا گیا (۲۸۰۷) -

۲۲ - ٹروئیر (Cap. Troyer) سکریٹری کلکتہ ہندو کالج -

۱ - گلزار ابراہیم - از علی ابراہیم خاں خلیل - خود ٹروئیر کا
مکتوبہ (۲۸۱۰) -

(۲) - " قصہ کامروپ " از تحسین الدین - فورٹ ولیم کے کتب
خانے سے ٹروئیر نے نہایت اہتمام سے نقل کرایا (۲۸۵۴) -

(۳) - " قصہ یوسف زلیخا " از امین دکنی سنہ ۱۹۰۰ع - فورٹ ولیم
کے کتب خانے سے ٹروئیر نے نہایت اہتمام سے نقل کرایا (۲۸۸۱) -

(۴) - " تذکرہ گردیزی " از علی حسین گردیزی سنہ ۱۱۵۳ع - خود
ٹروئیر نے ٹیپو سلطان کے ایک مخطوطے سے نقل کیا (۲۹۴۱) -

۲۳ - وائٹ (Col. Wight)- ”مجموعہ کلام هندستانی و فارسي“ از صدرالدین محمد فیض ابن زبردست خان (۲۸۷۸) -

---

ان مستشرقین کے علاوہ دس اور یورپی افراد کے نام گارسان دتاسی کے اردو مخطوطوں کے سلسلے میں هماری نظر سے گذرے هیں - گو ان کا حسب ذیل تذکرہ بظاهر کوئي اهمیت نہیں رکھتا مگر ممکن هے کہ کسي وقت تحقیق و تفتیش میں اس سے مدد ملے - فوسعن میں دتاسی کے ان مخطوطوں کا فہرست نمبر درج هے جن کے سلسلے میں ان اشخاص کا ذکر آیا هے -

۱- اینڈ رسن (James Anderson) اور گلاڈون نے ملفوظات جہانگیري کے انتخابات کئے تھے (۲۷۹۷) -

۲- بوتروس (F. Boutrous) پرنسپل دهلی کالج - اس شخص کی زیر نگراني مولوی امام بخش صہبائي نے ”حدائق البلاغت“ کا اردو ترجمہ کیا (۲۹۰۱) بوتروس هي نے دتاسي کے لیے نہایت احتیاط سے اس ترجمہ کا ایک نسخہ لکھوایا -

اسی بوتروس نے دتاسي کو مصطفی خان شیفتہ کا ”تذکرۂ گلشن بے خار“ بھي نقل کرا کر تحفہ دیا تھا (۲۹۳۰) -

۳- فولس (Captain Foules) - اس شخص کي فرمایش پر کلیات ولي سنہ ۱۷۸۰ع میں نقل کیا گیا تھا (۲۸۲۹) -

۴- فرانسس- (M. Robert Fransis) اس شخص کو تحفہ دینے کے لیے شاہ حسین خان حقیقت دهلوي نے اپنے قصے ”جذب عشق“ کو ۱۲۱۲ھ (م ۱۷۹۷ - ۱۷۹۸) میں نقل کیا - یہ نسخہ اصل کام کي تیسري نقل هے - نقل کرتے وقت مصنف فتح گڈھ کیمپ میں تھا - اس کتاب میں ایک صحیح واقعہ بیان کیا گیا هے جو بمقام سماوي

۱۲۰۴ھ (م - ۱۷۸۹ - ۱۷۹۰) گذرا - اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۱ھ ھے (۲۸۸۳) -

۵—گلاڈون - (Gladuin) نے " ملفوظات جہانگیری " کے اِنتخابات پیش کئے تھے (۲۷۹۷) -

۶—ھیربلو - (D' Herlbelot) نے ایک کتاب " قصۂالصبحہ " کا ذکر کیا ھے جس میں وھی قصہ بیان کیا گیا ھے جو نظام الدین دکنی کی کتاب " کھوپری نامہ " میں یسوع مسیح کی نسبت لکھا گیا ھے (۲۸۹۹ - ۳) -

۷—جونس - (sir William Jones) نے " تاریخ نادری حیدری " کا انگریزی میں ترجمہ شایع کیا - (۲۸۰۱) -

۸—لیڈن - (Leydan) - " گلشن عشق " نصرتی دکنی (۱۹۵۸) مورخہ سنہ ۱۷۵۸ اسی شخص کی ملک تھی جو داسی نے حاصل کی - (۲۸۷۹) -

۹—لٹل (Captain Thomas Little.) یہ شخص ٹیپو سلطان کی مخالف انگریز فوج میں سردار تھا - اور اسی کی فرمایش پر حیدر نامہ فارسی کا اردو میں ترجمہ کیا گیا - اس کتاب میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سوانح و حالات درج ھیں - مورخہ ۱۲۰۰ھ (۲۷۹۹) -

۱۰—مونات (James Monot) فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں یہ شخص ھندستانی پروفیسر تھا اور اس نے " بیتال پچیسی " مترجمہ سری للو لال کبی گجراتی اور مظہر علی خان ولا در نظر ثانی کرنے کے لیے تیرینی چرن متر سے فرمایش کی - (۲۸۹۸) -

"مثنوي حُزن اختر"

اور

خصوصیات مصنف

(از مولانا احسن مارهروي پروفیسر اُردو اِنترمیڈیٹ کالج علی‌گڑھ)

تاریخي اندراجات سے الگ هو کر دیکھا جائے تو هندستان کے سلاطین و والیان ملک میں چند هستیاں هي ایسی نظر آئیں گي، جن کو شہرت عام نے بقائے دوام کی شاہ راہ سے گزرنے کا موقع دیا ھے - انھیں چند نفوس میں لکھنؤ کے آخري تاجدار جان عالم واحد علي شاہ اختر کو بھي شمار کرنا چاهیے، خاص و عام میں اُنکي شہرتیں جن واقعات و حالات سے وابستہ هیں وہ تین عنوانوں میں محدود هیں :—

(۱) کمال شاعري -

(۲) انہماک نشاط -

(۳) زوال سلطنت -

ان تینوں حالتوں کے وقوع میں کسي شبہے کي گنجائش نہیں، البتہ اُن کے بیان و اظہار میں ریبائش داستان کی سي رنگ آمیزیاں دھوکے میں ڈال سکتي هیں - ایسي باتوں کي تصدیق و تکذیب کے لئے دوسرے وقائع نویسوں کي تحریروں کے مقابل میں خود صاحب واقعہ کے بیانات کا مطالعہ زیادہ قابل اعتبار اطلاعیں بہم پہونچا سکتا ھے -

حُسن اتفاق سے واحد علي شاہ مرحوم کا بیشتر سرمایہ تصنیف و تالیف طبع هو چکا ھے اگر اُس کو معیار نفسیات پر فطري اصول کے ساتھہ پرکھا جائے تو مصنف کے اکثر صحیح واقعات اور وقوعي حالات معلوم هو سکتے هیں - فيالحال اُن کي ایک تصنیف (مثنوي حزن

اختر) سے خصوصیات مذکور پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی -

اس مثنوی میں بادشاہ موصوف نے انتزاع سلطنت کے بعد اپنے لکھنؤ سے جانے؟ کلکتے میں رهنے اور قید هونے کے سوانح اس شرح و بسط سے قلم بند کیے هیں کہ ان کو پڑھکر واقعات کی تصدیق کرنے کے لیے؟ اُن کے بیان کا انداز صداقت؟ دوسری تحریروں کے تائیدی ثبوت سے مستغنی کر دیتا ھے -

جان عالم کی مشہور خصوصیتوں میں اُن کی شاعری کا نمبر تیسرا ھے - اور اُن کی شہرت سخن؟ صرف طبقۂ شعرا اور وہ بھی مخصوص حلقے تک محدود ھے -

مثنوی حزن اختر کو پڑھ کر جو معلومات حاصل هوتی هیں وہ اُنھیں خصوصی شہرتوں کے ماتحت هیں جن کا بیان اوپر هو چکا ھے؟ یعنی ——

١ - کمال شاعری اور اُس کے اسالیب بیان کی تنقید -

٢ - انہماک نشاط اور اُس کے متعلقات -

٣ - زوال سلطنت اور اُس کے اسباب -

لیکن قبل اس کے کہ اُن خصوصیات پر تبصرہ و نظر کا سلسلہ شروع کیا جائے بعض اهل قلم کی ایسی تحریریں نقل کی جاتی هیں جن سے موجودہ طرز تنقید کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ھے ——

رسالۂ مخزن لاهور نمبر (١) جلد (١٦) اکتوبر سنہ ١٩٠٨ع میں "جان عالم کی شاعری" کے عنوان سے ایک مضمون شائع هوا ھے؟ اُس کے صفحہ (٣٨) سطر (٥) میں یہہ الفاظ درج هیں ——

"یہہ هندستان کے پہلے بادشاہ هیں جنھوں نے شاعری میں کسی کی شاگردی قبول کرنا ننگ ؟ سمجھا" -

اس انکشاف کے بعد خود خان عالم اختر کا اعتراف بھی سننے کے قابل ہے:—

زن و مرد سے کم ہوئے سات لوگ
مجھے فتح دولہ کا اب بھی ہے سوگ
خدا بخشے اُس کو عجب مرد تھا
فنِ شاعری میں تو وہ فرد تھا
یہہ بندہ ہے شاگرد اُس ماہ کا
بندھا ہے دھواں دل میں اک آہ کا

(مثنوی حزن اختر مطبوعہ سلطان‌المطابع صفحہ (۵۳)-

اسی طرح ایک مضمون نگار کا بیان اخبار ذوالقرنین بدایوں میں دیکھا گیا، نمبر (۳۵) جلد (۲۸) ۳۱ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں بعنوان "اودھہ کی تاریخ کا ایک ورق یعنی آخری تاجدار اودھہ واجد علی شاہ کی زندگی کا مختصر خاکہ" - بیان کیا گیا ہے کہ —

حرام مطلق نہیں کرتے تھے، غیر ممنوعہ عورت کی صورت تک دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے، (۳۶۰) بیگمات تھیں اور اُن میں کوئی ایسی نہ تھی جس کے ساتھہ از روئے شرع شریف متعہ نہ ہو گیا ہو، کبھی کسی عورت کے ساتھہ جبراً متعہ نہیں کیا، بے شک ممنوعات کی کثرت تھی اور بادشاہ پر جو فرد جرم لگائی گئی ہے اُس میں سب سے زیادہ سنگین یہی جرم تصور کیا جاتا ہے، اس پر کوئی شرعی الزام تو آ ہی نہیں سکتا اس لیے کہ بادشاہ مذہب اثنا عشریہ کے پیرو تھے لہذا اُن کے اعتقاد میں متعہ بغیر کسی حد اور قید کے شرعاً جائز تھا، اب رہا یہہ کہ اخلاقی اور تمدّنی حیثیت سے بادشاہ کو اتنی عورتوں سے متعہ کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اس

کي حالت یہہ ھے کہ بادشاہ نہایت ھي محتاط اور پرھیزگار تھے؟ اور اُنھیں ایک گھڑي کے لیے بھي گوارا نہ تھا کہ کسي نا محرم عورت پر اُن کی نظر پڑے مگر شاھي محل تھا جس میں بیش خدمتوں محلداروں؟ مغلانیوں؟ مکان‌دارنیوں؟ یہاں تک کہ بھشتنوں اور خاکروبنوں کے ایک گروہ کثیر کے رھنے کي ضرورت تھي - ممتوعات میں چند ھي تھیں جن کے ساتھہ خلوت‌گاہ میں داخل کرنے کي غرض سے متعہ کیا گیا ہو؟ ورنہ سب کی سب خدمتگارنیاں تھیں؟ لیکن چونکہ متعہ ہو جانا لہذا جائز تھا کہ اُن میں سے کوئي پسند آئے تو خلوت میں بلا لي جائے - معترضین نے اس بارے میں بادشاہ کي حالت پر غور نہیں کیا اس لیے کہ ممتوعات کي کثرت تو اُن کے اتقا اور پابندي شرع کي دلیل تھي اور اتقا بھی ایسا؟ جیسا معمولي مسلمانوں میں بھی کم دیکھا گیا ھے؟ بہت سے اگلے بادشاھوں کي نسبت آپ سنتے ھیں کہ اُن کے محل میں چند بیوي کے ساتھہ ہزاروں کنیزیں بھري ھوتي تھیں اور اب بھی اگرچہ بردہ فروشی ممنوع اور جائز کنیزوں کی فراھمی کا سلسلہ مسدود ھو گیا ھے؟ مگر ھندستان کے مسلمان والیان ملک کے محل اور زنان‌خانے اُسي طرح بے حد عورتوں سے بھرے ھوئے ھیں جن کے جائز و ناجائز ھونے کا کبھي اُنھیں خیال بھي نہیں آتا - لہذا واحد علي شاہ نے شرعي پہلو کی نگہداشت کے ساتھہ اپنا شوق پورا کیا تو کون اعتراض کرسکتا ھے؟ لوگ خواہ مخواہ کو بدنام کرتے ھیں کہ بھشتنیں اور مہترانیاں واحد علي کی بیوي تھیں مگر جو لوگ ایسا کہتے ھیں وہ سخت مغالطے

میں پڑے ہوئے ہیں اصل واقعہ یہہ تھا کہ بادشاہ اپنے ہاتھہ سے آبدست نہیں لیتے تھے لہذا کئی گز چھالتین یا نینُسکھہ کی لُنگی سے آبدست کرایا جاتا تھا ؟ جس کو دو عورتیں اِدھر اُدھر کھینچتیں ؟ اس خدمت پر ایک بھشتن اور بھنگن مقرر تھی ۔ اور چوں کہ اُن پر سطر ظاہر کرنا پڑتا تھا لہذا بادشاہ نے ان دونوں کو ممنوعات میں داخل کرکے پہلی کو آب رساں بیگم ؟ اور دوسری کو مُصفّی بیگم کا خطاب دے دیا تھا ؟ بادشاہ نے کبھی حرام نہیں کیا اور نہ کسی نا محرم عورت کو اپنے سامنے آنے دیا ۔ چنانچہ خدمت میں جتنی عورتیں رہتی تھیں وہ قبلہ و کعبہ کے سامنے آئیں اور قبلہ و کعبہ تحقیق و تفتیش کے بعد اُن کے ساتھہ متعہ کا صیغہ پڑھہ دیتے ،، ۔ لیکن خود بادشاہ سلامت یہہ ارشاد فرماتے ہیں ۔

چہارم ہے قیصر بھی بیگم کے ساتھہ
لکھا نام میں نے بہت غم کے سادھہ
نہ منکوحہ تھی اور نہ ممنوعہ تھی
فقط دوستی سے یہاں وہ رہی
اُسے بعد چندے جو آیا خیال
گئی لکھنؤ ہم کو دے کر ملال
وہیں زاد رہ سارہ تھیلیاں
عدد میں تھے گیارہ ہزار اے جواں
وہ دس اس لئے نا رہے میرے پاس
نہ ٹھہری ہوئی اس طرح کی اُداس
ہمیں چھوڑ زنداں میں ؟ راہی ہوئی
گئی وہ گئی وہ گئی وہ پری

(حزن اختر صفحہ (۶۵ و ۶۶)۔

کسي مشہور و معروف ہستي کے اوصاف بیان کرتے میں ایسي بالاخوانیاں جن سے اس کي وقعت اور کم ہو جائے ہجو ملیح کی مترادف ہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ موصوف خود اس کا مدعي نہ ہو - اپني انفرادي رائے پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کے متعلق اب تک جن دو ایک اہل قلم نے آزادانہ یا روادارانہ تبصرہ کیا ہے اُس کا خلاصہ درج کردیا جائے تا کہ عام رایوں کو سن کر، ناظرین ہر اتفاقي اور اختلافی رائے سے بآسانی نتیجہ نکال سکیں، نیز دونوں قسم کي روایتوں کا امتزاج، درایت کے تجزیئے سے دودھہ کا دودھہ اور پاني کا پاني ہو سکے -

(۱) (اقتباس خم خانۂ جاوید مولفہ پنڈت سري رام جلد اول صفحہ ۲۰۹ و ۲۱۰) -

"ہم اُن کي نفس شاعري کے متعلق اپني رائے ظاہر کرتے ہیں، اُن کے متعدد دیوان، مثنویاں، ضخیم مرثیے، سلام اور مختلف و بے شمار نظمیں دیکھہ کر ہر شخص یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ سلطان عالم ہر وقت اور ہر لحظہ اسي فکر میں رہتے ہوں گے - ہر رنگ اور ہر طرز میں لکھا ہے، مگر اساتذۂ لکھنؤ کي خشک کلامي کے زبردست اثر پر حاوی نہ ہوسکے، چنانچہ کلام میں سوز و گداز کم ہے اور زیادہ تر رعایت لفظي ھي کی تکرار ہے - غزل، قصیدہ، مثنوي، سلام، قطعہ، الغرض کوئي صنف شاعري اُن کي فکر رسا سے نہیں چھوٹي بلکہ اپني حیرت انگیز پُر گوئي کي بدولت جو کچھہ لکھا جي بھر کر لکھا مگر افسوس ہے کہ جملہ تصانیف میں سے صرف ٹُھمریوں نے قبولیت کا درجہ حاصل کیا، جملہ تصانیف کي تعداد (۴۰) جلدوں سے کم نہیں اُن کے زمانے میں کیا بلکہ اُن سے پہلے ھي لکھنؤ کے شعرا رعایت لفظي اور استعارہ بندی کا ایسا رواج دے

گئے تھے کہ وہاں والے اب تک اس طرز پر مٹے ہوئے ہیں غزلوں میں حضرت اختر کی روش بھی وہي ہے ؛ پس ہم نہایت آزادي سے اس رعایت لفظي کی پابندیوں کو مد نظر رکھکر اُن کي غزلوں پر رائے دیتے ہیں کہ اُن کے کلام میں اکثر جگہ مرزوبي طبع اور فراهمي الفاظ کے سوا کوئی خاص زبان یا بیان کا لطف نہیں پایا جاتا ؛ مثنویوں میں البتہ اکثر جگہ روزمرہ اور بیان کی صفائي کا خیال رکھا ہے - دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ اُن کے مکتوبات وغیرہ دیکھہ کر ایک عجیب اور قابل قدر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ اختر هي ایک ایسے بے دھڑک اور سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنے تمام خفیہ رازوں ؛ دلي بھیدوں اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپني خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ اُن خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے بھی پیش کیا ؛ ان کي یہ اخلاقي جرءت واقعي اس خاص روش میں تمام شعراے ماضي و حال سے بڑھہ گئي ہے - "

(۲) (اقتباس مضمون "جان عالم کي شاعری" از رسالۂ مخزن لاہور ؛ اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ع نوشتہ خواجہ عشرت لکھنوي) -

"حضرت قدر قدرت ابوالمنصور سکندر جاہ ناصرالدین قیصر زماں سلطان عالم ؛ علاوہ اور تمام علوم و فنون کے کلاسن شاعري کي بھی گلگشت کیا کرتے تھے اور اس باغ میں بہت کچھہ گلکاري بھی کی ہے ؛ نظم کے ہر صیغے میں داد سخن دي ہے . . وہ زمانہ اُردو شاعري کے شباب کا تھا ؛ زبان کے قواعد ؛ محاورات کي پابندي ؛ متروکات کا لحاظ تقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے پرهیز کا دور دورا تھا . . دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے لکھنؤ کي زبان مستند اور مقبول عام بھی اور دهلي کا ٹوٹتا ہوا مجمع بھي اسی دربار میں فروغ حاصل کر رہا

تھا ۔ .پھر شاہ اختر کا شاعری میں معجز نمائی کرنا ایک لازمی فعل تھا، بادشاہ کا مذاقِ شاعری ایک نئیں اور اچھوتا پہلو لیے ہوئے تھا ۔ بادشاہ اگرچہ کسی سے تلمذ نہ رکھتے تھے لیکن طرز کلام زیادہ تر میر و مرزا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا تھا ۔ شاعری میں بڑے بڑے سخن فہم شاعر لکار اُٹھتے تھے، خداوند ! یہ شاعری نہیں سحر ہے، اعجاز ہے ۔ فارسی ترکیبوں کے جملے ایک جدید شان سے جھلکتے تھے ۔ بادشاہوں کا کلام اس سبب سے لوگ کم دیکھتے ہیں کہ اُن کی شاعری تعریف کی بوچھار سے کمال کی حد تک نہیں پہنچنے پاتی اور مصاحبین کی بے جا خوشامد سے عمدہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی، مگر شاہ اختر کا کلام اس عیب سے بری تھا وہ اپنے کلام کو ہمیشہ نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے اُن کو یہ شک ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کوئی نقص شاعری کلام میں رہ جائے اور چوں کہ خود سخن فہم تھے اس سبب سے ایسے ویسے شاعر کی غزل اُن کے مشاعرے میں مشکل سے مدح کی مستحق ہوتی تھی ۔ جانِ عالم نے تو باوجود مشاغل اور سلطنت کے جو کچھ فرمایا آویزۂ گوش حقائق ہوا، ہر غزل مقبول خاص و عام تھی، مشکل سے مشکل اور سنگلاخ زمیں آپ کے دریائے فکر کے آگے پانی تھی، ہر پہلو پر جزئیات بلاغت کا خیال رہتا تھا پھر تشبیہات و استعارات کی ملمع کاری نور علی نور ۔ اُن سب باتوں سے قطع نظر کر کے تمام کلام پر اجمالی نظر ڈالی جائے تو معنوی خوبیوں اور عمدہ تخیل کے سمندر موج زن نظر آئیں گے" ۔

غالباً دو اقتباسات شاہ موصوف کی حقیقت شاعری اور مذکرہ اہل الرائے کی ذہنیت کے معلوم کرنے میں کافی مدد دیں گے اُردو شعرا کے اکثر تذکرے واجد علی شاہ کے وجود سے پہلے لکھے گئے، اور جو تذکرے

اَن کے عہد میں تصنیف و تالیف ہوئے اُن میں "سخن شعرا" (مولفہ نساخ) کے سوا کسی میں اُن کا نام تک نہیں دیکھا گیا - نسّاخ نے بھی صرف دو سطری حال لکھ کر دو ایک سعر درج کردیے ہیں ' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سلسلۂ شاعری قابل تذکرہ نہ تھے ' دو ایک تذکرے چودھویں صدی عیسوی میں اشاعت پذیر ہوئے اُنھیں میں کم و بیش اُن کے حالات ملتے ہیں ' یا بعض رسائل و صحائف میں اُن کی شاعری وغیرہ کے متعلق مضامین پڑھنے میں آتے ہیں ' جن دو تحریروں کا انتخاب یہاں درج کیا گیا ہے ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی دو چار تحریریں اور مل جائیں مگر وہ بھی بیشتر انھیں سے ماخوذ ' اور اس لئے اسی انداز کی حامل ہوں گی ' لہٰذا اِنھیں اصل ماخذوں کو ملحوظ رکھ کر اس باب میں کچھ عرض کیا جاتا ہے -

جب سے دور جدید کی شاعری نے اہل ذوق میں تعارف حاصل کیا ہے اُس وقت سے بخصوصیت "اُردو شاعری کے دو مختلف اسکول" کا عنوان لکھنؤ اور دھلی کی شاعری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ' اس اصطلاحی روز مرہ و عنوان کو پیش نظر رکھکر دیکھا جاتا ہے تو اہل دھلی اور اُن کے ساتھ دوسرے دلدادۂ سلاست زبان ' مؤلف حمخانۂ جاوید کے ہمنوا پائے جاتے ہیں ' یعنی اہل لکھنؤ خشک کلامی ' رعایت لفظی کی تکرار ' استعارہ بندی ' کنگھی چوٹی کے سوا اور کوئی سرمایۂ شاعری نہیں رکھتے - اُن خیالات کی تائید میں اقتباس خمخانۂ جاوید کے علاوہ شعرالہند جلد اول کی عبارت پڑھنی چاہیے —

"لکھنؤ کی شاعری کا خاکا اگرچہ مصحفی اور انشا ھی کے زمانے میں قائم ہوچکا تھا - تا ہم ابھی تک شاعری کے مختلف اسکول قائم نہیں ہوئے تھے ' لیکن ناسخ اور آتش نے اس رنگ کو زیادہ نمایاں کیا ' اُن کے زمانے سے لکھنؤ اور دلی کے دو مختلف اسکول قائم ہوگئے جن کی

خصوصیات باہم مختلف قرار پائیں :—

(۱) لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں عام طور پر جو زنانہ پن پیدا ہو گیا تھا اُس کا اثر وہاں کی شاعری میں نمایاں ہوتا ہے -

(۲) شعرائے دہلی کے کلام میں فارسی زبان کی دلاویز ترکیبیں نہایت کثرت سے پائی جاتی ہیں لیکن شعرائے لکھنؤ کا کلام اُن ترکیبوں سے بالکل خالی ہے -

(۳) شعرائے دہلی قدما کی طرز پر اکثر مختصر غزلیں کہتے تھے اس لیے اُن کے یہاں مبتذل، سخیف اور بھرتی کے اشعار بہت کم ہوتے تھے، لیکن شعرائے لکھنؤ اکثر نہایت سیر حاصل غزلیں لکھتے ہیں جن کی انتہا بسا اوقات دو غزلہ سہ غزلہ اور چو غزلہ پر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام قافیوں کو خواہ مخواہ باندھنا پڑتا ہے اور اس طرح بہت سے مبتذل مضامین پیدا ہو جاتے ہیں -

(۴) شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام میں معنوی طور پر جو جزء مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ کے کلام میں روحانی جذبات بہت کم پائے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ معشوق کے خارجی اوصاف و لوازم وغیرہ کا ذکر اس کثرت سے آجاتا ہے کہ اُن کے کلام کو پڑھ کر تغزل کا لطف بہت کم حاصل ہوتا ہے -

(۵) رعایت لفظی کی طرف شعرائے لکھنؤ کا عام میلان پایا جاتا ہے اور اس صنعت کو وہ نہایت ابتذال کے ساتھ استعمال کرتے ہیں -

(۶) ابتذال بھی شعرائے لکھنؤ کی ایک عام خصوصیت ھے -

(۷) شعرائے لکھنؤ کا عام رنگ معاملہ بندی ھے جس نے حد اعتدال سے بڑھ کر بازاری روش اختیار کر لی ھے - اس لیے اُن کے کلام میں متانت و ثقاہت نہیں پائی جاتی -

(۸) تشبیہات و استعارات میں نزاکت و لطافت نہیں -

(از صفحہ ۲۰۷ تا ۲۱۴ شعرالہند جلد اول) -

ان خیالات سے اگرچہ اھل لکھنؤ اور اُن کے متبعین کم و بیش اختلاف رکھتے ھیں مگر ایسا اعتراف اکثر سنجیدہ صاحبان ذوق کی تحریروں میں ضرور پایا جاتا ھے --

۱ - "وہ خیالات سخن (ناسخ) کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطۂ غزل سرائی میں داخل ھو گئے جو در حقیقت احاطۂ غزل سرائی سے باھر ھیں ؟ اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ھوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور دھندہ کے مضامین سے سخن کی غزلیں معرّا ھو گئیں اور غزل سرائی کا مطلب فوت ھو کر ایک ایسی قدم کی شاعری ایجاد ھو گئی جس نہ قصیدہ گوئی اور نہ غزل سرائی دو میں سے کسی کی تعریف صادق نہیں آتی ھے - ناسخ کی تشبیہیں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی ھیں اس پر بھی کبھی کبھی بھدتی کا اثر پیدا کر دیتی ھیں -

(کاشف الحقائق مولانا شمس العلما مولوی سید امداد امام اثر صفحات ۱۳۹ - ۲۴۸) -

۲ - بادشا (واجد علی شاہ) کی طبیعت نے نظم کو سادہ پسند کری تھی ؟ یعنی برق و بحر و جواھر وغیرہ جس رنگ میں ڈوبے

ہوئے تھے وہی رنگ بادشاہ کو پسند تھا مگر یہ رنگ غیر طبعی ہونے کے سبب سے کبھی عام پسند نہیں ہوا -

(مضمون رسالہ ادیب الہ آباد بابت مارچ سنہ ۱۹۱۲ع نوشتہ مولوی حیدرعلی طبا طبائی)-

متذکرۂ بالا تمام اقتباسوں میں صرف خواجہ عشرت لکھنوی کی رائے ایسی ہے جس کا نقطہ نقطہ شاہ اختر کی شاعری کے اُن اوصاف سے دست و بغل ہے جن میں ذرا سی گنجائش بھی اُس دوسرے پہلو کے نظر نہیں آتی جو بڑے بڑے شاعر میں بحیثیت انسان ہونا چاہیے - اُن کا بانگ بلند یہ لکھنا کہ :-

۱ - "وہ زمانہ اُردو شاعری کے شباب کا تھا ، زبان کے قواعد ، محاورات کی پابندی ، متروکات کا لحاظ ، ثقیل اور غلط الفاظ کی بندش سے درھم کا دور دورہ تھا -

۲ - بادشاہ کا مذاق شاعری ایک نفیس اور اچھوتا پہلو لیے ہوئے تھا -

۳ - طرز کلام زیادہ تر میر و مرزا کے انداز شاعری سے ملتا جلتا تھا -

۴ - مضامین کی بیجا جوشامد سے دقیقہ کلامی اور کہنہ مشقی نہیں آنے پاتی - مگر شاہ اختر کا کلام اُس عیب سے بری تھا -"

میرے نزدیک حقیقت سے دور ہے -

اہل وقوف کے نزدیک شاہ اختر کی شاعری کے لیے یہہ کہنا کہ "اُن کا رنگ میر و مرزا سے ملتا جلتا ہے" مطبوعات شاعری میں یقیناً نا قابل قبول ہے اب رہا یہہ امر کہ وہ محاورات کے ایسے پابند تھے کہ کبھی غلطی نہیں کرتے تھے ، اس لحاظ سے مان لیا جائے کہ وہ بادشاہ تھے ، اور بمصداق ، ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است - خاموشی اختیار کر لی جائے تو دوسری بات ہے ، ورنہ اُن کا کلام پڑھ کر صاف معلوم

ہوتا ہے کہ وہ نہ تمام محاورات پر پوری طرح حاوی تھے نہ اُن کا کلام متروکات سے بے نیا ہے نہ اُن کی شاعری میں وہ پُختگی و سنجیدگی پائی جاتی ہے جو کسی مشاق اور محتاط سخن گو کے کلام میں ہونی چاہیے ؛ اور نہ اُن کے اسالیب بیان سے بحیثیت مجموعی کوئی روحانی انبساط حاصل ہوتا ہے - بلکہ صرف اس بنا پر کہ اُنھوں نے مثنویوں میں اکثر آپ بیتی بیان کی ہے ؛ پڑھنے والے اور سننے والے میں انسانی ہمدردی کا فطری جذبہ ضرور بیدار ہو جاتا ہے - غرض کہ اُن کی شاعری میں وہی ایک بات مابہ الامتیاز ہے جس کو مؤلف خم خانۂ جاوید نے ظاہر کر دیا ہے کہ "اُن کے مکتوبات وغیرہ کو دیکھ کر ایک عجیب اور قابل قدر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہ اختر ہی ایک ایسے بے دھڑک اور سچے شاعر تھے جنھوں نے اپنے تمام جذبات ؛ دلی بھیدوں اور خانگی باتوں کو اس طرح صاف صاف الفاظ میں نہ صرف اپنی خاص مجلس اور چند محرم راز لوگوں میں بیان کیا بلکہ اُن خیالات کو زیور طبع پہنا کر ملک کے سامنے پیش کیا ؛ اُن کی یہ اخلاقی جرأت واقعی اس خاص روش میں تمام شعرائے ماضی و حال سے بڑھ گئی ہے" - فی الحقیقت یہی وہ خصوصیت ہے جس نے شاہ اختر کو شعرا کی صف میں شامل ہونے کا موقع دیا ورنہ اُنھوں نے جس قسم کی سخن سرائی اور قافیہ پیمائی کی ہے اُس کا اندازہ سطور آیندہ سے واضح ہوگا -

اس سے میرا یہ منشا نہیں ہے کہ شاہ موصوف کے کلام میں کوئی شعر یا کوئی حصہ ؛ صحت الفاظ ؛ برجستگی محاورات ؛ پختگی بندش ؛ اور سلاست بیان سے خالی ہے ؛ اس بحث کی مزید توضیح سے پہلے لکھنؤ کے عام مذاق شاعری کی بابت جو خاص بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کے متعلق اپنی رائے کا اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے - لیکن یہ خیالات زیادہ تر بیسویں صدی عیسوی سے پہلے کی شاعری کے آئینہ بردار ہوں گے -

غالباً تاریخی حیثیت سے حسب بیان مؤلف شعرالہند کوئی سخن فہم اس کا مخالف نہ ہوگا کہ لکھنؤ کی شاعری کا جداگانہ وجود شیخ ناسخ کی بدولت قائم ہوا ؟ اور اُنھوں نے اسی ادعا پر اپنا تخلص ناسخ رکھا - کہا جاتا ہے کہ شیخ سے پہلے عام شعرا کے کلام میں جو رطب ویابس بھرا ہوا تھا اُن سب کو اُنھوں نے صاف کر کے ایک منجھی ہوئی زبان کا رواج دیا - اس دعویٰ کی تائید و تردید کے لیے دو تنقیحیں قائم کی جاتی ہیں -

(الف) آیا ناسخ سے پہلے کسی شاعر نے وہ الفاظ اور وہ ترکیبیں استعمال نہیں کیں جو اُن کے قلم سے ظہور پذیر ہوئیں -

(ب) آیا ناسخ کے زمانے میں وہ الفاظ مستعمل ہوتے رہے جن کو اُنھوں نے متروک کیا - تنقیح اول کی تائید میں صاحب کشف الحقائق جلد دوم صفحہ (۱۳۸) میں لکھتے ہیں ؟ کہ :—

" شیخ امام بخش ناسخ زبان اُردو کے مصلح گزرے ہیں ؟ اس اعتبار سے اُن کا یہ تخلص نہایت حسب حال ہے ؟ شیخ نے اُردو کو خراس خراس کر ایسا درست کردیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی - ذوق نے صرف مضمون آرائی کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور اصلاح زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے - مومن کو بھی اس جانب کچھ میلان نہ ہوا ؟ اور غالب نے تو فارسی کی اس قدر آمیزش کردی کہ اُردو پر زبان فارسی کا شبہہ ہونے لگا ؟ حضرت (غالب) نے فارسی الفاظ یا فارسی جملوں کو اس طرح باندھا کہ اُردو فارسی نما ہو گئی - اس کے برخلاف شیخ نے گو الفاظ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اُردو اُردو رہ گئی ؟ بلکہ

اگر فارسی جملے کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی کو اُردو کر کے دکھا دیا، مثلاً شیخ فرماتے ہیں "":—

"سوالِ وصل پر ہلتا پری رو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے شرابِ عاشقاں بر شاخ آہو کا"

اس شعر میں سوالِ وصل، پری رو، ابرو، اشارہ، اور شرابِ عاشقاں بر شاخ آہو - الفاظ فارسی اور جملہ و ترکیب کی تعریف میں آسکتے ہیں، کیا ناظرین میں کوئی ایسا ذوق نا آشنا ہوگا جس نے یہ الفاظ شیخ ناسخ کے سوا کسی دہلوی شاعری کے کلام میں نہ دیکھے ہوں مثلاً -

سوال بوسہ کو ٹالا جوابِ چین ابرو سے
شرابِ عاشقاں بر شاخ آہو اس کو کہتے ہیں

مؤلف کاشف الحقائق نے طویل تمہید کے بعد صرف ایک شعر مثال میں لکھا ہے، اس لیے جواب میں بھی ایک ہی شعر کافی سمجھا گیا ورنہ ایسے الفاظ اور جملے متقدمین ناسخ و ذوق کے کلام میں بھی بکثرت پائے جاتے ہیں - لہٰذا بوادید حالات اس امتیاز خصوصی کو قدر مشترک پا کر تنقیح اول کا فیصلہ شیخ صاحب کے خلاف کیا جا سکتا ہے -

دوسری تنقیح اصل تقسیم ہے اور اسی پر اختلاف و اتفاق کا دارومدار ہے - جہاں تک راقم کی معلومات ہے محاورات و الفاظ کے ترک و اختیار کی دو ہی صورتیں دیکھی جاتی ہیں، اول یہ کہ جب کسی قدیم لفظ یا محاورے کا استعمال کم یا زیادہ ہونے لگتا ہے تو فصحائے مستند و ممتاز اُن لفظوں کو اپنے روز مرہ سے خارج کرنے لگتے ہیں یا داخل کرلیتے ہیں مثلاً آوے، جاوے، ہووے، کہارے، لیویں، دیویں وغیرہم کو سو سوا سو برس عام و خاص سب بے تکلف بولتے تھے، بعد کے آنے والوں نے ابتداءً کبھی بھی الفاظ استعمال کیے اور کبھی ان کی جگہ آئے، جائے، ہوئے،

کھائے ، لے یا لیں - دے یا دیں بولنے سروع کیے - رفتہ رفتہ مُصلحین و محققین نے پہلے لفظوں کو بول حال میں کم دیکھہ کر اور ان قائم مقاموں میں کسي حرف کو مخل فصاحت نہ سمجھہ کر بولنا اور لکھنا سروع کردیا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صاحبان ترک و اختیار کے عہد آخر میں قدیم الفاظ معدوم ہو گئے اور اُن کے بعد جو نسل پیدا ہوئي اُس نے اُن لفظوں کو ہمیشہ کے لیے مفقود سمجھہ کر یک قلم متروک کردیا - دیکھیے فارسي ترکیب کے ساتھہ نون کا اعلان فارسي قواعد کے خلاف تھا مگر متقدمین اور متوسطین شعراے اُردو نے بکثرت دین - و ایمان - زمین و آسمان ، فخر ہندستان وغیرہ کو باعلان نون لکھا ھے - چنانچہ ذوق و مومن اور غالب کے زمانے تک اس قسم کا استعمال رہا مگر متقدمین سے کم ، اُن کے بعد جو زمانہ آیا اُس میں اہل سخن نے متفق علیہ اس کو متروک سمجھہ لیا - اس خصوص میں اُن حضرات کو مستثنی سمجھنا چاھیے جنھوں نے سخرل ساعری کی تائید و ترویج کے بعد متروک تراکیب و الفاظ کا استعمال جائز سمجھہ لیا ھے -

دوسري صورت یہ ھے کہ آنے والی نسل نے وہ قدیم الفاظ سنے ھي نہیں یا اُس کے نمونہ و نثرمیں ادبي حیثیت سے وہ الفاظ داخل روز مرہ نہیں ایسي حالت میں وہ شاعر اپنی سخن آفریني میں اُن الفاظ سے کیا سروکار رکھہ سکتا ھے جن کا وجود اُس کے موجود ہونے سے پہلے معدوم ہو چکا ہو - معمولي تفحص سے معلوم ہوسکتا ھے کہ لکھنؤ کے آغاز ساعري میں ایسے بہت سے الفاظ جن کو متروکات ناسخ کہا جاتا ھے اُن سے پہلے ترک ہونے شروع ہوگئے تھے ، مگر چوں کہ شعراے عصر نے اپنے ابتدائی کلام سے اُن الفاظ کو خارج نہیں کیا تھا ، اس لیے جا بجا اُن کے دیوانوں میں آئے ھے ، کھلائے ھے ، وغیرہ الفاظ قائم رہ گئے ، اگر ان الفاظ کے ساتھہ وہ مترادف اور اختیار کردہ الفاظ اُن معاصرین کے کلام میں

کہیں موجود نہ ہوتے تو بے شک یہ خیال صحیح تھا کہ اُن کے سوا دوسرے مجتہدانِ فن نے اُن لفظوں کو ترک کیا ہے مگر جب کہ بکثرت یہ دیکھا جاتا ہے کہ متروک الفاظ فی صدی ناسخ اور اختیار کردہ فی صدی پچاس مستعمل ہو رہے ہیں تو اس کا کامل یقین ہوجاتا ہے کہ شیخ ناسخ کے لکھے ہوئے الفاظ دوسرے معاصرین بلکہ متقدمین کے کلام میں بھی موزوں ہوتے رہتے تھے -

شیخ ناسخ لاهوری نسبت کے لحاظ سے شمالی هند میں ایک نو وارد کی حیثیت رکھتے ہیں یہ مسلّم ہے کہ وہ ساری عمر اسی صوبے میں رہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ خلاقِ مطلق نے اُنھیں جوہر قابل بننے کی صلاحیت عطا کی تھی اور اسی طرح تمام وہ خوبیاں جو ایک مستند فاضل کو حاصل ہوسکتی ہیں بوجہ کمال اُن میں موجود تھیں - تاہم ہمہ یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اباً عن جد دوسرے شعرائے شمالی هند کی طرح اُردو کو اپنی مادری زبان کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں - جن الفاظ کو آج غلط فہمی سے مختص اُن کی متروکات میں شامل سمجھا جارہا ہے وہ یقیناً اُن سے پہلے متروک ہونے شروع ہو گئے تھے؟ اول تو اُنھوں نے وہ الفاظ جس کو شاہ حاتم کے زمانے سے اُردو داں بول رہے تھے سنے ہی نہ ہوں گے اور جب سنے ہی نہیں تو ترک و اختیار کا احساس کیا ہوتا اور بفرض سنے بھی تو ایسے وقت میں سنے جب کہ عموماً دوسرے شعرائے مصلحین یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب اُن محاورات و الفاظ کی ترویج موزوں و مناسب نہیں - اس بنا در تنقیح دوم کا یہ فیصلہ قرینِ انصاف ہے کہ تنہا شیخ صاحب ہی محاورات متقدمین کے ناسخ نہیں ہیں بلکہ -

اُنھیں آشفتہ مزاجوں میں جواں میر بھی تھا

شیخ ناسخ کے کلام میں بھی بعض الفاظ اور اسالیب بیان ایسے ملتے ہیں

جن کو بی زمانہ کوئی اُردو داں استعمال نہیں کرتا اور اُن کے زمانے میں بلکہ اُن سے پہلے بھی موجودہ عہد کے الفاظ مستعمل ہونے لگے تھے - مثلاً ولے (مگر) تلے (نیچے) ہووے (ہو) بن (بغیر) مثلاً حسب ذیل اشعار :-

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احسان ہوتا

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

راز کا چاہیے عاشق کو چھپانا ایسا
دل میں ہو ذکر صنم ہاتھ میں قرآن ہووے

غیر کوثر کسی دریا کا میں سیاح نہیں
تشنۂ سیر خدا بن کہیں سیاح نہیں

لیکن اگر اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو کہ ناسخ سے پہلے مگر ؟ تلے ؟ ہووے اور بن کے سوا دوسرے مترادفات کا استعمال ہی نہ تھا ؟ تو اس کا جواب بھی حسب ذیل اشعار سے ملے گا - ان مثالوں میں ولے اور بن کی مثالیں مخصوص نہیں لکھی ہیں کیوں کہ ایک مدسکک یکساں وزن عروضی ہونے کی وجہ سے بے کسی جگہ بن اور ولے کے بجائے مگر پڑھ سکتا ہے ؟ تا ہم مگر کی مثال ایک فائدے سے لکھی جائے گی -

نذر - آتش کے قوافی کے ساتھ نذر کا شعر ہے —

روؤں تو آتشِ دل شمع نمط بجھتی نہیں ؟
مجھکو لے جا کے ڈبو دیویں مگر پانی میں

هونے کی جگہ ہو ملاحظہ ہو :—

میر

قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیس سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ہو سو ہو

میرحسن

وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار
وہی صحبت ہو اور وہ سب کے یار

میر عباس علی عرفاں دہلوی

یہ حال نہیں ابروے خمدار کے نیچے
زنگی کو قضا لائی ہے تلوار کے نیچے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شیخ ناسخ اور اُن کے تلامذہ و متبعین نے بندش الفاظ، استعمال تراکیب اور اسالیب بیان میں کوئی ایسا خاص فرق نہیں دکھا سکے جس کی شان کم و بیش اُن کے متقدمین و معاصرین کے کلام میں دستیاب نہ ہو سکے، البتہ خارجی اور سطحی مضامین حسن و عشق کو رعایت لفظی اور دیگر صنائع و بدائع کے لزوم مالا یلزم سے ضرور اپنالیا* ہے اور یہی اُن کا امتیازی اور خصوصی رنگ مانا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ چوں کہ اُن کے مستعملہ لوازمات صنایع بدایع زیادہ تر فارسی کی تقلید میں شروع ہوئے تھے اس لیے اُن کے زمانے میں بمصداق "کل جدید لذیذ" ہیں ایسی گل کاریاں چمنستان دہلی میں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن اُن کی مقدار اُسی قدر ہے جس

---

*یہ لفظ دانستہ لکھا گیا ہے۔

قدر کہ ناسخ، وزیر، رشک، برق، بحر وغیرہم کے مجموعۂ کلام سے صاف سنجیدہ، اور با اثر اشعار کے انتخاب کی مقدار -

چوں کہ یہ مضمون صرف واجد علی شاہ کے متعلق لکھا گیا ہے اور موجودہ بحث شاعری لکھنؤ کے خصوصی رنگ کی وجہ سے چھڑ گئی تھی اس لیے حضرت ناسخ وغیرہ کا تذکرہ اتنی وضاحت سے کیا گیا، اب اصل مدعا کی طرف متوجہ ہونا چاہیے -

واجد علی شاہ اگرچہ شیخ ناسخ کے انتقال سے ۸ - ۹ برس بعد تخت نشیں ہوئے لیکن اُن کی پیدائش شیخ صاحب کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی جبکہ اُن کی طرز و روش کا اثر عام طور پر صوبۂ اودھ میں پھیلا ہوا تھا اُن کے نامور تلامذہ اور جملہ مقلدین عموماً اُسی رنگ کو پسند کرتے تھے، ایسی حالت میں شاہ اختر جان عالم، (جن کے میلان طبع کی تصدیق اُن کے مصاحب مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی بھی فرماتے ہیں) کس طرح اُس چھائے ہوئے رنگ سے بچ جاتے، چنان چہ وہ بھی زیادہ تر اُسی لفظی تکرار، عامیانہ جذبات، عریاں مضامین، کے سبق دہراتے رہے - اب چند اشعار شاہ اختر کے درج کیے جاتے ہیں اس دعویٰ کو مد نظر رکھ کر پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ محروکات اور پختگی بندش اور استعمال محاورات پر کس قدر حاوی و عامل ہے، یہ مضمون مثنوی حزن اختر کی تنقید کے سلسلے میں شروع کیا گیا ہے اس لیے نمونۂ اشعار بھی اُسی مثنوی سے منتخب کیے گئے ہیں -

(۱) وزیرِ نبی شوہرِ فاطمہ

حسین و حسن کا پدر مہ لقا

وہ تھی لکھنؤ میں مع والدہ

سنا، اب گئی سوے ملکِ بقا

بت دل کی سوزے کی مانند ہے
گروہِ بار رنداں ترا رند ہے

(۲) جو کچھہ حد امکان میں آئے گا
بحکم گورنر وہ مل جائے گا
جہاں میں رہوں گا ثنا خوان ہوں
مگر قید غم میں پریشان ہوں
الٰہی ملیں مجھسے میرے حبیب
جو ہوں دور وہ جلد ہوویں قریب
کیے نذر قیصر بھی گیارہ ہزار
کہ لیوے نہ رنج اُس کے دل میں قرار
ہے چھبیسویں آج ذیقعد کی
لکھہ اشعار کچھہ قید کے بعد کی

(۳) گلِ تازہ مجھسے ہے با آب و تاب
جس بھی ہرا ہے ، درختوں میں آب
ادب کر ادب کر خموش اختیار
کہاں تو کہاں یہ سخن مرحبا
بس اختیار کر اب ترک طرزِ بیاں
ہوئی ختم یہ مثنوی گلِ ستاں

مندرجۂ بالا اشعار میں صرف خط کشیدہ الفاظ توجّہ طلب ہیں ۔ اگرچہ آج کل کا ادبی مذاق اور ذوقِ سلیم ان اشاروں کے بعد کسی تفصیل و صراحت کا محتاج نہیں ، لیکن اس خیال سے کہ شاید مضمون نگار اچھی طرح اُن شعروں کے محاسن کو نہ پہچان سکا ہو ، تھوڑی سی وضاحت کی جائے گی - ان ابیات میں دو تین

قسم کے شبہات ہیں ؟ اول یہ کہ اُس زمانے کے مسلمہ قواعد و اصول کے خلاف قافیے لکھے گئے ہیں - دوم یہ کہ بعض الفاظ کی موزونیت اُردو شاعری کے شباب کے زمانے میں ایک پابندِ متروکات کے لیے قابلِ نظر ہے - سوم یہ کہ ایک سخنۂ کلام اور کہنہ مشق جس کو نکتہ حیثیوں کا لحاظ بھی رہتا ہو ایسے الفاظ استعمال کرے جن سے باقی جملے نہ صرف بے ربط ہو جائیں بلکہ اُن سے مضحکہ خیز مہملیت ظاہر ہوتی ہو -

(۱) موجودہ زمانے کی بے راہ روی اور آزادی سے قطع نظر کر کے نصف صدی پہلے کے اساتذۂ لکھنؤ بالعموم اس کے پابند نظر آتے ہیں کہ ؟ ہائے مطہرہ یا عربی کی تائے مدوّرہ کو الف سے ہم قافیہ نہیں کرتے - فاطمہ ؟ والدہ ؟ لقا اور بقا اگرچہ اُردو تلفظ میں ہم آواز ہیں لیکن شیخ ناسخ اور اُن کے تلامذہ اور دیگر اساتذہ نے اپنے زمانے میں اس کو جائز نہیں رکھا ؟ - اور بعض کسی نے کہا تو غلط مانا گیا - اسی طرح مانند بفتح نون اول صحیح لفظ ہے اور بند بقیناً بکسر رائے مہملہ ہے - یہ اختلاف توجیہہ غیر مسلم ہے - عوام کالانعام (جُہلا) البتہ مانند کو بکسر نون بولتے ہیں جن کی پابندی اخص الخواص (اور پھر بادشاہ) کے لیے کیسی ؟ -

(۲) امکان ؟ آسمان ؟ وغیرہ جیسے الفاظ کا نون بہ ترکیب اضافی اعلان نون کے ساتھ مدت سے واقفان فن نے متروک کردیا ہے - ؟

جہاں میں رہوں گا ثناخوان ہوں - اس مصرع میں اظہار نون ثنا خوان کے علاوہ ؟ ہوں رو، مرہ کی پابندی سے آزاد ہے - صیغۂ استقبال کے ساتھ حال (ہوں) کا جوڑ اس وقت موزوں ہوسکتا ہے جب کہ وہ مضارع کا صیغہ ہو؟ اگر یہاں حال و استقبال کا اتصال

غلط نہ مانا جائے تو بھی فقرہ ناقص اور غلط ہو جاتا ہے اس کی تصحیح تدر نہ ہو گی "میں جہاں رہوں گا تنخواں رہوں گا یا ہوں گا" - اس مد میں ہووس اور لیوے وہ الفاظ ہیں جن کو اُسی عہد کے متروکات میں شامل ہونا چاہیے - اسی سلسلے میں "لکھہ اخبار کچھہ قید کے بعد کی" والا مصرع کسی ناول کو ذہن نشیں ہونے نہیں دیتا - کیوں کہ پہلے مصرع میں چھتیسویں کے لیے یقیناً کی (بیائے معروف) چاہیے مگر اخبار میں جس کو متفق علیہ ابتدا سے اب تک اہل لکھنؤ کے لیے بقاعدۂ جمع عربی مذکر ہونا چاہیے) فعل تانیث قابل غور ہے -

(۳) الفاظ کا توازن، اسالیب کا تناسب، فصاحت و سلاست کی روح ہے، مگر اس شعر میں

گُلِ تازہ تجھسے ہے با آب و تاب
چمن بھی ہرا ہے، درختوں میں آب

ذوق سلیم کو "چمن بھی ہرا ہے" کے بعد "درختوں میں آب" کا جملہ جس قدر نا مربوط معلوم ہو سکتا ہے اُس کی لذت اہل مذاق ہی سے پوچھی جائے - مزید تصدیق کے لیے پورے شعر کو ایک ساتھہ پڑھہ کر دیکھنا چاہیے کہ اس سلاست میں کیسی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، جس سے شاعر کا انتہائی عجز ثابت ہوتا ہے -

اکثر مثنویوں میں قافیہ پیمائی کے لیے برائے بیت الفاظ لائے جاتے ہیں، یہ عمل بھی اگرچہ شاعر کی کم مشقی اور عجز طبع کا نمایندہ ہے - لیکن معنوی حیثیت سے اُن بھرتی کے لفظوں میں شعر کی ترکیب کے ساتھہ کچھہ نہ کچھہ مناسبت ہوتی ہے - ذیل کے اشعار اس خصوصیت سے مُعرا ہیں -

ادب کر ادب کر خموش اخترا

کہاں تو کہاں نہ سخن مرحبا

اس شعر میں علاوہ اخترا کی رکاکت کے، مرحبا کا کوئی محل نظر نہیں آتا - مرحبا تحسین و تعریف کے موقعے پر مستعمل ہے جس کا ترجمۂ اُردو واہ وا ہے - اور یہاں تحسین کی جگہ تادیب کا موقع ہے، اسی طرح منقبت کا پہلا شعر —

وزیرِ نبی شوہرِ فاطمہ

حسن و حسین کا بدر مہ لقا

یہاں پہلا سوال تو یہ ہے کہ باضافت توصیفی بدر مہ لقا ہونا چاہیے، اور اگر اُردو کی عام بول چال یا مجبوری نظم کی خاطر فک اضافت جائز بھی ہو تو حضرت مولیٰ علی کو مہ لقا کہنا کم از کم اس موقع پر تو کوئی مناسبت نہیں رکھتا - تیسرا شعر

بس اختر کر اب ترک طرزِ بیاں

ہوئی ختم یہ مثنوی، گلستاں

یہاں بھی حذف اضافت کے علاوہ ایسی مثنوی کو گلستاں بتانا جس میں اول سے آخر تک حزن و ملال کی داستان لکھی گئی ہو کس قدر مُضحک ہے -

رسالۂ مخزن سنہ ۱۹۰۸ع کے مضمون میں جس بلند آہنگی سے شاہ موصوف کو بابند متروکات اور تحفہ کلام وغیرہ بتایا گیا ہے اُس کا اندازہ مندرجۂ بالا انتخاب اشعار سے ہو گیا ہوگا جو بہت سرسری طریقے سے نقل کر لیے گئے ہیں، اگر بالاستیعاب ساری مثنوی کے اشعار لکھے جائیں تو غالباً مثنوی کا نصف حصہ ایسا منتخب کیا جا سکتا ہے جن میں شاعرانہ خوبیوں کا کوئی لطیف اور دلچسپ پہلو بجز متروکات کے نظر نہ آئے گا -

اس دعوے کا تصفیہ کہ شاہ اختر کا رنگ میر و مرزا سے ملتا جلتا ہے اس سے بہتر نہیں ہوسکتا کہ مضمون نگار مذکور کے منتخب کردہ اور چیدہ اشعار لکھ کر میر و مرزا کے بھی بعض اُسی قسم کے اشعار درج کیے جائیں اور آخری فیصلہ خود ناظرین پر چھوڑ دیا جائے -

شاہ اختر

بندے کو اُس کے عشق ہے ذات و صفات کا
مبدع حقیقۃ ہے وہ کُل کائنات کا
پایا نہ کوئی چاہ ذقن دیدۂ تر سا
جسموں سے بہت کھینچتے ہیں اشکوں کا جرسا
ناقوس برہمن سے صدائے اذاں سنی
مسجد سے میں نے قصد کیا سومنات کا

فقط دل سے ہیں اعضائے رئیسہ
کرے سلطاں نہ آدمی کی خواہش

کچھ نہیں اختر مجھے عشق مجازی سے حصول
اب تو معشوقِ حقیقی سے ہے اپنا اختلاط
پر پتنگوں کے جلا کر منہدم کُل کر دیا
بزم عالم میں یہی کیا شمع کا محصول تھا

بدن صاف نہ رنگینی دکھاؤ صاحب
پھول ہارے ہو تو گُل جھلوں کے کھاؤ صاحب
کہیں بار نظر بد نہ نزاکت نہ ترے
بال کی اوٹ میں جائے ہو تو جاؤ صاحب

کیا یہی وہ اشعار ہو سکتے ہیں جو میر و مرزا کے مذاق سے ملے جلے کہے جائیں بہر حال ان کے مقابل میں ہم طرح اور ہم قافیہ کیسے ؟ ہم مضمون اشعار بھی پوری طرح نہیں مل سکتے - لیکن باوجود اس کے میر و مرزا آفتاب و ماہتاب کی طرح آسمان شاعری پر چمک رہے ہیں - یہاں اُن کے چند معمولی شعر جو کسی حد تک ہم قافیہ و ہم مضمون ہیں لکھے جاتے ہیں —

میر

ہر دم حباب کا ہے سبب جو حیات کا
نکلے ہے جی ہی اُس کے لیے کائنات کا
اشجار ہوویں خامہ و آبِ سیہ بحار
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اُس کی صفات کا
اُس کے فروغِ حسن سے جھمکے ہے سب زمین
شمعِ حرم ہو یا کہ دِیا سومنات کا
عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھ ہو، تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

کچھ بھی معاش ہے یہ کہ اُس نے ایک چشمک
جب مُدتوں ہمارا جی دیکھنے کو ترسا

کیا کہیے کیا رکھے ہیں ہم تجھسے یار خواہش
اِک جان و صد تمنا اِک دل ہزار خواہش

سب سے آئینہ نمط رکھتے ہیں، خوباں اختلاط
ہوے ہیں یہ لوگ، یہی کرتے ہیں انساں، اختلاط

پھر گئیں آنکھیں تم نہ آن پھرے
دیکھا تم کو بھی واہ وا صاحب

دل کا اُلجھنا اپنا ایسا نہیں کہ سلجھے
ہیں دام زلف میں ہم اُس کے اسیر صاحب

کس گنہ کا ہے بس از مرگ نہ عذرِ جانسوز
پاؤں پر شمع کے پاے ہیں پرِ پروانہ

سوداؔ

خال کا دانہ ملے ہے خرمن گوہر کے طرح
حُسن گندم‌گوں کے مزرع کا یہ کچھ محصول ہے

مرے سجود کی دیر و حرم سے گزری قدر
رکھوں ہوں دعویٰ ترے در نہ جبہ سائی کا

دھن غنچے کا جب دیکھوں ہوں گوش گل نہ گلشن میں
تو اپنا درد دل کہنا کسی سے یاد آتا ہے

شاہ اختر کے زیادہ اشعار کا انتخاب تحصیل حاصل سمجھا گیا ؟ کیونکہ حسن جذبات و خیالات کی روشنی ان شعروں میں نظر آ رہی ہے اُسی کا پرتو اوروں میں بھی ہوتا - سخن فہم ناظرین کے لیے اس روش کے اتنے ہی اشعار صحیح رائے قائم کرنے کے لیے کافی ہوں گے - ایسے شعروں کے انتخاب سے یہ غرض و غایت نہیں کہ سلطان عالم اختر زمرۂ شعرا میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے تھے ' بلکہ مدعاے اصلی یہ ہے کہ جس جامعیت و مشابہت کے ساتھ ممدوح کو پیش کیا جاتا ہے وہ صورت اساتذہ کے ہم پہلو بنانے کے لیے کافی نہیں -

مثنوی حُزن اختر کو پڑھکر اُس کے حُسن و قُبح پر راقم سطور نے جو رائے قایم کی ہے اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

۱—شاہ اختر کی پُر گوئی بغیر کسی حجت و تاویل کے مُسلم ہے -

۲—جہاں تک شعر میں وزن عروضی کا تعلق ہے اُن کی بندشیں صاف اور چست ہوتی ہیں عام شعرا کی طرح معمولی حروف کو بھی حتی‌الوسع ساقط‌الوزن ہونے نہیں دیتے -

۳—پورے کلام کو پڑھکر بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ فن شعر سے کافی آگاہی رکھتے ہیں اور جس شعبے میں قلم اُٹھاتے ہیں اُس کی اکثر اصطلاحیں اور خصوصیات نمایاں کرتے جاتے ہیں -

۴—ایسے خانگی اور پرائیویٹ حالات ' جن کو عموماً شعرا پوشیدہ رکھتے ہیں ' پوری جرأت اور کافی وضاحت کے ساتھ بے تکلف سینے سے سفینے میں منتقل کر دیتے ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جس میں کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی اُن کا حریف نہیں -

۵—مضامین کے اعتبار سے اُن کے کلام میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی وہی فرسودگی جن کے تذکرے صفحات ما سبق میں جا بجا ہو چکے ہیں بکثرت موجود ہے جس کو پڑھکر پڑھنے والے پر ایسا اثر نہیں ہوتا جیسا کہ قدرۃً آپ بیتی کو سن کر ہونا چاہیے -

۶—رعایت لفظی اور استعارات و تشبیہات کی بلائیں اُن کے کلام پر اُسی طرح مُسلط ہیں جس طرح اُن کے معاصرین ؛ وزیر ؛ رشک ؛ برق اور امانت وغیرہ کے مجموعۂ سخن کو مغلوب کیے ہوئے ہیں -

مثنوی حزن اختر ۷۴ عنوانوں پر منقسم ہے ممکن ہے کہ یہ تعداد سنہ ۷۴ھ کی مناسبت سے مقرر کی گئی ہو - ان عنوانوں میں بیں عنوان بخصوصیت شاعرانہ تلازمات اور تشبیہ و استعارات کے مرکز ہیں -

اول صفحه (۱۰۱) در "ساقي نامه و حال بيوفائي مطلوب السلطان
نواب حسنه صاحب كربلائي۔"

دوم صفحه (۱۱۳) در "ساقي نامه در انتظام جواهر گفتاد در
بيوفائي چند صاحبان محل در قيد" ۔

سوم صفحه (۱۳۳) در "گفتار در صرف زر خود به رندان و
ساقي نامه بالتزام سلاح" ۔

يه تينوں مضامين علي الترتيب صفحه (۱۰۱) سے شروع هو کر
صفحه (۱۳۵) پر ختم هوئے هيں - پہلے عنوان ميں گانے بجانے اور تمام
راگ راگنيوں اور آلات سرود کا مذکور هے ؛ مثلاً —

صدا دے مغني کو اے غمگسار
کہاں هے ذرا لاے اس جا ستار

کدهر بين هے اور کہاں دائرا
کہو چھيڑے قوال ڈهولک کو آ

صدا زير و بم کي سنادے همیں
وه رقاصهٔ حوش دکهادے همیں

وه مدهم وه پنچم وه دهيوت لگے
نکهاد فلک جس نه تحسين کرے

دوسرے عنوان ميں حسن اور گل و رباحين ؛ اور جواهرات کے نام
رعايت لفظي کے ساتهه گنائے گئے هيں مثلاً —

چهک بلبل لکهنؤ باغ ميں
هُما ميں دکها دوں اور زاغ ميں

کلي جب کهلے دست نعمه گهلے
زر و سيم ميں روپے نسرين تُلے

کدهر هے وه بيلا جو نوشه بناے
گُل اسرفي هے کہاں نذر لائے

وہ الماس معنی کو ہووے چمک
که روشن رهیں را ت دن سب فلک
تراشوں وہ فیروزۂ رنج کو
که قاروں رکھے بلّے میں گنج کو

تیسرے عنوان میں ہر قسم کے اسلحہ کی تفصیل سے بزم سخن کو رزم گاہ بنایا گیا ہے :—

لگا میرے تیغِ مضامیں میں رنگ - ہوا بیرۂ فکر جس طرح سنگ
بنا خنجرِ ذهن جس کي طرح - سنر فہم کی ہے مگس کي طرح
طبیعت کی تیغ اصفہاني جو تھي - مضامیں کی سیفِ حوائي جو تھی
وہ خاشاک کي طرح تد بر ہوئی - نه بحرِ تقارب تھي خنجر ہوئی

ان اشعار سے اس زمانے میں جب که اُن اسیاء کے دیکھنے والے تو درکنار سمجھنے والے بھي نابید ہوئے جا رہے ہیں لغت نویسوں کے لیے ایک مفید ذخیرہ جمع ہو سکتا ہے -

---

مثنوي حزن اختر جو الناظر پریس میں مولوی محبوب علي صاحب ناظم دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے چھپوائی ہے ؟ اُس میں مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم نے ایک مقدمہ بھي لکھا ہے ؟ مولانا سے اس مثنوی کے نام کے متعلق تسامح ہو گیا ہے ؟ یعنی وہ لکھتے ہیں که ''یه مثنوي آج سے ٦۵ برس پیشتر ۱۲٦٦ هجري میں جب که بادشاہ بعد ورنگ میں تھے تصنیف ہوئي اور اس کے کئی سال بعد یعني ۱۲۷٦ هجري میں خود ظل‌الله جہاں پناہ کے مطبع واقع متیا برج میں چھپ کر اهل دربار اور بازار میں تقسیم ہوئي '' - (صفحه ۷) -

اغلباً یه تسامح حزن اختر کے اعداد (۱۲٦٦) سے ہوا ہے - حال آں که اِس سنه میں بادشاہ لکھنؤ ہی میں سریرآرائے سلطنت تھے - لکھنؤ

سے اُن کي روانگی سنه ۱۲۷۱ هجري ميں واقع هوئي هے پھر کس طرح سنه ۱۲۶۶ هجري ميں مقيد زندان فرنگ هو سکتے هيں چناں چه مثنوي ميں روانگي کا زمانه اس طرح ظاهر کيا هے —

کر اب ميراں جي کا مهينا رقم
که جس ميں هوا حکم تھا نه عَلَم
دلا همت و تسنم تھي اُس ماه کي
چھٹی سلطنت جس میں محمد شاه کی

اکھتّر تھے سنه باره سو پر زياد
تو هجری زباں سے رکھه اب اس کو یاد

واقعه يه هے که حزن اختر ميں بادشاه نے ۱۲۶۶ اشعار لکھے هيں اسی مناسبت عددي سے اس کا نام حزن اختر رکھه ديا هے جيسا که اس شعر سے ظاهر هے —

رکھا حزن اختر جو شعروں کا نام - یہی نام رکھکر کیا هے تمام

اس کے بعد ۱۲۷۴ هجري تک وه مقيّد رهے اور آزاد هوکر ۱۲۷۶ هجري میں اس مثنوي کو چھپواديا - مزيد اور مکمل ثبوت ذيل کي تاريخ سے ملتا هے —

حضرت سلطانِ عالم دين پناه
اخترِ اوج و کمال و برتري
حزن اختر مثنوی تصنیف کرد
واقعی خوش داد دادِ شاعري

الغرض مطبوع شد اَحسن ز حکم
گفتمش تاريخ - حزنِ اختری
۱۲۷۶ ھ

اس تاريخ کے مصنف شاهي کاتب محمد عبدالرحمن صاحب اَحسن هيں -

شاہ اختر کي فہرست تصانیف طویل الذیل ھے - جن کے موضوع بھي مختلف ھیں - صرف منظومات میں چھہ دیوان ' اور مثنویاں ھیں ' پھر مراثی کي تیں جلدیں علیحدہ ' اور قصائد اُردو و فارسي کی متعدد جلدیں مرتب ہو آں - ظاھر ھے کہ ایسے سیر نویس کے کلام کا انتخاب معمولي کام نہیں -

اس وقت تک اُن کي غزلوں کے جتنے اشعار درج کیے گئے ھیں وہ خاص مذاق کی پسند کے موافق تھے - لیکن اب کچھہ ایسے اشعار بھي نقل کیے جاتے ھیں جو اپني بعض خوبیوں کے لحاظ سے نہ صرف عام پسند کہے جا سکتے ھیں بلکہ اھل مذاق کی داد و تحسین کے جائز مستحق ھو سکتے ھیں '—

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا
آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

پڑا ھے پاؤں میں اب سلسلہ محبت کا
بُرا ھمارا ھوا - ھو بھلا محبت کا

ھاتھوں سے دل نکل کر پانسوں اُچھل پڑا ھے
ڈھونڈھیں ملک نہ قدسی کچھہ کھو گیا ھے میرا

بہت زخم جرّاح تو نے بھرے ھیں
مرے داغ کا کوئی مرھم نہ نکلا

حسن کی جو بات ھے با مرگ رھي اُس کے ساتھہ
ایک پیوند بھي اس جامے میں جوڑا نہ گیا

دل تنک چھین لیا وصل میں اے خانہ خراب
جار وقت کے سوا اب نہیں گھر میں بنکا

———

مرہم کوئی لگائے جو دو چار داغ ہوں
اختر کا تن تو سر سے ہے پا تک جلا ہوا

———

وسعتِ خُلد سے بڑھکر ہے کہیں حُبِّ وطن
تنگیِ گور سے بد تر ہے فضائے غربت

———

ہم بھی شریک جلسۂ ابنائے دھر تھے
ٹھہرکر نہ مار دم نہ اے خوش خرام عیش

———

پوچھتا ہے جو کوئی مجھکو کہ ہمراہ ہے کون
شرم سے کہتے ہیں وہ ؟ ہے یہ ہمارا عاشق

———

اس دوستی میں ہو گئے اے مہرباں تمام
جب تک تم آؤ آؤ ہوئے ہم یہاں تمام

———

دکھاتے ہیں جو یہہ صنم ؟ دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی کو ہم دیکھتے ہیں

———

غمزہ و عشوہ و انداز و ادا نے مارا
ناتواں ایک یہ ؟ جو رنگ ہوا چار کے ہاتھ

———

ٹالوں کس طرح دل سے تری مژگاں کے تیروں کو
مٹا سکتا نہیں انسان ہاتھوں کی لکیروں کو

جان عالم اختر کے کمال ساعری کي نعض رَوسوں نے ایسے سخن گسترانہ میداں دکھائے کہ اُن سے دامن کساں گزر حانا ممکن نہ ھوا اور محبوراً — ع - رفتہ رفتہ می سود نسیار گو ' کا مصداق بننا پڑا - طوالت اگرچہ محل فصاحت ھوتي ھے لیکن نعض اوقات — ع - بنتي نہیں ھے بات مکرر کہے بغیر' اس خیال سے پھر اعادۂ سخن کیا جاتا ھے کہ شاہ جان عالم اختر اسے واقعات و واردات کی بدولت جس قدر سوز و گداز اور جذبات روحاني کے ھم پہلو رہ چکے ھیں اُن کی مطابقت میں وہ اثرات اُن کے کلام سے مترسح نہیں ھوئے ' جن کا ظاھر ھونا مقتضائے نفسیات ھے ' بر خلاف اس کے تمام مجموعۂ کلام پر تعیّش و اطمینان کا رنگ چھایا ھوا ھے - وہ واقعات بیان کرتے ھیں اور حد سے زیادہ فصاحت کو کام میں لاتے ھیں ' لیکن الفاظ میں ایسی تاثیر اور بیان میں ایسا سوز و گداز پیدا نہیں کر سکتے جس کو سن کر سننے والا بے چین ھو جائے - اسی بنا پر کہنا پڑتا ھے کہ وہ صرف خارجي اور سطحی ساعري کے عَلَم بردار تھے - جذباتي اور داخلی ساعري میں ان کو اندازہ نظر آتے ھیں -

(باقی آیندہ -)

غیبی آواز

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

قسم اِس دل کی، چسکا ہے جسے گو بُت پرستی کا
مگر پہچانتا ہے جو مزاجِ اشیائے ہستی کا

قسم اِن تیز کانوں کی، کہ ہنگامِ قدح نوشی
مشیت کی زباں رہتی ہے جن سے محوِ سرگوشی

قسم اِس جان کی، خُو ہے جسے فطرت پرستی کی
گِنا کرتی ہے راتوں کو جو ضربیں قلبِ ہستی کی

قسم اُس نور کی، کشتی جو اِن آنکھوں کی کھیتا ہے
جو نقشِ پا کے اندر عزمِ رہرو دیکھ لیتا ہے

قسم اِس ذوق کی، حاوی ہے جو آثارِ قدرت پر
ضمیرِ کائنات آئینہ ہے جس کی بصیرت پر

قسم اِس حِس کی، جو پہچان کر تیور ہواؤں کے
سناتی ہے خبر طوفان کی طوفان سے پہلے

قسم اِن اُنگلیوں کی دوستو! جو دیکھ لیتی ہیں
چٹانیں چھو کے بے ترشے ہوئے اصنام کی نبضیں

قسم اِس آنکھ کی، جو درسِ بینش مجھکو دیتی ہے
زمیں کی بھاپ میں جو بجلیوں کو دیکھ لیتی ہے

قسم اِس فکر کی ، سوگند اِس تخئیلِ محکم کی

جو سنتی ہے صدائیں جنبشِ مژگانِ عالم کی

قسم اِس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے

کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

اُٹھو ، جاگو ، بڑھو ، مُنہ ہاتھ دھو ، آنکھوں کو مل ڈالو

خبر لو ، انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو !

اُٹھو ، وہ صبح کا غُرفہ کُھلا ، زنجیر سب ٹوٹی

وہ دیکھو پَو پھٹی ، غُنچے کِھلے ، پہلی کرن پھوٹی !!

تبصرے

اُردو کے لغات

(از پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم - اے)

(۱)

ہندستانی اکیڈمی نے اپنی چند سالہ زندگی میں ایسے علمی کارناموں کی وجہ سے اپنی ضرورت، قیام اور بقا کا ثبوت پہونچا دیا ہے۔ اس کا تماہی رسالہ ہندستانی اس سلسلے کی ایک بین و نا قابل تردید دلیل ہے۔ امید کہ یہ رسالہ نہ صرف اُردو ادب و تاریخ کے لیے مفید ثابت ہوگا بلکہ متحدہ ہندستان کی مشترکہ زبان کے مسئلہ کے حل کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر رہے گا -

رسالے کے پہلے نمبر میں جتنے مضامین ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کو افادی نظر سے پڑھا جائے۔ آج میں ان میں سے صرف ایک مضمون کے متعلق جو اردو لغت کے متعلق ہے کچھہ عرض کرنا چاہتا ہوں -

یہ مضمون لکھنؤ یونیورسٹی کے استاد اردو جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی کا ہے۔ - مسعود حسن صاحب کو ادبیات اردو سے جو خاص شغف ہے اس کا ثبوت ان کی شایع کردہ کتابوں اور رسالہ ادب کے صفحات سے ملتا ہے اُن کا اردو کا کتب خانہ بھی جیسا کہ مجھے خود اُن کی زبانی معلوم ہوا تھا اچھا خاصہ ہے، اور اس مرتبہ انھوں نے اس میں سے اردو کے متعلق لغات کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ مضمون نا مکمل ہے، لیکن چونکہ وہ تاریخ و سنہ کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے ؟ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تیرھویں صدی کے ربع اول تک کی تصانیف پر مشتمل ہے، اس لیے ایک طالب علم اس کو اُس زمانہ تک کی لغاتی تصانیف کے لئے ایک مکمل فہرست سمجھہ سکتا ہے اور اسی

لیے میں اس میں اُن کتابوں کا اضافہ کرنا چاھتا ھوں جن کا اس میں ذکر نہیں ھے -

پروفیسر صاحب موصوف کی اس رائے سے مجھے کامل اتفاق ھے کہ اگر ایک ایک صاحب علم ایک ایک شُعبے کو لے لے تو بہت جلد اردو تصانیف کی ایک مکمل فہرست مرتب ھو سکتی ھے ؛ اُنھوں نے یہ تحریک ھی پیش نہیں کی ھے بلکہ اس مضمون کو لکھ کر اس طرف عملی قدم بھی بڑھایا ھے ؛ امید کہ دوسرے مستند بزرگ اس طرف توجہ کرینگے -

(۲)

خالق باری کے متعلق اس وقت تک جتنے مضامین شائع ھو چکے ھیں ؛ اُن میں سب سے بہتر و مدلل مضمون جناب پروفیسر محمود شیرانی کا تھا جو پہلے رسالہ اُردو میں شائع ھوا اور اس کے بعد اُن کی مشہور تصنیف " پنجاب میں اردو " کا جزو بن گیا ؛ - پروفیسر مسعود حسن صاحب نے خالق باری پر اظہار خیال کرتے ھوئے پروفیسر شیرانی کے شکوک کی طرف بالکل توجہ نہیں کی ھے اور جب تک ان شکوک کو رفع نہ کیا جائے یہہ کتاب یقینی طور سے خسرو دھلوی کی نہیں کہی جا سکتی؛ مجھے امید ھے کہ ھمارے لائق ادیب بہت جلد اس طرف توجہ کرینگے -

اسی سلسلے میں دونوں فاضل استادوں نے عبدالواسع ھانسوی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ھے؛ پروفیسر شیرانی اس کو نصاب سہ زبان کے نام سے موسوم کرتے ھیں اور پروفیسر مسعود حسن نے اُسے غرائب اللغات کے نام سے یاد کیا ھے - پروفیسر مسعود حسن کو اگرچہ یہ کتاب نہیں ملی ھے ؛ لیکن چونکہ ایسے لغات کا پتہ چل گیا ھے؛ جن میں اس کا ذکر ھے ؛ اس لیے میرا خیال ھے کہ ان کا بتایا ھوا نام صحیح ھے -

لیکن میرے لیے ایک دوسری مشکل بھی آن پڑی ہے، وہ یہ ہے کہ میرے پاس ایک کتاب کا قلمی نسخہ ہے، جو خالق باری کے طرز پر لکھی گئی ہے، اور اُن کی ترتیب عموماً یہ ہے کہ پہلے وہ عربی، پھر فارسی اور آخر میں هندی یا اردو لفظ آتا ہے، اور پروفیسر شیرانی نے خالق باری اور رسالہ سہ زبان کے الفاظ کا مقابلہ کرنے میں جو الفاظ دیے ہیں، اُن کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عبدالواسع هانسوی کی تصنیف نصاب سہ زبان ہے، مثلاً نصاب سہ زبان نے اعضائے انسانی کے یہ هندی نام دیے ہیں —

بیساسی—مادھا، آنکھہ—لہوچن

دیدہ—نتری، کان—سرون

گال—کنول، پہلو پسلی وغیرہ وغیرہ

اب میرے نُسخے میں بھی یہی الفاظ ہیں —

۱—جبہ، پیسانی، مادھا کھے

۲—عین، چشم، لہو حن حان

۳—قرہ، مردمک، نتری حان

۴—اذن، گوش سرون، پہچان

۵—خد رخسار کنول جوکھے

۶—جنب، پہلو، پسلی مان

میں نے طوالت کے خوف سے صرف ضروری مصرعے ہی نقل کر دیا ہے، اس کے علاوہ پروفیسر شیرانی کا بیان ہے کہ —

"متناسب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کر دیا ہے، مثلاً لغات اعضائے انسانی، اجناس غلہ، میوجات، ترکاریہا و گلہا، ادویات وغیرہ وغیرہ، خاتمہ میں مصادر مشہورہ و غیر مشہورہ دے دیے ہیں۔"

میرا نسخہ بھی بالکل اسی طرح مرتب کیا گیا ہے ؛ اور اس کے آخر میں بھی مصادر ہیں ؛ اس لیے میرا پہلا خیال یہ ہوا کہ یہ وہی کتاب ہے ، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے کتاب کے اوپر ، سر ورق پر ؛ اور آخر میں اس کتاب کو مصادرالللطائف کے نام سے موسوم پایا ؛ - میں نے سمجھا کہ ممکن ہے کہ اس کا نام غلط لکھہ گیا ہو ؛ لیکن خاتمے کی عبارت نے جو کاتب کے قلم سے ہے ؛ مجھے اور زیادہ مشتبہ بنا دیا ؛ - کہ اس میں اس کتاب کی تصنیف کا سہرا کسی دوسرے ہی "واصل اجل" کے سر بندھا ہوا ہے ؛ وہ عبارت یہ ہے —

"تمام شد نسخہ مصادراللطائف عرف جان پہچان تصنیف مُلّا پسر محمد صمدانی قدس اللہ سرہ ، راقم الحروف احقرالعباد محمد عبدالغنی عفی عنہ قوم انصاری معروف بہ لقب لاهوری ؛ ساکن سہسوان قاضی محلہ متصلہ محلات لاهوری محلہ ؛ جہت خواندن برخوردار طالب علم مطہر علی نوشتہ شد"

ان حالات میں ان دو صورتوں کے سوا کسی تیسری کی گنجائش نہیں ، یا تو یہ کوئی دوسری کتاب ہے یا پھر کاتب نے کتاب و مصنف دونوں کے نام غلط لکھہ دیے ؛ - بہر حال اس خیال سے کہ ناظرین ھندستانی میں سے کوئی صاحب اس پر مزید روشنی ڈال سکیں اس کے متعلق کچھہ مزید معلومات بھی پیش کر دینا چاھتا ھوں -

اس کتاب میں ۳۰۹ شعر ھیں ، ان میں سے ۲۴۵ اشعار اسمائے ذات و صفات کے متعلق ھیں اور ۶۴ اشعار میں مصادر ھیں - پہلے حصے کا پہلا شعر یہ ہے —

صمد پاک پرتحن جان   سی بعمبر بسیتہ نکھان

چونکہ ہر مصرعے میں تین الفاظ کا التزام رکھا گیا ہے اس لیے مصادر میں بھی یہ کیا گیا ہے کہ پہلے مصرعہ میں تین مصدر دیے ہیں اور دوسرے میں علی الترتیب اُن کے معنی ؛ مثلاً

کردن ، گفتن شنیدن ، جان
کرنا ، کہنا ، سننا ، جان

اسی سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ہے کہ پروفیسر شیرانی صاحب عبدالواسع کو عہد اورنگ زیب کا مصنف بتاتے ہیں ؛ پروفیسر مسعود حسن صاحب کوئی تاریخ نہیں دیتے البتہ یہ بتانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ عجائب اللغات کی تصنیف کے وقت زندہ تھے ؛ - ان کے متعلق ایک مفصل مقالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی روداد سنہ ۱۸۸۷ء صفحہ ۱۲۱ میں شائع ہوا تھا ؛ لیکن افسوس کہ اس وقت میرے پاس موجود نہیں - *

(۳)

ایک دوسری کتاب اللہ خدائی کا پروفیسر صاحب نے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ نام مصنف نے خود رکھا ہے ، اور کریما و مامقیما اور خالق باری کی طرح اس کے ابتدائی یہ الفاظ نہیں ہیں - میرے پاس اس قسم کی ایک کتاب کا دریدہ ورق ہے ، جس کی ابتداء بالکل اسی طرح ہوتی ہے ؛ اور کیا عجب ہے کہ خالق باری کی طرح اس کا نام بھی اللہ خدائی ہو ، - اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں —

الله خدا کرتار - الخالق آفرینندہ سرجنہار
الرسول پیغمبر بسیٹھ - الاصحاب یاران مسیتہ
الدنیا گیتی سنسار - الاحمق نادان گوار
الجنت بہشت سرگ - السقر دوزخ نرک

---

* میرا خیال ہے کہ اپنے پہلے شعر کی وجہ سے یہ کتاب صمد باری یا صمد نامہ کے نام سے مشہور ہو گئی ہے -

الیوم روز دیس - الشعر موی کیس
اللیل شب رات - القول گفتار بات

یہاں یہ بات بھي قابل غور هے کہ اس میں بھي عربی ؟ فارسي ؟ اور اُردو کي ترتیب باقي رکھي گئي هے -

لیکن ان سب سے اهم چیز جس کا میں ذکر کرنا چاهتا هوں ایک اور هي لغت هے اور میرا خیال هے کہ اس کي دریافت کي عزت مجھے هی ملي هے ' اس وقت تک هم کو جتنے لغت ملے هیں ' وہ سب کے سب هندی سے متعلق هے پھر بعض مناسب الفاظ کي حیثیت سے مرتب تھے جیسے صمد باري وغیرہ اور بعض صرف قافیہ کي رعایت سے لیکن جو لغت میں پیش کرنا چاهتا هوں وہ عربي فارسي اور هندي کا نہیں بلکہ عربي فارسي اور گجراتي کا هے ' دوسرے اس کي ترتیب صراح وغیرہ کے طریقے پر آخري حرف کے اعتبار سے کي گئي هے ' یعنی پہلے اُن الفاظ کو لکھا گیا هے جو الف پر ختم هوتے هیں ' پھر ب ' پھر پ علیٰ هذا القیاس ' لیکن اس سے بھي بڑھ کر جو بات هے ' وہ یہ کہ ترتیب میں عربی و فارسي کے الفاظ کو اصل لغت نہیں قرار دیا گیا هے بلکہ گجراتي الفاظ کو ' ان سب سے بڑہ کر بات یہ هے کہ هر لفظ کي تشریح سے حاشیہ بھرا هوا هے اور یہ حاشیہ تمام تر عربي میں هے -

---

اردو کي پیدائش کے متعلق جو اسباب بیان کیے جاتے هیں اُن کي روشني میں اگر دیکھا جائے تو گجرات هي کا صوبہ هندستان کا وہ صوبہ هے ' جو سیاسي ' مذهبی ' اور تجارتي حیثیت سے مرکزیت رکھتا تھا ' اس لیے میرا خیال هے کہ اردو کي اولین بنیاد اسي صوبے میں ڈالي گئي - اور اس کے ثبوت میں میرے پاس بہت کچھ دلیلیں

موجود ہیں، جن کو کسی وقت مفصل طور سے پیش کروں گا ۔ میرا خیال ہے کہ، مرثیہ مثنوی اور مذہبی شاعری میں گجرات کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے اور ہندستانی اکیڈیمی کا فرض ہے کہ وہ اس کی حفاظت و اشاعت کا سامان کرے ۔

موجودہ نسخہ ۱۱۵۱ ع کا لکھا ہوا ہے ، بدقسمتی سے نہ کتاب ہی کا نام معلوم ہو سکا اور نہ مصنف کا ۔ کاتب نے خاتمہ پر یہ عبارت لکھی ہے :—

"تم الکتاب بعون اللہ الکریم ، علی یدالفقیر شیخ عطاءاللہ بن شیخ میران فی رابع عشر من الجمادی الثانی سنہ ۱۱۵۱ احدی و خمسون ومایۃ بعد الالف من الہجرۃ النبویہ صلی اللہ تعالی علیہ و صحبہ اجمعین" ۔

اسکے بعد فارسی کے چھہ شعر ہیں، جو بظاہر کاتب کی طرف منسوب کیے جاسکتے ہیں ۔ لیکن آخری شعر میں جو دعوی کیا گیا ہے وہ اس خیال کو مشتبہ بنادیتا ہے ، شک کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جو اشعار یہاں پر لکھے ہیں ، وہ کاتب خاتمہ کتاب پر نہیں لکھتے ، اُن کے چند مقرر شعر ہیں جو ہر قلمی نسخوں کے مطالعہ کرنے والے کو بہت جلد یاد ہو جاتے ہیں ، اشعار یہ ہیں :—

ختم می گردد کتاب اے دوستاں
بے نظائر در فصول داستاں (دلستان)

گر خطائے رفتہ است اندر کلام
ہست امیدم ز اخلاقِ کرام

کز نحشا یند از روی کرم
ننگرند اندر خطائے بیش و کم

التماسِ دیگر است ناصد رحا

از همه یاران با صدق و صفا

چون رسند ایں جا مرا یاد آورند

فاتحه خوانند و آنگه بگذرند

انچه آمد در ضمیرم اے کبار

وا نمودم حصۂ از صد هزار

یہ کتاب ۷۱ اوراق پرمستمل ہے - ہر صفحہ پر نو مصرعے ہیں لیکن بہت سے مصرعے حاشیہ پر بھي ملتے ہیں ، اس کے تمام اشعار کي موجودہ مقدار تقریباً ۷۰۰ ہوتی ہے - ہر لفظ کے متعلق عربي میں حاسیے پر تشریح کي گئي ہے - شارح نے بعض جگہ اپنا نام ابراہیم دیا ہے - چند جگھوں پر حاشیہ فارسي میں بھي ہے -

اس لغت کو ہندي یا اردو نہ کہنے کا ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ دئے گئے ہیں وہ تقریباً ۹۰ في صدي وہ الفاظ ہیں جو صاف گجرات میں بولے جاتے ہیں - دوسرے شارح نے بعض جگہ خود تشریح کردي ہے کہ ہندي میں اس کا دوسرا نام ہے ، یہاں پر ہم کو یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اردو کا قدیم تر نام گجري ، گوجري یا بولي گجرات بھي ہے ، اور اس لغت میں جو الفاظ ہیں وہ اسي گجري زبان کے ہیں اس لیے فی صدي بقیہ الفاظ یہاں کے ہندوؤں کي گجراتي میں نہیں ملتے اور اسے وہ مسلمانوں کے اثر کا نتیجہ بتاتے ہیں -

اس کتاب کي ابتداء ان اشعار سے ہوتي ہے —

باب الالف

الالٰہ پرستیدہ پوجیا

المعلوم دانستہ بوجھیا

المحمد ستودہ بکھانیا

المعروف شناختہ بچھانیا

اور خاتمہ ان الفاظ پر ہے :—

العطارد استاد گاندھی

الھدوۃ باد گرد آندھی

الرمکۃ مادیان گھوڑی

الرداء چادر پچھوڑی

یہ کتاب میرے ایک دوست مسٹر عبداللہ عریفی بی- اے ٭ کے کتب خانے میں ہے جب میں نے اس صوبے کی ورناکولر سوسائٹی کے صدر دیوان بہادر دھرو صاحب کو یہ کتاب دکھائی تو وہ بہت خوش ہوئے انکی تحریک پر میں اسے اڈٹ کر رہا ہوں ٭ اور گجرات ورناکولر سوسائٹی اس کو شایع کریگی -

اس قسم کے دوسرے رسالوں پر اگر کبھی موقع ملا تو عرض کروں گا -

(۵)

تحفۃالہند کے متعلق مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ آج سے برسوں پہلے علامہ شبلی رح نے بھی اس کا ایک نسخہ دریافت کیا تھا

٭ کاش اکبر مرحوم زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ لوگوں نے اُس سے سیکڑوں برس پہلے ہی سے گاندھی و آندھی کا قافیہ باندھ رکھا ہے -

اور اس پر الندوہ میں مضمون بھی لکھا تھا پروفیسر صاحب نے جس لغت کا ذکر کیا ھے - وہ یقیناً اسی کا جزو ھے -

(۲)

یوروپین مصنفین کے متعلق اُنھوں نے لکھا ھے کہ اُن کا ماخذ مولانا عبدالحق صاحب کا فاضلانہ مضمون ھے؟ - اس سلسلے میں؟ میں اُن کی توجہ سر جارج گریرسن کی شائع کردہ "ھندستان کی لسانی پیمایش جلد ۹ حصہ اول (Linguistic Survey of India) کی طرف مبذول کرانا چاھتا ھوں جہاں اُنھوں نے نہایت محنت سے اُن تمام کتابوں کو جمع کر دیا ھے جو اھل یورپ اور دوسرے لوگوں نے اس سلسلے میں لکھی ھیں؟ اس طویل فہرست میں اُن کو بہت سے نام ملجائیں گے -

اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپ ھے کہ جب جہانگیر نے انگریزوں کو تجارت کی اجازت دیدی اور اُنھوں نے سنہ ۱۶۱۲ع میں سورت میں اپنا کار و بار شروع کیا تو مقامی زبان کو سیکھنے کے لیے سنہ ۱۶۳۰ع میں اُنھوں نے ایک لغت مرتب کیا جس کا حال گریرسن نے ان الفاظ میں بیان کیا ھے —

"Mr. Quaritch, in his Oriental Catalogue published in 1887, mentions a Ms Dictionary then in his possession (No. 34,724 in the Catalogue) which he doubtfully dates as "Surat about 1630"

This is a Dictionary of Persian Hindustani, English and Portuguese, and he describes it as a great curiosity as being the first work of its kind It was probably compiled for the use of the English Factory at Surat. The Persian is given in Native and in Roman letters, the Hindustani in Gujrati and Roman letters. It is a small folio manuscript on Oriental tinted paper"

اس کے علاوہ اٹھارویں صدی کے بعض طبی لغات یا بحری لغات جو انگریزی ، لاطینی هندی (هندستانی) اور عربی الفاظ پر مشتمل هیں کتب خانہ الاصلاح دیسنہ (ضلع پٹنہ) میں موجود هیں ، اگر میرا وهاں جانا هوا تو انشاءالله اُن کے متعلق مفصل طور سے کچھہ عرض کر سکوں گا -

مجھے امید کامل هے کہ پروفیسر موصوف ان معروضات پر غور فرمائیں گے ممکن هے کہ اردو زبان کے مختلف لغتوں کا جو گلدستہ وہ تیار کر رهے هیں ، اُس کی تعمیر و تکمیل میں یہ چند پنکھڑیاں بھی کام آجائیں -

---

اردو لٹریچر کی تاریخ

(مصنفہ مسٹر رام بابو سکسینہ)

از مرزا احسان احمد، بی - اے ، ایل ایل ، بی (علیگ)

اس میں شبہہ نہیں ، کہ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھہ کر ایک قابل قدر علمی خدمت انجام دی ، لیکن چونکہ وہ نقش اول تھا ، اسی لیے اس میں اکثر خامیاں رہ گئیں ، یعنی اُردو شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی ؟ کیا کیا ادوار قائم ہوئے ؟ مُلکی اور قومی حالات نے اس پر کیا کیا اثر ڈالے ؟ خود اس نے ملک اور قوم کو کس حد تک متاثر کیا ؟ اس کے ارتقاے تدریجی کے کیا کیا دور رہے ؟ اور ہر دور کی خصوصیات کیا تھیں ؟ اس نے کیا کیا قالب بدلے ؟ کیا کیا صورتیں اختیار کیں ؟ اِن سوالات کا جواب آب حیات سے بمشکل مل سکتا ہے ، حالانکہ یہی چیزیں اُردو لٹریچر کی تاریخ کا اصلی سرمایہ ہیں ، محض شعرا کے لطائف و ظرائف سے ایک نکتہ شناس نگاہ کو سیری نہیں ہو سکتی -

آب حیات کے بعد بھی جو اکثر تذکرے عالم وجود میں آئے ، افسوس ہے ، کہ ان میں بھی یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے ، یعنی تحقیق و تنقید سے بہت کم کام لیا گیا ہے ، جس کے بغیر کوئی تذکرہ تاریخی حیثیت سے قابل قدر نہیں ہو سکتا ، شعرالعجم کی امتیازی خصوصیت یہی ہے ، کہ بجاے لطائف و ظرائف کے اس میں خصوصیات شاعری اور ان تمام اسباب و علل پر جن سے شاعری متاثر ہوتی ہے ، زیادہ تر بحث کی گئی ہے ، چنانچہ اس کو پڑھنے کے بعد فارسی شاعری کے ارتقاے تدریجی کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے ،

اس بنا پر ایک ایسے تذکرے کی سخت ضرورت تھی جس میں اُردو لٹریچر کے عہد بہ عہد ترقی کا ہر ممتاز پہلو نمایاں کیا جائے ، اور شعرا کی خصوصیات کلام پر تنقیدی نظر ڈالی جائے ہم کو نہایت مسرت ہے ، کہ ہمارے فاضل دوست مسٹر رام بابو سکسینہ نے اس گرانقدر تصنیف میں اس کمی کی ایک بڑی حد تک تلافی کردی ہے -

یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس کے دو حصے ہیں ، جو ۱۹ ابواب پر مشتمل ہیں ، پہلے چودہ ابواب میں شاعری کے مختلف مدارج ترقی پر تحقیقی حیثیت سے نظر ڈالی گئی ہے ، اور نہایت مرتب طریقے پر عہد بہ عہد کی خصوصیات اور انقلاب و تغیّر کا تذکرہ کیا گیا ہے ، اس کے بعد تین ابواب میں اُردو نثر کی ابتدائی حالت اور اس کی عہد بہ عہد ترقیوں کا ایک مسلسل اور مربوط بیان ہے ، اٹھارویں باب میں اُردو ڈراما کی مختصر تاریخ ہے ، اور آخری باب میں اُردو لٹریچر کی ترقی اور کارناموں پر ایک عام تبصرہ کیا گیا ہے ، غرض پوری کتاب پڑھنے کے بعد اس امر کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے ، کہ اُردو کی ابتدا کیونکر اور کب ہوئی ؟ اس نے کس ماحول میں پرورش پائی ؟ شاعری کے کیا کیا رنگ قائم ہوے ؟ ہر دور کی خصوصیات کیا کیا تھیں ؟ نثر کی ابتدائی حالت کیا تھی ؟ اس کے کیا کیا انداز بدلے ؟ علمی حیثیت سے زبان میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں ؟ غرض مسٹر رام بابو کے ، اس آئینہ تاریخ میں اُردو لٹریچر کے جمال ارتقا کے وہ مختلف جلوے نظر آسکتے ہیں ، جن سے اور تذکرے خالی ہیں -

تصنیف زیر تنقید کی ایک بڑی خوبی تسلسل بیان ، اور ترتیب خیال ہے ، جس کی وجہ سے اردو لٹریچر کے سلسلۂ تاریخی کی تمام کڑیاں سامنے آجاتی ہیں ، اور پڑھنے والے کو جس ترتیب کے

ساتھہ جس قسم کی معلومات کي ضرورت محسوس هوتي هے؟ اسي ترتیب کے ساتھہ اسي محل اور موقعے پر اسکو ملتي جاتي هیں؟ اس خصوصیت کا صحیح طور پر اندازہ کرنے کے لیے ضروري معلوم هوتا هے؟ کہ جس طرح لائق مصنف نے مختلف ابواب کي تقسیم کی هے؟ اس کو مختصر الفاظ میں ظاهر کردیا جائے ـ

سب سے پہلے زبان کي تاریخ ابتدا پر بحث کي گئی هے ' یعنی اس کا اصلي منبع وجود کیا هے؟ فارسی اور دیگر مغربي زبان نے اس پر کیا کیا اثر ڈالے؟ مولوي محمد حسین آزاد کے نزدیک اُردو کا ماخذ برج بھاشا هے' لیکن فاضل مصنف نے اس رائے سے اختلاف کیا هے ' اور یہ دکھلایا هے ' کہ اُردو کا گہوارۂ وجود در اصل وہ خاص دیسی زبان هے' جو عام طور پر دلي اور میرتھہ کے اکناف و حوالي میں رائج تھی' برج بھاشا متھرا اور اُس کے قُرب و جوار میں مستعمل تھي؟ علاوہ فارسی کے انگریزي اور پرتگالي زبانوں نے اردو کو ایک بڑي حد تک متاثر کیا' سنہ ۱۵۳۰ ع میں پرتگالیوں نے هندستان کے خاص خاص بندرگاهوں پر مستقل حیثیت سے قبضہ کرلیا تھا ' اور مشرق کے ممتاز تجار میں اُن کا شمار هوتا تھا ' ملک کے اندر ان کی مختلف آبادیاں قائم تھیں ' حکومت ' تبلیغ مذهب اور تجارت کے تعلق سے ان کو عوام سے اختلاط اور راہ و رسم پیدا کرنے کا موقعہ ملا ' سب سے پہلے پرتگالیوں نے هندستان میں مغربي چیزوں کو رو شناس کرایا ' اس طور پر اردو لغت میں خفیف رد و بدل کے ساتھہ بہت سے جدید الفاظ کا ذخیرہ جمع هوگیا ' مثلاً آلپین (Alpin) الماری (Almara) بوتل (Bottle) ارغنون (Organ) ' کارتوس (Cartridge) صابون (Soap) کوچ (Sofa) تولیہ (Towel) گارد (Guard) ' بالٹی (Bucket) کمرہ (Room) وغیرہ وغیرہ ـ

اس کے بعد فاضل مصنف نے اُردو لٹریچر پر ایک عام تبصرہ کیا ہے، جس سے مختلف مدارج ترقی کا ایک اجمالی خاکہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، جس کی مفصل ابواب ما بعد میں کی گئی ہے، اُردو شاعری کی عام خصوصیات پر بحث کرنے کے بعد اس کو مختلف دوروں میں تقسیم کیا ہے، اور ہر دور کی خصوصیات پر محققانہ نظر ڈالی ہے، دکن کے ابتدائی دور شاعری کے تذکرے کے بعد دلی کے دور شاعری کو لیا ہے، اور اس کو تاریخی اصول پر مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے، جو حسب ذیل ہے :—

پہلا دور — آرزو اور حاتم -

دوسرا دور — میر اور سودا -

تیسرا دور — مصحفی اور انشا -

چونکہ اس دور کے بعد شاعری کا مرکز لکھنؤ کی طرف منتقل ہو گیا، اس لیے اس کے بعد تاریخی حیثیت سے لکھنؤ کے دور شاعری کا تذکرہ ضروری تھا، جس کو فاضل مصنف نے حسب ذیل تقسیم کیا ہے:—

ناسخ اور آتش کا دور، واجد علی شاہ کا دور -

چونکہ مرثیہ گوئی کو لکھنؤ کی سر زمین سے خاص تعلق رہا ہے، اس لئے اسی سلسلہ میں فاضل مصنف نے ایک مستقل باب میں مرثیہ اور ممتاز مرثیہ گویوں مثلاً انیس، دبیر وغیرہ پر تبصرہ کیا ہے -

نظیر اکبرآبادی اور نصیر دہلوی کو چونکہ کسی خاص اسکول سے تعلق نہ تھا، اس لیے ان کی خصوصیات شاعری اور حالات کا تذکرہ ایک علیحدہ باب میں کیا گیا ہے -

اس کے بعد دلی کے خزاں رسیدہ چمنستان شاعری میں دوبارہ بہار آگئی، اور کچھ ایسے ارباب کمال پیدا ہو گئے جن کی سحر طرازیاں

اُردو ادب کے لئے سرمایۂ ناز ہیں، اس لیے اس کو دلي کي شاعری کا چوتھا دور قائم کر کے لایق مصنف نے ممتاز ترین شعرا، مثلاً غالب، ذوق وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے ۔

آخری دور کا تعلق رامپور اور حیدرآباد سے ہے، یہ زمانہ امیر اور داغ کي زمزمہ سنجیوں کا ہے، جن کی خاموشی کے بعد اردو شاعری میں ایک نئی تحریک کا آغاز ہوتا ہے، جس کے علمبردار آزاد اور حالي ہیں، جن کی شاعرانہ جدت طرازیوں کو لائق مصنف نے ایک علٰحدہ باب میں دکھلایا ہے ۔

اس کے بعد اُردو نثر کا حصہ شروع ہوتا ہے، جس کي تاریخ ارتقا کے فاضل مصنف نے تین دور قائم کئے ہیں۔ پہلا ابتدائی دور جس کا خاص تعلق کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے ہے، یعني جب انگریزوں کا تسلط هندستان میں قائم ہوا اور ان کو اغراض حکومت کے لیے دیسی زبان کی تعلیم و اشاعت کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی، دوسرا دور غالب اور سر سید احمد خاں کا ہے، جب کہ اردو زبان نے ایک خاص علمی اور ادبی حیثیت اختیار کی، اور تیسرا دور سرشار اور سرور کا ہے، جب کہ اُردو ناول اور افسانہ نگاری کو ترقی ہوئي ۔

اس کے بعد لائق مصنف نے ایک مستقل باب میں اُردو ڈراما کي مختصر تاریخ لکھی ہے، اور آخری باب میں اُردو لٹریچر کي عام ترقی کا تذکرہ کیا ہے، جو در اصل ابواب ما سبق کا خلاصہ ہے ۔

اس تفصیل سے آپ خوبی اندازہ کرسکتے ہیں، کہ لائق مصنف نے اپنے موضوع بحث کے مختلف پہلوؤں کو کس حسن ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے، نہ صرف ترتیب و تقسیم کي

خوبی کا نتیجہ ہے، کہ آخر تک پڑھنے والے کی توجہ ہٹنے نہیں پاتی، اور نہ اس کے دماغ میں کوئی انتشار پیدا ہونے پاتا ہے -

علاوہ حسن ترتیب کے اس تصنیف کی دوسری نمایاں خصوصیت تحقیق و تنقید ہے، جو در اصل اس قسم کے تاریخی تذکروں کی جان ہے، لائق مصنف نے صرف شعرا کے عام ذاتی حالات اور واقعات زندگی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی خصوصیات کلام پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ فاضل مصنف صرف افسانہ نگار نہیں ہے، بلکہ تنقیدی نظر بھی رکھتا ہے، ممکن ہے کہ فاضل مصنف کی تمام رایوں سے کسی کو اتفاق نہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ فاضل مصنف نے اس نازک فرض کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے، اور جس نکتہ شناسی کے ساتھ اردو شاعری کے محاسن و معائب پر تنقید کی ہے، وہ موجودہ بزم ادب کی خاص توجہ کی مستحق ہے -

لائق مصنف کے نزدیک فارسی کی کورانہ دبہم تقلید نے اردو شاعری میں متعدد معائب پیدا کردیے، قدیم شعرا کے لیے یہ نا ممکن تھا - کہ وہ فارسی زبان کو بالکل نظر انداز کر دیتے، لیکن انھوں نے جوش تقلید میں اس حد تک غلو سے کام لیا کہ ہندستان کو بالکل بھول گئے، اور اپنی خاص انفرادی حیثیت قائم نہ رکھ سکے، چنانچہ ہر ہر قدم پر فارسی شاعری کے دست نگر بن گئے، بہار کا منظر کھینچتا ہے، تو وہی ایران کے گل و بلبل، شمشاد و قمری، نرگس و سوسن، سنبل و ریحان کا خواب دیکھتے ہیں، لیکن چمن زار ہند میں اُن کو کوئی رنگینی نظر نہیں آتی، عشق و محبت کی بزم آرائی مقصود ہے، تو صرف لیلیٰ و مجنوں،

فرهاد و شیریں کے پُر گداز واقعات ان کے حُسن خیال کی آرایش کا سرمایہ هیں ۔ هندستان کے جاںنثاران مذهب کا نام تک نہیں آتا ۔ شجاعت اور بہادری کی مثالیں پیش کرتی هیں تو بحر رستم ، افراسیاب اور اسفند یار کے اپنے ملک کے بہادروں کی مطلق خبر نہیں ۔ نقاشی اور صنعت گری کا نمونہ دکھاتا هے تو صرف مانی اور بہزاد کی مصوری ان کی تمام تشبیہات کا ماخذ هے ۔ عالم آب کا سماں کھینچتا هے تو صرف جیحوں اور سیحون کی موجیں اُن کی جسم تخیل کے سامنے رقص کرتی هوئی نظر آتی هیں ۔ لیکن گنگا اور جمنا کی روانی ان کی تخیلات میں کوئی تموّج پیدا نہیں کر سکتی ۔ بلند پروازی کے جوش میں ان کو صرف کوہ الوند کی چوٹیاں نظر آتی هیں ۔ لیکن ان کی فکر همالیہ کی فلک بوس چوٹیوں سے کبھی بھولکر بھی نہیں ٹکراتی ۔ هندستان کے بادشاهوں کو عدل و انصاف میں نوشیرواں سے ، سخاوت میں حاتم سے ، ترک و احتشام میں قیصر و سکندر سے تشبیہ دیجاتی هے ۔ غرض اردو کی قدیم شاعری کا جو کچھہ سرمایۂ خیال هے ، وہ صرف فارسی شاعری کی صدائے باز گشت هے ۔ اس غلامانہ تقلید نے اردو شاعری سے واقعیت کے عنصر کو بالکل فنا کر دیا ۔ اور طبیعتیں صرف فرضی اور خیالی نقش آرائیوں کی خوگر هو گئیں ۔

ان حالات نے اردو شاعری کو جادۂ اصلیت سے بالکل منحرف کر دیا ۔ شعریت کی روح فنا هو گئی ۔ ایک هی قسم کے خیالات اور مضامین کے اعادۂ پیہم نے دل و دماغ کو جدّت ، تنوع ، اور لطافت سے خالی کر دیا ۔ صنائع و بدائع ، دور از کار تشبیہات و استعارات ، مبالغہ آورئی ، قافیہ بندی وغیرہ بھی جدید شاعری کا معیار کمال سمجھے جانے لگیں ۔ دائرہ خیال صرف چند مخصوص مضامین تک محدود

ہو کر رہ گیا، انداز بیان میں کوئی ندرت یا جدت باقی نہ رہی صرف ایک ہی، موضوع تھا، جس پر مختلف طریقوں سے طبع آزمائیاں کی جاتی تھیں، ایک ہی خاکہ تھا، جس کو خفیف ترمیم و تغیّر کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا، ایک ہی شاہراہ تھی، ایک ہی منزل تھی، ایک ہی قسم کے مسافر تھے، ایک ہی طرح کی رفتار تھی، حالانکہ تخیّلات کی وسیع اور گونا گوں شاہراہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں، پورا صحیفۂ کائنات معہ اپنی تمام لا زوال رنگینیوں کے سامنے تھا، لیکن ایک دماغ جو مدت سے مصنوعی جذبات کے ادا کرنے کا عادی ہوچکا تھا، اس پر جمال حقیقت کی شعاعیں کیونکر پرتو افگن ہو سکتی تھیں، غرض فارسی کی تقلید کی بندشوں نے اردو شاعری کو کچھ اس طرح جکڑ دیا، کہ اس کو اپنے فطری نشو و نما کے لیے مطلق موقعہ نہ مل سکا، اور وہ تمام معائب جو اس قسم کی غلامانہ تقلید کے ضروری نتائج ہیں، اس میں پیدا ہوگئے، یعنی تصنع و تکلف، تنگ خیالی، ابتذال، پستی، لطف اور بلند جذبات کا فقدان، حقائق سے گریز، منافقانہ ذہنیت، لفظ پرستی، سطحیت وغیرہ جن کی وجہ سے اردو شاعری محض ایک بے حس اور بے جان مشین بن کر رہ گئی، جس کی حرکت صرف چند پامال مقررہ قواعد کے بل پر قائم تھی -

یہ خیالات در اصل فاضل مصنف کے ہیں، جن کو میں نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے، مجھکو ان معائب کے وجود سے انکار نہیں، تقلید اور کورانہ تقلید فی نفسہ ایک مبتذل حرکت ہے، اس لیے اس کے اثرات و نتائج کا مبتذل ہونا ضروری ہے، لیکن ہمارے فاضل دوست کی یہ شکایت صحیح نہیں، کہ قدیم شعرا نے "فارسی کی نامانوس اور شاندار ترکیبوں کے سامنے بھاشا کی

سیرینی اور نزاکت کو نظر انداز کر دیا ؟ ممکن ہے کہ فارسی شاعری میں اس قدر بلند اور سریعانہ جذبات نہ ہوں جتنا کہ عرب کی شاعری میں پائے جاتے ہوں یا اس میں عاشقانہ احساس کی اس قدر شدت اور گرمی نہ ہو جتنی کہ ہندی میں محسوس ہوتی ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ جہاں تک زبان کی شیرینی اور نزاکت کا تعلق ہے دنیا کی کوئی زبان مشکل سے فارسی کا مقابلہ کرسکتی ہے اردو شاعری میں جو کچھ شیرینی لطافت اور رنگینی ہے وہ صرف دوں فارسیت کا پرتو فیض ہے البتہ غالب کی سی بعض طویل اور نامانوس ترکیبوں کے استعمال سے ضرور احتراز کرنا چاہئے مثلاً

سمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گُل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

اگر آیا کی جگہ بر آمد کر دیا جائے تو پورا شعر فارسی بن جاتا ہے مثلاً دور حاضر کے ایک مشہور بزرگ فن کا شعر ہے

گویا شب فراق میں میں سر سے تا قدم
آئینۂ تحمل ایذائے درد تھا

اگر ناقد مصنف کا منشاء اسی قسم کی نا ہموار اور نا موزوں ترکیبوں سے ہے تو بے شبہ مجھ کو ان کی رائے سے اتفاق ہے اردو زبان کو عربی اور فارسی کے مغلق اور دقیق الفاظ و تراکیب سے جہاں تک ممکن ہو پاک کرنا ہمارے شعرا کا فرض اولین ہونا چاہئے لیکن فارسیت کو قطعاً خارج کر دینا در اصل اردو شاعری کی رنگینی لطافت اور شیرینی کو غارت کرنا ہے -

جو لوگ فارسیت کا ذوق صحیح رکھتے ہیں ، ان کے کلام سے اس امر کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے ، کہ فارسی کی لطیف اور نازک ترکیبیں شعر میں کیا حُسن اور خوبی پیدا کر دیتی ہیں ، بعض اوقات ایک مختصر سی نازک ترکیب پورے شعر میں جان ڈالدیتی ہے ، مثلاً

لُٹا دے دولتِ کونین اور میرے لیے

بس اک تبسمِ عاجز نواز رہنے دے ،

غور کیجیے صرف ایک تبسم عاجز نواز کی پُر لطف ترکیب نے ایک معمولی سے خیال کو کس قدر پُر کیف اور دلکش بنا دیا ہے ۔

چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں —

اس جوئبار حسن سے سیراب ہے فضا ،

روکو نہ اپنی نعرس مستانہ وار کو ،

کرم کچھ آج ہے ساقی کا وہ طرب انگیز ،

کہ جرعہ جرعہ ہے موج نسیم سحری ،

ہم اس سے بے خبر نہیں ، کہ سادگی ، زبان کی ایک بڑی خوبی ہے ، لیکن ہم اُس کے قائل نہیں ، کہ جو الفاظ اور عام محاورے روزانہ گفتگو میں بولے جائیں ، وہی شعر میں بھی استعمال کیے جائیں ، شاعر عام سطح سے ایک بلند تر ہستی ہے ، اُس کے تخیلات غیر معمولی ہوتے ہیں ، وہ خشک فلسفیانہ تقریر نہیں کرتا ، اس کا مطمع نظر قلب انسانی کے لطیف احساسات کو مشتعل کرنا ہے جس کے لیے ضروری ہے ، کہ پیرایۂ بیان ایسا اختیار کیا جائے جو عام روش سے کسی قدر الگ ہو ، جس میں کوئی خاص طرفگی ہو ، کوئی خاص ندرت اور جدت ہو ، ورنہ وہ شاعر کہلائے جانے کا

مستحق نہیں ہو سکتا ، اس بنا پر اردو شاعری کے طرز ادا کی جدت اور لطافت کو اگر قائم رکھنا مقصود ہے ، تو فارسی کی لطیف ترکیبوں سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی جا سکتی لایق مصنف کے اس خیال سے بھی مجھکو اتفاق نہیں ہے ، کہ "قافیہ اور ردیف کی پابندیوں نے اردو شاعری کو مسیں بنا دیا اور اُس کے دائرہ خیال کو محدود کر دیا" ۔

یہ نظریہ مغربی تعلیم کا نتیجہ امر ہے ، مجھکو اس سے انکار نہیں ، کہ محض قافیے کی رعایت سے شعر کہنا در اصل ذوق شاعری کو پست اور مبتذل کرنا ہے ، لکھنؤ کے قدیم شعرا کے دواوین اُٹھا کر دیکھیے تو ایک ہی قافیہ اور ردیف پر تین تین چار چار غزلیں تک ملیں گی ، لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں مل سکتا ، جس میں کوئی لطیف خیال یا کیفیت ادا کی گئی ہو ، اور آج بھی مشاعروں میں یہی تعریفیں کی جاتی ہیں ، کہ "کیا انوکھی ردیف ہے" ! "کیا بولتا ہوا قافیہ ہے" ! اس طرح کی قافیہ پیمائی ہمارے نزدیک شعریت کے نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں ، اور نہ ہم فن عروض کی غیر ضروری اور مہمل بندشوں ، مثلاً ایطائے خفی اور ایطائے جلی وغیرہ میں پھنس کر خیالات کی فطری رو میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے ، لیکن ہمارے لائق دوست کو غالباً اس سے انکار نہ ہوگا کہ موسیقیت اور ترنم شاعری کا ایک ضروری عنصر بلکہ جزولاینفک ہے ، روح کو نغمے سے جو خاص تعلق اور مناسبت ہے ، وہ محتاج بیان نہیں ، چونکہ شاعر کا اصل مقصد روح انسانی کو مشتعل اور متاثر کرنا ہے ، اس لیے اس کے موزوں فقروں میں موسیقیت کا ہونا ضروری ہے ، موسیقیت صرف ایک ذوقی چیز ہے ، جو چند اجزا کی باہم ترکیب سے پیدا ہوتی ہے ، الفاظ منتخبہ ہوں ، ان کی نشست و ترکیب

صحیح اور موقعے کے مطابق ہو، جس قسم کا خیال ہو، اسی کے لحاظ سے الفاظ کا انتخاب کیا جائے، ترکیبیں جو استعمال کی جائیں ان کے باہم دروبست میں چستی اور شگفتگی ہو، ان چیزوں کے ساتھ ساتھ قافیہ ایک بڑی حد تک ترنم اور موسیقیت پیدا کرنے میں معین ہوتا ہے، بلینک ورس میں ممکن ہے، کہ شاعر کو اپنے اظہار خیال کے لیے زیادہ آزادی محسوس ہوتی ہو، لیکن بغیر قافیے کے شعر میں خوش نوائی اور خوش آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی، جو مسلمہ طور پر شاعری کا ضروری جزو ہے، یہ خیال بھی ہمارے نزدیک صحیح نہیں، کہ قافیہ کی وجہ سے تسلسل خیال میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، ممکن ہے کہ یہ دقت زیادہ تر ان لوگوں کو محسوس ہوتی ہو، جو زبان پر کامل قدرت نہ رکھتے ہوں، لیکن قادرالکلام شعرا نے باوجود قافیے کی پابندی کے تسلسل خیال کے وہ نمونے پیش کیے ہیں، جن کو دیکھ کر نگاہیں روشن ہو جاتی ہیں، میر انیس کے مرثیے، مولانا حالی کا مسدس، ڈاکٹر اقبال اور علامہ شبلی کی قومی تاریخی اور سیاسی نظمیں کیا اس الزام کی تردید کے لیے کافی نہیں ہیں؟ خود فارسی شاعری کو لیجیے جو اس بدعت کی موجد ہے، کیا تسلسل خیال اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے فردوسی کا شاہ نامہ دنیائے ادب کا اعلیٰ ترین شاہکار نہیں ہے؟ کیا قافیہ اور ردیف کی بندشوں کی وجہ سے حافظ، سعدی اور امیر خسرو عشق و محبت کی لطیف کیفیتوں کی مصوری میں کامیاب نہیں رہے ہیں؟ کیا قاآنی نے مناظر قدرت کی مصوری کے بہترین نمونے پیش نہیں کیے ہیں؟ کیا عمر خیام کی رباعیات میں جذبات انسانی کے نکتہ ہائے لطیف کی جھلک نظر نہیں آتی؟ کیا اسرار و حقائق کے لحاظ سے مثنوی مولانا روم کے مقابلے میں انگریزی شاعری کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ ہمارے فاضل دوست

کے نزدیک انگریزی شاعری نے اس وقت ترقی کی ، جب اس نے قافیے اور ردیف کی پابندیوں کو ترک کر دیا ، لیکن ایران کے "دو رندان لم یزل" نے ان قیود کو مد نظر رکھتے ہوئے جس تنوع ، جس وسعت ، جس خوبی اور لطافت کے ساتھ مختلف اصناف شاعری پر اپنے گراں اور نتائج افکار پیش کیے ہیں ، اس کی مثال دنیا کی کوئی شاعری مشکل سے پیش کر سکتی ہے -

ردیف سے گو کلام کا حُسن بڑھ جاتا ہے ، لیکن وہ ایک غیر ضروری قید ہے ، اس لیے اس کو ترک کر دینے میں شعریت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ سکتا ، البتہ وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر ہمارے نزدیک قافیے کا وجود ضروری معلوم ہوتا ہے ، بغیر اس کے شعر نغمۂ بے آہنگ ہے لیکن کم از کم ہم اتنی ترمیم ضرور چاہتے ہیں ، کہ قافیے کے متعلق جو بعض جزئی اور غیر ضروری قیدیں عائد کر لی گئی ہیں ، ان کو ترک کر دینا چاہیے ، قافیے کا اصل مقصد خوش نوائی اور ترنم آفرینی ہے اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے ، کہ دونوں قافیوں کے آخری حروف بھی یکساں ہوں ، مثلاً موجودہ اصول کے مطابق "حیات" کا قافیہ "نشاط" جائز نہیں ہو سکتا ، لیکن ہم کو اس سے اختلاف ہے ہمارے نزدیک دو ہم آواز الفاظ کا قافیہ جائز ہونا چاہیے ، کیونکہ اس حالت میں بھی ترنم قائم رہتا ہے ، اور ہم کو صرف ترنم سے تعلق ہے ، چنانچہ شعر میں حیات کا قافیہ "نشاط" یا "مخصّص" کا قافیہ "مجسّس" یا "خبط" کا قافیہ "عبث" باندھا جائے ، تو اس میں کیا نقصان ہے ، شعر کی موسیقیت اور خوش آہنگی میں کوئی فرق نہیں آتا ، اس ترمیم سے ایک طرف شعریت بھی قائم رہتی ہے اور دوسری طرف نسبتۃً شاعر کو ذرا آزادی مل جاتی ہے بہر حال موسیقیت اور

ترنم کو مد نظر رکھتے ہوئے قافیے کی بندشیں جو ضرورت سے زائد سخت ہیں ، اگر ہلکی کر دی جائیں ، تو یہ ایک قابل قدر اصلاح ہوگی -

مختلف اصناف شاعری پر لایق مصنف نے جو عام تبصرہ کیا ہے ، وہ اگرچہ مختصر ہے لیکن لایق توجہ ہے ، اُردو شاعری میں نہ نسبت اور اصناف سخن یعنی قصیدہ ، مثنوی ، قطعہ رباعی وغیرہ کے غزل کا سرمایہ بہت زیادہ ہے ، اور آج بھی اسی صنف سخن پر بکثرت طبع آزمائیاں کی جاتی ہیں ، اس کے متعلق مصنف نے شکایت کی ہے کہ غزل کا میدان کس قدر محدود ہے اور اس صنف میں اس قدر تصنع اور سوقیانہ پن پیدا ہو گیا ہے - افسوس ہے کہ غزل آج بھی ان معائب سے خالی نہیں -

لایق مصنف نے غزل پر ریویو کرتے ہوئے بہت زیادہ اختصار سے کام لیا ہے ، حالانکہ اس موضوع کی اہمیت کسی قدر تفصیل کی طالب تھی ، یعنی اس کے دکھلانے کی ضرورت ہے کہ غزل کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں ؟ اس کے اصلی عناصر کیا ہیں ؟ کس قسم کے جذبات اس میں ادا ہونے چاہئیں ؟ زبان کس قسم کی ہونی چاہیے ؟ انداز بیان میں کن کن باتوں کا لحاظ ہونا چاہیے ؟ اور پھر اس معیار پر اُردو تغزل کے معائب و محاسن کا اندازہ کیا جائے اور اس سلسلے میں خاص طور پر شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی جائیں ، تا کہ لوگوں کو یہ صاف نظر آ جائے کہ ان کے سامنے جو چیز تغزّل کے نام سے پیش کی جا رہی ہے اس کو فی نفسہ تغزل سے کوئی تعلق نہیں ، بلکہ صرف الفاظ کا ایک نظر فریب طلسم ہے ، جو درد آشنا قلوب کے لیے اپنے اندر کوئی مستقل سامانِ لذت نہیں رکھتا -

غزل کا اصلی موضوع سخن عشق و محبت ہے ، اس لیے سب سے

پہلے یہ دکھانا ضروری ہے ، کہ اس عشق کی نوعیت کیا ہے ؟ اور اس کے اثرات و نتائج کیا ہیں ؟

دلی کے شاعری کی خوبی اور لطافت کی خاص وجہ یہ تھی، کہ اکثر شعرا بادۂ تصوف کے ذوق شناس تھے جیسا کہ لایق مصنف نے تصریح کی ہے ، اور اکثر صوفی منش شعرا کا نام لیا ہے ، مثلاً شاہ مبارک آبرو گوالیار کے مشہور صوفی شاہ محمد غوث کی سلسلۂ اولاد میں تھے شاہ حاتم ، خان جاناں مظہر ، شیخ شرف الدین ، مضمون ، میر درد ، اکابر صوفیہ میں تھے ، جن کے ذوق عرفان کی جھلک میر ، سودا اور اس دور کے دیگر شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے واقعہ یہ ہے کہ جوش و اثر ، اور سوز و گداز جو شاعری اور خصوصاً عشقیہ شاعری کی جان ہے ، اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا ، جب تک شاعر اس جرعۂ آتشیں کا لذت شناس نہ ہو چونکہ تصوف کا اصل مقصد روح انسانی کا تزکیہ ، اور شریفانہ اخلاق کی تربیت ہے اس لیے اس کا ایک دوسرا لازمی اثر یہ ہوتا ہے ، کہ جب تک شاعری ان ارباب نظر کے ہاتھ میں رہتی ہے ، اس کا دامن ابتذال سے پاک رہتا ہے ان کی فکر و نظر کا مقصود شاہد بازاری نہیں ، بلکہ جمال حقیقی ہوتا ہے اس لیے ان کی زبان سے وہ الفاظ اور خیالات نہیں نکلتے ، جو پاکیزگی اور متانت کے خلاف ہوں -

یہ امر خاص طور پر غور کے قابل ہے ، کہ وہی تغزل جو دلی میں رہ کر احساسات کو برانگیختہ کرتا تھا ، لکھنؤ پہونچ کر آخر اس میں اس قدر ابتذال اور پستی کیوں آ گئی ؟ وہ اس قدر بد مزہ اور بے کیف کیوں ہو گیا ؟ حالانکہ علم و فضل کی کمی نہ تھی، قدردان فن کا قحط نہ تھا فرمانروایان اودھ کی فیاضیوں کا یہ عالم تھا ، کہ شعرا دلی سے کھنچے چلے آتے تھے شاہی دربار ارباب سخن

سے بھرا پڑا تھا، در و دیوار سے شاعری کی صدائیں آرهی تھیں، ناسخ کی علمی قابلیت سے کس کو انکار هو سکتا ہے، لیکن ان کی شاعری کے متعلق فاضل مصنف کی یہ رائے ہے —

"ان کی غزلیں سحر ساماں لفظی طلسم کاریوں کے صحیح اور پُر کیف جذبات و احساسات سے خالی هیں، تصنع و تکلیف ان کی نمایاں خصوصیت ہے، ان کے اعلیٰ ترین اشعار کو بھی پڑھ کر دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، تشبیہات دوراز کار اور بے کیف هوتی هیں عامیانہ خیالات کو پر شکوہ الفاظ میں ادا کرتے هیں، لفظی صناعی اور زینت و آرائش کے سامنے جذبات کی لطافت کا بالکل لحاظ نہیں رهتا اکثر ناموزوں، ثقیل اور بھونڈے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے هیں، جن کو غزل کی نزاکت برداشت نہیں کرسکتی"

امیر مینائی بھی بہت بڑے عالم تھے، لیکن ان کی شاعری میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔

اسی طرح امیر و داغ کا موازنہ کرتے هوئے لائق مصنف نے امیر کی شاعری کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے، اس سے مجھکو بہت کم اختلاف ہے، همارے نزدیک دونوں میں وهی فرق ہے، جو ایک مولوی اور شاعر میں هوتا ہے، اس سے انکار نہیں، کہ داغ کے کلام میں بعض اوقات ابتذال کی بھی جھلک نظر آ جاتی ہے، لیکن امیر نے اس سے کہیں زیادہ مبتذل اور عامیانہ خیالات ادا کیے هیں، اگرچہ لائق مصنف کو یہ امر تسلیم ہے، کہ دونوں میں جذب اور روحانی جوش و اثر کی کمی ہے تاهم ان کا فیصلہ یہ ہے کہ —

"دنیا وجود اپنی تمام کمزوریوں کے جہاں تک الفاظ کے شکوہ، انداز بیان کی سنجیدگی، اور احساس کی نزاکت کا تعلق ہے، امیر کا درجہ داغ سے بڑھا ہوا ہے، امیر فن عروض کے بہتر استاد تھے، اُن سے نظم کی غلطیاں نہیں ہوئیں، لیکن داغ سے اکثر لغزشیں ہو جاتی ہیں"۔

ہمارے لائق دوست کو غالباً مولانا روم کا یہ شعر معلوم ہو،

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات،
شعر میگویم بہ از قند و نبات،

فن عروض کی استادی، در شکوہ الفاظ یا مولویانہ ثقاہت کا نام شاعری نہیں اصل چیز احساس کی شدّت اور نزاکت ہے، یعنی یہ دیکھنا ہے، کہ شعریت کی روح کس کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے؟ موازنے کے لئے ضروری ہے، کہ دونوں کے ہم معنی اشعار لے کر ان کے معائب و محاسن پر بحث کی جائے، لیکن لائق مصنّف نے صرف ایک مجمل رائے پر اکتفا کیا ہے حالانکہ فیصلے کے لیے وجوہ و اسباب کا دکھانا ضروری ہے اس لیے ہم بھی طوالت کے لحاظ سے اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث چھیڑنا نہیں چاہتے، لیکن اتنا عرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں، کہ لکھنؤ کی غزل گوئی میں 'نزاکت احساس' کی تلاش فضول ہے البتہ دور حاضر نے چند شعرا ایسے پیدا کردیے ہیں جن کی لطافت آفرینیوں نے تغزل کو معجزہ بنا دیا ہے۔ اس لیے وہ فاضل مصنف کی خاص توجہ کے مستحق ہیں، ہم کو مسرت ہے، کہ لائق مصنف کی نگاہیں محض لفظی طلسم کاریوں کی فریب خوردہ نہیں ہیں بلکہ لطیف احساسات

کو ڈھونڈھتی ہیں اس لیے ہمکو امید ہے کہ آیندہ دور حاضر
کے شعرا کے کلام پر ریویو کرتے ہوئے اُن کا یہ ذوق جستجو قائم
رہیگا ' اور اپنی رائے کی تائید میں مثالوں سے احتراز نہ کرینگے '
موجودہ تصنیف میں مثالوں کی کمی نہایت شدّت سے محسوس
ہوتی ہے ' اور ایک ادبی تذکرے کا یہ بہت بڑا نقص ہے -

علاوہ اس کے لایق مصنف نے شعرا کے انتخاب میں اصول
فن کا لحاظ نہیں رکھا بعض بہت سے ایسے شعرا کا تذکرہ کیا
ہے ' جو فن کے لحاظ سے کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے ' کسی
ملک یا قوم کی تاریخ ادب لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے ' کہ
جتنے شعرا گذرے ہوں ان کا تذکرہ ضروری ہے ' قطع نظر اس سے
کہ انہوں نے فن ادب کو کوئی خاص ترقی دی یا نہیں ' ایران
نے ہزاروں لاکھوں شعرا پیدا کیے ' لیکن شعرالعجم کے فاضل مصنف
نے صرف انہی شعرا کو لیا ہے ' جو کسی خاص طرز کے موجد تھے '
یا جنہوں نے من حیث الفن شاعری میں کوئی قابل قدر اضافہ یا
اصلاح کی ' ہمارے لایق دوست کو بھی اسی اصول پر شعرا کا انتخاب
کرنا چاہیے تھا ' مثلاً فن کے لحاظ سے بے شبہہ ناسخ کا تذکرہ
ضروری تھا ' کیونکہ وہ ایک طرز خاص کے بانی تھے ' اگرچہ وہ
طرز اُردو غزل کے لیے پیام موت تھا لیکن اُن کے شاگردوں کے
تذکرے کی کیا ضرورت تھی ' وزیر ' برق ' رشک ' وغیرہ نے شاعری
کو کیا ترقی دی بجز اس کے کہ اپنے استاد کے رنگ کو اور بھی
پست و مبتذل کر دیا ' خواجہ آتش کی عظمت سے کس کو انکار
ہے ' لیکن صبا ' خلیل ' رند وغیرہ نے اُردو شاعری پر کیا احسانات
کیے ہیں ' جن کا تذکرہ کیا جائے اسی طرح قلق ' امانت ' اسیر '
درخشان اختر کی وہ کون سی گران قدر ادبی خدمات ہیں '

جن کی بناء پر اُردو شاعری کی تاریخ ارتقا میں جگہ دی گئی ہے؟ تعجب ہے کہ لائق مصنف نے جلال اور آرزو تک کا تذکرہ کیا، لیکن شعرائے دلی میں سے خواجہ میر اثر ایسے صاحب کمال کو بھول گئے۔

فاضل مصنف نے علاوہ امیر و داغ کے اکثر ہمعصر اور ہم مذاق شعرا کا موازنہ بھی کیا ہے، اور ان کی خصوصیات کلام کو الگ الگ دکھایا ہے، مثلاً میر و سودا، ذوق و غالب، انیس ودبیر وغیرہ وغیرہ، اگرچہ اس کام کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت تھی، تاہم مختصر الفاظ میں جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، اس سے لایق مصنف کی نکتہ شناسی کا اندازہ ہوتا ہے، البتہ ذوق کی جس حد تک تعریف کی گئی ہے، اُس میں ہمارے نزدیک کسی قدر مبالغہ ہے، ذوق نے جس حد تک زبان میں صفائی، سلاست اور روانی پیدا کی، اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اس لحاظ سے (جیسا کہ لائق مصنف کا خیال ہے) ذوق کو غالب پر ترجیح دی جائے، تو چنداں بیجا نہ ہوگا، اگرچہ غالب کی اکثر غزلیں زبان کی سادگی اور حسن و لطافت کی اعلیٰ ترین نظیریں ہیں، لیکن ذوق کے کلام میں اکثر عامیانہ اور مبتذل خیالات نظر آتے ہیں، جن سے غالب کا دامن شاعری تقریباً پاک ہے، واقعہ یہ ہے، کہ غالب کی سطح دماغی اس قدر بلند ہے، کہ وہاں تک ذوق کا وہم بھی مشکل سے پہونچ سکتا ہے، اس لیے دونوں کا موازنہ بالکل فضول ہے۔

اب تک عام خیال تھا، کہ اُردو شاعری کے جدید دور مذاق کی ابتدا حالی، اور آزاد کے زمانے سے ہوئی، لیکن یہ کس کو معلوم تھا، کہ اس سے بہت قبل نظیر اکبرآبادی نے جدید دور شاعری

کی بنیاد ڈالدی تھی، جس پر حالی وغیرہ نے بعد کو رفیع الشان عمارتیں تعمیر کیں، چنانچہ فاضل مصنف نے گیارھویں باب میں نہایت خوبی کے ساتھہ اس قدیم شاعر کی خصوصیات شاعری کو بے نقاب کیا ھے، اور یہ دکھایا ھے، کہ صحیح معنوں میں اگر کوئی شاعر ھندستانی کہا جاسکتا ھے، یعنی جس نے ھندستان کے طرز تمدن، اخلاق و عادات، اور مختلف قدرتی مناظر کی مصوری کی تو وہ نظیر اکبرآبادی کا وجود ھے، انھوں نے بقول مصنف " ھندستان کے اکثر میلوں اور تہواروں مثلاً ھولی، دیوالی، بسنت، عید وغیرہ پر بھی نظمیں لکھیں، جن سے ان کی مذھبی روا داری، وسعت اخلاق، فطرت شناسی، اور جزرسی کا اندازہ ھوتا ھے۔

اُردو شاعری کے جدید دور ترقی کا تذکرہ کرتے ھوئے، فاضل مصنف نے تین اسکول قائم کیے ھیں، ایک تو قدامت پرستوں کا گروہ ھے، جو کسی جدید انداز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، جو ایک قدم بھی آگے بڑھنا نہیں چاھتا، جس کے نزدیک جذبات انسانی کے زندہ حقائق کی مصوری جرم ھے، جس کی شاعری صرف بزرگوں کی صدائے بازگشت ھے یہ لوگ در اصل شاعر نہیں ھیں، بلکہ ایک قدیم طرز کی نقالی کرتے ھیں۔

اس میں شعرا کی وہ جماعت بھی ھے، جو اگرچہ قدیم طرز سخن کی کامیاب پیرو ھے، لیکن ایک ھی قسم کے خیالات اور مضامین کے اعادۂ پیہم نے اِس کی شاعری کو نوجوان طبقے کے لیے بالکل بد مزہ اور بے کیف بنا دیا ھے، ھمارے لائق دوست کا خیال ھے، کہ واقعات کی موجودہ رفتار اور جدید مذاقِ شاعری کے سیلاب نے اِن قدامت پرست بزرگوں کو بہت کچھہ

سامنے سے ہٹاتا ہے ، جن کا وجود اُردو لٹریچر کے لیے کسی حیثیت سے مفید نہیں ، لیکن افسوس ہے کہ ملک میں اِس جماعت کا اب بھی عوام پر بہت کچھہ اقتدار و اثر قائم ہے ، اور ہمارے فاضل دوست کو شاید یہ معلوم ہو ، کہ اسی مقدس گروہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں ، جو عام طور پر اقلیم سخن کے جم وکے سمجھے جاتے ہیں ، لیکن کم نظری اور تنگ خیالی کا یہہ عالم ہے کہ ان کے آستانۂ قدس پر کبھی کوئی شوریدہ سر کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ "ذرا گوشۂ عزلت سے سر باہر نکال کر افق جہاں کی گوناگوں رنگینیوں کا نظارہ کیجئے" تو اندر سے درد ناک آواز میں جواب آتا ہے کہ "ان کو ان کے ماتمکدوں میں رہنے دیجئے اور آہ و زاری و نالہ و بکا کرنے دیجئے ، اگر وہ آپ کی بزم عشرت میں شریک ہونا نہیں چاہتے تو اِس میں آپ کا کیا نقصان ہے" اِس میں کیا نقصان ہے ? یہ فاضل مصنف کے غور کرنے کی چیز ہے !

دوسرا گروہ اُس کے بالکل بر عکس ہے ، جو سر تاپا مغربی انداز خیال کا دلدادہ ہے ، جس کو قدیم طرز سخن میں کوئی خوبی یا لطافت نظر نہیں آتی ، جو بلا لحاظ اپنی قومی ضروریات ، یورپ کی کورانہ تقلید اور نقالی پر آمادہ ہے ، جو اسلاف کے کار ناموں کو محض دفتر بے معنی سمجھتا ہے ، اور ہر چیز میں مغربیت کی شان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اُس کو پروا نہیں کہ وہ جو کچھہ لکھتا ہے ، اس سے قوم کی روح کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے ، وہ کہاں تک خود اُن کے دل و دماغ کی فطری صلاحیت کے مطابق ہے یا اِس میں اس آب و ہوا کی بھی جھلک نظر آتی ہے ، جس میں اُسی کی پرورش ہورہی ہے ،

لیکن اِن دونوں فرقوں سے الگ ایک تیسرا درمیانی گروہ ہے ؛ جو خاص عظمت اور اہمیت کا مستحق ہے ۔ کیونکہ اِس کا نقطۂ نظر دونوں طبقوں کے افراط و تفریط سے پاک ہے وہ ماضی اور حال دونوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے ؛ وہ اِسلاف کے گراں بہا ترکۂ علمی کا قدر شناس ہے ؛ لیکن اِسی کے ساتھہ موجودہ حالات واقعات زندگی سے چشم پوشی بھی نہیں کرنا چاہتا ؛ وہ اُن تاجروں میں نہیں ہے ؛ جو ایک ملک میں خریدتے ہیں اور دوسرے ملک میں لیجا کر بیچدیتے ہیں ؛ بلکہ وہ ذوق شاعری کا معمار وصنّاع ہے ؛ جس کی قوت متخیلہ میں کچی خام پیداوار لیکر اُس کو مختلف جدید اور خوبصورت سانچوں میں ڈھالدیتی ہے اور خود اپنی اور نیز اپنے ملک و قوم کے دل و دماغ کی ضیافت کے لیے نئے نئے سامان مہیا کرتی ہے ؛ درحقیقت یہی وہ اسکول ہے ؛ جو اُردو شاعری کا صحیح معنوں میں محسن ہے ؛ اور جس کے وجود سے اُردو لٹریچر کی آئندہ ترقی کی تمام اُمیدیں وابستہ ہیں ۔

اس تصریح کے بعد فاضل مصنف نے اِس اسکول کے چند معمار شعرا مثلاً حالی ؛ آزاد ؛ سرور ؛ اکبر الہ آبادی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے ؛ اور نہایت نکتہ رسی کے ساتھہ اُن کی خصوصیات شاعری پر تنقید کی ہے ؛ اور یہہ دکھایا ہے کہ اِن ارباب فن کے ابر قلم کے رشحات سے اُردو شاعری کا خزاں رسیدہ چمن کس طرح دفعتاً لہلہا اُٹھا ؛ لیکن تعجب ہے ؛ کہ اِس سلسلے میں فاضل مصنف نے علامہ شبلی کی جدید تاریخی ؛ سیاسی اور اخلاقی نظموں کو نظر انداز کردیا ؛ اگر چہ لائق مصنف نے علامہ مرحوم کے حالات میں اِس کی طرف معمولی طور پر اشارہ کردیا

ھے لیکن حقیقت یہہ ھے کہ نظمیں یہہ خاص اھمیت کی مستحق ھیں، حالی، آزاد وغیرہ نے اردو شاعری کے دائرہ خیال کو جس حد تک وسیع کیا، اس سے کون انکار کر سکتا ھے، لیکن سیاسی اور فارسی نظموں کو غالباً سب سے پہلے مولانا ھی نے رواج دیا، علاوہ اس کے " طنز لطیف " کی آمیزش بھی مولانا ھی کا کار نامہ فخر ھے، یہہ نظمیں در اصل اردو شاعری کے سرمایۂ سخن میں ایک قابل قدر اضافہ ھیں، جس کو اردو لٹریچر کا کوئی مورخ آسانی کے ساتھہ نظر انداز نہیں کر سکتا -

علاوہ تنقید کلام کے فاضل مصنف نے جس احتیاط اور ضروری اختصار کے ساتھہ شعرا کے عام حالات زندگی قلمبند کئے ھیں، وہ تصنیف ھذا کی ایک قابل قدر خصوصیت ھے، آب حیات کے مصنف کی طرح ھمارے لائق دوست نے شعرا کے لطائف و ظرائف در اثنا وقت صرف نہیں کیا ھے، بلکہ ان کی زندگی کے حسنہ حسنہ اور ضروری واقعات بیان کرنے کے بعد زیادہ تر ان کی خصوصیات کلام در نظر کرنے کی کوشش کی ھے، اور اکثر جدید معلومات کا اضافہ کیا ھے، مثلاً عام خیال ھے، کہ ولی نے سب سے پہلے اردو میں باضابطہ دیوان مرتب کیا، لیکن فاضل مصنف نے اس شرف اولیت کی تردید کی ھے، اور یہہ دکھایا ھے، کہ ولی سے قبل گولکنڈہ کے اکثر سلاطین شاعری میں خاص شہرت رکھتے تھے -

اس تصریح سے آپ اندازہ کر سکتے ھیں کہ لائق مصنف نے نہ صرف قابل قدر معلومات کو یکجا کر دیا ھے، بلکہ اکثر غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ھے، علاوہ شعرا کے حالات اور عام تنقید شاعری کے، ایک خاص مسئلہ ھے، جس کے وجوہ و اسباب پر غور

کرنا اردو لٹریچر کے مورخ کا بہت بڑا فرض ہے۔ یہلی دلی کو اردو کا وطن کہا جاتا ہے، اس لیے فطری طور پر اس کی ابتدا وہیں سے ہونی چاہیے تھی، لیکن بجائے اس کے دلی سے سیکڑوں کوس دور اردو شاعری کا مرکز ہم کو دکن میں نظر آتا ہے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ تعجب ہے کہ اتنے اہم مسئلے کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہو سکی، لیکن فاضل مصنف نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے، جس نے اس تصنیف کی تاریخی وقعت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے اس دور کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے، بہمنی سلطنت کا بانی ایک مشہور برہمن مسمی گنگو کا خاص چیلہ یا شاگرد تھا، وہ جب تخت نشین ہوا، تو اس نے نہ صرف اپنے گرو کا نام اختیار کر لیا، بلکہ گنگو کو اپنا وزیر مال مقرر کر دیا، گنگو سے پہلے برہمنوں کو حکومت میں کوئی دخل نہ تھا، لیکن اس کی تقرری کے بعد سے شاہان دکن کے وزرائے مال عام طور پر برہمن ہونے لگے ہندوؤں کی اس تقرری سے زبان کی ترقی میں دوہری تحریک پیدا ہوئی، اور ہندو مسلمانوں میں باہم دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے، یہاں تک کہ ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے حکومت کا حساب کتاب جو پہلے فارسی میں رکھا جاتا تھا، برہمنوں کی زیر نگرانی ہندی میں لکھا جانے لگا، جس کی وجہ سے ہندی سرکاری دفاتر کی زبان بن گئی، اس لیے اس کی ترقی لازمی تھی، جنوبی ہند میں ہندوؤں کی خدمت نا قابل اعتنا نہ تھی، مسلمان سلاطین اپنے قیام امداد کے لیے اکثر ہندو حکمرانوں سے مدد لیا کرتے تھے، اس سیاسی تعلق نے ہندو اور مسلمانوں میں ایک عام اختلاط کی راہ کھول دی، جس سے زبان کو معتدبہ فائدہ پہنچا،

غرض گولکنڈہ اور بیجا پور کی تین صدیوں کی خودمختاری کے دور میں ہندو مسلمانوں میں باہم جس قدر خوش گوار تعلقات قائم رہے ، ہندوستان کے کسی اور حصے میں یہ حالت نہ تھی ، یہ صرف اِسی روا داری اور یگانگت کا اثر تھا - کہ ہندو کثیر تعداد میں سرکاری عہدوں پر مامور تھے ، اگر چہ اکثر خانہ جنگیاں پیش آتی تھیں ، باہم سلاطین گولکنڈہ اور شاہان بہمنی کو بہ نسبت فرمانروایان دلی کے جن کے نظام حکومت کو شمال کی طرف سے اکثر حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا ، نظم سلطنت اور تُر امن ترقی کے لیے زیادہ مواقع حاصل تھے ، غرض ہندو مسلمانوں کے باہمی محبت آمیز تعلقات ، سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کی کثیر تعداد کی تقرری ، دفاتر سرکاری میں ہندی کا استعمال ، عام رواداری اور فراخ دلی ، یہ اسباب ہے ، جن کی اثر سے دکنی زبان کو غیر معمولی اشاعت و ترقی ہوئی ، اور اُس نے بہت جلد ادبی حیثیت اختیار کرلی ، جنوبی ہند میں صوفیوں کی موجودگی نے اور بھی تحریک پیدا کر دی ، یہ لوگ مذہبی اور قومی تعصبات سے آزاد تھے ، عوام تک پہونچنے کے لیے وہ دیسی زبان کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے ، ان میں سے اکثر شاعر تھے ، اور دیسی زبان میں عوام کے خیال سے شعر لکھتے تھے -

فاضل مصنف نے اُردو نثر کے مختلف مدارج ترقی پر بھی محققانہ نظر ڈالی ھے تعجب کی بات ھے ، کہ باوجود اُس کے کہ شاعری کا بازار چاروں طرف گرم تھا ، اور اُردو نثر کی ترقی صحیح معنوں میں حکومت برطانیہ کے تسلط تک رکی رھی ، یعنی جب تک انگریزوں نے اغراض حکومت کے لیے ملکی زبان کی اشاعت و ترقی

کی طرف خاص توجہ نہیں کی ۔ اس وقت تک اردو نثر کو خاص علمی یا ادبی حیثیت حاصل نہیں تھی ، صرف نثر مرصع ، نثر مسجع اور نثر عاری کا رواج تھا ، جن میں بجز لفظی تکلف اور آرائش کے اور کچھ نہ ہوتا تھا ، یہ نثر نہ تھی ، بلکہ نثر کے پردے میں ایک قسم کی شاعری تھی ، اس کی وجہ جیسا کہ فاضل مصنف نے بتلائی ہے ، یہ بھی کہ در حقیقت وہ دور شاعری کا تھا ، فارسیت کا مذاق چاروں طرف پھیلا ہوا تھا ، یہاں تک کہ خط و کتابت بھی عام طور پر فارسی میں ہوتی تھی ، کتابوں کے مدحیہ دیباچے ، تنقیدیں اور تبصرے ، یا شعرا کے تذکرے جو لکھے جاتے تھے ، ان کی زبان فارسی ہی ہوتی تھی ، شاعری گھر گھر پھیلی ہوئی تھی ، یہاں تک کہ اکثر خطوط نظم میں لکھے جاتے تھے ، شاعر ہونا فضل و علم کا ضروری جزو سمجھا جاتا تھا ، غرض شاعری کے ہنگامہ آرائیوں میں اردو نثر کی آواز دب کر رہ گئی تھی ، اور کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا -

اردو نثر کی ابتدائی تصنیف عام طور پر دہ مجلس حیال کی جاتی ہے ، جس کو فضلی نے سنہ ۱۷۳۲ع میں محمد شاہ کے زمانے میں لکھا تھا ، یہ فارسی کی کتاب روضۃالشہدا کا ترجمہ تھا ، اس کے علاوہ دوسری قابل ذکر تصنیف نو طرز مرصع ہے ، یہ امیر خسرو کے قصۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے ، اس کی تکمیل میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے سنہ ۱۷۹۸ع میں نواب شجاع‌الدولہ فرمانروائے اودھ کے عہد حکومت میں کی تھی ، لیکن جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے ، موجودہ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو نثر کی بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی ، چنانچہ محققین کو جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے ، اس سے اردو نثر کی تاریخ کا آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہونا معلوم ہوتا ہے ،

جو نثر کے قدیم نمونے دستیاب ہوئے ہیں، وہ سب مختصر رسالے ہیں، جن میں گجرات اور دکن کے فقرا، درویشوں اور صوفیوں کے حکیمانہ اقوال و امثال درج ہیں، یہ رسالے زیادہ تر مذہبی کتابوں کے ترجمے ہیں، جو اگرچہ علمی حیثیت نہیں رکھتے، تاہم ان سے اس زمانے کی زبان کی نوعیت کے متعلق بہت کچھ واقفیت حاصل ہو سکتی ہے، شیخ عین الدین گنج الاسلام المتوفی سنہ ۷۰۵ ھ کے مذہبی رسائل، معراج العاشقین، جس کو خواجہ بندہ نواز حضرت سید گیسو دراز نے نشاط العشق سے ترجمہ کیا تھا، جال ترنگ، گلباس، مرلیہ شاہ میرانجی شمس العشاق ساکن بیجا پور وغیرہ اس زمانے کے انداز تحریر کے قابل اعتنا نمونے ہیں۔

لیکن جیسا کہ لائق مصنف نے تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے، موجودہ اُردو نثر کی حقیقی تاریخ کا مطلع انیسویں صدی کا آغاز ہے، جب کہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو صحیح طور پر "بابائے نثر اردو" کہے جاتے ہیں، فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے صدر یا پرنسپل تھے، ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے، اور سنہ ۱۷۵۹ع میں بمقام ایڈنبرا پیدا ہوئے تھے، سنہ ۱۷۸۳ع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے طبی مشیر کی حیثیت سے ہندوستان آئے، اور یہ محسوس کیا کہ اُصول حکومت کے لحاظ سے انگریز افسروں کے لیے بہ نسبت فارسی کے ہندوستانی زبان کے سیکھنے کی ضرورت زیادہ تھی، چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے خود اپنا قدم اُٹھایا، اور دیسی لباس پہن کر مختلف صوبوں کی سیر و سیاحت کی جہاں ہندوستانی بہترین صورت میں مستعمل تھی، اور دیگر مشرقی زبانوں، فارسی، سنسکرت وغیرہ پر بھی کافی عبور حاصل کیا، ڈاکٹر موصوف کی کامیابی نے کمپنی کے ملازمین میں ایک نئی روح پھونک دی اور ہندوستانی زبان کے مطالعہ

کي طرف عام توجه پیدا هو گئی ؛ لارڈ ولزلی نے اس تحریک کی اهمیت محسوس کرکے کمپنی کے خزانے سے ڈاکٹر موصوف کي نهایت فیاضي کے ساتهه مالي امداد کی اور سنه ۱۸۰۰ع میں برٹش عهده داروں کو ملکي زبانوں کي تعلیم دینے کي غرض سے ان کو فورٹ ولیم کالج کي پرنسپلی پر مقرر کر دیا ؛ جهاں انهوں نے رہ کر هندستانی زبان کی اشاعت و ترقي میں غیر معمولی سرگرمی سے کام لیا اور خود بهی هندستاني زبان میں قواعد ؛ علم اللسان ؛ لغت وغیره پر متعدد کتابیں تصنیف کیں ، کالج میں أن کي سعی و کوشش کي بدولت هندستاني اهل فن کا ایک مستقل گروه جمع هو گیا تها ، جو ان کی نگرانی میں اردو هندی کی ترقي میں سر گرم عمل تها ، ان میں سے چند قابل ذکر افراد کے نام یه هیں ، میر امن دهلوي ، میر بهادر علی حسینی ، سید حیدر بخش حیدري ، کاظم علي جوان ، مرزا لطف علي ولا ، حفیظالدین احمد ، اکرام علی خاں ، للو جي لال ؛ بینی نرائن ؛ مرزا علی لطف -

علاوه ان دعاوي اهل فن کے اس دور میں کچهه ایسے ارباب فضل و کمال پیدا هوئے ؛ جن کي بدولت اردو میں مذهبی لٹریچر کا اضافه هوا ؛ مثلاً شاه ولی‌الله رحمةالله علیه کے خلف ثانی شاه رفیع‌الدین نے قرآن مجید کا پہلا ترجمه أردو زبان میں کیا ؛ مولوی شاه عبدالقادر نے سنه ۱۲۰۵ھ میں سلیس اور با محاوره زبان میں دوسرا ترجمه کیا ؛ مولوي اسمعیل دهلوی نے اکثر کتابیں أردو میں تصنیف کیں ؛ جن میں سب سے زیاده مشهور تقویت الایمان هے -

علاوه تصانیف و تراجم کے اس زمانے میں لغت اور قواعد زبان پر بهي اکثر کتابیں عالم وجود میں آئیں ، چنانچه فاضل مصنف نے

اکثر سورویس ارباب قلم کا تذکرہ کیا ہے ' جنہوں نے اس میدان میں خاص سرگرمی سے کام لیا -

عیسائی مبلغین کی جد و جہد سے اردو لٹریچر کو جو فائدے حاصل ہوئے ' ان کا بھی تذکرہ فاضل مصنف نے کیا ہے ' جس سے اندازہ ہوتا ہے ' کہ ان مبلغین نے اردو کی توسیع و اشاعت میں کس حد تک حصہ لیا ' مرزا محمد فطرت نے انجیل جدید کا ترجمہ اردو میں کیا تھا ' جو کلکتے میں سنہ ۱۸۰۵ع میں شائع ہوا تھا ' ریورنڈ ہنری مارٹن نے سنہ ۱۸۱۴ع میں بوتالی سے اس کو اردو میں منتقل کیا ' سیرام پور کے مبلغین نے سنہ ۱۸۱۹ع سے لے کر سنہ ۱۸۱۹ع تک اس تین سال کے زمانے میں پوری انجیل کا ترجمہ کر ڈالا -

اردو نثر کے ابتدائی مراحل ارتقا کا یہ اجمالی خاکہ ہے جس کو فاضل مصنف نے پیش کیا ہے ' اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں ' کہ نہ صرف قابل قدر معلومات یکجا جمع کر دیے گئے ہیں بلکہ ان حالات و اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جنہوں نے اردو نثر کو ابتدا میں خاص طور پر متاثر کیا ' اور یہی اس تذکرے کی نمایاں خصوصیت ہے -

اس کے بعد فاضل مصنف نے غالب اور سر سید کے دور کی خصوصیات پر تبصرہ کیا ہے ' جو در اصل اردو نثر کی معراج ترقی کا زمانہ ہے ' یعنی اردو زبان اس قابل ہوئی ' کہ اس میں سنجیدہ علمی اور ادبی تصانیف کی جا سکیں ' اس دور کی ممتاز ترین ہستیاں جنہوں نے اردو کو قدیم طرز انشا کے مہمل اور غیر ضروری تکلف و آرائش سے پاک کرکے علمی اور ادبی زبان بنایا سر سید ' آزاد ' حالی ' نذیر احمد ' شبلی ' محسن الملک ' چراغ علی ' سید علی بلگرامی ' سجاد حسین

بلگرامی ، عزیز مرزا ، وغیرہ ہیں ، جن کی خصوصیات انشا پردازی پر فاضل مصنف نے نکتہ شناسی کے ساتھہ ریویو کیا ہے ، غالب کو آج دنیا عام طور پر صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے ، لیکن فاضل مصنف کی یہ رائے بالکل صحیح ہے ، کہ جس بنیاد پر ان بزرگان فن نے اردو نثر کی فلک بوس عمارتیں تعمیر کیں ، اس کا بانی اول در اصل یہی یگانۂ روزگار تھا ، جس کے رقعات کے انداز تحریر کی سادگی ، روانی اور سلاست نے اردو نثر میں ایک جدید رنگ کی شاہ راہ کھول دی ، جس کا اثر حالی ، آزاد ، سر سید وغیرہ کے طرز تحریر میں نظر آتا ہے -

اس دور میں اُردو نثر کو جو غیر معمولی ترقی اور اشاعت حاصل ہوئی ، فاضل مصنف نے اس کے اسباب پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے ، مثلاً سید احمد دہلوی کی مذہبی اصلاحات اور اُن کے موافقین اور مخالفین کی باہمی بحث آرائیاں ، جن کی وجہ سے اکثر مذہبی رسائل اور کتابیں وجود پذیر ہوئیں ، چونکہ ان کا مقصد عوام کے دل و دماغ کو متاثر کرنا تھا ، اس لئے سادہ اور سلیس طرز تحریر اختیار کی گئی ، دوسرے سامان طبع کی فراہمی نے کتابوں کی تصنیف و تالیف میں خاص تحریک پیدا کر دی ، علاوہ اس کے اخبارات اور رسائل بھی عالم وجود میں آنے لگے ، سنہ ۱۸۳۲ع میں دفاتر سرکاری کی زبان بجائے فارسی کے دیسی زبان قرار دی گئی ، جس کی وجہ سے اردو کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی ، لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے اردو لٹریچر کو متاثر کیا ، وہ دلی کالج کا وجود تھا ، جس نے نذیر احمد ، آشوب ، آزاد ، حالی ، ضیاءالدین ، ذکاءاللہ ایسے افراد کامل پیدا کئے ، جو جدید اردو لٹریچر کے بانیان خاص میں شمار کئے جاتے ہیں ، دلی

کالج میں پہلے سے علاوہ مشرقی تعلیم کے مغربی علوم و فنون کی بھی تعلیم کا محکمہ قائم تھا سنہ ۱۸۲۷ع میں ایک انگریزی کلاس خاص طور پر قائم کیا گیا، اگرچہ اُس وقت انگریزی زبان کے خلاف ایک عام تعصب کا جوش پھیلا ہوا تھا، تاہم اس کا خیر مقدم امید افزا تھا، چنانچہ سنہ ۱۸۳۱ع میں تقریباً تین سو طلبہ اس کلاس میں داخل ہوئے، اور رفتہ رفتہ انگریزی لٹریچر کے مطالعہ کا شوق عام ہوتا گیا، اور طبیعتیں لفظی صناعیوں اور تکلف آرائیوں سے ہٹ کر سادگی، روانی، سلاست، اور حقیقت سنجی کی طرف مائل ہو گئیں، جو اس دور کا خاص کارنامہ فخر و امتیاز ہے، سنہ ۱۸۴۲ع میں ایک علمی انجمن قدیم دلی کالج سے متعلق قائم کی گئی، جس کے روح و رواں پروفیسر رام چندر اور امام بخش صہبائی تھے۔ اس انجمن کی بدولت اکثر کتابیں شایع ہوئیں، جن میں سے زیادہ تر انگریزی تصانیف کے ترجمے تھے، ان تراجم کی اشاعت نے اردو طرز انشا کو سادہ، اور تصنیفی حیثیت سے کار آمد بنانے میں بہت زیادہ مدد دی، سنہ ۱۸۶۴ع میں ایک دوسری علمی انجمن دلی میں وجود پذیر ہوئی، جس کے فاضل سکریٹری رائے بہادر ماسٹر پیارے لعل آشوب تھے، اس انجمن کی جد وجہد سے بھی اردو لٹریچر کو معتدبہ فائدہ پہونچا، غرض یہ اسباب تھے، جنھوں نے اردو لٹریچر کو اس قابل بنا دیا، کہ آج اس میں علمی، ادبی اور تاریخی تصانیف کا ایک گراں قدر ذخیرہ نظر آتا ہے۔

فاضل مصنف نے سر سید، آزاد، حالی، شبلی، نظیر احمد وغیرہ کی خصوصیات انشاپردازی پر جو اظہار رائے کیا ہے، ارادہ تھا، کہ اس پر ذرا تفصیل کے ساتھ ریویو کرتا، لیکن افسوس ہے، کہ

طوالت کے خوف سے اس وقت اس فرض کو انجام نہیں دے سکتا ۔ لیکن اتنا عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا ، کہ علامہ شبلی کے انداز تحریر کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ۔ اگر چہ وہ صحیح ہے ' لیکن علامہ مرحوم کی انشا پردازانہ حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت زیادہ مختصر اور نا کافی ہے ۔ سر سید نے بیشک طرز جدید کے بانی خاص تھے ۔ لیکن ان کا طرز تحریر ضرورت سے زیادہ خشک ہے ۔ یہی حال حالی کا بھی ہے ۔ آزاد میں ضرورت سے زیادہ رنگینی ہے ، اور جیسا کہ فاضل مصنف نے لکھا ہے ۔ اپنے رنگ خاص میں بے مثل ہیں ۔ لیکن وہ رنگینی سنجیدہ علمی مضامین کے لیے موزوں نہیں ۔ نظیر احمد کو زبان پر بے شبہ قدرت تھی ' لیکن اکثر عامیانہ محاورے اور مبتذل فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں ۔ لیکن شبلی کا انداز تحریر " آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری " کا مصداق ہے ، افسوس ہے ، کہ فاضل مصنف نے مولانا کے اس وصف جامعیت کو بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ اس کے لیے تفصیلی موازنہ اور مثالوں کی ضرورت تھی ۔ غالباً اختصار کے لحاظ سے فاضل مصنف نے اس طرف توجہ نہیں کی ، تاہم بحیثیت ناقد کے ان کا یہ ایک ضروری فرض تھا ۔ یعنی پہلے یہ دکھاتے کہ انشا پردازی کی اصلی خصوصیات کیا ہیں ' اور پھر اس پر نظر ڈالتے ، کہ وہ خصوصیات کس میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں ۔ اس تفصیل سے صاف ظاہر ہو جاتا ، کہ شبلی کا طرز تحریر در اصل اردو انشا پردازی کی معراج ہے ۔

موجودہ اردو انشا پردازی میں جیسا کہ فاضل مصنف نے دکھایا ہے ۔ دو خاص جدید انداز نظر آتے ہیں ۔ ایک تو وہ رنگ ہے ۔ جس کی ابتدا مولانا ابوالکلام آزاد نے کی ۔ یعنی بڑے بڑے

پُر شکوہ عربی اور فارسی الفاظ اور طویل ترکیبوں کا استعمال ، لیکن ابوالکلام کو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے ، اس لیے ان کا طرزِ تحریر اِن معائب سے محفوظ رہا ، جو عام طور پر ان کی رنگ کی نقالی کرنے والوں میں نظر آتے ہیں ، اس رنگ کی پیروی کے لئے ذوقِ صحیح اور خاص قابلیت کی ضرورت ہے ، جو ہر شخص کا حصہ نہیں ، اس کے جواب میں کچھ لوگوں نے ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور ہندی الفاظ کی بھرتی شروع کر دی ؟ لیکن خوش قسمتی سے اردو لٹریچر کے اس قسم کے بہی خواہوں کی تعداد نہایت محدود ہے ۔

دوسرا انداز "تخئیلی نثر" کا ہے ، جس کو بعض اوقات "ٹیگورین انداز" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ، یہ صرف نثر نما شاعری ہے ، جس میں صرف خوبصورت اور پُر شکوہ الفاظ کی نمایش ہوتی ہے ، جو اکثر ابتذال کی حد تک پہونچ جاتی ہے ، مجھ کو فاضل مصنف کے اس رائے سے بالکل اتفاق ہے ، کہ یہ دونوں انداز اردو لٹریچر کے صحیح نشو و نما کے لئے مناسب نہیں ، ہر شخص ٹیگور اور ابوالکلام نہیں ہو سکتا ، اور نہ ہر بڑے آدمی کی خوامخواہ تقلید ضروری ہے ، ہمارے نزدیک اردو انشا پردازی کا بہترین نمونہ جس کی تقلید سے اردو لٹریچر کو گراں بہا فائدے پہونچ سکتے ہیں ، وہی انداز تحریر ہے ، جس کی بنیاد سر سید نے رکھی تھی ، اور جس کو شبلی کے معجز نگار قلم نے اُٹھاکر آسمان تک پہونچا دیا اعتدال ہر چیز کے حسن کا اصلی راز ہے ؟ اس لیے ہمارے خیال میں اردو انشا پردازی کو ان دونوں انداز کے افراط و تفریط سے محفوظ رکھنا بہی خواہان اردو کا سب سے مقدم اور ضروری فرض ہے ۔

اس سلسلے میں فاضل مصنف نے قدیم اُردو صحافت کا بھی تذکرہ

کہا ہے ' جس سے ظاہر ہوتا ہےکہ سنہ ۱۸۳۸ع میں آزاد کے والد باقر حسین نے دلی سے اُردو اخبار'' کے نام سے ایک اخبار نکلا' جس میں زیادہ تر علمی اور ادبی بحثیں رہتی تھیں اور ذوق' مومن' غالب وغیرہ کی غزلیں شایع ہوتی تھیں سنہ ۱۸۵۰ع میں منشی ہر سکھہ رائے نے لاہور سے کوہ نور کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار کی بنیاد ڈالی' جس نے غیر معمولی اشاعت حاصل کی' بعد کو ہفتے میں دوبار اور سہ بار شائع ہونے لگا اس کے بعد مختلف مقامات سے متعدد اخبار نکلنے شروع ہوئے' جن میں اودھہ اخبار کو خاص اہمیت حاصل ہے' جس کو منشی نول کشور نے سنہ ۱۸۵۹ع میں جاری کیا تھا۔ اُس میں انگریزی جرائد کے اقتباسات اور خبروں کے ترجمے زیادہ تر شایع ہوتے تھے' سنہ ۱۸۷۷ع میں سر زمین لکھنؤ سے اودھہ پنچ کا طلوع ہوا جس کی اشاعت نے اُردو لٹریچر اور صحافت کو خاص طور پر متاثر کیا' یہ خاص طور پر ظریفانہ پرچہ تھا' جس کی زبان نہایت صاف' سادہ اور سستہ تھی' سنہ ۱۸۸۳ع میں ایک دوسرا اخبار ''ہندستانی'' نامی لکھنؤ سے شائع ہوا۔ جس میں مسائل حاضرہ اور سیاسیات پر سنجیدہ بحثیں شایع ہوتی تھیں' سر سید کے قائم کردہ اخبار انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق ادبی اور علمی خدمت کے لحاظ سے خاص عظمت کے مستحق ہیں' سنہ ۱۸۸۷ع میں پیسہ اخبار وجود پذیر ہوا' جس کی اشاعت نے اردو صحافت کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا' علاوہ اُس کے فاضل مصنف نے موجودہ زمانے کے جرائد ادبیہ پر بھی ایک سر سری نظر ڈالی ہے' ضرورت تھی' کہ اس موقعے پر ان رسائل کو اُن کے ادبی فرائض سے ذرا آگاہ کر دیا جاتا' کیونکہ صحیح ذوق ادب کی اشاعت بہت

کچھ اِنھیں کی فرض شناسی پر منحصر ہے، لیکن افسوس ہے، کہ فاضل مصنف نے اس کو نظر انداز کر دیا، ممکن ہے، کہ آیندہ کے لیے اٹھا رکھا ہو۔

ناول اور افسانہ نگاری کے دور پر ریویو کرتے ہوئے فاضل مصنف نے دکھایا ہے، کہ اُردو کے قدیم افسانے زیادہ تر ایرانی افسانوں سے ماخوذ ہوئے تھے، مثلاً الف لیلہ، داستان امیر حمزہ صاحب قرآن، طلسم ہوشربا، بوستان خیال، حاتم طائی، کے قصے، باغ و بہار وغیرہ جن میں سحر دیووں، جادوگروں اور پریوں کے مافوق الفطرت واقعات اور دور از کار تخیلات کی سحر کاریوں کے سیرت نگاری، جذبات صحیح کی ترجمانی اور واقعیت کا عنصر نہایت کم ہوتا تھا، مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب اور دیگر مختصر افسانے لکھ کر کسی قدر ناول کو ترقی دی لیکن اُن کا سرمایۂ خیال بھی وہی قدیم افسانے تھے، علاوہ اس کے زبان میں غیر معمولی تصنع و تکلف تھا، جو افسانہ نگاری کے لیے کسی طرح مناسب نہیں، ڈپٹی نذیر احمد نے البتہ جدید افسانہ نگاری کے میدان میں ایک بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، چنانچہ ان کے افسانوں میں بجائے حیرت انگیز اور مافوق الفطرت واقعات کے موجودہ زمانہ کے تہذیب وتمدن، اور اخلاق و عادات کی تصویر نظرآتی ہے، زبان کی سادگی اور شیرینی، انداز بیان کی دلاویزی اور لطافت نے اُن کے فسانہ طرازی میں خاص حُسن پیدا کردیا ہے، سجاد حسین، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق کی خدمات بھی اس میدان میں کچھ کم قابل قدر نہیں ہیں، لیکن اس وادی کے اصلی ہیرو پنڈت رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرر ہیں، جنھوں نے موجودہ مذاق کے رو سے اس فن کو غیر معمولی

ترقي دي' چنانچه ان کے افسانوں اور ناولوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں' جو جدید انداز کے لحاظ سے ناول کے لیے ضروري ہیں یعني ایک متعین پلاٹ ہو' اس کے مختلف کیرکٹر ہوں' ہر کیرکٹر کی خصوصیات علیحدہ اور متعین ہوں' واقعات میں باہم ربط اور تسلسل ہو' جو حالات بیان کئے جائیں' وہ خلاف قیاس اور فطرت انساني کے منافي نہ ہوں' مشاہدہ صحیح اور عام تجربات زندگي پر مبني ہو' انداز بیان دریسان گوئي اور بے راہہ روي سے پاک ہو' زبان صاف' سادہ اور شیریں ہو' شرر نے تاریخي ناولوں کا اضافہ کر کے ایک قابل قدر ادبي خدمت انجام دي' محض شوقیانہ گپ ربي اور بازاري قصوں سے کوئي نتیجہ نہیں' ہمارے نزدیک ناولوں میں اخلاقی پہلو کا لحاظ ضروری ہے -

دور حاضر میں بھي افسانہ نگاروں کی کمي نہیں ہے' لیکن جیسا کہ لایق مصنف نے لکھا ہے' ان میں سب سے زیادہ ممتاز منشي پریم چند کا وجود ہے' جن کے مختصر افسانے انداز بیان کي دلکشي' زبان کی سادگي' ترکیبوں کي فصاحت' واقعات کی مصوّري' جذبات کي اندازہ شناسي کے لحاظ سے غیر معمولي قدر و عظمت کے مستحق ہیں' ہمارے لائق دوست نے لکھا ہے' کہ اُردو دان طبقہ کي بے اعتنائی اور ناقدر شناسی کي وجہ سے منشي پریم چند' کی توجہ حال میں ہندي کي طرف مبذول ہوگئي ہے' اگر یہ صحیح ہے' تو ہم کو نہایت افسوس ہے' اور یقیناً یہ اُردو لٹریچر کي بدقسمتي ہے' اگر ہم اس یگانۂ فن کے ادبي احسانات کے اعتراف سے گریز کریں' لیکن ہمکو منشي پریم چند کي عالي حوصلگي سے توقع ہے' کہ وہ چند

نا اہلوں کے عدم اعتراف سے متاثر ہو کر اُردو کو فراموش نہ کرینگے ۔

نیاز فتحپوری کی "نثر نما شاعری" پر لایق مصنف نے جو اظہار خیال کیا ہے ' وہ صحیح ہے ' یعنی یہ معلوم ہوتا ہے ' کہ کوئی شخص خوامخواہ بلا وجہ تکلف کررہا ہے ' تصنع و تکلف خواہ نثر میں ہو یا نظم میں ' تمام ادبی لطافت کو خاک میں ملا دیتا ہے ' فاضل مصنف نے نیاز صاحب کو کسی قدر تہذیب و اصلاح کا مشورہ دیا ہے ۔

اُردو ڈراما کے مختلف مراحل ارتقا پر بھی فاضل مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے ؟ جس سے ظاہر ہوتا ہے ؟ کہ اُردو ڈراما کی بنیاد "اندر سبھا" کے زمانے سے قائم ہوئی ؟ جس کو ناسخ کے شاگرد امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش سے لکھا تھا ؟ لیکن یہ صحیح معنوں میں ڈراما نہ تھا ؟ بلکہ محض نوابین اودھ کی عیش پرستی ؟ اور اوباشانہ طرز زندگی کا نقشہ تھا ؟ تاہم عوام میں بہت زیادہ مقبول ہوا ؟ اور یہاں تک شہرت حاصل کی کہ جرمن زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا ؟ جو تمام لبرگ سنہ ۱۸۹۲ع میں شایع ہوا ؟ طالب بنارسی اور احسن لکھنوی نے ڈراما کے عام لہجے اور زبان میں بہت زیادہ اصلاح کی ؟ اب گفتگو کے لیے بجائے اشعار کے مقفی فقرے استعمال کیے جانے لگے ؟ اندر سبھا میں گفتگو تک اشعار میں ہوتی تھی ؟ بیتاب دہلوی نے راماین اور مہا بھارت لکھکر اس زمین کو اور بلند کیا ؟ جس کو آگے چل کر آغا حشر کے نکتہ رس دماغ نے اُٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا ' اور اُردو ڈراما میں انگریزی ڈراما کے خصوصیات کی جھلک نظر آنے لگی ' لیکن اب بھی اُردو ڈراما بہت کچھ اصلاح و ترقی کا محتاج ہے ' ابھی تاریخی ' سوشل اور علمی ڈراموں کی کمی ہے ۔

مجھہ کو فاضل مصنف کے ان خیالات سے اتفاق ہے، کہ ڈراما لٹریچر کی ایک اہم شاخ ہے، اس سے قوم اور ملک کی اصلاح میں بہت کچھہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اُردو ڈراما کی توسیع و ترقی کے لیے ضروری ہے، کہ یوروپین ڈراما کے بہترین شاہکار اور نمونے ترجمہ کے ذریعہ سے منظر عام پر لائے جائیں، تا کہ لوگوں کو اس امر کا صحیح طور پر اندازہ ہو جائے کہ ڈراما کے عناصر اصلی کیا ہیں، لیکن ہمارے لائق دوست کی اس رائے کا تسلیم کرنا مشکل ہے کہ "پردے کا وجود اُردو ناول اور ڈراما کی ترقی کے لیے سد راہ ہے۔ کیونکہ جب تک مرد و عورت میں باہمی اختلاط کی آزادی نہ ہو۔ اُس وقت تک صحیح جذبۂ عشق کا امکان نہیں، جس کی ڈراما میں ضرورت ہے" یہ ایک طویل بحث ہے۔ جس کو ہم اس موقعے پر چھیڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ کہ مرد و عورت کا وہ آزادانہ اختلاط جس کو لایق دوست ڈراما کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، کس قسم کا ہونا چاہیے۔ اگر اس سے وہ آزادی مقصود ہے۔ جو مغرب کی جنس لطیف کو حاصل ہے۔ تو ہم اس قسم کے آزادانہ اختلاط کے خیر مقدم کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جس سے اخلاق کا آئینہ غبار آلود ہو جائے۔ اور نہ ہمارے نزدیک ناول اور ڈراما کی ترقی کے لیے اس قسم کی بے باکانہ راہ و رسم ضروری ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے تبصرے کے آغاز میں یہ تسلیم کیا ہے۔ کہ قدیم ہندوستان میں ڈراما غیر معمولی ترقی کے درجے تک پہونچ چکا تھا۔ جیسا کہ سنسکرت کے ڈراموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا اُس زمانے میں مرد و عورت کی اخلاقی حالت اسی قدر پست تھی، جیسا کہ یوروپ میں نظر آ رہی ہے۔ میں پردے کی موجودہ ضرورت سے زائد سخت بندشوں میں کچھہ ترمیم ضرور چاہتا ہوں۔ لیکن جنس لطیف کو مغربی خواتین کا پیام آزادی دے کر اُس کے آبگینۂ عصمت کو جو اس

کی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے، ٹھکرانا نہیں چاہتا۔

آخری باب میں اُردو لٹریچر کی عام ترقی اور کارناموں پر نظر ڈالتے ہوئے فاضل مصنف نے حق شناسانہ الفاظ میں اُردو زبان کی عام صلاحیت اور دیگر محاسن کا تذکرہ کیا ہے، وہ یہ ہیں —

"اُردو زبان میں مسلمہ طور پر بہت زیادہ وسعت، شیرینی اور لطافت ہے، یہ علم اور تہذیب کی زبان ہے، جس میں ہر قسم اور ہر رنگ کے خیالات اور احساسات کے ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

"قومی ترقی و اصلاح کے موجودہ دور میں اُردو جو ہندو مسلم اتحاد کا نشان ہے اس کی اہمیت کو گھٹایا نہیں جا سکتا۔"

"اُردو صحیح معنوں میں ہندوستان کی عام مشترک زبان ہے، کیونکہ تمام ہندوستان میں اور ان مقامات میں بھی جہاں اُردو بولی نہیں جاتی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔"

یہ تنقید کسی قدر ضرور طویل ہو گئی، لیکن تصنیف زیر بحث کی حیثیت اسی کی مقتضی تھی، لیکن پھر بھی حقیقت یہ ہے، کہ اکثر مواقع پر مجھ کو اختصار سے کام لینا پڑا، تاہم جو کچھ عرض کر سکا، وہ غالباً اس تصنیف کی نمایاں خصوصیات کو بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہو، یہ تو ممکن نہیں، کہ کوئی تصنیف ہر قسم کے معائب اور فروگذاشتوں سے قطعاً پاک ہو، یا مصنف کی تمام رائیں مان لینے کے قابل ہوں، لیکن جہاں تک موجودہ انداز تحقیق و تنقید کا تعلق ہے، اِس کتاب کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

رسید کتب :-

سلطان شہید — مصنفۂ محمود خاں محمود بنگلوری
قیمت ۱۲ آنہ -
محمود خاں نمبر ۹۴ بلاکیلی روڈ کنٹونمنٹ بنگلور
اس میں سلطان ٹیپو شہید کے حالات زندگی، ان کے
جنگی، علمی اور سیاسی کارناموں کا تذکرہ ہے - چاہتا
ولولہ خیز نظمیں بھی درج ہیں -

شوپنہار — دفتر ایوان اشاعت گورکھپور - قیمت ۱ روپیہ
۸ آنہ -
جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہار کے حالات زندگی اور
اس کا فلسفہ از جناب احمد صدیق مجنوں -
بی، اے -

زہر عشق — ایوان اشاعت گورکھپور مرتبہ احمد صدیق
مجنوں گورکھپوری - قیمت ۱ روپیہ ۸ آنہ -
نواب مرزا شوق کی مشہور و معروف مثنوی کو جناب
احمد صدیق مجنوں گورکھپوری نے ایک عمدہ مقدمہ
کے ساتھ شائع کیا ہے -

تذکرۂ مشاہیر کاکوری — مطبع اصح المطابع، وکٹوریہ
اسٹریٹ، لکھنؤ - قیمت درج نہیں ہے - مولفہ مولوی
حافظ علی حیدر صاحب علوی کاکوروی -
اس میں کاکوری کے علما - فقرا، شعرا اور مشاہیر اُمرا کے
نثر و نظم و کلام کے انتخابات اور اُن کے تاریخی
حالات درج ہیں -

تلاش حق جلد اول و دوم — جامعۂ ملیۂ اسلامیہ پریس
قرول باغ دهلي - قیمت فی جلد ۱ روپیه -
مہاتما گاندھی کي خود نوشته سوانحعمري - مترجمه ڈاکٹر
سید عابد حسین ' ایم - اي - پي - ایچ - ڈي -

ھندستانی فونٹیکس (بزبان انگریزی) —
مطبوعه ٹیرس ' دارالاشاعت مکتبۂ ابراهمیه امداد
باهمي - اسٹیشن روڈ ' حیدرآباد دکن - مصنفۂ ڈاکٹر
محي الدین قادري زور ایم - اے - بي - ایچ - ڈي -
قیمت ۲ روپیه ۸ آنه -
حیدرآباد کی اردو صوتیات پر مغربي انداز میں لکھي
گئی ھے -

گلشن گفتار — دارالاشاعت مکتبۂ ابراهمیه امداد باهمي
اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن -
مصنفۂ خواجه خان حمید اورنگ آبادي -
یه شعراے اردو کا قدیم ترین تذکرہ ھے جسے سید محمد '
ایم - اے نے ترتیب دیا ھے -

دولت غزنویه — مولفه مولانا محمودالرحمن ندوي
قیمت ۳ روپیه -
شیخ علي بخش ' احمد بخش ' مالکان کتب خانه دارالادب
اندرون بھاٹي دروازہ ' لاھور -
سلطان محمود غزنوي اور اُس کے جانشینوں کے دیني اور
علمي کارنامے اور غلط فهمیوں کا ازاله -

اداریہ

ہندستانی اکیڈیمی کے اراکین اور ممبروں کا انتخاب اگر چہ بالکل سرکاری طور پر ہوتا ہے، تاہم اِس کے اراکین یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ کسی علمی و ادبی ادارے کا سرکاری حیثیت میں محدود و مقید رہنا اُس کی حقیقی ترقیوں کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہے، ملکی علم و ادب مشترکہ طور پر اہل ملک کی چیز ہے اور وہ اِس دولت عامہ و ملکیت مشترکہ پر اِسی طرح کا حق رکھتے ہیں جس طرح اکیڈیمی کی یہ کارکن جماعت، اِس لیے ہندستان اور خصوصاً صوبہ متحدہ کے تمام ارباب علم و فضل سے سررشتہ تعلقات قائم رکھنے اور اُن کے مفید مشوروں سے اکیڈیمی کو مستفید بنانے کی غرض سے اکیڈیمی کی مجلس منتظمہ نے یہ تجویز کی کہ اکیڈیمی کی جانب سے ایک سالانہ ادبی کانفرنس منعقد کی جائے جس میں اردو اور ہندی کے ماہرین علم و ادب یکجا ہو کر دونوں زبانوں کے وسائل ترقی پر تبادلۂ خیال کریں اور اِس طرح باہمی تجربہ اور مشورے سے ملکی لٹریچر کی اصلاح و ترقی کا کام انجام پائے، لوگوں میں علمی بیداری اور ادبی مذاق پیدا کرنے کے لیے مشاہیر ادب کو مختلف مباحث و موضوعات پر مضامین لکھنے اور تقریر کرنے کی دعوت بھی دی جایے، اور اکیڈیمی جن لکچروں کا سالانہ اہتمام کرتی ہے وہ بھی اِسی کانفرنس کے زمانے میں دیے جائیں۔

چنانچہ پہلی ادبی کانفرنس سنہ ۱۹۳۰ع میں منعقد ہوئی تھی جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور انشا پردازوں نے اپنے گرانقدر علمی مقالوں سے کانفرنس کو مستفید فرمایا تھا۔ اب دوسری

ادبی کانفرنس کا انعقاد ۴ و ۵ و ۶ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع کو قرار پایا ہے اکیڈیمی کے اراکین اور کارکن جماعت نے اردو اور انگریزی اخباروں میں اعلان شایع کرائے ہیں ؛ ہندی اور اردو کے بہی خواہوں سے دعوت ناموں اور پرائیویٹ مراسلات کے ذریعہ کانفرنس میں شرکت کی درخواست کی ہے ؛ مہمانوں کے قیام و طعام اور اُن کی آسائش و مدارات کا بھی انتظام کیا ہے ۔

ہم کو کافی امید ہے کہ جو حضرات اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ کانفرنس میں شریک ہو کر اسے ضرور کامیاب بنائینگے ۔

اس سال کانفرنس میں نہایت اہم مباحث کے پیش ہونے کی امید کی جاتی ہے مثلاً تالیف و تصنیف کے باب میں اکیڈیمی کا طریق کار کیا ہونا چاہیے ؟ دوسری زبانوں سے اگر ترجمے کرائے جائیں تو اُن کی نوعیت کیا ہوگی ؟ آیا لفظی ترجمے کرائے جائیں یا اُن کے مطالب اور خلاصے پر اکتفا کیجائے ۔ مستقل تصانیف کے لیے کن امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا ۔ پھر اُن کتابوں کا درجہ ؛ انشا و ادب کے اعتبار سے کیا ہونا چاہیے ؛ علوم و فنون کی کتابوں کے لیے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ وہ طلبہ کے کام کی ہوں یا عوام اور اہل علم کے لیے ؛ اسی سلسلے میں رسم خط اور زبان کا مسئلہ بھی آجاتا ہے ۔ اصطلاحات علمیہ کے تراجم کا مسئلہ بھی اکیڈیمی کے پیش نظر ہے ۔ اس باب میں بھی اہل علم اور اختصاصین کی رائیں طلب کی جائینگی ۔

غیر ملکی الفاظ و اصطلاحات کے ترجمے کے علاوہ ایک اہم مسئلہ خود ہندستانی لفظوں کا ہے ؛ ہندستان ایک زراعتی ملک ہے مگر ہمارے ؛ شعرا اور انشا پردازوں نے اپنی تمام توجہ شہری امور کی طرف

مبذول رکھی اس لیے دیہات کی صدھا چیزیں ایسی ھیں جن کو ھم دیکھتے ھیں اور جانتے ھیں مگر صحیح طور پر اُن کے نام نہیں بتاسکتے اس میں زراعتی آلات ، بیلوں کی قسمیں، زراعتی کاروبار ، گھاسوں ، پھولوں مچھلیوں اور چڑیوں کے نام سب آ جاتے ھیں - جن لوگوں کو اُردو کی توسیع کا خیال ھے اُن کا فرض ھے کہ "لالہ و گُل" "نسرین و نسترن" سنبل و ریحان" ماھی سقنقور و ھما" کے علاوہ اُن ناموں کو بھی متعین کرلیں جن کا مسمیٰ تو ہرابر ھمارے گرد و پیش رھتا ھے مگر ھمارے پاس الفاظ نہیں ھوتے جن سے اُن کو پکار سکیں -

ھمیں اُمید ھے کہ کانفرنس اس مسئلہ میں اکیڈیمی کی خاص طور پر رھنمائی کریگی -

---

ھندستانی کے پہلے نمبر میں نظم و شعر کی بابت بظاھر کچھہ حوصلہ شکن باتیں قلم سے نکل گئی ھیں، جس سے بعض حضرات نے تو یہاں تک سمجھہ لیا کہ شاید نظم و شعر کو سرے سے رسالے میں جگہ نہ مل سکے گی ، حالانکہ اُصولاً ایسا نہ تھا البتہ "نظم و شعر" کے نام کے ساتھہ ھی دھن کے سامنے "غزل نکبت" حملہ آوروں بلکہ بلوائیوں کا ایک ھجوم نظر آیا جس سے سہم جانا ایک قدرتی امر تھا ، غزل اور غزل گوئی کو کیا کہئے کہ اپنی بھی کل کائنات یہی ھے ، لیکن یہ کیا ضرور ھے کہ اپنی غلطیوں کی رعایت سے رسالے کو بھی اس سے ، "آلودہ" و "ملوث" بنایا جائے -

من نہ کردم شما حذر بکنید

ایک محفوظ اور سنجیدہ مشورہ ھے جس کے عرض کرنے اور سننے میں طرفین کو تکلف و تامل نہ کرنا چاھیے ، بہر صورت غزل کو کہ اس میں یا وہ گوئیوں اور ھرزہ سرائیوں کا زیادہ امکان و اندیشہ ھے - مسلسل

نظموں کو بشرطیکہ وہ سنجیدہ ، شگفتہ اور ولولہ خیز بھی ہوں ہم نہایت شوق و مسرت سے رسالے میں لینے کے لیے طیار ہیں -

---

ہندستانی اکیڈیمی اردو اور ہندی میں سالانہ دو خطبوں کا اہتمام کرتی ہے، چنانچہ اس کے سال اُردو میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم - اے، پی - ایچ - ڈی صدر شعبۂ عربی و فارسی - الہ‌آباد یونیورسٹی "سامی لسانیات " پر اُردو میں اپنا مقالہ درس فرمائیں گے -

---

یونیورسٹی کے طلبہ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے اکیڈیمی نے ۵۰۰ روپیے اُردو اور ۵۰۰ ہندی کے لیے مقرر کیے ہیں یہ انعامات اِس صوبے کے اُن طلبہ کے لیے مختص ہیں جو یونیورسٹی میں تعلیم پاتے ہوں مضامین کے لیے جو موضوعات مقرر کیے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں —

(۱) کسی ادبی موضوع پر ایک مضمون -

(۲) مسلسل واقعاتی نظم -

(۳) افسانہ -

(۴) ڈراما -

(۵) طنزیات -

اِمسال اکیڈیمی نے نظم و نثر کی کتابوں پر جو انعامات دیے ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے —

(۱) "معراج سخن" پر سید خورشید حسن عروج کو ۵۰۰ روپیے -

(۲) "الدبین" پر مولانا سید سلیمان اشرف کو ۵۰۰ روپیے -

(۳) "نفسیات ترغیب" پر سید وہاج الدین کنتوری کو ۵۰۰ روپیے -

۱ — هندستانی میں جو مضامین لیے جائیں گے اُن کا معقول معاوضہ دیا جائے گا -

۲ — معاوضے کا فیصلہ مجلس مدیران کے اختیار میں ہو گا -

۳ — مضمون نگاروں کو چاہئے کہ مضامین صاف اور خوش خط حروف میں کاغذ کے ایک طرف لکھہ کر روانہ کریں -

۴ — مضمون بیس پچیس صفحے سے زیادہ نہ ہو ، اور اگر اس سے زیادہ طوالت نا گزیر ہو تو مضمون ایسے متعدد ٹکڑوں میں ہونا چاہئے جو اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت رکھتے ہوں -

مرتب

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ

جلد ۱ | جولائی سنہ ۱۹۳۱ع | حصہ ۳

* ولی کے معاصر ہاشم علی
کا
دیوان مراثی

(از مولانا سید سلیمان ندوی)

(مضمون پڑھنے سے پہلے میں معذرت کرلوں کہ یہ سفر کی حالت میں صرف ایفائے عہد کی بنا پر لکھا گیا ہے)

اُردو کی جائے پیدائش بننے کا فخر خواہ ہندستان کے کسی گوشہ کو حاصل ہو، مگر اس میں کسی شبہہ کی گنجایش نہیں کہ دکن کا ملک وہ پہلی سر زمین ہے جہاں اُردو شاعری کا بیج نصب کیا گیا، اور اس نے پودا بن کر وہاں نشو و نما حاصل کی، شمالی ہند کے رہنے والوں نے جب اس پودے کے پھول اور اُس کی بو باس کو دیکھا، تو بے ساختہ اُس کی آبیاری کو آمادہ ہوئے اور چند روز کے بعد اُس کی قلم اپنی سر زمین

* یہ مضمون اکیڈیمی کی دوسری ادبی کانفرنس منعقدہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں پڑھا گیا تھا -

میں لگا کر اُس کو سدا بہار بنا دیا؟ قائم کے زمانہ تک اُردو کو دکنی کا طعنہ سننا پڑتا تھا —

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اِک بات لچر سي بزبانِ دکنی تھي

تاریخ اُردو کي نئي تحقیقات نے یہ ثابت کیا ھے؟ کہ اُردو نظم نے دلي کے تخت طاؤسی کے بجاے مسند دکن کے زیر سایہ نشو و نما پائي سلطان قلی قطب شاہ نے ۹۱۸ ھجري میں قطب شاھي حکومت کي بنیاد ڈالی، تو بیجا پور؟ احمد نگر اور گولکنڈہ تینوں میں شیعیت اور اور تفضیلیت کي اشاعت ھوئي' ساتھہ ھی عزا اور میلاد کي مجلسیں قایم ھونے لگیں' جن میں محتشم کاسي وغیرہ کے فارسي نغموں کے ساتھہ ملک کي دیسي زبان میں بھي شاعري کا رواج ھوا -

یہ بھي اردو زبان کي تاریخی شہادتوں سے ثابت ھے کہ اُردو میں عشق و محبت کي داستان سرائیوں سے پہلے مذھبي نظموں کي ترانہ سنجي پیدا ھوئي چنانچہ سلطان قلي اور اس کے بھتیجے محمد علی قطب شاہ' اور دوسرے شعراء شجاع الدین نوري اور نصرتي نے مرثیے لکھے' لیکن غالباً مرثیوں کے صنف میں سب سے زیادہ جو شخصیت نمایاں ھے وہ ھاشم برھانپوري کي ھے -

ھاشم برھانپوري کے مجموعۂ مراثي کا نام دیوان حسیني ھے' شاہ اودھہ کے کتبخانے میں اس کا ایک نسخہ تھا' جس کا ذکر اسپر نگر کے کیٹلاگ میں ھے' آجکل آندھرا یونیورسٹي کے کتب‌خانہ میں اس کا ایک نسخہ ملتا ھے جس کا ذکر آجکل کے بعض تحریرات میں کیا گیا ھے؟ لیکن خوش قسمتي سے مارچ سنہ ۱۹۳۱ ع کے سفر پونہ میں محبي پروفیسر شیخ عبدالقادر (دکن کالج پونہ) کے کتب خانے میں اس کا مکمل

نسخہ میری نظر سے گذرا، جس سے ہاشم علی اور اس کے اس دیوان مراثی کے متعلق بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں -

ہاشم علی برہانپوری

نام کے سوا اس شاعر کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملے، جو کچھہ معلوم ہوتا ہے وہ خود اسی مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے - اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس کے آخر میں خوش قسمتی سے کاتب نے جو شاعر کا معاصر تھا، چند سطریں حوالۂ قلم کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام علی محمد خاں ہے اور ہاشم علی اس کا عجیب و غریب مرکب نام تخلص ہے، چنانچہ اس دیوان کے آخر میں ہے —

" تمام شد دیوان حسینی گفتۂ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی -"

اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی میں مرتب ہوا ہے، اس کا سال ولادت اور سال وفات نہیں معلوم مگر اُس کے اس دیوان میں اس کے ایک مرثیہ کی تمہید میں ایک فارسی عبارت ہے، جس میں مذکور ہے کہ ۲۰ رمضان ۱۱۴۸ھ کو اُس کے ہم مشرب و ہم عقیدہ دوست حافظ فضل الدین نے خواب دیکھا کہ ضریح سے صدائے غیب آئی اور ہاشم علی کو اپنے مرثیہ سنانے کی فرمایش سنائی دی، عبارت یہ ہے —

" از جملہ تفضلات امام شہید کہ برین عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ کلام ربانی، فضل الدین در عالم رویا بتاریخ بستم ماہ مبارک رمضان ۱۱۴۸ ہجری مشاہدہ نمود (ص ۷۳) -"

اس کے بعد اس دیوان میں ایک مسمط مرثیہ ہے جس کا نام شاعر نے درد نامہ رکھا ہے، اُس کے آخر میں یہ دو شعر ہیں —

جب منجم نے کیا اس درد نامہ کا حساب

عین و قاف و سین و طا آیا رقم اندر کتاب
۱۰۰۰ ۱۰۰ ۶۰ ۸ (۱۱۶۸ ھ)

سن کے یو تاریخ کوں سینہ میں دل ھوتا کباب

ختم کر ھاشم علی قاسم کی شادي کا بچن

اس لحاظ سے یہ ولي دکني کا معاصر ھے جس کا سال وفات ۱۱۵۵ ھ ھے ۔ عام طور سے ھاشم علي اس کا نام سمجھا جاتا ھے ' مگر اوپر کے اقتباس سے جو اس کی زندگی میں لکھا گیا ھے ھویدا ھے کہ اُس کا نام علي محمد خاں تھا اور "ھاشم علی" پورا اُس کا تخلص ھے ' گو یہ اسلوب تخلص شعراء کی طرز و روش کے خلاف ھے ' مگر واقعہ یہي ھے کہ یہ اس کا تخلص ھے ' نام نہیں ' چنانچہ اس کے دیوان کے ھر قصیدہ اور نظم کے آخر میں یہي تخلص آیا ھے ' مثلاً

چو طرف ھاشم علي ھے سر بسر

انقلاب و فتنۂ و آشوب و شر

بول توں بلبل صفت ھاشم علي

صبحدم میں مدح اولاد علي

زندگي دنیا کي ھے ھاشم علي خواب و خیال

جو رھا سویا وہ چوکا ' جاگتا ھیگا مثال

تجے ھاشم علي محشر میں دریائے گنہ سیتیں

بھروسا ھے وہ شہ اوپر وھاں سیں پار اُتاریگا

عام طور سے اس کو برھانپوری کہتے ھیں، شاید یہ اس کی جاے پیدایش ھو، مگر اُس کے دیوان میں ایک سعر یہ ھے :—

گجرات میں پڑي جب یہ مرثیہ کوں یاراں
سن کر چلے ھیں روے دکھنی دکھن کو اپنے

اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ اُس کا قیام گجرات میں تھا ۔

دیوان حسینی

چونکہ ھاشم علي کا یہ دیوان سر بسر مرثیوں کا مجموعہ ھے اس لیے شاعر نے اس کا نام "دیوان حسیني" رکھا ھے، چنانچہ وہ خود کہتا ھے :—

توں لکھا ھے کربلا کا یوں بیان ھاسم علي
ھے یو "دیوان حسیني" نام اس دیوان کا

معلوم ھوتا ھے کہ یہ ھر سال ماہ محرم میں نیا مرثیہ تصنیف کرتے تھے، کہتے ھیں :—

تجھکو ھاشم علي حسین سرور
ھر برس مرثیہ لکھاتے ھیں

اپني شاعري کي برتری کا بھي اس کو خیال تھا :—

شاعروں نے شعر بولے گر چہ رنگیں دلکشا
اے عزیزاں یو سخن ھے اس دل بریاں کا

عربي سے بھي واقفیت تھي، بعض مصرعے پورے عربي میں ھیں —

یہ بشارت بہشت کے در پر
ادخلوا خالدین سلام علیک
ربنا اغفرلنا خطایانا
بالنبی الامین سلام علیک

فارسي میں بھي بعض مرثیے کہے ھیں، جن کي زبان اچھي خاصي ھے، حافظ کي فارسي غزل ع دل مي رود ز دستم صاحبدلاں خدا را

پر مصرعے لگائے ہیں -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرثیوں کے علاوہ وہ غزلیں وغیرہ نہیں کہتے تھے چنانچہ ایک جگہ مقطع میں یہ اقرار ہے :-

بجز مدح نہیں شعرِ ہاشم علي
کہو راستي کے سخن پر سلام

دوسري جگہ ہے —

شاعري میں یوں مقرر ہے تجھے ہاشم علي
جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط

ایک اور مرثیہ کا مقطع ہے :—

شعر ہاشم علي کے تئیں یاراں
مدح مولا مني دیکھیو خالص
ہاشم علي ہمیشہ ثنا خوان شاہ کا
جز مدح و منقبت سخن اُس نے لکھا نہیں

موجودہ نسخہ

دیوان حسیني کا یہ پیش نظر نسخہ میرے خیال میں نہایت ہي پرانا ہے ؟ اور خود مصنف کي زندگي میں لکھا گیا ہے ' جیسا کہ دام ظلہ کے الفاظ سے ظاہر ہے ؟ یہ نسخہ ۲۸×۲۴ کي تقطیع پر پرانے کشمیري کاغذ پر خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے ؟ جدول اور بیچ کي لکیریں سرخ ہیں ؟ اصل دیوان اسي خط اور جدول میں ہیں ؟ دیوان حروف ابجد کي ترتیب پر الف سے یا تک مرتب ہے ؟ مگر شروع میں بیچ میں بعض بعض حروف کي ردیفوں سے بعد اور آخر میں بعض نئي نظمیں جدولوں کے بغیر دوسرے خط میں اضافہ کي گئي ہیں ؟ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کي ترتیب کے بعد شاعر نے جو مرثیے کہے ہیں ' وہ اپني اپني جگہ پر اپنے

اپنے حروف میں بڑھائے گئے ھیں ؛ چنانچہ نسخہ مذکور کے آخر میں یہ تصریح بھي ملتي ھے :—

"این چند تا مرثیہ هندي سو کہ در دیوان مرزا صاحب مشفق
مہربان انیس خمي و حلي محمد علي سلمہ رنہ نبود'
احقر عباد محمد علي عفراللہ تعالیٰ دسہ برائے یاد و بود
نوشت ؛ امید کہ هر کہ بخواند بدعائے خیر فقیر حقیر را
یاد نماید ۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

تمت تمام شد دیوان حسیني گفتہ علي محمد خاں دام ظلہ
تخلص ھاشم علي ۔"

اس نسخہ میں (۴۲۰) صفحے ھیں ؛ اور ھر صفحہ میں تقریباً سترہ شعر ھیں؛ اور یہ کل کے کل مختلف اصناف سخن میں سر تا سر مرثیے ؛ سلام اور بیان مصائب کربلا ھیں؛ اس سے اندازہ ھوگا کہ آج سے دو سو برس پہلے اردو کے ایسے شاعر موجود تھے ؛ جنھوں نے صرف مرثیوں کا ایسا ضخیم مجموعہ یادگار چھوڑا ؛ اور اس حیثیت سے یہ نسخہ غالباً ھندستان میں اپني طرز کا تنہا اور یکتا ھے ۔

زبان کي خصوصیات وھي ھیں جو ولي کے کلام میں ھیں ؛ مثلاً

ستیں اور سیں	بجائے	سے
یو	,,	یہ
کوں	,,	کو
سوں	,,	سے
منے	,,	میں
میانے	,,	میں

کتیں	بجائے	کے تئیں = کے لیے
مجے	,,	مجھے
انجھو	,,	آنسو
تمن	,,	تم
همن	,,	هم
هیگا	,,	هوگا
کسوں	,,	کسی
سونے	,,	سنے
اِیتا	,,	اتنا

جمع الف نون کے ساتھہ؛ یہاں تک کہ هندي لفظوں کي بھي؛ جیسے انکھیاں؛ پلکاں؛ انجھواں؛ مت (کلمہ نفي) کو "متہ" (هاے کے ساتھہ) چنانچہ ایک مرثیہ جس میں ردیف متہ هے؛ ب کے بجاے ہ کي ردیف میں جگہ دي هے -

هندي لفظوں کا بکثرت استعمال؛ جیسے بچن بات کے معني میں مُکھہ منہ کے معني میں —

رو رو سکینہ غم سوں کبھی بھر نہیں سونے
بابا کے مُکھہ سوں میٹھی بچن کربلا منے

سیس سر کے معني میں؛ نمانا؛ جھکانا؛ من دل کے معني میں؛ دولن بجاے دلھن :—

بیٹھي گھونگھٹہ میں سیس نما درد سیں خموش
روتي هے آج من میں دولن کربلا منے

سجن بمعني محبوب :—

جب سیں چلے هیں میرے سجن کربلا منے

دیسے بمعنی دیکھے ع چھرہ خورشید سا دیسے تیرا

باج بمعنی بن ع آج تجھ باج سیہ پوش ہوا کعبہ ز غم

جگت بمعنی دنیا ع ہاسم علی ہو جگت میں سہے ملال

اندھکار بمعنی اندھیرا ع آج تجھ باج جگت بیچھ ہے اندھکار حسین

اوجاری بمعنی اُجالا ع دو جگ کے اُوجاری پر ایتا ستم

چندر بمعنی چاند پھر محرم کا چندر آیا ہوتا کاسکے

قتل سرور کی خبر لایا ہوتا کاشکے

کرن بمعنی کان دونو گالوں اوپر رلتاں بڑی چھوتی کرن ہے ہے

نین بمعنی آنکھ کیا نور نین ہے ہے

چرن بمعنی قدم ع افسوس ہے نہ لائی گھرمیں چرن توں اپنی

اکاس بمعنی فضا ع غم کے داغاں سے بھرا سارا اکاس

داس بمعنی غلام اے شہ دیں کمترین ہاشم علی

ہے تمہارا بندۂ و مملوک و داس

ذرا اوپر کے دوسرے مصرعے کی فارسی و ہندی ترکیب کی آمیزش ملاحظہ ہو۔

نگر بمعنی شہر سن نگر میں شور محشر ہر گلی

ہے شبِ قتلِ شہیداں آج رات

اس نگر سے کوئی خاص شہر غالباً مراد نہیں، کہ دوسری جگہ وہ کہتا ہے —

اس درد سوں ہاسم علی لاگے دلاں میں تلملے

نگروں نگر، گلیوں گلی کہتے ہیں یاراں وا حسین

باوجود اس قدامت کے مرثیہ کے بہت سے شعر صاف ہیں — صاف شعر

ظلم کیا کربلا ہائے فلک کیا کیا
فاطمہ کا دل جلا ہائے فلک کیا کیا
جس کے گلے مصطفا بوسہ لیا بارہا
شمر کا خنجر رکھا ہائے فلک کیا کیا
عابدین بیمار تھا شاہ گرفتار تھا
تجھکوں سزاوار تھا ہائے فلک کیا کیا
شکوۂ دوراں لکھوں غم کی یو باباں لکھوں
کاں (کہاں) تلک ہردم کہوں ہائے فلک کیا کیا

جس وقت شاہ رن سوں پیاسا جگر سدھارا
بیتاب کھول سر کوں زینب نے یوں پکارا
دیکھو رسول احمدؐ فرزند کوں تم اپنے
افسوس کربلا میں بے سر پڑا ہے مارا
یہ کوفیان بیدیں، مہماں بولائے ہم کو
بن جور بن جفا سوں کرتے نہیں مدارا

ہوا پھر کر محرم کا مہینا
نبی کے آل کا توٹتا سفینا
سدھارا تشنۂ لب فردوس کوں وہ
جہاں میں کوئی نہ تھا حسن کا قرینا
سلیماں تخت کو چھوڑا ہے روتا
گرا خاتم نبی کا جب نگینا
کہا شہ نے حرم سوں نہیں ہے چارا
مجھے شربت شہادت کا ہے پینا

نہ یہ تبدیل پاوے آج تقدیر
هوئے حق کے قضا اوپر رضینا
سکینہ نے کہا وہ دن نہ آوے
جہاں میں بے پدر ھو مجھکو جینا
یہ دشت کربلا ہے ہائے بابا
کہاں مکہ کہاں جد کا مدینا

نمونۂ کلام

ان مرثیوں میں سرتاپا پُر درد مضامین، ماتم، بین، یتیمی اور بیکسی کے حسرت انگیز واقعات بیان کیے گئے ہیں، مناظر قدرت، لڑائی کا نقشہ، گھوڑے کی تعریف، تلوار کے تشبیہی مضامین اور مبالغہ کی رنگ آمیزی مطلق نہیں، بلکہ درد و غم کے صرف فطری مضامین ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں، ایک مرثیے کا عنوان ہے :—

"نوحہ نمودن شہر بانو بعد از شہادت امام زادہ علی اصغر و
بیان کردن حالات و مکالمہ نمودن با او"

دیکھو کہ ایک معصوم ننھے بچہ کی موت کا کتنا پُر اثر فطری بیان ہے ۔

کہتیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
بالے اصغر ناج میں کس کا جھولاؤں پالنا
اے جان مادر کہاں ہے تو پھر کر میں تجھکو کہاں ملوں
بیٹھی اکیلی کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
بر میں سولاؤں میں کسے دود پلاؤں میں کسے
جاماں پنداؤں میں کسے کس کا جھولاؤں پالنا
سویا ہے گردن ڈال کیوں، اولجھے زلف کے بال کیوں
رنگین لوھو سیں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

تو کھول انکھیاں میں دیکھوں؟ تو بول بتیاں میں سنوں
روتا نہیں تو کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا

تو چھوڑ مجھکو کہاں گیا ؟ توں دود کس کا کیوں پیا
بسرا ہے میری کیوں میا کس کا جھولاؤں پالنا

بھیگا لہو میں ہے گلا ؟ لیتی ہوں تیری میں بلا
توں پاس اپنے مجھ بولا کس کا جھولاؤں پالنا

جاؤں کدھر میں کیا کروں ؟ یہ گود خالی لے پھروں
اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤں پالنا

یہ دیکھ میرا حال توں ؟ توڑی موں سر کے بال کوں
میں دل کی حالت کیا کہوں کس کا جھولاؤں پالنا

تھے کھیلنے کے دن ترے ؟ کیا عمر تھی کیا سن ترے
نہیں چین مجھکو بن ترے کس کا جھولاؤں پالنا

نہیں بھولی مجھکو توں کبھوں؟ تجھ یاد کرنے میں رہوں
رو رو کے تجھ بن دن بھروں کس کا جھولاؤں پالنا

یہ بہن تیری غمگسار ؟ بیٹھی ہے روتی زار زار
تو اُٹھ سکینا کر پوکار کس کا جھولاؤں پالنا

توں روٹھ ہٹ کر کہاں گیا ؟ میں تجھکوں لاؤں پھر منا
مت ہوئے مجھسوں تو جدا کس کا جھولاؤں پالنا

تیری صورت پر میں فدا ؟ پھرنا نظر میں توں رہا
جب کہ لحد میں توں گیا کس کا جھولاؤں پالنا

جاتا نظر سیں نور کیوں ؟ توں مجھسوں ہوتا دور کیوں
آتا ہے غم کا پور کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں سبز اجل تھی گھات میں ؟ گئی لیکے تجھکو ہات میں
بالا کیا حق بات میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے میرے پیارے لاڈلے ؟ پھر آ کے لگ توں مجھ گلے
انجھوں نین سیں نہ چلے ؟ کس کا جھولاؤں پالنا
کہاں کھیلتا ھے آاج تو ؟ خالی یہ گھر تجھہ باج یوں
جاتا ھے میرا داج کیوں کس کا جھولاؤں پالنا
ھاشم علی کوں نہیں تواں ؟ بانو کا لکھنا سب بیاں
کہتی تھی ھر دم با فغاں کس کا جھولاؤں پالنا

حضرت قاسم کی شادی اور شہادت کا پُر اثر سماں اِن لفظوں میں کھینچا ھے جس سے آج سو دو سو برس پہلے کے رسم و رواج ظاھر ھوتے ھیں -

محبان غم شہیداں کا دلوں سیتیں بھولاوو مت
جگر میں شہ کی فرقت کی اگن جلتی بوجھاوو منہ
حسن کی حب وصیت پر لگے قاسم کے تئیں بھیاے
کہا رخصت کرو رن کوں ؟ یہ جنگل میں بھاوو مت
نہیں سامان شادی کا مصیبت سب مہیا ھے
یہ سر کاٹیں گے رن میانے اُسے سہرا بندھاوو مت
پلادیں گی مجھے شربت شہادت کا حوران ساری
نہیں پانی پیاسوں کوں سو شربت کر پلاوو مت
براتی ساتھہ نہیں میرے چلے ھیں سب شہید ھو کر
میرے سر برقعا پھرتی دگر چھتر پھراوو مت
طبق دیکھے ملائک کون لے آاے نور کے ؟ رن میں
کہا قاسم نے اے امّاں بری میری لے جاوو منہ
لہو میں لال ھووینگے ؟ مرے دو ھاتھہ کنگن کے
نہیں حاجت مجھے مہندی ؟ انجھو سیتیں گندھاوو منہ

سینہ کے دف رھیں بجتے میری شادی کے تا محشر
سو غم کی آج تم نوبت میرے بھیا کے بجاوو مت
لوھو اور خاک رن میانے لگے گیی میرے تن اوپر
اوبٹنا تیل مت لاؤ، مجھے روتی چڑاوو مت
زمیں کے سیج پر سونا مجھے ھے گا لحد میانے
رھیگی سیج سب خالی نہیں فرصت بچھاوو مت
جدائی آج ھے قسمت نہیں یہ دور اجل ھے گا
سو دولھن ساتھ تم میرا یہ عقد غم پڑھاوو مت
مقرر مہر منزل ھے گیی شہادت رن میں پانے کوں
سو جُلوہ میں ادا کرنا یہ نقدِ جاں دلاوو مت
اجل سیں تلخ اب ھوتا میرا شیریں دھن دیکھو
جگر اس غم سو ھے ٹوکرے داتاں کو چوباوو مت
کہاں دولھن سٹیں روتا سو تخت جُلوہ سیں اوتھ کر
میری دوری کی آتش سوں دل اپنا یہ جلاوو مت
عروسی کل قیامت کوں ھماری ھے گیی جنت میں
رکھو نتھ ناک مین اپنی سوھاگ اپنا لٹاوو مت
شہادت سن میری ھرگز سنگار ابرن نتورو تم
سو کاجل کو نین سیتیں بہا اچھو متاوو مت
روا ھے آج دولھن کوں سراپا لال جلوہ کا
میرے لہو میں رنگو آنچل دگر رنگ تم رنگاوو مت

اس نسخہ میں ایک بات خاص لحاظ کے قابل یہ ھے، کہ اِس میں اکثر ثقیل ھندی حروف کو خفیف لکھا گیا ھے، مثلاً بیٹھے کی جگہ بیتھے، توڑو کی جگہ تورو، لوٹاؤ کی جگہ لوتاؤ، اوبٹنا کی جگہ اوبتنا، وغیرہ، اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ابھی تک فارسی کی

عادی زبانیں ہندی حروف کے ادا کرنے پر پوری طرح قادر نہیں ہوتی تھیں ؛ الف ممدودہ کو الف پر مد دیکر لکھنے کے بجائے دو الف سے لکھا ہے یعنی " آج " کو " ااج " وزن میں بعض حروف کے گرنے کی پروا اُس نے نہیں کی ہے نین کی جگہ نیئں ؛ نہیں کی جگہ نئیں ؛ اسی طرح عربی لفظ عروس کو عارس باندھا ہے ۔

غزل گو میر و مرزا سے پہلے کے پرانے اردو شعراء کے غزلیات کے بہت سے دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ؛ جن سے ہماری زبان کی تدریجی ترقی ظاہر ہوتی ہے ؛ مناسب ہے کہ اسی طرح مرثیہ گو میر و مرزا سے پہلے کے اس مجموعۂ مراثی کو بھی شائع کیاجائے ؛ تا کہ پتہ چلےکہ وہ زمین‌تھی جس کو میر و مرزا نے اپنی بلند خیالیوں سے آسمان بنا دیا ؛ اور معلوم ہو کہ ان مرحومین نے جس گلستان سخن کو سدا بہار بنا دیا ؛ اس کا آغاز بہار کیونکر ہوا ؟

اس نسخے کے اصل دیوان کا پہلا شعر یہ ہے ؛ جو حمد میں ہے ۔—

ابتدا ہر نامہ و ہر کلام کا
لازم آیا ذکر تیرے نام کا

اور آخری شعر یہ ہے —

یہی آرزو دل میں تجھے ہاشم علی دائم
کہ مولا کے کرم سینئیں نجف اور کربلا دیکھے

مگر دیوان کی ترتیب کے بعد جو نئے مرثیے اضافہ کیے گئے ہیں ؛
اس کے لحاظ سے ردیف الف میں پہلا شعر یہ ہے —

افسوس ہے ہزار کہ نوشہ گذر گیا
روتی دولھن کون چھوڑ گھونگھٹ میں؛ گزر گیا

اور آخری شعر یہ ہے جو اردو مسدس کا فارسی بند ہے —

داشت ہاشم علی چو روے ارادت بہ بیار
کرد منظوم چنیں واقعہ در سوز و گداز

مجموعہ کے شروع میں غالباً اسی زمانے کے ایک اور مرثیہ‌گو شاعر کے دو مرثیے ہیں جن کی زبان بھی اسی قسم کی ہے؛ اور ان میں شاعر کا تخلص تقی آیا ہے؛ یہ حسب معمول چومصرعے ہیں؛ تین مصرعے ایک قافیہ کے اور چوتھا پورے مرثیہ میں ایک قافیہ اور ردیف کا؛ سودا تک نے اسی رنگ میں مرثیے لکھے ہیں :—

نامہ اعمال کا اُس کے ہے گناہوں سیں سیاہ
تجھہ سیں اُمید شفاعت ہے تقی کو اے شاہ
تجھہ سوا کوئی کی دو جگ میں نہیں رکھتا پناہ
از ازل تیرے چرن سیتیں لگا ہے ہائے ہائے

مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا

(از ڈاکٹر تارا چند ایم اے - ڈی - فل)

بہت پرانے زمانے سے ہندوستان اور ایشیا کے مغربی ملکوں کے مابین تجارت ہوتی آئی ہے - عرب، فلسطین، مصر، کابل، اسیریا اور دوسری قوموں کے سوداگر ہمارے ملک کی چیزیں منگاتے تھے[1] اور اپنے ملک کا مال یہاں بھیجتے تھے - سلیمان نے بھی جو یہودیوں کا بڑا نامی بادشاہ ہوا ہے اپنے مشہور مندر کے بنوانے کے لیے ہندوستان سے سونا ہاتھی دانت اور مور کے پر منگوائے تھے[2] - مصر کے بطلیموس خاندان کے بادشاہوں نے بحر احمر کے کنارے ہندوستان کی تجارت کے لیے بندرگاہوں کی بنیاد ڈالی - ایران کے بادشاہوں نے ان کی دیکھا دیکھی خلیج فارس میں بندرگاہ[3] قائم کیے - یونانی سوداگر ساحل مالابار سے چاول، ادرک، کالی مرچ، دارچینی خریدتے تھے[4] - اور یونانی و رومی مصنفین ہندوستان کے جغرافیے سے واقفیت رکھتے تھے مثال کے لیے "ہپالوس اور پلینی" پہلی صدی کے، بطلیموس دوسری صدی اور کوسما چھٹی صدی عیسوی کے مصنفین کے نام ہیں - امیان مارسلانی لکھتا ہے کہ لنکا، لکادیپ اور مالدیپ کے لوگوں نے شہنشاہ جولین کے پاس سفیر بھیجے تھے - ایک کتاب ہے جس کا نام "بحر تیرن کا تجسس" ہے

---

1 ہنٹر - ہسٹری آف برٹش انڈیا جلد اول صفحہ ۲۰ -

2 ہنٹر - ہسٹری آف برٹش انڈیا جلد اول باب اول -

3 کنیڈی - جے - آر - اے - ایس - سنہ ۱۸۹۸ء -

4 کنیڈی - جے - آر - ایس سنہ ۱۸۹۸ء -

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں کرنگانور میں رومیوں کی، اور مصر کے بندرگاہ اسکندریہ میں ہندؤں کی آبادی تھی اس ہندستانی آبادی کو روم کے ظالم قیصر "کاراکلا" نے تیسری صدی کے شروع میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا، جنوبی ہندستان میں "آگستس" سے لے کر "زینو" تک یعنی پانچ سو برس کے سکے آج تک ملتے ہیں * اور اس تجارت کا پتا دیتے ہیں جو ہمارے اور مغربی ملکوں کے مابین جاری تھی -

ایران بھی تجارت میں روم سے پیچھے نہ تھا † - ایرانیوں نے دریائے دجلہ اور فرات کے دھانے پر بصرے کے نزدیک "اوبولا" کا بندرگاہ بنایا - ساسانیوں نے ہیرا کو صوبے کا پایۂ تخت قرار دیا - عربی مورخین لکھتے ہیں کہ ہیرا کے باشندے دن رات اپنے مکانوں کی چھتوں پر سے ہندستان سے آنے والی کشتیوں کو دیکھا کرتے تھے خسرو نوشیرواں کے وقت میں تجارت بڑی ترقی پر تھی اس نے خود سندھ پر حملہ کیا تھا اور "دارا" نے اپنے بیٹے کو لنکا بھیجا تھا تا کہ ان لوگوں کو، جنھوں نے ایرانیوں کو مار ڈالا تھا، سزا دے - تاجک شاستر ‡ کا نام ہی بتاتا ہے کہ ہندیوں اور ایرانیوں میں کتنا گہرا تعلق تھا -

§ عرب کے رہنے والوں نے ہندستان اور مغرب کی تجارت میں بڑا حصہ لیا ان کے ملک میں سمندر کے کنارے بہت سے بندرگاہ تھے جیسے عدن جنوب میں، اور سحر مشرق میں، بحر ہند کی کشتیوں میں عربی ملاح تھے اور اس سمندر کے دونوں کناروں پر ان کی بستیاں تھیں

---

* تھرسٹن - عجائب خانہ مدراس کے سکے - فہرست نمبر ۲ -

† رینو جغرافی - دی ابوالفدا صفحہ ۳۸۲ -

‡ کار ڈیر ملانجے - ایچ - ڈرنبور - نوٹس سور لے مسلماں ڈی شین - Cordier Melange H Derinburg notes sur les Musalmans de chine

§ رینو ریلا سیاں دی ویاژ نے یارلدر اراب اے لا پرساں - داں لیبرینڈ اے آلاسن داں لے ۹ سی ایکل ، ترم ایک -

ہندستان کے مغربی کنارے پر چول، کلیان، سوپارا وغیرہ مقاموں پر آج بھی ان کے آثار پائے جاتے ہیں - رینو کا خیال ہے کہ چودھویں صدی تک ساحل مالابار پر عربوں کا ویسا ہی اثر تھا جیسا بعد میں پرتگالیوں نے قایم کر لیا -

ساتویں صدی میں جب اسلام کا جھنڈا بلند ہوا اور عرب کی سب قومیں ایک جھنڈے کے سایہ میں جمع ہوئیں تو اس تحریک کو بہت زور پہونچا جو حضرت محمد کی پیدائش سے پہلے شروع ہوگئی تھی - عرب چاروں طرف تیزی کے ساتھ پھیلنے لگے - ان کی فوجیں جنگلوں، میدانوں اور پہاڑوں کو عبور کرتی ہوئی شام، ایران افغانستان اور بلوچستان کو طے کر کے ہندستان کی سرحد پر پہونچ گئیں - مسلم بیڑوں نے ایرانیوں کے بیڑوں کو سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سونپ دیا اور بحر ہند پر اپنا قبضہ کر لیا - ان بیڑوں کے ساتھ ساتھ عرب کے سوداگر بحر ہند کی ساری تجارت کے ٹھیکے دار ہوگئے -

عربوں کی کشتیاں، مغرب میں بحر احمر کے کنارے سے یا جنوبی کنارے سے چلتی تھیں - اور ہندستان میں ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یا تو سندھ کے دہانے میں، یا کھمبائت کی خلیج (Bay of Cambay) میں پہونچ جائیں یا مالابار کے بندرگاہوں میں جا کر مال اتار دیں - پہلی صورت میں وہ ایشیا کے کنارے کنارے کشتیوں کو لگائے رکھتے تھے لیکن دوسری صورت میں برسات کی ہواؤں (Monsoon) سے فائدہ اٹھانے کے لیے بادبان کھول کر بیچ سمندر سے کولم، جا پہونچتے تھے - یہ کولم سے کالی کٹ کوچین ہوتے ہوئے لنکا، ملایا، مشرقی ممالک اور چین کو چلے جاتے تھے -

* کیمبرج میڈیول ہسٹری -
÷ رینو جوگرفی دی ابوالفدا -

مسلمانوں کا پہلا بیڑا حضرت عمر کی خلافت میں سنہ ۶۳۶ع میں ہندستان آیا اُس وقت عثمان ثقفی بحرین کا صوبہ دار تھا اور اس نے ایک فوج سمندر کے راستے سے تھانے کے بندر پر بھیجی - خلیفہ نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور عثمان کو اس حرکت سے روکنے کے لیے سخت سزا کی دھمکی دی - حضرت عثمان کے زمانے میں ہندستان کی طرف کئی بار دیکھ بھال اور توہ لینے کے لیے فوجی دستے آئے اور آخرکار سنہ ۷۱۲ع میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس صوبے کو عربوں کی مملکت میں شامل کرلیا -

جس وقت مسلمان صوبے داروں اور فوجی کپتانوں کی للچائی ہوئی نگاہیں سندھ پر پڑ رہی تھیں اس وقت عرب کے سوداگر ساحل مالابار پر امن کے ساتھ اپنی بستیاں بسا رہے تھے† - مدراس کے ضلع کے مینول‡ میں "اسٹرروک" لکھتا ہے کہ ساتویں صدی سے عرب کے سوداگر ہندستان کے مغربی کنارے پر بس رہے ہیں - وہ ہندستانی عورتوں سے شادیاں کرتے تھے اور ان کے رہنے اور گھر بنانے میں کسی طرح مزاحمت نہیں کیجاتی تھی - بلاذری نے اپنی تاریخ میں اس بات کی تصدیق کی ہے - حجاج§ کے حالات میں اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک جہاز لنکا سے کچھ مسلمان لڑکیوں کو جن کے ماں باپ

---

* ابلٹ ہسٹری آف انڈیا - جلد اول صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶ -

† رولینڈ سن مقدمہ تحفۃالمجاہدین ڈی ' دی لینڈ آف دی پیرو ملس صفحہ ۳۶۹ -

‡ اسٹرروک جنوبی کنارا (مدراس ڈسٹرکٹ مینولس) صفحہ ۱۸۰ -

§ ابلٹ ہسٹری آف انڈیا - جلد اول صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹ -

مر گئے تھے واپس لے جارہا تھا* اس جہاز پر "کچھ" کے لٹیروں نے حملہ کیا اور لڑکیوں کو گرفتار کر لیا - حجاج نے راجہ داہر سے لڑکیوں کو چھڑانے کے لیے مطالبہ کیا لیکن داہر نے اس پر توجہ نہیں کی تب حجاج نے قاسم کو فوج اور بیڑے کے ساتھ داہر پر چڑھائی کے لیے بھیجا -

حجاج اپنے جبر و تشدد کے لیے مشہور ہے - اِس نے ہشام کے گھرانے کے لوگوں کو اس قدر تنگ کیا کہ اُنہوں نے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لی اور "کوکن" اور کنیا کماری (Cape Comorin) کے مغربی ساحل پر ڈیرا جمایا - اُن کی اولاد سے "نوائط" اور "لبے" قومیں بنیں جو اب بھی ان مقامات پر آباد ہیں -

کولم میں "میت کنو" نام کے قبرستان میں علی بن عثمان کی قبر پر سنہ ۱۶۶ھ (سنہ ۷۱۰ع) کا کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں مالابار کے ساحل پر مسلمان آباد ہو گئے تھے - مسلمانوں کا اثر بہت جلد جلد بڑھا - ہندو راجاؤں نے اُن کی بڑی آؤ بھگت کی - اُن کی تجارت کے لیے آسانیاں بہم پہنچائیں - انہیں زمین خریدنے، مسجدیں بنانے کی اجازت دی - مالابار میں آباد ہوتے ہی ان سوداگروں نے اپنے مذہب کے پھیلانے کی کوشش شروع کردی - مسلمانوں میں درویش اور پادری نہیں ہوتے لیکن ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مذہب کی اشاعت کرے - قرآن میں لکھا ہے کہ لوگوں کو خدا کے راستے

---

* راس مسٹرز اینڈ کرگس، جلد اول صفحہ ۳۶۳ - اور کلابا اینڈ جنجیرہ گزیٹیر صفحہ ۷۳ -

† انس مالابار اینڈ انجنگو ڈسٹرکٹ گزیٹیر صفحہ ۴۳۶ -

پر چلنے کا پیغام دو اور انہیں عقلمندي کے ساتھہ اور رحم کے ساتھہ بلاؤ - قرآن (۱۶ - ۱۲۶) اس تبلیغ کے کام میں نہ صرف مرد بلکہ عورتوں تک نے بڑا حصہ لیا ہے - حضرت حسن کي پر پوتي نفیسہ نے مصر میں بہتوں کو مسلمان بنایا - اُن کے بارے میں روایت ہے کہ وہ جس گھر میں رہتي تہیں اُس کے پڑوس میں ایک ذمی کا گھر تھا - اُس کی لڑکي ایسي بیماري میں مبتلا تھي کہ اپنے ہاتھہ پاؤں نہیں ہلا سکتي تھي - وہ رات دن بیٹھہ کے بھل چارپائی پر پڑی کراھا کرتی تھی - ایک دن اُس لڑکی کے ماں باپ کو بازار جانا پڑا - انھوں نے نفیسہ سے لڑکی کے پاس رہنے کے لیے خواہش ظاہر کی - نفیسہ کو بڑا ترس آیا اور انہوں نے اُس کے پاس رہنا منظور کر لیا - جب ماں باپ چلے گئے تو نفیسہ نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ "اُس لڑکی کے دکھہ کو دور کر" - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی اچھی ہو گئی - ماں باپ اور سارا کنبہ نفیسہ کا گرویدہ ہو گیا اور اُنہوں نے اظہار شکر میں اِسلام قبول کر لیا -

مسلمان مرد اور عورتیں ھی نہیں بلکہ قیدی تک اشاعت مذہب کے لیے تیار رہتے تھے - ایک مسلمان قیدی نے سب سے پہلے یورپ میں اسلام پھیلایا اور "پیچے نیگ" قوم کو جو گیارھویں صدی میں ڈینوب اور ڈون کے بیچ میں آباد تھی، مسلم بنایا -

غلام سرور نے خزینۃالاصفیا میں لکھا ہے کہ شیخ احمد مجدد کو جہانگیر نے قید خانے میں بھجوادیا تھا - اُنھوں نے دو برس میں سیکڑوں ھندو قیدیوں کو مسلمان کر لیا -

آٹھویں صدی میں مسلمانوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے کئی اسباب تھے — دکھن کے لوگ اُنہیں عرب کی نگاہ سے دیکھتے تھے - ان کی دولت، اور بڑھتی ہوئی طاقت کا ان کے دلوں پر

سکہ جم گیا تھا ، لیکن سب سے بڑھکر مسلمانوں کے خیالات ان کے رواجوں، ان کے اطوار اور چال چلن کا اثر پڑا ۔ مسلمانوں کا مذہب سادہ ، آسان اور اچھا تھا ۔ ان کی پرستش کے طریقے دلوں میں گھر کرنے والے تھے اور رات دن خدا کی یاد دلانے والے تھے ۔

رینان ایک فرانسیسی عالم نے خود قبول کیا ہے "میں جب کبھی مسجد میں جاتا ہوں تو میرا دل ایک نا قابل بیان کیفیت سے اُمنڈ آتا ہے اورمیرے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ میں مسلمان کیوں نہ ہوا"۔ جب رینان ایسے کٹر مُلحد اور سائنسداں کے دل پر اسلامی عبادت کا ایسا اثر ہوتا تھا تو اوروں کا کیا ذکر ہے ۔ ایک اور بات جو بھولنی نہیں چاہیے یہ ہے کہ پہلی صدیوں کا اِسلام ایک بڑا عملی مذہب تھا ۔ اِسلام کے ماننے والے اپنے عقیدوں کو محض زبان سے نہیں دھراتے تھے بلکہ اپنے بندگی اور چال چلن میں اُن پر پابند ہوکر رہتے تھے ۔ اُن کی نماز کی صف بندی ، روزوں کی سختی ، خیرات اور عُشر کے قاعدے ، سماج میں برابری اور مساوات کا برتاؤ، مذہب کے ایسے زبردست حصے تھے کہ آدمی کے دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے ۔

اس کے خلاف آٹھویں صدی میں دکن میں ہندوستانی دھرموں میں سخت اختلاف جاری تھا ۔ بودھ ، جین اور ویدک دھرم کے ماننے والے ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے ۔ برہمنوں کی کوشش سے بودھ اور جین دھرم ختم ہو چلے تھے اور شیو اور وشنو کا مت پھیل رہا تھا ۔ سیاسی دنیا میں بھی ایک طوفان برپا تھا ۔ چیر اور کرال کی طاقتیں گھٹ رہی تھیں اور نئے گھرانے اوبھر رہے تھے ۔ مسلمان دکن میں اس وقت پہونچے

---

* ا ۔ اینڈ ہسٹاریکل اِسکیچ آف دی اینشنٹ دکن ۔

جب سماج اور راج میں فساد برپا تھا - اُن کے آنے کا قدرتی طور پر بڑا اثر ہوا - نویں صدی کے اوائل میں مالابار کے خاندان کا جو چیرمن پیرو مل * سے ملقب تھا خاتمہ ہوا اور اُس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے آخری راجہ نے جس کی راجدھانی کودنگلور تھی اپنے دھرم کو چھوڑ دیا اور اِسلام قبول کر لیا -

مشہور یہ ہے کہ راجہ نے خواب میں یہ دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں صبح کو اُس نے خواب کی تعبیر پوچھی تو کوئی ٹھیک مطلب نہ بتا سکا - اتفاق سے مسلمانوں کی ایک جماعت جو لنکا سے لوٹ رہی تھی راجہ سے ملنے کو دربار میں حاضر ہوئی - اس کے سردار نے خواب کی تعبیر ٹھیک ٹھیک بتادی اور راجہ کو اپنے مذہب کی تعلیم کی - اس کے بعد راجہ مسلمان ہوا اور عرب کے ملک کو گیا - وہاں سے اُس نے ملک ابن دینار، شرف ابن مالک اور مالک ابن حبیب کو مالابار بھیجا - اُنھوں نے یہاں آکر گیارہ جگہوں پر مسجدیں بنائیں اور اِسلام کی اشاعت کی -

راجہ کے مذہب بدلنے کی وجہ سے ملک میں بڑی ھلچل مچی اور اس واقعہ نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا - مالابار میں آج بھی اس واقعہ کی یاد زندہ ہے جس وقت راجہ تخت پر بٹھایا جاتا ہے تو اُس کا سر مونڈتے ھیں اور اُسے مسلمانوں کا سا لباس پہناتے ھیں - ایک موپلا اُس کے سر پر مُکٹ رکھتا ہے †- گدی پر بٹھائے جانے کے بعد راجہ کے ساتھ وھی برتاؤ کرتے ھیں

* لوگن '' مالابار '' جلد اول صفحہ ۲۴۵ -

† قادر حسین خاں ''ساؤتھ انڈین مسلمانس'' مدراس کرسچین کالج میگزین ۱۳-۱۹۱۲ صفحہ ۲۴۱ -

جو ایک ذات سے نکالے ہوئے آدمي کے ساتھہ ـ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھہ بیٹھہ کر کھانا نہیں کھا سکتا ؟ نائر لوگ اُس کو چھو نہیں سکتے ـ یہ بھي سمجھا جاتا ھے کہ راجہ آخري چیرمن پیرومل کا وائسرائے ھے اور اپنے راجہ کے لوٹنے کا انتظار کر رھا ھے ـ

تراونکور ۔ کے مہاراجہ ؟ تخت نشیني کے وقت ؟ تلوار کمر میں باندھتے ہوئے یہ اعلان کرتے ھیں کہ " میں اس تلوار کو اس وقت تک رکھونگا جب تک میرا چچا جو مکہ گیا ھے لوٹ نہ آئے " ـ آخری چیر من پیرو مل کي داستان کہاں تک تاریخی حیثیت سے سچی ھے کہنا مشکل ھے لیکن اس واقعے کے کچھہ آثار باقی ھیں ـ گو نائکوں کے نام ٹھیک نہیں ھیں کیونکہ چیرمن پیرومل خطابي نام ھے - لیکن اتنا ماننا ھی پڑیگا کہ کو دنگلور کے شاھی خاندان کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ اُس کے آخری راجہ نے اپنا مذہب تبدیل کر دیا ـ

اس میں شبہہ نہیں کہ اُس زمانے میں مسلمانوں کا بڑا اقتدار تھا - انہیں موپلا کے نام سے پکارا جاتا تھا ـ موپلا کے دو معني ھیں - بڑا لڑکا یا دولھا ' جن لوگوں کی عزت کرنی منظور ہوتی تھی انہیں موپلا کا خطاب دیتے تھے ؟ جیسے عیسائیوں کو نصرانی موپلا کہتے ھ ں ـ موپلوں کے بڑے اختیارات تھے ؟ مسلمان موپلا نام بوتری برھمنوں کے برابر بیٹھہ سکتا تھا - حالانکہ نائر ایسا نہیں کر سکتا تھا - موپلوں کا درجہ جیسے تھنگل کہتے ھیں راجہ کے ساتھہ ساتھہ پالکي پر سواري کر سکتا تھا ـ

۔ لوگن " مالا بار ' جلد اول صفحہ ۲۳۱ ـ

کوچین کے راجہ (جسے زمورن کہتے ہیں) کی عرب سوداگروں پر بڑی مہربانی کی نگاہ تھی - اس کی اجازت سے راج میں بہت سے سوداگر آباد ہوئے ان کی تجارت سے راج کو مالی فایدہ پہونچتا اور اُن کے ناروؤں کی قوت سے راج کی طاقت بڑھی -

زمورن نے آس پاس کے راجاؤں کو شکست دے کر ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیا - جہاں جہاں راجہ کا تسلط ہوا مسلمان سوداگروں نے منڈی قائم کی ٭ اِس طرح کالی کٹ کے بندرگاہ کی بنیاد قائم ہوئی - یہاں کا قاضی جسے وہاں والے "کوبا" کہتے ہیں زمورن کا بڑا مددگار تھا - اس کی طرف سے ہمیشہ دوسرے راجاؤں کے خلاف لڑا کرتا تھا - اسی مدد کے سبب سے وہ جنوبی مالابار میں سب سے طاقتور راجہ بن گیا اور اس نے "مہامکھم" کے میلے کا بندوبست جو ترموئی کے مقام پر ہوتا تھا اس کے سپرد کیا - اس سے اس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی -

کوبا کے برابر علی راجہ کا گھرانا تھا جس کے نائک کولاتری راجاؤں کے بیڑوں کے سردار ہوتے تھے† -

ہندو راجہ مسلمانوں کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انھوں نے خود اپنی رعایا کو مسلمان ہونے کے لیے جوش دلایا؟ انھیں اپنے بیڑوں کے لیے ملّاحوں کی ضرورت تھی؟ اس لئے انھوں نے اجازت دی کہ مکوان قوم کے ہر گھر میں ایک یا دو آدمی اسلام قبول کرے - نویں صدی کے بعد اسلام کا اثر دن بدن بڑھتا گیا - مسعودی ‡ نے

٭ لوگن - مالابار جلد ۱ صفحہ ۲۷۸ لغایتہ ۲۸۰ انیز مالابار اینڈ انجینکو ڈسٹرکٹ گزٹیر صفحہ ۴۳ -

† لوگن - مالابار -

‡ ایلیٹ جلد ۱ -

سنہ ۹۱۶ع میں ہندستان کا سفر کیا ـ وہ لکھتا ہے کہ چول میں دس ہزار سے زائد مسلمان آباد تھے ـ اُن کا اپنا سردار تھا جسے ہزامہ† کہتے تھے ـ ابو دولف مسعر بن المہلہل چول کی مسجدوں کا ذکر کرتا ہے ـ ابن سعید نے تیرھویں صدی میں سمندر کے کنارے ہر جگہ مسلمانوں کو پایا ـ سر مارکو پولو‡ نے دیکھا کہ لنکا کے راجے مسلمان سپاہیوں کو باہر کے ملکوں سے لا کر اپنی فوج میں بھرتی کرتے تھے ـ ابوالفدا (سنہ ۱۲۷۳ع سے ۱۳۳۱ع تک) لکھتا ہے کہ کولم میں ایک خوبصورت مسجد اور مسلمانوں کا چوک تھا ـ ابن بطوطہ¶ نے کھمبایت سے لیکر سارے مالابار کے کنارے کا سفر کیا اُسے ہر جگہ پر مسلمان ملے اور وہ اچھی پھلتی پھولتی حالت میں تھے ـ اُس کا بیان ہے کہ گویا مسلمانوں کے قبضہ میں تھا ـ کنڈباد میں مسلمانوں نے اُس سے ملاقات کی ، کونکن میں اُس نے ایک پرانی مسجد دیکھی وہاں پر اُسے چادری درویشوں کی ایک ٹولی ملی ـ
سندا پور میں بغدادی سوپے کی مسجد تھی ـ ہنور میں مسلمانوں کی سلطنت تھی اور کولم تک ہر بندرگاہ میں مسافرخانے تھے ، جہاں مسلمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا ـ سب مقامات پر

---

* رینو - رالسپلان دی ویر "Four nd Relation de Voyages" (داقوب کے بیان میں
† ہزامہ - ہنرمند کی بگڑی ہوئی صورت ـ
* میران ر"سلسلہ دی ریار" اس سید کے بیان میں ـ
‡ یول - دی بک آف سر مارکوپولو - جلد ۱ ، صفحہ ۲۱۴ ـ
یول - دی بک آف سر مارکوپولو - جلد ۲ صفحہ ۳۷۷ ـ
¶ مترجمہ - دی وریمری اے سانگی نیتی اس بطوطہ - Defremery et Sanguinette) جلد ۴ صفحہ ۔۔ اور بعد کے صفحے ـ

مسلمانوں کی عزت تھي - بارسي لور اور مکانور میں مسلم آبادي کے ساتھہ اُن کے قاضي اور مفتي تھے - منگلور میں چار ہزار مسلمان بستے تھے جن میں فارس اور یمن کے سوداگر تھے - وہاں کي مسجد میں بہت سے طالب علم پڑھتے تھے - تینوں پٹنوں میں مسجدیں تھیں اور مسلم محلے تھے -

عبدالرزاق * پندرھویں صدي میں ھندستان آیا اِس کے تھوڑے ھي دنوں بعد پرتگال والوں نے ھندستان کا راستہ معلوم کیا ' وہ کالي کٹ کے بارے میں لکھتا ھے کہ یہاں پر بہت سے مسلمان ھیں ' اُن کے اپنے گھر ھیں ' دو مسجدیں ھیں جہاں وہ ھر جمعہ کے دن نماز پڑھتے ھیں -

ان بیانوں سے معلوم ھوتا ھے کہ ھندستان کے مغربی کنارے پر مسلمان اپنے مذھب کے قائم ھونے کے کچھہ ھي دن بعد آ کر بسے - اور اُن کي تعداد' دولت اور طاقت بڑی تیزي سے بڑھي - ھندستان کے مشرقی کناروں پر بھي عربوں کي پرانے زمانے میں بہت قدر و عزت ھوئي - جب دارا نے پانچویں صدي قبل مسیح میں دجلہ اور فرات کے دھانوں کو رکوادیا اور مصر کي تجارت کو فنا کردیا تو یہ تجارت یمن کے عربوں کے ھاتھہ لگي - عربوں اور یہودیوں کی نوآبادیاں لنکا اور جنوبي ھند میں قائم ھوئیں - یہاں پر یونانیوں اور رومیوں کے سوداگر پہلے ھي سے کاروبار کرتے تھے - اُن کے جہازوں کو بھي عرب ملّاح چلاتے تھے - اس لیے جب رومۃالکبری کا خاتمہ ھوا تو عرب سوداگروں نے اُن کي جگہ لی - عرب سوداگر جول منڈل (کارومنڈل) کے کنارے سے انڈمن ' آسام ' برھما ھوتے ھوئے چین چلے جاتے تھے -

---

* میجر انڈیا اں دي ففٹینتھہ سنیچری' سفرنامۂ عبدالرزاق --

عربوں نے مذہب اسلام قبول کرنے کے بعد اِس تجارت کو اپنے هي هاتهه میں رکھا - سلیمان ابو زید سیرافي اور مسعودي کے بیانوں سے معلوم هوتا هے که مسلمان اِن راستوں سے اچھي طرح واقف تھے - اِن مسلم عربوں کي بڑي منڈي تنے ولي ضلع کے کائل پٹنم شہر میں تھي - مسٹر کالڈویل نے اس مقام پر مسلمانوں کے سکے ساتویں صدي (۷۱ هجري) سے لیکر تیرهویں صدی تک کے پائے -

یہاں پر مسلمانوں نے اپنا مذہب پھیلانے میں بہت کوشش کي اور اُس کا نتیجه یه هوا که بہت سي هندو قوموں نے اپنا مذهب تبدیل کردیا - مدراس صوبے کي مسلم قومیں اپني ابتدا اُسي زمانے سے لگاتي هیں - مدرا اور ترچناپلي کے راوتنوں میں کئي پشتوں سے یه روایت چلي آتی هے که اِنہیں نابھڑولي نے مسلم بنایا - نابھڑ کي قبر آج بھی ترچناپولي میں موجود هے - اور اُس پر اُس کے مرنے کا سال سنه ۴۱۷ هجری کُھدا هے - نابھڑ کے بارے میں روایت هے که وہ ترک شاهزاده تھا لیکن اُس نے سلطنت چھوڑ کر فقیري اختیار کرلي تھي - وہ عرب ، فارس اور شمالي هندستان میں گھومتا هوا دکھن میں ترچور (ترچنا پلی) میں آیا - یہاں آکر وہ بس گیا اور یہیں اُس نے اپني باقي زندگی گزار دی - وہ عبادت اور خیرات کرنے میں مشغول رهتا تھا اور اسلام کي تبلیغ کیا کرتا تھا -

سید ابراهیم شہید نے جس کی پیدائش ۱۱۰۲ ع کے لگ بھگ هوئي * پانڈیوں کے راج پر تیرهویں صدي کے شروع میں چڑهائی کی - کہتے هیں که بارہ برس تک اُس نے اُن پر حکومت کي لیکن آخر میں اِس کي شکست هوئي اور وہ مارا گیا - اس کي قبر اروازی میں هے -

---

* قادر حسین خاں - پہلے حواله دیا گیا هے -

بابا فخرالدین ایک فقیر تھا۔ جو پین کونڈا میں رہتا تھا، اُس نے وہاں کے راجہ کو مسلمان بنایا اور وہاں پر مسجد تعمیر کی۔ ڈودیکل ذات اُسی کو اپنا مرشد مانتی ہے۔ اُس کے مرنے کا زمانہ (سنہ ۱۱۶۸ع) ۵۶۴ ہجری ہے۔

مدورا کے ضلع میں مسلمان ۱۰۵۰ع میں داخل ہوئے* اُن کے سردار کا نام ملک الملوک تھا، اِسی کے ساتھ ایک بڑا درویش حضرت علی بادشاہ بھی آیا۔ یہ مدورا کی حضور کچہری میں دفن ہے۔ گوری پالن گاؤں میں ایک مسجد ہے جس کے لیے کُن پانڈیا نے گیارھویں یا بارھویں صدی میں چھ گاؤں خرچ کے لیے خیرات میں دیے تھے۔ بادشاہوں کی خیرات کو سولھویں صدی میں ویرپا نائک نے جانچ کے بعد قائم رکھا۔

مشرقی ساحل کے راجہ مسلمان سوداگروں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھتے تھے۔ وہ نہ سخت محصول لگاتے اور نہ طوفان زدہ کشتیوں کو جو اُن کے بندرگاہوں میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہوتی تھیں مغربی راجاؤں کی طرح اپنے قبضہ میں کر لیتے تھے۔ ایک برائے نام محصول وصول کر لیتے تھے جو کسی کو گراں نہیں گزرتا تھا† ۔

اس دور اندیشی کی وجہ سے تجارت کو بڑی ترقی ہوئی، اور کئی منڈیاں قائم ہوگئیں۔ جول منڈل کے ساحل پر اتنے جہاز گزرنے لگے کہ اُس کا نام عربی میں معبر (راستہ) پڑ گیا۔

وصّاف‡ لکھتا ہے کہ معبر سمندر کے اُس کنارے کو کہتے ہیں جو کولم سے نلور تک پھیلا ہوا ہے۔ اِس کی لمبائی تین سو

---

* نلسن '' مدورا '' صفحات ۶۹ و ۸۶ ۔

† آئینگر - ساؤتھ انڈیا - اینڈ ہر محمڈن انویڈرس ۔

‡ ایلیٹ - جلد ۳ صفحہ ۳۲ ۔

فرسنگ ہے - یہاں کا راجہ اپنے کو "دیو" سے ملقب کرتا ہے - چین، ماچین، ہند اور سندھ کے بیش قیمت مال سے لدے ہوئے بڑے بڑے جہاز جب یہاں سے گزرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اونچے پہاڑ ہوا کے بادبان لگائے ہوئے پانی پر تیر رہے ہیں - خلیج فارس کے جزیروں سے عراق اور خراسان، روم و فرنگ کے ملکوں سے خوبصورت و خوشنما چیزیں یہاں آتی ہیں اور یہاں سے چاروں طرف جاتی ہیں، کیونکہ یہ ہندستان کی تجارت کا مرکز ہے -

بارھویں صدی میں مسلمانوں کی بڑی آبادی اس صوبے میں تھی - وصاف لکھتا ہے کہ کابل دیم میں کس کے حکمران ملک الاسلام جمال الدین نے یہاں گھوڑوں کی تجارت قائم کی تھی - ہر سال دس ہزار گھوڑے فارس سے منگوائے جاتے تھے اور ان کی قیمت کا اندازہ دائی سی لاکھ دینار تھا -

رشید الدین* لکھتا ہے کہ سنہ ۱۲۹۳ ع میں جمال الدین کابل پر قابض ہوگیا تھا اور اس کا بھائی تقی الدین عبدالرحمن بن محمد طوبی اس کا نائب مقرر ہوا -

مارکو پولو نے لکھا ہے کہ تقی الدین سندر باندیا کا وزیر تھا اور اس کا بیٹا سراج الدین اور پوتا نظام الدین اس کے بعد جانشین ہوا - باندیا راجہ نے جمال الدین کے لڑکے فخرالدین احمد کو ایلچی بنا کر چین کے بادشاہ قبلئہ خان کے یہاں ۱۲۸۷ ع میں بھیجا تھا - مسلمانوں کی اور بھی بستیاں تامل ملک میں آباد تھیں -

---

* الیٹ جلد ۳ صفحہ ۳۲ -

† ہدایت جلد ۱ صفحہ ۶۹ و ۷۰ -

‡ یول، حوالہ دیا جا چکا ہے

امیر خسرو * نے خزائن الفتوح میں لکھا ھے (علیگڈھ کا ایڈیشن صفحہ ۱۹۱ و ۱۹۲) کہ کندور (کنانور) کے شہر میں مسلمانوں کی بستی تھی ' جس کو ملک کافور نے مسلم ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا ' گو کہ وہ لوگ قتل کیے جانے کے قابل تھے - ابن بطوطہ † نے ملک کافور کے حملے کے کچھہ برسوں بعد اس صوبے کا سفر کیا - وہ لکھتا ھے کہ اُس وقت مدورا پر غیاث الدین ادم غاسی حکومت کرتا تھا - اور راجہ ببر بلّال کی فوج میں بیس ہزار مسلمانوں کا دستہ تھا - بیر بلّال کے صوبےدار ھری ایااوڈیار کے ماتحت "ہوناور" میں ایک مسلمان حاکم تھا - اِن بیانات سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ھے کہ ظہور اسلام کے تھوڑے ھی دنوں بعد مسلمانوں نے ھندستان پر اپنی تہذیب ' مذھب اور خیالات کے پھیلانے کا موقع حاصل کر لیا - ساتویں صدی سے تیرھویں صدی تک اُن کا تعلق تجارت کی صورت میں تھا - اور سوداگروں کی حیثیت سے شروع میں اُن کی آؤبھگت ہوئی ' جب ھندو راجہ اُن سے واقف ھو گئے تو اُن کی وقعت اور بھی بڑھہ گئی - وہ بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہوئے - اُن میں سے وزیر ' بیڑوں کے کمانڈر ' ایلچی ' افسران محاصل اور فوج کے کپتان وغیرہ مقرر ہونے لگے - اُن کو اپنے مذھب کی پابندی کے لیے مسجدیں بنانے کی اور اپنے مذھبی پیشواؤں اور فقیروں کو خانقاھوں میں رکھنے کی اجازت تھی - صرف یہی نہیں بلکہ وہ کُھلّم کُھلّا

---

* ابلیٹ جلد ۳ صفحہ ۹۰ -

† ابن بطوطہ دی فریمری سانگینیتی جلد ۳ - صفحہ ۱۹۹ اور ساؤتھہ انڈیا اینڈ ھر محمڈن انویڈرس -

اپنے مذھب کی تبلیغ کر سکتے تھے اور کہیں کہیں تو راجہ خود اس تبلیغ میں مدد کرتے تھے - لیکن صرف جنوبي دکھن تک اس پُر امن اثر کے حدود نہ تھے بلکہ شمالی ھندستان میں بھي مسلمانوں کا ھندؤں سے بہت دنوں تک اِسي طرح کا تعلق رھا - یہ سچ ھے کہ آٹھویں صدی کے اوائل میں عربوں نے سندھہ پر قبضہ کر لیا ؟ لیکن مُلتان اور سندھہ کو چھوڑ کر اور کوئي حصہ تین سو برس تک اُن کے قبضے میں نہیں آیا -

اس مغربی صوبے پر تو مسلمان حاکم تھے لیکن کاتھیا واڑ ؟ گجرات اور کونکن میں وہ صرف سوداگروں کي حیثیت سے رھتے تھے - دائبل ؟ سومناتھ ؟ بھڑوچ ؟ کھمبائت ؟ سندان ؟ اور چول وغیرہ بندرگاھوں میں مسلم نوآبادیاں تھیں اور مسجدیں ؟ خانقاھیں اور محلے قائم تھے -

مغربی ھندستان کے ھندو راجاؤں نے بھي اُن کا خیر مقدم کیا - سلیمان ؟ مسعودی ؟ ابن حوقل اور ابو زید یہ سب سیاح ؟ بلھارا ؟ یعني گجرات کے بلبھی راجاؤں کي بڑي فراخدلی سے تعریف کرتے ھیں - اور مسلمانوں کے ساتھہ اُن کي دوستي اور محبت تسلیم کرتے ھیں - سلیمان لکھتا ھے "" ھندستان کا کوئی اور راجہ عربوں سے اتني دلچسپي نہیں رکھتا جتني کہ بلبھہ رائے ؟ اور اُس کی رعایا راجہ کے مثال کی تقلید کرتي ھے - مسعودي جہاں جہاں گیا اس نے اپنے ھم مذھبوں کو مذھبی عبادات میں آزاد پایا - گجرات کے راجہ کے بارے میں وہ لکھتا ھے "" اس کے راج میں اسلام کي عزت اور

---

* رینو ؟ ریلا سیاں دي ویار -

حفاظت ہوتي ہے - ملک کے ہر حصے میں بڑی بڑي مسجدیں ہیں جہاں روز پانچوں وقت نماز پڑھی جاتي ہے * - "

الاصطخری † نے سنہ ۹۵۱ ع میں ہندستان کا سفر کیا - وہ کہتا ہے کہ گجرات کے سب ملکوں میں مسلمان آباد ہیں اور راجا نے مسلمانوں ہي کو اُن کا افسر بنایا ہے - ابن حوقل نے فسحّل ' سندان '، سیمور اور کھمبایت میں جامع مسجدیں دیکھیں - ادریسي نے گیارھویں صدي میں مسلمان سوداگروں کو بڑي تعداد میں انہل واڑے میں تجارت کرتے پایا - وہ لکھتا ہے کہ راجا اور اُس کے وزراء اِنھیں عزت کے ساتھہ اپنے دربار میں بلاتے ہیں - اور اُن کي ہر طرح مدد کرتے ہیں -

شمالي ہندستان کے مغربي ملکوں میں مسلمانوں کي حالت ویسي ہي ہوگئي تھي جیسي مغربي اور جنوبي ہندستان میں - محمود غزنوي کے حملوں کے پہلے ہي اِنھیں اپنے مذہب اور رسوم کے پھیلانے کا موقع مل چکا تھا - ہندو راجا خود اُن کے اثرات پھیلانے کے باعث تھے - محمد عوفي ‡ لکھتا ہے کہ جب کھمبیات کے ہندوؤں نے مسلمانوں سے جھگڑا کیا تو مہاراجا سدھہ راج نے کل معاملے کي جانچ کي اور اور فسادیوں کو سزادي - مسلمانوں کا جو نقصان ہوا اُس کا بدلا دیا اور اپنے خرچ سے اُن کي مسجد بنوادي - یہی نہیں بلکہ کئي ہندو راجاؤں کي فوج میں مسلمان سپاہي بھرتي تھے - سومنات کے راجا کي فوج میں کئي مسلم افسر تھے - احمدآباد کے قصائی اپنے کو بگھیل راجاؤں کے خراسانی سپاہیوں کے خاندان سے بتاتے ہیں§ -

* ایلیٹ جلد ۱ صفحہ ۲۹ -
† ایلیٹ جلد ۲ صفحہ ۱۶۴ -
‡ ایلیٹ جلد ۲ صفحہ ۱۶۲ -
§ مصنفہ میر غلام علي آزاد مآثرالکرام صفحہ ۲ -

مسلمان فقیر اور صوفي، سوداگروں اور سیاحوں کے ساتھہ ساتھہ چلتے تھے - نویں صدي* میں ابو حفص رابع بن صاحب‌الاسدی البصري ایک تارک‌الدنیا محدث سندھہ میں آیا - اُس‌کي وفات ۱۶۰ ھ (سنہ ۷۷۶ع) میں‌هوئي- دسویں‌صدي‌میں‌مشہور صوفي‌منصورحلاج † سمندر کے راستے سےهندستان پہونچا اور خسکي کے راستے شمالي‌هندستان هوتا هوا ترکستان گیا، گیارھویں صدی میں بابا راهن‡ درویشوں کے ساتھہ بغداد سے بھڑوچ آیا - کہا جاتا هے کہ اُس نے راجا کے لڑکے کو مسلمان بنایا - سنہ ۱۰۶۷ع میں بوهروں § کا شیخ یمن سے گجرات آیا - سنہ ۱۰۹۴ع اور ۱۱۴۳ع کے بیچ میں نورالدین|| یعني نورست‌گر نے گجرات کے کنبي کھتوا اور کوریوں کو اپنے مذهب کا پیرو بنایا -

محمود کے حملوں کے بعد بہت سے مسلمان عالم اور درویش هندستان میں آئے، جن کا ذکر خالي از طوالت نہیں هے - عربي اور فارسي کي سوانح‌عمریوں کي کتابوں میں سیکڑوں نہیں هزاروں نام ملتے هیں - کچھہ کے نام یہاں دینا نامناسب نہ هوگا -

علي بن عثمان، الهجویري¶ جس نے کشف‌المحجوب تحریر کي، عربی کا رهنے والا تھا - لاهور میں آ کر بسا اور ۴۶۵ ھ (سنہ ۱۰۷۲ع) یا ۴۶۹ ھ (سنہ ۱۰۷۶ع) میں اُس کی وفات هوئی - شیخ اسمعیل**

* میر غلام علي آزاد ماثرالکرام صفحہ ۲ -
† کیمبل ہیورٹ اینڈ بروچ (گزٹیر آف گجرات) صفحہ ۵۲۸ -
‡ ایل میسي نیاں کتاب الطا و سین مقدمہ صفحہ ۵ -
§ فاربس — '' راس مالا '' -
|| آرنلڈ - پریچنگ آف اسلام باب هندستان -
¶ کشف‌المحجوب مرتبۂ نکلس مقدمہ -
** آرنلڈ متذکرہ بالا -

بخاري گیارھویں صدي کے شروع میں یہاں آیا - فریدالدین عطار *
جو تذکرۃالاولیا اور منطق‌الطیر کا مصنف ہے بارھویں صدي میں یہاں آیا -
شیخ معین الدین چشتي† سنہ ۱۱۹۷ع میں اجمیر پہونچے ؛ یہ کہا
جاتا ہے کہ راے پتھورا اُس وقت زندہ تھا - اجمیر کے مندر کا مہنت
راے دیو تھا ؛ اور سلطنت میں اجمال بڑا جوگي تھا - اِن دونوں
نے شیخ معین الدین چشتي کے ہاتھوں پر مذہب اسلام قبول کیا -
چشتیہ سلسلے کے بڑے بڑے صوفیوں میں قطب الدین بختیار کاکی ؛
فرید الدین گنج شکر ؛ نظام الدین اولیا وغیرہ وغیرہ تھے - سہروردي
سلسلہ والوں میں جلال‌الدین‡ تبریزي ؛ دوسروں میں جلال الدین
بخاري ؛§ بابا فرید ناک|| نتنی تھے -

عبدالکریم جیلي¶ جس نے اہل تصوف کے زبردست عالم ابن‌العربی
کی کتاب کی شرح اور انسان کامل لکھی ہے سنہ ۱۳۸۸ع میں یہاں
آیا - اسي صدی میں سید محمد گیسو دراز** نے مہاراشٹر میں اسلام
پھیلایا - پیر صدرالدین†† نے خوجہ فرقے کي بنیاد ڈالي ؛ اور سید
یوسف الدین‡‡ نے مومن فرقے کي - اِن صوفیوں کے علاوہ بہت سے فقیر جو
کسي ملک سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور جن کا مذہب کسي قاعدے

---

* تذکرۃالاولیا مرتبۂ نکلسن -

† عبدالحق اخبارالاخیار صفحہ ۲۲ -

‡ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۴۵ -

§ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ٦۰ -

|| مکالف دی سکھ ریلیجن جلد ۳ صفحہ ۳۵٦ -

¶ نکلسن - اسٹڈیز اِن اسلامک مسٹي‌سیزم صفحہ ۸۱ -

** آرنلڈ متذکرہ بالا -

†† بامبیے گزٹیر جلد ۹ حصہ ۲ صفحہ ۴۰ -

‡‡ ایضاً ایضاً ایضاً صفحہ ۲۷ -

کا پابند نہ تھا ؛ ملک میں پھرتے تھے ۔ سخی سرور * ست گرو پیر اور شاہ مدار† کے نام اِن میں بہت مشہور ہیں ۔

بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام تلوار کے زور اور مسلمان بادشاہوں کی طاقت کے سہارے سے اس ملک میں پھیلا ۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا ' کیونکہ مسلمان بادشاہوں میں صرف تین یا چار ایسے ہوئے جنھوں نے مذہب کے پھیلانے کی کوشش اپنی قوت حکمرانی کے ذریعہ کی ۔ لیکن تیرھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک پانچ سو برس کے ہندستان کی تاریخ میں سیکڑوں چھوٹے بڑے سلطانوں ' بادشاہوں اور شہنشاہوں میں صرف تین یا چار کی وجہ سے ہم یہہ نہیں کہہ سکتے کہ حکمرانی کی قوت سے مذہب پھیلایا گیا ۔ فیروز ' سکندر ' زین العابدین ' اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان کے ناموں کے علاوہ کوئی ایسا نام مشکل سے ملیگا جس کے لیے کہا جائے کہ اُس نے اسلام کے پھیلانے میں حکومت کی طاقت سے کام لیا ۔

یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ دولت ' عہدوں ' مرتبوں اور خطابوں کے لالچ سے بہت سے ہندوؤں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ۔ حاکموں کی خوشامد کمزور آدمیوں سے بہت کچھہ کرا لیتی ہے ' لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح مذہب کا پرچار تلوار کے ڈر سے ہوا ۔

سچ تو یہ ہے اسلام کا اثر تیرھویں صدی تک دکن میں بلا کسی غیر واجبی دباؤ کے پڑا ۔ شمال میں بادشاہت قائم ہونے سے پہلے ہی مسلمان آچکے تھے ۔ بادشاہت کے قائم ہو جانے کے بعد اسلامی تہذیب کی اشاعت نہ صرف امیروں ' مالکوں اور سلطانوں کے باعث

---

* ارنلڈ دی سینٹس اینڈ مارٹرس آف انڈیا ۔
† ایضاً ایضاً ایضاً

بلکہ زیادہ تر فقیروں، درویشوں اور صوفیوں کی وجہ سے ہوئی - یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صوفی اور فقیر اسلام کے مبلغ ہوتے ہوئے بھی حکومت کی اندھا دھند پیروی نہیں کیا کرتے تھے - حکومت کے مذہبی محکمے کے قاضیوں اور مفتیوں سے اِن درویشوں کی ہمیشہ اَن بَن رہتی تھی - یہی ٹھیک بھی ہے - قاضی کٹّر قانون کے پابند، درویش خدا کی بندگی میں مست، ضابطوں میں بندھے ہوئے لوگوں میں اور پریم کے متوالوں میں کیسے نبھ سکتی تھی - مسلمان سلطنتوں کی تاریخ کے صفحات اِن جھگڑوں سے بھرے پڑے ہیں - درویش سلطنت کی اندھی اطاعت نہیں کرتے تھے - لیکن مصلحت اندیش بادشاہ اِن سے بہت سے کام لیا کرتے تھے - بادشاہ اُن سے صلاح لیتے، سفیر کا کام کراتے اور شہزادوں، صوبہ داروں اور امیروں کے جھگڑے نپٹواتے تھے - کمزور رعایا انہیں اپنا مددگار، دکھ درد کا ساتھی اور شاہی بے انصافیوں سے بچانے والا سمجھتی تھی -

یہ واقعات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بہت سے صوفی فقیر ونچے اور فیاض طبیعت کے لوگ ہوتے تھے - اِن میں سے کتنے ہی ایسے تھے جنہوں نے گھر بار، اور مال دولت، کو لات مار کر دنیا سے منہہ موڑ لیا تھا اور خدا کی محبت میں دنیا کو ترک کر کے ذکر، شغل اور مراقبے میں طبیعت کو غرق کر دیا تھا - اِن فقیروں کی آتما طاقتور تھی، انہیں کسی کا خوف نہ تھا، اُن کا دل بندگی اور محبت کی کیفیتوں سے لبریز تھا، وہ اسلامی یکجہتی اور مساوات کے اصولوں کے حامی تھے - اسی لیے اچھوتوں، گرے ہوئے لوگوں اور غریبوں کو سماج راج، پنڈتوں اور عالموں کے ستائے ہوئے مصیبت زدوں کو

ان كي باتوں میں الہام، ان کے کاموں میں کرامات اور ان کي سیرت میں خدائی کی جھلک نظر آتي تھي۔

غریب اور مصیبت زدہ لوگ ھی نہیں امیر، راجا، اور پروھت بھي کبھي کبھي اِن کے روحانی انوار سے متاثر ھو جاتے تھے۔ اور ان کي طرف کھنچے آتے تھے، اور اپنے پرانے رسم و رواج کو چھوڑ کر اُن کے عقیدوں اور اُن کے سلسلوں کو قبول کر لیتے تھے۔

مثنوي حزن اختر اور خصوصیات مصنف

(از مولانا احسن مارهروی اُردو پروفیسر انٹرمیڈیٹ کالج علیگڑھ)

۲ - اِنہماک نشاط اور اس کے متعلقات

دنیا اور دنیا کے عیش و نشاط کے لیے غریب واجد علی شاہ هي مورد الزام نهیں، بلکه جب سے مسلمانوں میں عجمي معاشرت پیوست هوئي هے اُس وقت سے اِس وقت تک کوئي خلیفه، کوئي ظل‌الله، کوئي بادشاه، کوئي والی ملک اور کوئي فارغ‌البال انسان اپني شبستان عشرت میں بوریا نشین بن کر دعاے گنج‌العرش پڑھتا نظر نهیں آیا - بات یه هے که اکثر پراني داستانیں کرم خوردہ کتابوں میں دب کر فرسودہ هو چکي هیں اور بعض نیم مردہ حکایتیں جو ابھی زبانوں پر باقي هیں وهي دنیا میں نقل مجلس بنا کر طشت از بام هوتی رهتی هیں -

"بد اچھا بدنام برا" یه مثل جان عالم اختر پر پوري صادق آتي هے اور همارے خیال میں اس کا سبب تفضیح زیادہ تر خود اُن کی تصانیف هوئي هیں -

گُل و گلچیں کا گله بلبلِ خوش لهجه نه کر
تو گرفتار هوئی اپنی صدا کے باعث

بدنام عیش پرستوں میں جس قدر دہلي کے محمد شاہ رنگیلے اور لکھنؤ کے جانِ عالم پیا تمام بادشاہوں میں پیش پیش ہیں اِس قدر کوئی دوسرا بادشاہ نظر نہیں آتا۔ لیکن حجابات نظر فریب اگر ہٹادیے جائیں تو حمامِ عیش پرستی کي عام عریاني نمایاں ہوجائے گي ۔ اس مضمون میں سلاطین ماضی کي پردہ‌دري منظور نہیں ؟ مثلاً ایک واقعے کي مطابقت و مماثلت دکھا کر ناظرین کو قرایں قایم کرنے کا موقع دیا جاتا ہے ۔

محمود غزنوي کي ایاز نوازی محتاج تشریح نہیں؟ اور قصص و حکایات سے قطع نظر کر کے صرف ایک مشہور واقعہ لکھا جاتا ہے ۔—

"ایک دن بزمِ عیش میں بادۂ و جام کا دور تھا؟ محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ پي کر بدمست ہوگیا ؟ اسي حالت میں ایاز پر نظر پڑی؟ اُس کي شکن در شکن زلفیں چہرے پر بکھري ہوئي تھیں ؟ محمود نے بے اختیار اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالدیے؟ لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوشِ تقویٰ میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھدے؟ ایاز نے فوراً حکم کي تعمیل کی ؟ صبح کو جب محمود سو کر اُٹھا تو ایاز کي صورت دیکھہ کر سخت مکدر ہوا ؟ بار بار اُٹھہ اُٹھہ کر بیٹھہ جاتا تھا ؟ ندما اور مقربین دم بخود تھے آخر علی قریب نے جو حاجب خاص تھا عنصری۔ کو بلا کر صورتِ واقعہ بیان کي ؟ عنصري نے محمود کے سامنے جا کر یہ رباعي پڑھي ۔—

گر عیب سر زلف بت از کاستن است

نے جاے بہ غم نشستن و خاستن است

وقت طرب و نشاط و مے خواستن است

کاراستن سرو ر پیراستن است

یعنی معشوق کی زلفیں اگر ترش گئیں تو رنج و غم کی کیا بات ہے ؟ یہ تو اور خوشی کا موقع ہے اس لیے کہ جب سرو چھانٹ دیا جاتا ہے تو اور زیادہ موزوں ہو جاتا ہے ،،

(شعرالعجم جلد اول ـ ص ۹۲)

اسی عشوہ پرستی کے سلسلے میں واجد علی شاہ کا انداز دیکھیے :—

،، واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ عورتوں کے عشق میں دیوانے ہو رہے تھے ـ اور بعض حسینوں سے اس درجہ محبت تھی کہ قید میں جب اُن کے وصل سے محروم تھے تو ہر وقت اُنھیں یاد کیا کرتے اور بار بار اُن سے یادگار محبت کے طور پر اُن کی خاص خاص چیزیں مانگ بھیجا کرتے؟ بعض فرمایش پوری کر دیتیں تو خوش ہوجاتے اور بعض ناز آفرینی اور شوخ ادائی کے انداز سے نہ بھیجتیں تو شکایت کرتے ـ دلدار محل سے اُن کی مسی مانگی اُنھوں نے بھیج دی ؟ اختر محل سے اُن کی زلفوں کے بال منگوائے اُنھوں نے بھیج دیے جن کو ہمیشہ سرھانے نظر کے سامنے رکھتے اور بار بار سونگھتے ـ ،،

(مقدمہ حزن اختر نوشتہ مولوی عبدالحلیم شرر ص ـ ۲۲)

اس بیان کی تصدیق خود بادشاہ یوں کرتے ہیں ؟ :—

طبیعت بہت میری گھبرائی جب

کیا بائے قیصر کا چھلّا طلب

کٹے ناخنِ دست معشوق سے

طلب یہ کیا دل کے صندوق سے

منگائی پھر اِک شے یہ اک یار سے
مسّیِ شب آلودہ دلدار سے
یہ اختر محل سے کہا اے قمر
ذرا بھیج دے اسے تو موئے سر
کہا جعفری سے کہ اے خوش جمال
مجھے چاہیے تیرے منہ کا اُگال
کہ آگے بھی بھیجا تھا تونے اُگال
منگا کر مرا خوش ہوئی تھی کمال
اس اختر کا تو کہا حکمی ہے اُگال
نہ کر بھیجنے میں تو اب قیل و قال
انگوٹھی بھی بھیجی تھی تونے مجھے
دیا لعل تجھ خوش گلو نے مجھے
دُلائی بھی اِک ؟ اِک دوپٹہ بھی یار
مجھے بھیجا تھا شک نہیں زینہار
اُتنا بدن کا عنایت ہوا
مجھے تھوک پھر واں کا بھجوا ذرا
کہا جعفری نے کہ سن اے جواں
کہاں میں؟ کہاں تو، کہاں یہ بیاں
منگا اُس سے جس کو دیے ہیں ہزار
بہت جس کا سینے میں ہو تیرے پیار
نہ بھیجوں گی میں تجھ کو اپنا اُگال
دیا کچھ نہ اُس نے سوائے ملال
دیا ملکۂ ملک نے یہ پیام
کہ میرا ہے دنیا میں معشوق نام

مثلاً اُن کے ناخن جو کرتی ہوں پیار
وہ بھیجیں جو ہوں آپ کی راز دار
جو مانگے ہیں ناخن نہیں ہیں وہ اب
یہ حجام کا کام سیکھا ہے کب
دیا مجھ کو دلدار نے یہ جواب
نہ بھیجی مسی تو نہ کرنا عتاب
طبیعت مری ہے نہایت علیل
نکلتی نہیں بھیجنے کی سبیل
تو پھر بولی یوں قیصرِ نامدار
نہ کر مجھ کو معشوقوں میں تو شمار
مرے پاس چھلا کہاں اے جواں
کہاں ہے کہاں ہے کہاں ہے کہاں
کسی کی نہ مجھ پر عنایت ہوئی
کسی کی نہ زنداں میں چاہت ہوئی
نہ بھیجی کسی نے مجھے کوئی چیز
کسی نے نہ دی دوستی کی سبیز
مگر ہاں اک اختر محل ہے لئیق
وہ زنداں میں میری ہوئی ہے رفیق
وہیں موئے سر مجھکو بھجوا دیے
بنا جس طرح مجھکو پہونچا دیے
رکھے موئے سر میں نے دل کے قریں
یہ سمجھا کہ دل میں ہے وہ مہ جبیں
(از مثنوی حزن اختر مطبوعہ سلطان المطابع - ص۱۲۸ تا ۱۳۰)

ہرچند محمود اور اختر کے زمانوں میں کم و بیش آٹھ سو نو سو برس کا تفاوت ہے لیکن دل کے جذبات کا عالم متغیر نہیں؟ یہ امر آخر ہے کہ اس فطری شوق و ذوق کو عشق و مستی سے تعبیر کیا جائے یاہوس پرستی سے -

تم جسے چاہو چڑھالو سر پر - ورنہ یوں دوش پہ کاکل ٹھہرے

واجد علی شاہ کی عیش سامانیوں اور اُن کی تصدیق و تکذیب کا بغیر ثبوت کامل ہمیں کوئی حق نہیں - بجز اس کے کہ شاہ موصوف کے کلام نظم و نثر کا کچھ انتخاب درج کردیا جائے جس سے ناظرین خود اندازہ کر سکیں کہ ان گرد و پیش واقعات اور ایسے ماحول میں قرائن کیا رہنمائی کرتے ہیں -

اس سے پہلے کہ ان کے خود نوشت اقتباسات اشعار کو پیش کیا جائے شاہ اختر کی دینداری اور اخلاقی استواری کا موازنہ بھی محمود غزنوی کے حوش تقویٰ سے کر لینا چاہیے جیسا کہ شعرالعجم کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے —

مولوی علی حیدر طباطبائی اور مولوی عبدالحلیم شرر جنہوں نے اپنی آنکھوں سے کم و بیش مٹیا برج کی مٹی ہوئی بہاریں دیکھی ہیں لکھتے ہیں —

۱ - ۲۳ شوال ۱۲۷۳ ھ (۱۸۵۹ع) صبح کا وقت تھا بادشاہ وظیفے میں مشغول تھے کہ دھنی طرف مڑ کر دیکھا کہ دریائے بھاگرتی میں تین جنگی جہازوں نے ایوان شاہی کے محاذی لنگر ڈال دیا " ماخوذ از رسالۂ ادیب مارچ سنہ ۱۹۱۲ع صفحہ ۱۵۷)

۲ - " لوگوں میں شہرت ہے کہ عیش پرستی نے اُن کو زناکاری میں مبتلا کر دیا تھا مگر عہد شاہی کے واجد علی شاہ کو میں نہیں جانتا ؟ مٹیا برج کے واجد علی شاہ

شاہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تو اتقا و پرہیزگاری ، خدا ترسی اور خدا پرستی کی مجسم تصویر تھے حضرت جان عالم کو اگر واقعی الزام دیا جا سکتا ہے تو موسیقی کا الزام ہے - اِس فن کو اُنھوں نے ابتدائے عمر سے حاصل کیا تھا جس کی طرف طبعی رجحان تھا اور اُس کا شوق اُن کے دل و دماغ میں اِس درجہ راسخ ہو گیا تھا کہ اچھا گانا چاہے کیسے ہی اتقا و پرہیزگاری پر آمادہ ہوں تو نہ توڑا دیا کرتا - (مقدمۂ حزن اختر نوشتہ شرر صفحہ ۱۰ و ۱۱)

ناٹک ساگر کے مصنفین نے "شاہان اسلام اور ہندوستانی ڈراما" کے تذکرے میں واجد علی شاہ کے راجہ اندر بننے اور اندر سبھا وغیرہ کی جو بحث کی ہے اُس کا سلسلہ بہت طویل ہے - رسالہ اُردو اورنگ آباد اور دلگداز لکھنؤ میں کئی مضامین اس کے متعلق شائع ہوئے ہیں - ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ واجد علی شاہ نے اِندر سبھا امانت کا ڈراما قیصر باغ میں شروع کیا یا اپنا رہس مبارک ، اور وہ راجہ اندر بنے یا کنھیا جی - جس کو اِس مباحثے کی تفصیل دیکھنی منظور ہو وہ ناٹک ساگر صفحہ (۳۵۴) اور رسالہ اُردو اورنگ‌آباد (اپریل سنہ ۱۹۲۷ع) کا مطالعہ کرے -

---

اِس مضمون میں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ واجد علی شاہ کا انہماک نشاط کس قدر تھا اور اس کے متعلقات کیا تھے ، جن کا وقوع اختلاف کے باوجود ثابت ہے یعنی شاہ اختر خواہ راجہ اندر بنتے ہوں یا کنھیا جی ، بہر حال بے منہمک نشاط

اب رهي اسباب و متعلقات كي تحقيقات ؟ وه حسب ذيل اقتباسات سے حاصل کی جاے —

۱ - اپنے پیارے جوڑے کو حال درد دلِ پُر ملال لکھتا ھوں ؟ رنگ هجر و وصال لکھتا ھوں - اے بلقیس ! اے رشک پریس' بڑي دیر سے ہم آئے ھیں ؟ جہاڑ کنول تمہارے لیے بارہ‌دری سکندر باغ میں سجوائے ھیں ؟ صاحب ؟ تم کہاں ہیں ؟ یہاں بھی نہ وہاں بھی - خدا کے واسطے سچ بتاؤ ذرا ھاتھ تو اِدھر لاؤ - میرا دل دیکھنا کیسا دھڑکتا ہے - مثل طائر مذبوح پھڑکتا ہے - لو پھر میں اب سوار ھو جاؤں تمہارے واسطے بھي گاڑي چوکڑی تیار کروا منگواؤں - کوچوانوں کي آنکھوں پر پٹیاں بندھوا دوں - جوانان چمن پھر رہے هیں کوئی قصہ بڑھکر ابھی بھی کہہ‌سکا دوں ؟ آب شبنم سے برگ درختان دھو جائیں ؟ ملکۂ عالمیان سلامت ! اب ہمارے تمہارے وصل کے موقعے ھو جائیں - حمام سکندر باغ تیار ہے حکم دیجیے تو خزانے کا پانی حوض کي تہ میں بھی خزانۂ بالا کھلوا دوں - آبشاروں کو اپنے حال زار پر رلوا دوں ؟ (رسالہ مخزن لاهور مرحوم شاہ اودھ کے خطوط ستمبر سنہ ۱۹۰۵ع -)

۲ - جانِ جاں ! تم جو بدر عالم کو جانِ عالم کی دلہن لکھتے هو - جواب بدر عالم —

اے خورشید تاباں حسن دور سے تم برج حمل کو گئے ہیں بدر سے هلال ' غمگیں کمال هوئي جو دلہن کہتے هو ؟ حق تعالیٰ وه دن لائے کہ دولہا مع برات آئے -

عروس شب گھونگھٹ فراق کو ھٹا کر مصحفِ رخسا
دکھائے ؟ شربت وصل پلائے جب دلھن کھنا - ؟؟

۳ - جانِ عالم ! جب ھمارا دل تمہاري محبت میں گھبرا
تھا بغیر دیکھے چین نہ آتا تھا ؟ بے تاب ھو کر تمہار
دیکھنے کو آتی تھي ؟ اور جس وقت جلسہ معشوقو
کا تمہارے پاس پاتي تھی ؟ جل بھن کر خاک ہ
جاتي تھي - عاشق ھیں مگر جلے تن ھیں ؟ اَ
عاشقوں میں نہیں ھیں کہ ھمارے سامنے تم اوروں
. . گلوریاں دو ؟ ھمیں جلاؤ ؟ کیا کریں ھمیں تو برداشہ
غیر کے سایہ دیکھنے کي بھی نہیں ؟ دیکھہ کر چلي آتر
تھي ھماري بہن صاحبہ ھم کو دھمکا کر مار رکھتر
تھیں نہیں تو ھم اسي زمانے میں تم سے لڑتے ا
اپني جان دیتے -

۴ - میرے اختر جنیا پر واضح ھو کہ حسب سرشتۂ قدیر
زنجیرھاے منتي ایک طلائي اور ایک نقرئي اِس پابند
سلسلۂ عشق نے بھجوائی ھیں اپنے پیارے جاني کر
سلامتیاں منائي ھیں ؟ جان عالم تم کو میرے سر کر
قسم پر فور پہنچنے کے اِن زنجیروں کو گلے میر
ڈال لیجیے گا اس معتوبہ دور اُفتادہ کو شاد کیجیے گا
کس واسطے کہ دور ھوں ؟ اِس سے مجبور ھوں اَ
پاس ھوتي جس طرح تم پہنتے پہناتي ارمان دا
گا نکالتي مزا اُٹھاتي - .. ..

(خطوط نواب بدر عالم " موسوم ,
اریخ بدر " مرتبۂ واجد علي شاہ اختر صفحہ - ۲۶ و ۳۲ و ۳۳ و ۴۳

ایسے مکتوبی مضامین اگر چہ لفظاً مجاز مرسل کا لباس مستعار پہنے ہوئے ہوتے ہیں لیکن معنیً اپنے موضوع حقیقت کے دامن گیر رہتے ہیں۔

مثنوی حزن اختر میں جہاں جہاں اپنے پسندیدہ مشاغل اور بیگموں کے تذکرے کیے ہیں اُن اشعار کو پڑھکر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس کا مصنف نہ صرف طبعاً اور فطرۃً عیش پسند اور کمزور طبیعت کا آدمی ہے بلکہ غیر وضعی طور سے نسائیت کی طرف زیادہ رجحان رکھتا ہے ۔ ایک جگہ اپنے ضعف ونقاہت کے بیان میں لکھا ہے۔۔۔

یہ احوال اعضا ہے جیسے کباب
نہ رگوں میں دل ہے نہ وہ پیچ و تاب
کلائی کا عالم یہ ہے کم ہوئی
کہ پنجہ جو گل سے کیا خم ہوئی
یہ گالوں کا عالم ہے اے خوش خصال
ہوے بدر کامل سے گھٹ کر ہلال
لویں کانوں کی دونوں مرجھا گئیں
گُل تر کی کلیاں تھیں کُمھلا گئیں
وہ سینہ جو تھا تختۂ نور سا
وہ مُکھڑا جو تھا خوشنما حور سا
ہوئے اس قدر دونوں غم سے نحیف
کہیں میں ہوں جس طرح سے دو حریف

مثنوی حزن اختر صفحہ (۸ و ۹ و ۱۰)

اُن اشعار میں رگوں کا پیچ و خم؟ کلائی کی گل سے پنجہ کشی ۔ گالوں کا بدر کامل و ہلال ہونا کان کی لویں اور گل تر کی کلیاں پھر سب پر طرہ یہ کہ اپنے چہرے کو مکھڑا کہنا؟

کسی طرح کسی مرد آدمی کے منھ سے بھلا نہیں معلوم ہوتا -
الخلاصہ ، یہی وہ متعلقات نشاط ہیں جن کی وجہ سے وہ
باوجود ذی علم ، خوش اطوار ، سلیم الطبع اور دین دار ہونے کے اپنے
اوقات اچھے مشاغل میں بسر نہ کر سکے اور آخر میں ہمیں پھر کہنا
پڑتا ہے کہ یہ سب اُن کی بے محل صاف گوئیوں کا نتیجہ ہے
کہ اُن کے بعد مورخین و مصنفین کو اس قسم کے استدلال و اجتہاد کی
گنجایش نظر آئی ، جس کی تائید میں نانک ساگر کے (صفحہ ۳۶۱) پر
یہ عبارت (صحیح یا غلط) لکھی گئی -

" یہ تو مسلمہ ہے کہ واجد علی شاہ رہس میں پارٹ کیا کرتے تھے
اور یہ بھی مخفی نہیں کہ اختر پیا کی تمام زندگی ایک
ڈراما ہے جس میں وہ کبھی نئی نویلی دلھن ، کبھی
سہاگ لُٹی بیوہ ، کبھی دردوں کی ماری رچھ کی شکل میں
دکھائی دیتے ہیں -

بہر حال اب اس تذکرہ انہماک نشاط کو مولوی عبدالحلیم شرر
مرحوم کی اس عبارت پر ختم کیا جاتا ہے —

جب ہم بہت سے بزرگان دین کو صحبت غنا کا لطف
اٹھاتے دیکھتے اور تعرض نہیں کرتے ہیں تو واجد علی شاہ
مرحوم کے معاملے کو بھی خدا پر چھوڑ دینا چاہیے -
خدا معاف کرنے والا ہے اور امید ہے کہ برگشتہ بخت
تاجدار اودھ کے اس جرم کو وہ اُن کی اور نیکیوں کے
صلے میں معاف کردے گا - "

(۳) زوال سلطنت

یہ عنوان بہت پیچیدہ اور دردناک ہے ، پیچیدہ اِس لیے کہ اِس میں

بے شمار سیاسی عقدے ہیں ؟ اور درد ناک اس لحاظ سے کہ ایک بھولا بھالا خوش مزاج بادشاہ بیٹھے بٹھائے اُن مصیبتوں میں مبتلا ہو گیا جس کے لیے وہ بنایا نہیں گیا تھا - لہذا معاملات سیاست میں اِس سے زیادہ تجسس و تلاش یا تصفیہ وتنقیح کا موقع نہیں کہ چند ایسے واقعات قلم بند کردیے جائیں جن سے زوال سلطنت کی حقیقت تاریخی واضح ہو جائے :—

۱ - خان بہادر مولوی محمد مسیح الدین کاکوروی جو واجد علی شاہ کے سفیر بن کر ولایت گئے تھے اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں :—

"قریب دو برس کے میں خانہ نشین رہا کہ اتنے میں اودھ کی سلطنت سرکار انگریزیہ نے ضبط کرلی ؟ جس دن ضبطی کا حکم بادشاہ کو سنایا گیا راقم اپنے گھر میں تھا بتاکید میری طلبی ہوئی اور بادشاہ نے اپنے پاس مجھے بلا کے نہایت تاکید سے دوسرے یا تیسرے دن ضبطی کے مجھے کلکتہ کی روانگی کا حکم دیا یہاں تک تاکید تھی کہ اُسی طرف سے میں روانہ ہو جاؤں اور پھر گھر میں نہ جاؤں ایسے اضطراب میں مجھکو روانہ کیا کہ طبیعت نہایت منقبض ہوئی ۔ اُس کی صبح کو کلکتے کی طرف روانہ ہوا اور بادشاہ کو اُن کے خیر طلبوں نے صلاح دی کہ بذات خود انگلستان کی طرف روانہ ہوں اور مرافعہ اپنی مظلومی کا ملکہ معظمہ کے حضور میں اور پارلیمنٹ میں بذات خود اصالتاً پیش کریں حقیقت میں یہ رائے بادشاہ کے واسطے بہت بہتر تھی اگر ایسا کرتے تو دو برس جو اُنھوں نے قلعے میں رہنے سہنے سے مصیبت جھیلی اُس سے محفوظ رہتے

اور غالب گمان قریب نہ یقین کے ھے کہ جو مآل
اب بادشاہ کے واسطے ھوا اُس سے مراتب بہتر ھوتا ۔
الغرض پہلے تو بادشاہ نے اسي عزیمت در کلکتے کی
روانگي کا قصد کیا چنانچہ اسي بندوبست کے واسطے
پہلے راقم کو روانہ کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد خود
بھی روانہ ھوئے مگر چوں کہ جبلت سے ضعیف‌القلب
ھیں اور دریا کے سفر سے اُن کو نہایت خوف و خطرہ بھاکلکتے
میں پہنچ کر رائے بدل گئی ۔ اپنی عزیمت موقوف کي ؟
ملکۂ کشور بڑی والدہ ماجدہ کو اور مرزا حامد علي بہادر
ولي عہد کو اور مرزا جواد علی سکندر حشمت اپنے بھائی کو
ولایت کي روانگي کے واسطے تجویز کیا اور راقم کو سفیر مقرر
کیا ۔ اور قبل روانگي کے راقم نے بادشاہ کے حضور میں
عرض کیا کہ جس امر کے واسطے قبلۂ عالم قدري کو اور
اپنے عزیزوں کو اس سفر دور دراز میں بھیجتے ھیں
بہت صعب امر ھے اور انجام اُس کا موقوف نہایت
صبر اور تحمل اور محنت اور مشقت اور مصارف کثیرہ
پر ھے اگر پیچھے سے گھبرا کے نقدي قبول کر لینا منظور
ھے تو ناحق اس امر کو آپ اختیار فرماتے ھیں ؟
مجھے حکم ھو تو راقم یہیں بہت اچھا بندوبست
سلطان عالم کے واسطے کرا دیوے ۔ اِس در ارشاد ھوا
کہ میں بھیک مانگوں گا دریوزہ گری کروں گا مگر زنہار
ایک حبہ نقدی میں نہیں قبول کرونگا زنہار تم اس
طرح کي گفتگو کبھی نہ کیجیو ۔ عرض راقم مع سارے
قافلے کے ۱۸ جون ۱۸۵۶ ع کو بنگال نام جہاز

پر سوار ہوا اور جہاز نے کلکتے سے لنگر اُٹھایا - اب چوں کہ وہي سب نالائق لوگ جو سلطنت کي ضبطي کے باعث ہوئے تھے سب پادشاہ کے ہمراہ تھے اور وہي درانداریاں اور سازشیں اور جوڑ بندیاں بدستور تھیں • ملکۂ کشور کے ساتھہ بعضے مفسد جن کی کرنیل سلیمن نے شکایتیں لکھی تھیں اور وہ چھپ کے بلیو بک (Blue Book) میں ارباب پارلیمنٹ کے پاس پیش تھیں کہ وجوہ ضبطی سلطنت میں ایک وجہ مفسدہ پروازی اُن لوگوں کي لکھي گئي تھی • اُن ایک سو چالیس آدمی کے زمرے میں جو ہمارے ساتھہ روانہ ہوے شریک ہو گئے • بعضے لوگ جو لکھنؤ میں قدیم سے جعل ساز مشہور تھے اُن کو ان مفسدوں نے پیچھے بلا لیا کہ دوسرے جہاز پر سوار ہو کے اسکندریہ میں شامل ہو گئے اور بعضے خواجہ سرا جھلا اور بعضے دو دو پیسے کے آدمي تینوں صاحبوں کے ہمراہ گئے کہ وہي سب اُن تینوں سرکاروں میں پیش پیش اور با اقتدار تھے - چنانچہ بعد لندن میں پہنچنے کے کرنیل سیکسن جو اُس عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپني کے چیرمین تھے ایک دن وہ راقم سے کہنے لگے کہ مولوي صاحب ہم آپ کے بڑے شکر گزار ہیں کہ آپ ہمارے دعووں کے سب گواہ ہمراہ لے کے آئے ہیں - پہلا فساد جو مرزا ولی عہد بہادر کے ہمراہیوں سے ہوا وہ یہ تھا کہ بعضے رقوم جواہرات گراں بہا کے جو بادشاہ نے حضرت ملکۂ معظمہ کي نذر کے واسطے ہمراہ

کیے تھے وہ مرزا ولی عہد کے مفوض ہوے تھے اور
ایک خواجہ سرا حبشی اُن کی طرف سے خزینہ دار
تھا جب بندر سویز میں جہاز کا لنگان ہوا چونکہ
وہ بڑا بھاری جہاز گھاٹ تک نہیں جا سکتا تھا اس
واسطے ایک اور چھوٹے جہاز پر سب مال و اسباب
اُتار کے گھاٹ پر لے جانے تھے؟ رستے میں اُن خواجہ
سرا صاحب نے جو خزینہ دار تھے ظاہر کیا کہ وہ
رقوم جواہرات گراں بہا جس کی قیمت واقعی مجھے
نہیں معلوم تھی مگر میری تخمین میں دو تین
لاکھہ روپئے سے زیادہ کے نہ تھے کم کا احتمال ہے
اُنہوں نے بڑے جہاز سے چھوٹے جہاز پر آنے کے وقت
اُن کو ایک خاصدان میں رکھکے اپنے ایک خدمتگار کی
تحویل میں سپرد کیا تھا جو ڈیڑھہ دو روپئے مہینے
کا اُن کے پاس نوکر تھا اُس کے ہاتھہ سے وہ خاصدان بحر
زخار میں گر پڑا غرض لندن پہنچ کے بادشاہ کے
مقدمے کا بہت عمدہ بندوبست ہوا اور ایک خوبصورتی
سے ملکۂ معظمہ سے ملاقات ہوئی کہ جب سے انگلستان
کی سلطنت قائم ہوئی ہے کبھی وہاں ایسا امر ظہور
میں نہیں آیا تھا یعنی زنانہ دربار ہوا کہ کوئی
مرد وہاں نہ تھا راقم نے خریطہ بادشاہ کا گزرانا
اُس کو ملکۂ معظمہ نے اپنے ہاتھہ میں لے لیا اور
جب تک بیٹھی رہیں وہ ہاتھہ میں رہا. .. بعد
اس کے ملکۂ معظمہ نے دونوں شاہزادوں کو اور راقم
کو حکم دیا کہ اُس کے تیسرے دن ہم تینوں آدمی

کهانے کي ميز پر حاضر هوں . ليکن تقدير نے منظور نہ کيا يعني دوسرے دن کلکتے سے تار برقی پر خبر آئي که بادشاه کو قلعے ميں مقيد کيا هے وه سارا بندوبست جو وهاں هوا تها سب ملتوی هو گيا . الغرض جب بادشاه کے مقيد هونے کي خبر وهاں پهونچي اور معلوم هوا که هندستان ميں نهايت زور شور سے غدر شروع هو گيا هے جو تدبيريں مقدمے کي درستی کي هم نے کي تهيں وه سب برهم هو گئيں اور پارليمنٹ ميں جو درخواستيں گزری تهيں اپنے مشاورين کی صلاح سے اُن کو ملتوي کرا ديا يعنی پيروي اُس کی موقوف کی ' حقيقت ميں مقدمه بادشاه کا بهت زورآور تها بهت قرائن سے هم کو نهايت اميد ظفر کي تهي مگر هندستان کے غدر نے اُس کو بگاڑ ديا ' پارليمنٹ کے دونوں هاؤس کے بهت بڑے بڑے عمده ممبر همارے معين اور مددگار رهے اگر کچهه نه هوتا تو اِس ميں شک نه تهي که دو تين لاکهه ۲ روپيه بادشاه کا درماهه هو جاتا اور شهر لکهنؤ اور حوالي اُس کے بادشاه کے قبضے ميں رهتے جب هم لوگ لندن ميں پهونچے تو کمپنی کي طرف سے يه بهي تحرير گئی تهي که اگر بادشاه چاهيں تو چهه لاکهه روپئے کا ملک واگزاشت کر دو که اُن کے قبضے ميں رهے غرض نه تهي که لکهنؤ اور حوالی اُس کے بادشاه کے قبضے ميں رهيں مگر پهلے تو هندستان کے غدر نے معامله خراب کيا پهر بادشاه کي بے صبري نے بالکل سب ابتر کر ديا که وه عهد نامه

جو پہلے آیا تھا اُس کو قبول نہ کیا اور بغیر کسی
عہد نامے کے بارہ لاکھہ روپیے قبول کر لیے جو غالباً
اُنھیں کي ذات تک باقي رھیں گے۔

(ماخوذ از سیر اودھہ مطبوعہ الناظر پریس از صفحہ ۹۳ تا ۹۸)

۲ - منشي جالپا پرشاد سکریٹري اودھہ اخبار لکھنؤ اپنے
ایک مضمون میں لکھتے ھیں —

" بحیثیت ایک شاہ اور فرماں روا کے واجد علي شاہ
ایک مایوس، ناکام اور قاصر شخص تھے اور ایک
حد تک آرام طلب اور مردہ دل ھونے کے سبب
سے وہ اپنے ملک کي حکومت میں بہت کم یا
کوئي حصہ نہ لیتے تھے - اُن کے ڈوم ڈھاڑي، اُن کے
حرم، اُن کی رقاصہ عورتیں اُن کے اوقات اور توجہ کو
مستغرق و مصروف رکھتي تھیں - پس کوئی تعجب
نہیں کہ ھر مقام پر ظلم و تعدي اور بد عملي
پھیلي ھوئی تھي کرنیل سلیمن صاحب
رزیڈنٹ لکھنؤ کے پاس اخبار نویسوں کي ایک
جماعت تھي جو ان واقعات کی رتّي رتّی خبریں دیا
کرتے تھے، جو اُن کے دربار میں اُن کے حرم میں اور تمام
صوبۂ اودھہ میں گزرتے تھے اور اس طرح ایک
عیش پسند بادشاہ کي محافل اور مشاغل کے
حالات رزیڈینسي کي رپورٹوں میں قلم بند کیے
جاتے تھے - مندرجۂ ذیل خبروں سے اُن واقعات
کا کچھہ خیال پیدا ھو سکتا ھے جن سے یہ
رپورٹیں تیار کي جاتي تھیں ۔—

حضرت آج اپنے تامجان در سوار ہو کر فلاں محل کو
تشریف لے گئے اور وہاں فلاں فلاں محلات
موجود تھے ' جن کو دو جوڑ مینڈھوں کی
لڑائی دکھائی گئی جو بڑے جوش و خروش
کے ساتھ لڑے ' تتیروں کی بھی لڑائی ہوئی -
دو سو روپئے کا ایک دوسالہ اُس جمعدار کو
مرحمت ہوا جس نے اس وحشیانہ جنگ کا
انتظام کیا تھا ' اس کے بعد حضرت نے ایک
نئی گائن کو سنا اور پھر چار بجے شام تک
کنکوے بازی سے اپنا دل بہلاتے رہے ' بعد ازاں
خواب استراحت فرمایا - فلاں موضع ' فلاں پرگنہ
فلاں ضلع سے خبر آئی کہ رام سنگھ زمیندار
مال گذاری دینے سے انکار کرتا ہے جو
عامل نے اس سے طلب کی تھی ' اس پر
اُس کا مکان جلا دیا گیا ' وہ زخمی ہوا
اور اُس کے دو بیٹے اور بھائی بھاگ گئے -
حیون خاں داروغہ کبوتر خانے کو دو ہزار
کا ایک خلعت عنایت ہوا جس نے ایک
ایسا کبوتر پیش کیا تھا جس کا ایک بازو
سیاہ اور دوسرا سفید تھا - بادشاہ نے خاص
محل کو اپنی جدید غزل سنائی جس میں
گل و بلبل کے عشق کا مضمون تھا -

اس لہو لعب کے لحاظ سے واجد علی شاہ اپنے مذاق میں
کسی طرح یکہ و تنہا نہ تھے اُن سے پہلے اُن کے سابقین کے پاس

بھي اُن کے گویئے اُن کے ناچنے والي عورتیں ؛ اُن کے جانور خانے اور چڑیاخانے تھے ؛ اُن کي نسبت غالباً اُن کے زمانے میں جنگلي جانوروں کي لڑائي عام پسند تھی ؛ کنکوے بازي اور کبوتر اُڑانا بہت کم پسند کیا جاتا تھا ؛ ہر چند کہ وہ لوگ بھي اپنے مشاغل سور و سرود کو اپني سلطنت کے فرائض کا تابع رکھتے تھے مگر واجد علي شاہ نے اپنے تئیں ایک ایسے تعیّش اور تنعّم میں ڈال دیا جس کي کوئي حد و انتہا نہ تھی ؛ آخر کار برٹش گورنمنٹ کي مداخلت اور دست اندازی کا وقت آگیا جس کي نسبت اُن کو بارہا دھمکي دی گئی تھي وہ تخت سے اُتارے گئے اُن کی سلطنت کا الحاق اور انتزاع عمل میں آیا اور وہ بطور شاہی قیدي کے کلکتے کے ایک جنوبی نواح میں رہنے کے لئے بھیجے گئے اگر چہ وہ اپنے نئے وطن میں بغیر اُس حشم و خدم اور طبل و علم کے رہنے پر مجبور ہوئے تھے جس میں وہ لکھنؤ میں محصور تھے تاہم اُن کو اُن تکلفات کے ترک کر دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی جس کو اُنھوں نے بطور ایک بادشاہ کے اختیار کر لیا تھا ؛ وہ بہت جلد عیش و عشرت میں منہمک ہو گئے اور گذشتہ زمانے کو فراموش کر دیا - مٹیا برج گارڈن ریچ میں اُن کا حرم ویسا ھي کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جیسا لکھنؤ میں تھا ؛ اُن کے مغنّی اور مطرب ؛ ڈوم اور ڈھاڑھی ؛ اُن کي رقاصہ عورتیں اُن کے ساتھ آئي تھیں " -

رسالہ العصر لکھنؤ جلد ۳ نمبر (۱)

۳ - مولوي علی حیدر طبا طبائي ایک چشم دید واقعہ یوں لکھتے ھیں —

نواب سید امیر علي خاں باڑہ کے رہنے والے ھائي کورٹ

کے وکیل تھے مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے، بتدریج اسی ترقی کی اور اس قدر تقرب حاصل کیا کہ وزیرالسلطان خطاب ہوا اور تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں، غدر کے زمانے میں انہوں نے مسٹر کوئینا قلعہ دار ولیم فورٹ کو ایک جھوٹی خبر پہونچائی تھی کہ راجہ مان سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے ملے اور ایک فرمان مزین بمُہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھ غدر کر کے انگریزی تسلط اٹھادیں میجر کوئینا نے فوراً یہ واقعہ نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہوا۔

(رسالہ ادیب الٰہ آباد مارچ ۱۹۱۲ء)

۴۔ فتح بہادر بیگ وکیل لکھنؤ اپنے ایک مضمون (فرماں روا یان اودھ) میں لکھتے ہیں:—

جب کرنل سلیمن صاحب ریزیڈنٹ مقرر ہو کر لکھنؤ آئے ان کے دور دورہ سے سلطنت معطلی و اخراج سب پر وصی علی خاں کے بجائے ساقی پیدا ہوئی اور یہ ناچاقی روز بروز بڑھتی گئی۔ کرنل سلیمن نے ملک اودھ کا دورہ کیا اور بد انتظامی سلطنت کی متواتر رپورٹیں ولایت کو روانہ کیں دسمبر ۱۸۵۴ء میں جنرل اُٹرم صاحب ریزیڈنٹ صوبۂ اودھ ہوئے۔ مختصر یہ کہ کرنل سلیمن اور جنرل اُٹرم

کي رپورٹ پر نقش ارتباط و مراسم سابقہ یک قلم مٹ گیا اور پیشگاہ صدر سے بادشاہ پر بد انتظامي کا الزام قائم ہوا - بتاریخ یکم فروري ۱۸۵۶ع جنرل اُترم صاحب نے بادشاہ کو خبردي کہ سرکار کمپنی انگریز بہادر ۷ فروری سنہ ۱۸۵۶ع سے ملک اودھہ پر اپنا قبضہ کرےگي آپ کو بندوبست کے واسطے ایک ہفتے کی مہلت ہے * بادشاہ نے بمجرد سماعت اس بات کے کل کار و بار سلطنت کو بند کر دیا توپوں کو چرخ سے گروا دیا اور تمام ملازمین اور تعلقہ داروں کے نام اس مضمون کے احکام جاری فرمائے کہ ہم خود بدولت واسطے استغاثے کے سمت لندن جاتے ہیں تم سب تعمیل احکام اہالیان کمپني بہادر میں مصروف رہو ۴ فروري سنہ ۱۸۵۶ع کو ریذیڈنٹ مع دیگر افسران فوج بادشاہ کے پاس آئے اور عہدنامہ نواب گورنر جنرل بہادر پیش کیا - بادشاہ نے اُسے پڑھہ کر بے اختیار ایک آہ دل پر درد کھینچ کر فرمایا کہ خداوندا تو شاہد حال ہے کہ یہ مجھہ پر جفا اور جبر صریح ہے اور حیلۂ انتظام سے میرا گھر مجھسے چھینا جاتا ہے -

۷ فروري سنہ ۱۸۵۶ع بذریعہ ایک اشتہار کے جو خاص لکھنؤ شہر میں مشتہر کیا گیا سرکار کمپني بہادر نے کل دفاتر شاہي پر قبضہ کر لیا -

(رسالہ زمانہ کانپور جون سنہ ۱۹۱۰ع)

---

* مفصل اشتہار تاریخ نثر اُردو مولفہ راقم مضمون کے صفحہ (۳۹۷) میں درج ہے -

ان اقتباسات میں سلطنت اودھہ کی تباھیوں کے سچے حالات اُن اهل قلم کی تحریروں سے منتخب کیے گئے ھیں جن کی روایات تاریخی درائت کے معیار پر ھر طرح قابل اعتبار ھیں ' اس کے بعد مزید توضیح چنداں ضروری نہ تھی ' لیکن چونکہ زوال سلطنت کمال عیش و عشرت کی بدولت رونما ہوا ھے اس لیے مثنوی حزن اختر کے مختلف مقامات سے کچھہ ایسے اشعار نقل کیے جاتے ھیں جن کو پڑھکر اندازہ ہوگا کہ انتہاے بےبسی و بے سر و سامانی کے عالم میں بھی جان عالم کے وھی ٹھاٹ تھے جس کے طفیل میں اُن کو یہ روز بد دیکھنا نصیب ھوا -

قیدخانے میں جو تکلیفیں واجد علی شاہ مرحوم نے اُٹھائیں اُس کی مختصر تشریح یہ ھے —

نفس سرد مہری سے ژالہ ھوا
بدن غم کا نوالہ ھوا

جگر جل گیا گرمی رنج سے
تنفر ھوا اک قلم گنج سے

بدن تار مسطر سے مل مل گیا
کلیجا مصیبت سے ھل ھل گیا

نمی تک نہیں نام کو آنکھہ میں
نہ نیند آتی ھے نام کو آنکھہ میں

نہ کھانے کا اسباب ھے کچھہ نصیب
نہ پانی کا ھے ذکر لب کے قریب

ھوا بھی جو آتی ھے اُڑتے ھیں ھوش
کفِ غم سے بیزار ھے پاے پوش

وہ گرمي کا رخ سامنے کي وہ دھوپ
اُڑاسي ھے نا طاقتي رنگ و روپ
پھر اُس پر غضب چار سنڈاس ھيں
کہ مجھہ دل جلے کے وہ سب پاس ھيں
تپش یہ جو ہوتي ھے برسات کي
یہ گھٹس جو ہوتي ھے ھر رات کي
اُبھرتي ھے ھر عطر داں کي جو بو
کہ جس طرح مرچوں کي ھو تند جو
سلگتا ھے اِس سے دماغ ضعیف
ہوا جاتا ھے اور بھی دل نحیف
مجھے ڈیڑھہ سال اس بلا میں ھوا
ہوا قرب دو سال اے مہ لقا
نہیں حال اندوھگیں بوجھتا
ابھی تک تو کوئي نہیں پوچھتا
دو وقتہ تو آتا ھے گھر سے طعام
یہ کیا جان کرے آدمي گر کلام
کھلي دیکچي دیکھہ لیتے ھیں سب
تو پھر بیس ندہ وہ آتا ھے جب
جو کچھہ جاہیے مجھہ نہ پڑ پڑ گئے
قلم کس زباں سے سنائے اُسے
جڑیں پڑگئیں زمیں بھی ھے دراز
جفاؤں سے آتا نہیں چرخ باز

مگر یہ پشتینی عیش درست بادشاہ اسی درمیان میں
جب ذرا سا بھی اطمینان پاتا ہے تو اس طرح فرماتا ہے :—

شفا کا جو حمام میں نے کیا
مہینا وہ شوال کا تھا لکھا
مگر سر پلٹ کر بہتر ہوئے
کہ ہم تندرست اور بہتر ہوئے
ہوئیں شہر کی گھر میں تیاریاں
لگی کھلنے خلعت کی گُل کاریاں
مرے آدمی سب اکٹھا ہوئے
محل بھی جو تھے سب وہ یکجا ہوئے
ہوا ہر طرف ناچ گانا شروع
درخت خوشی کے جمے سب فروع
قہاقہ مچی تبی محل میں تمام
وہ بزم طرب بھی ہوئی جب کہ شام

زنداں کی سختیاں اور نگرانیاں یوں بیان کی جاتی ہیں —

وہ تکلیف ہے جس سے دل تنگ ہے
سب و روز زنداں کا یہ رنگ ہے
نہ بس ہے نہ کوٹھی نہ باغ کلاں
مگر میرے کس کام کی اے جواں
ہر اک اس کا در بند ہے آہ آہ
وہ گرمی وہ گرمی کہ دل ہے تباہ
کُھلے ہیں جو در تو ادھر دھوپ ہے
نہ ہے رنگ کوٹھی کا نہ روپ ہے

اس اوسط کے درجے میں دل شق ہیں ہم
نہ اوپر نہ نیچے معلّق ہیں ہم
کئی خط کئے لاٹ کو بھی رقم
ہوے سرفراز ایک سے بھی نہ ہم
کسی خط کا لکھا نہ ہم کو جواب
خدا جانے کس امر پر ہے عتاب
منگاؤ نوشتہ جو منشی کے ہاتھ
تو آیا ہے کرنیل صاحب کے ساتھ

ان تمام بندشوں میں سب سے زیادہ جس بات کا رنج ہے وہ صرف ماہرویوں کا فراق ہے ۔
کوئی رنج زنداں میں ایسا نہیں
جو اس بے سر و پا کو پہنچا نہیں
مگر درد فرقت ہے سب سے سوا
ہر اک غم دبا ہے اسی نے کُھلا
صبا بھی نہیں دیتی پیغام یار
کیا غم نے مجھکو ضعیف و نزار
وہ شام الم ہے سحر تک نہیں
مرے ماہرو کی خبر تک نہیں

قید ہونے سے پہلے اپنے عہد شاہی کے متعلقین کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے —
کبھی سر نہ رکھتا تھا میں کجکلاہ
اودھ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ

ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
فقط سترہ سو تھے اہل قلم
طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم
فقط پندرہ سو تو تھے چوبدار
رعایا وغیرہ کا کیا ہے شمار
کروں ساتھہ ستر محل گر شمار
تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار

قید کے عالم میں ہمراہیوں کی تفصیل یہ ہے —

اسامی ہمراہیاں کر رقم
جو لائے ہیں کلکتے میں ساتھہ ہم
زن و مرد اہل قلم اہل فوج
کہ ہو ایک چشمے کی جس طرح موج
کسی طرح تھے پانچ سو سے نہ کم
ملازم رفیق اور محل ذی حشم

محبوسی و مجبوری کے باوجود جس اولوالعزمی اور سیر چشمی سے شاہانہ مصارف جاری رکھے اُن کی تشریح اقرار عجز کے ساتھہ اس طرح کی گئی ہے —

یہ اختر جو ہے خاک پائے جہاں
یہ شاہ اودہ تھا کبھی اے جواں
مگر اب ہے محبوس اہل فرنگ
طبیعت سے جاتی رہی ہے اُمنگ

نہیں پوچھي جاتی خطا بے خطا
بہت تنگ اس جا پہ ھے دل مرا
جو تاریخ تک آج کي اُٹھہ چکا
وہ سب مدل اخبار میں نے لکھا
یہ بخشش نہیں ھے عنایت نہیں
بھلا اٹھتا ھے بار بخشش کہیں
غریبوں کی ھے یہ فقط روٹي دال
چنے بھون کر کھائیں جائے ملال
خدا کی قسم دے کے ھوں شرمسار
یہ وہ ھیں کروں جن پہ میں جاں نثار
نہیں ھوتی اس میں کبھي بان چاشت
مگر لکھہ لیا ھے پئے یاد داشت
دیے منشی صفدر کو یوں پانچ الف
کہ سو اپنے کاموں میں کر ان کو صرف
چل و پنچہزار اور پھر چار سو
کرو بیس زائد جو گنتي ھوۓ تو
یہ لندن روانہ کیے خرچ کو
کہا بیٹے ماں بھائي سے اس کو لو
پھر اک دفعہ ھفتاد و نہ الف یار
کرو تین سو زائد اُس پر شمار
یہ بار دگر بھیجا لندن میں زر
کہ کھاؤ اسے جب ملک بیٹھکر
دیے دفعہ چوتھي سن اے باتمیز
محل خاص ھے وہ جو مجھکو عزیز

چل و پنج الف اور پھر چار سو
دیے اُن کو اور یہ کہا ہیں یہ جو
دیے پھر مجاهد کو گیارہ ہزار
پُھپا ہے جو مرزا وہ رستم شعار
دیے بست و پنج الف اور چار سو
شمار انگلیوں پر کرو اس کو تو
انھیں کو دیے جو سزاوار ہیں
جو محبوبۂ خاص دلدار ہیں
جو ہیں جعفری بیگم خوش پری
دیے شش ہزار و سه صد اُن کو بھی
دیے پنج الف اُس کو سن اے نگار
کہ ہے نام حسن بہائی کا دوالفقار
دیے کربلائی کو پھر اک ہزار
کیے وقت رخصت یہ اس پر نثار
مرے بھائي اُن کے جو ہیں آغا جان
دیے پانسو اُن کو اے مہربان
جو تھے چھوٹے بھائی یہاں میرے ساتھ
کہو مرزا جعفر تو نام آئے ہاتھ
اُسے بھي دیے پانسو اے عزیز
مرے ساتھ تھا وہ سراپا تمیز
پھر اختر محل پر عنایت یہ کی
دیے تیس ہزار اُن کو اے منّشي
دیے ملکۂ ملک کو بیس ہزار
کہ آئے نہ سینے پہ اُس کے غبار

کیے نذر قیصر بھی گیارہ ہزار
وہ راھی ھوئی لے کے اے غمگسار
کیے صرف زنداں میں پھر چار الف
ھوے کارخانے میں بالکل وہ صرف
کیے نذر سادات چھہ سو پچاس
خدایا مجھے نذر آئے یہ راس
ہر اک ماہ تنخواہداروں کو یار
دیا کرتا ھوں اک قلم دس ہزار
طلا لاکھہ سکّوں کا باقي ھے اب
اسے بھی اُٹھاؤں گا اے خوش نسب
نہیں صورت آمد اے یار اب
اسی کا بہت ھے الم اور تعب
پلیں گي یہ کس طرح جایں جو ھیں
کھچیں گي یہ کیونکر کمایں جو ھیں

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھکر سنگ دل سا سنگ دل بھي متاثر ھوے بغیر نہیں رہ سکتا اللہ ! اللہ ! کیا انقلاب ھے آج ان سانحات کے پڑھنے والے حیرت و افسوس کي تصویر بن جاتے ھیں پھر اُس شخص کا کیا حال ھوا ھوگا جس پر خود یہ وارداتیں گذري ھیں - ساري مثنوي کو پڑھنے کے بعد واجد علي شاہ کی تمام کمزوریوں کا مرقع صاف صاف نظر آ جاتا ھے - شاھانہ اولوالعزمیاں اور خصوصیات خانداني بدرجۂ اتم اُن میں موجود تھیں لیکن طبیعت اس قدر کمزور پائي تھي کہ ذرا سي سختي میں گھبرا جاتے تھے اور وہ باتیں زبان و قلم سے نکال بیٹھتے تھے جو کم از کم ایک ۳ کرور ملک والے بادشاہ کے لیے خود داري کے منافی ھیں - وہ بادشاہ

جس کے دربار میں بڑے بڑے صوبہ دار اور ہم عصر والیان ملک بآدب و احترام آتے ہوں وہ اپنے قید کے زمانے میں گورنر جنرل کے القاب میں یہ عبارت لکھتا ہے —

" ذکر عنایات و الطاف اریکہ آرائے سلطنت و حشمت رونق بخش سریر شوکت و عظمت نواب مستطاب معلی القاب اشرف الامرا گورنر جنرل بہادر خلداللہ ملکہ و سلطنتہ ۔ "

اور پھر اپنے نام جو خطوط منجانب گورنر جنرل موصول ہوتے ہیں اور اُن میں پرانے القاب و آداب جو بجنسہٖ نہ تغیر درج ہوتے ہیں اُن کو بافتخار یوں ظاہر کیا جاتا ہے —

ابھی تک تو ہے لاٹ صاحب کو دھیان
یہ معلوم ہوتا ہے ہیں مہربان
سناؤں میں تفصیل اس کی تجھے
بگوشِ دل اس کو اگر تو سنے
بوقتِ حکومت جو تھا رسم یار
وہ آداب و القاب ہے بر قرار
جو تھا خلد اللّٰہ میں مُلکہ
وہ بدلا ہوا دام اور مجددہ
زر افشاں وہی خط وہی عرض وطول
خریطہ بھی زر بست کا با اُصول

ارادہ تو یہ تھا کہ ان سب تشریحات کے بعد مثنوی حزن اختر کا ایک ایسا مسلسل انتخاب پیش کیا جائے جس سے بالترتیب تمام واقعات ناظرین کے سامنے آجائیں مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ اب تک جتنے اقتباسات کیے گئے ہیں وہ بھی کافی مقدار میں قلمبند

هو چکے هیں ، مزید طوالت کو تحصیل حاصل سمجھا گیا اور اب یه تریجدي مثنوي کے اُن ۳ حسرتناک شعروں پر ختم کي جاتي هے جن سے کمال سخنوري ، جمال عشوه گري اور زوال اختري کے مرقع یکجا نظر آتے هیں —

رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے
سبھوں نے کنوے میں ڈھکیلا مجھے
عیال اور اطفال لوٹے گئے
جہاں میں میرے لال لوٹے گئے
کوئي مضطرب هے کوئي نالہ کش
کوئی پیٹتا هے تو آتا هے غش

فاعتبروا یا اولي الابصار

ایک ادبی استفسار

از مولوی سراج الحق، مچھلی شہری

کچھ دنوں سے اخبار اور رسائل میں ایک لفظ "سنہری" رائج ہو گیا ہے، خواہ وہ مذکر اسم کی صفت ہو خواہ مؤنث اسم کی - اور "سنہری کتاب" اور "سنہری موقع" وغیرہ بے تکلف استعمال ہو رہا ہے بلکہ اس پر اصرار بھی ہے - میں آج تک مذکر کی صفت کے لیے سنہرا اور مؤنث کی صفت کے لیے سنہری لکھتا تھا جب پہلے پہل (غالباً سنہ ۱۹۲۵ء) میں نے ایک افسانے کا نام "سنہری بچھو" پڑھا تھا (یہ افسانہ کسی انگریزی افسانہ نگار کے ایک دلچسپ ناول "گولڈن اسکورپین" کا ترجمہ ہے اور پنجاب کے کسی صاحب منشی تیرتھ رام فیروزپوری نے کیا ہے) تو میں نے اس وقت اس کو پنجابیت پر محمول کیا تھا لیکن آج ارباب قلم کی یہ روش عام اور اس پر اصرار تام دیکھ کر مجھے اپنے روزمرہ اور ذوق لسان پر اعتماد باقی نہ رہ گیا اور اس کی صحت میں کچھ شک سا آ چلا میں نے اس کی تحقیق کرنی چاہی چنانچہ لغات کی طرف رجوع کیا تو وہاں عجب عجب تماشے نظر آئے اور میں کوئی صحیح نتیجہ اور نئی معلومات نہ حاصل کر سکا اگر میں کچھ سمجھ سکا ہوں تو اتنا کہ جو کچھ ہم (اور ایک مجھی پر کیا موقوف ہے عام طور پر لوگ جو) بولتے ہیں وہی صحیح ہے -

اب ذیل میں اس لفظ سنہری کی بابت مجھے تین گذارشیں کرنی ہیں (۱) ارباب لغت کے ارشادات - (۲) رواج عام - (۳) قیاس لغوی

(۱) ـ لغت میں اس کی بابت یہ درج ہے ــــ

(الف) ـ فرہنگ آصفیہ (مطبوعہ اسلامیہ پریس لاہور ۔ جلد ۳
صفحہ ۱۱۳ سنہرا (ہ) صفت (۱) رپہلا کا نقیض ۔
سونے کے رنگ کا ـ مذہّب ـ زراندود ـ طلائی ـ طلاکار
زرّیں ـ پُر زر ـ سونے کا ــــ

(رشک)ــــبہ طلائی رنگ جسم یار گہرا ہو گیا
جو انگرکھا چھو گیا تن سے سنہرا ہو گیا

(آتش)ــــمے کی تکلیف نہ کیونکر کریں اِن آنکھوں کے جام
موئے سر ۔ اس سے ـ پری ۔ سنہرا معلوم

(۲) زرد ـ نیلا سنہری (ہ) صفت ـ (۱) رپہلی کا نقیض ـ سونے
کے رنگ کی ـ زریں ـ مذہّب ـ پُر زر ـ طلائی ــــ

(رنگین)ــــداب جامے دھڑی طلسم جسمی
سنہری لب بستہ پول حال پری

(ناسخ)ــــاے پری سونے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آتی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھکو

(ناسخ)ــــسورج کو بنا سنہری اوگی
سورج کی کرن کرن بنی ہے

(۲) زرد ـ طلائی رنگ ـ چنپئی رنگ ـ بسنتی رنگ! ــــ

(ناسخ)ــــوصف جب میں نے کیے ہرے سنہری رنگ کے
خود بخود ہر صفحۂ دیواں مذہب ہو گیا ۔۔

(ب) فرہنگ شفق (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ طبعہ اول
صفحہ ۴۰۴) سنہرا وہ چیز جو زبان پر مذکر جاری ہو اور
رنگ اُس کا طلائی ہو ــــ

ناسخ ــــمل گیا سونے کے گہنے سے سنہرا جوڑا
رنگ کہتے ہیں اکسیر اسے کہتے ہیں

میں کی تکلیف نہ کیونکر   یا سنہرا تعویذ (یہ شعر اوپر آچکا ہے)

سنہرا رنگ طلائی رنگ —

(ناسخ) — جب سے اُس بت کا سنہرا رنگ ہے پیش نظر

حلقہ اپنی چشم تر کا خاتم زر ہو گیا

(ذوق) — مصحف رخ پہ ترے رنگ سنہرا ہمرا

والا کا حرف ہے سونا سر قرآن چڑھا

سنہری وہ چیز جو زبان پر مونث جاری ہو اور رنگ اُس کا طلائی ہو —

(ناسخ) — اے پری ہوئے جو پہنی ہے سنہری انگیا الخ (یہ شعر آچکا ہے)

سنہری رنگت - رنگ طلائی —

(ناسخ) — مجھکو تیری سنہری رنگت کے

کبھی دیکھیں نہ رنگ سونے کا

(ج) لغات آزاد مطبوعہ کریمی پریس لاہور صفحہ ۴۰۱)

سنہرا - زر اندود - مذہب -

(د) سرمایہ زبان اردو (مولفہ صامن علی جلال لکھنوی مطبوعہ

انوارالمطابع صفحہ ۲۰۹) سنہری بتشدید معروف کے

ساتھ - جو چیز کہ زر اندود اور مطلا ہو اور نام ایک رنگ

کا بھی ہے اُسے طلائی بھی کہتے ہیں چنانچہ شیخ ناسخ

فرماتے ہیں —

وصف جب میں نے کیے تیرے سنہرے رنگ کے

حرف بتدریج ہر صفحہ دیواں مذہب ہو گیا

(بقیہ) ہمارا لفظ سنہرے کو یائے مجہول کے ساتھ یعنی امالہ

سنہرا پڑھنا خطا ہے اس واسطے کہ سنہری نام ایک رنگ

کا ہے پس اس رنگ کی طرف خواہ سے مونث منسوب ہو

خواہ وہ مذکر - بہر طور اس کو یائے معروف کے ساتھ

پڑھیں گے - قیاس پر رنگ اگری - بسنتی - چمپئی
کے -

(۵) نوراللغات (مولفہ سید نورالحسن نیّر ' مطبوعہ نیّر پریس لکھنؤ ؛ جلد ۳ صفحہ ۳۷۹) سنہرا (۵) صفت مذکر - سونے کے رنگ کا ؛ زریں - سنہری (۵) صفت مؤنث وہ چیز جو سونے کے رنگ کی ہو - نام ایک رنگ کا جس کو طلائی بھی کہتے ہیں :—

(ناسخ) — وصف جب میں نے کیے تیرے سنہرے رنگ کے
خود بخود ہر صفحۂ دیوان سنہری ہو گیا

جلال نے سرمایۂ زبان اردو میں لکھا ہے کہ " یہاں لفظ سنہری کو یائے مجہول کے ساتھہ یعنی امالۂ سنہرا پڑھنا خطا ہے اس واسطے کہ سنہری نام ایک رنگ کا ہے - الخ با چمپئی کے " (جیسا اوپر گزر چکا) سنہری رنگت ؛ سونے کی سی رنگت -

غرض یہ پانچ لغات مجھے ملے میں نے ان میں جو کچھہ اس لفظ کے بابت دیکھا سب نقل کر دیا اگرچہ خوامخواہ کا طول ہو گیا ہے مگر تمام عبارتیں یکجا اور پیش نظر ہو گئی ہیں اب میں ان عبارت کی بابت کچھہ عرض کرتا ہوں -

یہ تو ظاہر ہے کہ سنہری صفت مونث واقع ہو تو اس میں کسی قسم کا اعتراض کسی کو نہیں - رہی مذکر کی صفت اور لفظ " سنہرا " کا وجود تو سوا جلال لکھنوی کے کہ ' وہ ایسا کوئی لفظ ہی نہیں مانتے باقی سب کو تسلیم ہے کہ سنہرا ایک لفظ ہے ضرور ' چنانچہ شفق نے " سنہرا جوڑا " " سنہرا تعویذ " " سنہرا رنگ " " رنگ سنہرا " کی چار مثالیں ناسخ آتش اور ذوق کے کلام سے دی ہیں -

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غلطی کا منشا صاحب فرہنگ آصفیہ اور جلال لکھنوی کی عبارتیں ہیں - معلوم نہیں ان دونوں میں متقدم کون صاحب ہیں اور کس نے کس سے استفادہ کیا - بہر حال سید احمد صاحب نے سنہری کے معنے زرد اور بسنتی رنگ لکھ کر ناسخ کا ایک شعر سل کر دیا جلال نے ادّعائے استادی میں اُس سے ایک کلیہ بنایا کہ سنہرے نہیں ہے ؟ سنہری ہے اور جو چیز بھی زر اندود ہو (خواہ مذکر خواہ مؤنث) سنہری ہی کہی جائیگی پھر وہی شعر ناسخ کا سند میں پیش کر دیا پھر ایک قیاس کیا کہ اگری اور چمپئی کی طرح سنہری بھی صفت نسبتی ہے - صاحب نوراللغات نے تو اور بھی کمال کیا چونکہ وہ سنہرا لفظ کو صحیح مانتے اور مذکر کی صفت جانتے ہیں لہذا ناسخ کے اُسی رباعی یا استنادی شعر میں رنگ کے ساتھ تو سنہرا ہی پڑھا ہاں دوسرے مصرع میں سنہری لکھ دیا لیکن ہم کو دیوان ناسخ مطبوعہ نولکشوری پریس لکھنؤ ؟ دیوان دوم میں صفحہ ۳۵ پر یہ غزل ملتی ہے —

مطلع) — واعظا حُبّ ذَہَب تیرا جو مذہب ہو گیا

عیب کیا شُربِ شراب اپنا بھی مشرب ہو گیا

اس غزل کا تیسرا شعر یہ ہے —

وصف جب موزوں کیے اُس کے سنہرے رنگ کے

خود بخود ہر صفحۂ دیواں مذہّب ہو گیا

واضح ہو کہ دیوان ناسخ میں '' سنہرے رنگ '' بجائے مجہول لکھا ہے پھر اب نہیں معلوم کہ آیا سید احمد صاحب دہلوی اور جناب جلال لکھنوی کو جناب ناسخ سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا اور انہوں نے خود انہیں کی زبانی سنا تھا کہ اس جگہ سنہری نہیں بلکہ بتحتانی معروف کے ساتھ سنہری ہے - لیکن اگر انہوں نے بھی دیوان سے دیکھ کر یہ شعر لکھا ہے

دو ۹۹ فیصدی قیاس ہوتا ہے کہ دونوں حضرات نے اس لفظ کو پڑھا ہی غلط - اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ یہی ناسخ دوسرے اشعار میں بقول شفق لکھنوی خود بھی سنہرا جوڑا اور سنہرا رنگ فرماتے ہیں اور ان کے ہم عصر آتش سنہرا تعویذ لکھتے ہیں - جب سنہری رنگ قافیہ میں نہیں ہے تو کیسے حکم لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تحتانی معروف ہی کے ساتھ ہے -

خیر؟ صاحب فرہنگ آصفیہ تو اس " سنہری رنگ " کو غلط پڑھ کر غلطی میں پھنسے ورنہ وہ سنہرا کو صحیح مانتے اور روپہلا کو بھی صحیح مانتے ہیں اور ایک کو دوسری کا نقیض جانتے ہیں لیکن جلال لکھنوی نہ سنہرا کوئی لفظ مانتے ہیں نہ روپہلا " سرمایہ زبان اردو " میں صفحہ ۱۹۴ پر ایک لغت قائم کرتے ہیں " روپہلی جو کہ نقرئی ہو " یعنی اس میں بھی عموم ہے مذکر اور مونث دونوں کے لیے؟ حالانکہ یہ لفظ بھی عام ہے نوراللغات (جلد ۳ صفحہ ۲۱۰) روپلی کے ذیل میں ہے روپہلا (ہ-واو عیر ملفوظ) صفت مذکر - چاندی کے رنگ کا جیسے روپہلا موباف روپہلی (ہ) صفت مؤنث فرہنگ شفق میں ناسخ کا یہ شعر روپہلا کی سند میں آیا ہے -

جب روپہلا چوٹی میں موباف ڈالا یار نے
سنبلستاں میں گُلِ شبّو نظر آیا مجھے

اب ہم نہیں سمجھتے کہ یہ روپہلا اور سنہرا کے الفاظ کیوں لغت سے نکالے جارہے ہیں اور کتنے آدمی اس کو مانیں گے ؟

(۲) استعمال اور رواج عام —

جہاں تک مجھے معلوم ہے خود لکھنئو میں آج بھی اور دلی میں بھی یہ لفظ برابر مذکر کے لیے سنہرا اور مونث کے لیے سنہری بولا جاتا ہے جس کا ثبوت ایک تو وہی اشعار ہیں

جو اوپر گزر چکے دوسرا ثبوت ؟ ذوق سلیم کا فتوی ہے ۔ آج بھی
اردو بولنے والے عام اس سے کہ وہ اہل زبان ہونے کے مدعي
ہوں یا نہوں ذرا دو چار مرتبہ "سنہري موقع" "سنہرا موقع"
"سنہري نچھو" "سنہرا بچھو" کہہ کر اپنے ذوق سے دریافت کریں
اپنے کانوں سے پوچھیں اور جو کچھہ جواب ملے از روے انصاف اسي کو مانیں ۔

(۳) قیاس لغوی :—

جلال لکھنوی نے (اگر میرا خیال ما سبق صحیح ہے تو) ناسخ کا شعر غلط پڑھ کر ایک قیاس یہ بھي کیا ہے کہ اگری ی نسبتي اور چمپئي کی طرح یہ بھي صفت نسبت ہے ۔ جلال استاد کہے جاتے ہیں مگر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے تو اگر کہنے کی اجازت دیجائے تو عرض کروں کہ جلال کا قیاس یہاں غلط اور قیاس مع‌الفارق ہے ۔ انہوں نے اگری کو لکھا ہے کہ بر وزن جگري ہے بر وزن اجنبي نہیں ہے گویا یاے نسبت کے اس مشہور قاعدے کے موافق کہ اگر اسم کے آخیر میں الف ہو تو وي یا ئي لگاتے ہیں ورنہ صرف ی بڑھاتے ہیں پھر کیا انصاف ہے کہ لفظ سونا سے صفت نسبتي سنہري بنائیں ۔ سنہری اگر صفت نسبتي ہوسکتی ہے تو صرف لفظ سنہر سے بشرطیکہ یہ کوئی لفظ بھي ہو مگر ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لفظ اب تک "سونے" کے معنوں میں دیکھا یا سنا نہیں گیا ۔ سونا سے جب صفت نسبتي بنائیں گے تو چمپا پر قیاس کر کے سونئي بر وزن چمپئي بنائیں گے یا دنیا پر قیاس کرکے سونوی بر وزن دنیوی یا سوناوی بر وزن دنیاوی کہینگے مگر روز مرہ گواہ ہے کہ یوں بولتے نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ لفظ قیاس لغوی و لسانی کے مطابق سونا سے سنہري نہیں بنا ہے بلکہ زبان اردو

میں یہ لفظ بالکل خلاف قیاس صفت نسبت ھي بن کر استعمال ھوتا ھے اور ایسے الفاظ کو ان صفات نسبت کے قواعد کے مطابق رکھنا اور اصول و ضابطہ میں لانا زبردستي ھے -

اب ایک ھي بحث اور رہ جاتی ھے کہ سید احمد دھلوی اور جلال لکھنوي دونوں صاحبان لکھتے ھیں کہ سنہري، طلائي رنگ کو بھی کہتے ھیں - تو ممکن ھے کہ کسي خِطّہ میں کسي رنگ کو سنہري کہتے ھوں اور وہ سند نہیں - لیکن چونکہ دونوں صاحبان نے استناد کیا تھا ناسخ کے ایک شعر سے جس کو دیوان میں یاے مجہول ھي سے لکھا ھے اس لیے اعانت یہ ھے کہ اب اس امر کے ماننے کي بھي ضرورت نہیں کہ یہ کوئي رنگ ھے بھي -

ممکن ھے بعض حضرات کو یہ خیال گزرے کہ یہ استفسار کا ھے کو ھوا یہ تو خود قول فیصل کے طور پر پیش کیا گیا ھے مگر اصل یہ ھے کہ میں نے ارباب لغت کي رائیں یکجا کر دی ھیں اور اپنے شکوک اور خیالات کا اظہار بھي کر دیا ھے اس سے میري عرض یہ ھے کہ ان امور کو پیش نظر رکھکر ماھرین زبان اپنے فیصلے سے مطلع فرمائیں-

---

ضلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاحیں

(پروفیسر محمد نعیم الرحمان ، ایم اے)

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ، آیندہ صفحوں میں میں نے ان اصطلاحات کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو ضلع الہ آباد کے معماروں میں تعمیری کام اور اُس کے مسالے ، اوزار و آلات وغیرہ کے متعلق رائج اور مستعمل ہیں ۔ چند سال کا عرصہ ہوا کہ مجھے الہ آباد میں ایک عمارت کی تعمیر کے دوران میں مسلسل طور پر معماروں اور اُن کے مددگار کاریگروں اور مزدوروں سے سابقہ رہا ، میں نے اس موقعے سے یہ فایدہ اُٹھایا کہ کاریگروں کی جو اصطلاحیں روزانہ میرے کان میں پڑتی تھیں اُن کو قلمبند کرتا جاتا تھا ، اور چونکہ یہ زمانہ چار پانچ مہینوں پر حاوی اور خاصا طویل تھا ، اور میں برابر اسی فکر میں تھا کہ اصطلاحیں جمع ہوتی رہیں ، اس لیے ان کا ایک معقول ذخیرہ فراہم ہو گیا یہ چیز بجائے خود اس قدر مفید اور دلچسپ ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اب تک اس طرف توجہ کیوں نہیں کی گئی ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ پہلا ہی موقع ہے کہ اہل پیشہ میں سے معماروں کی اصطلاحیں ایک مجموعی صورت میں پیش کی جارہی ہیں ، اور مجھے اُمید ہے کہ اہل علم و فن ان کو دلچسپ پائینگے ۔

چونکہ مجھے محض اپنی سمجھ یا اپنے اندازے پر اعتماد نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا ، اِس لیے ان اصطلاحی الفاظ کے تلفظ اور اُن کے معنی کے متعلق جو کچھ سمجھا اُس کی تصدیق اور تشریح ان کاریگروں سے بھی کرا لی ۔ اس امر میں میں نے بالخصوص اُن معماروں

سے رجوع کیا جو سن رسیدہ اور پرانے تجربہ کار ہیں - اس کے بعد مزید اطمینان کے لیے میں نے یہ کیا کہ نہ صرف اسی وقت اور کاریگروں سے بھی ان تمام امور کی تصدیق کرائی ؛ بلکہ اس کے بعد بھی اس دو تہائی برس کے عرصے میں جب کبھی الہ آباد اور اُس کے مضافات کے معماروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ؛ اُن سے بھی یہ دریافت کر لیا کہ اِن کا تلفظ اور اِن کی تشریح یوں ہی ہے - اس طرح بالآخر مجھے یہ اطمینان ہوا ؛ اور ہے کہ یہ اصطلاحیں الہ آباد اور اُس کے نواح میں ضرور مستعمل ہیں ؛ اور اسی خیال سے عنوان میں میں نے اس کی تصریح کر دی ہے - مختصر یہ کہ میں نے یہ تمام اصطلاحیں من و عن اُسی تلفظ کے ساتھ درج کی ہیں ؛ جو ان لوگوں کی زبانوں پر رائج ہے - میں نے اس میں مطلق تصرف نہیں کیا ہے ؛ اور نہ کر سکتا ہوں - صحت ادا کی طرف سے اطمینان کرنے کے لیے میں نے قوسین میں قریب قریب ہر لفظ کا تلفظ بھی لکھ دیا ہے ؛ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ صرفی اصطلاحات کے لحاظ سے اس کا شمار کلمہ کی کس نوع میں ہے -

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ مجموعہ ؛ جس میں کم و بیش تہائی سو اصطلاحیں شامل ہیں ؛ ہر لحاظ سے مکمل ہے - بہت ممکن ہے کہ کچھ اصطلاحیں چھوٹ گئی ہوں ؛ اور میری نظر سے اوجھل ہو کر اس مجموعے میں شامل ہونے سے رہ گئی ہوں - تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان اصطلاحوں کا بہت بڑا حصہ اس میں ضرور آ گیا ہے - میں نے اکثر الفاظ کی لسانی اصلیت اور بناء بیان کرنے کی بھی کوشش کی ہے - البتہ جو الفاظ بالکل صاف اور واضح یا مشہور ہیں ؛ اُن کے متعلق میں نے ایسی صراحت کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا ہے

لیکن ایسے معروف الفاظ کے علاوہ اور بھی چند الفاظ (مثلاً نویل، پیالا، بوتا، سِل، وغیرہ) ایسے رہ گئے ہیں، جن کی لسانی تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے - مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سے قاصر ہوں، اور فی‌الحال اس کام کو دوسروں کے لیے چھوڑتا ہوں - لیکن میں حتی‌الوسع خود بھی اس سے غافل نہ رہوں گا اور ان کو حل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس میں شک نہیں کہ یہ تحقیق نہایت درجہ دلچسپ ہوگی کہ یہ اصطلاحیں ہمارے ملک کی کس کس زبان سے تعلق رکھتی ہیں - میں نے، ہمارے ملک اس لئے کہا کہ جو ظاہر ہے، اور یہی فطرت کا تقاضا ہے، کہ زیادہ تر اصطلاحیں ہماری دیسی زبانوں ہی سے ماخوذ ہونگی، گو یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں ایسے الفاظ بھی ہوں جن کے متعلق بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ ان کا علاقہ کسی زبان سے نہیں ہے بلکہ ضلع الہ‌آباد کے معماروں اور مزدوروں نے عمارت اور اس کی اینٹوں کی طرح اِن کو بھی خود ہی بنایا اور گڑھا ہے! اس مجموعے میں چند الفاظ انگریزی سے اور چند عربی اور فارسی سے ماخوذ ہیں، دوسی سب صریحاً ہندی یا سنسکرت اصل سے ہیں -

میں نے اُن اصطلاحوں کو حروف تہجی کی ترتیب سے فلسفند کیا ہے، اور متعدد مقامات میں شکلوں سے بھی کام لیا ہے، جن سے اُمید ہے کہ اصطلاحوں کے سمجھنے میں کافی مدد ملیگی -

ان صفحوں میں ذیل کی مختصف علامتوں سے کام لیا گیا ہے :

امذ	. اسم مذکر
امث	.. اسم مؤنث
بغ	. . تعلق پر غور کرو
حد	جس (یا، جن) کو دیکھو
صف	صفت

الف

اپراوا—امذ (الف کے پیش سے - هندي٠ اوپر ؛ اوپري ؛ اُپرالا) - کسي قسم کي جناي یا کسي چیز کا وہ رخ جو اوپر کی طرف سے دیکھنے سے نظر آئے - بالائي؛ اوپر کا رخ - اسے اُپرایا بھي کہتے هیں - اس کے مقابل یعنی نیچے کے رخ کو سراوا یا سرایا کہتے هیں - دیکھو متھالا -

اُپرایا—امذ - مترادف هے اپراوا کا ؛ حد -

آتھ پہل—صف - (آتھ=آتھ) آتھ پہلوں والا (والي)؛ هست پہل؛ وہ جس میں آتھ نکھ هوں - اس کو آتھ ماس بھي کہتے هیں -

آتھ ماس—صف - (آتھ = آتھ ؛ ماس = سنسکرت واس वास =گھر ؛ خانہ ؛ پہل کے معني میں) - اس کا تلفظ آتھ ماںس (س سے پہلے نون غنہ کے ساتھ) بھي کیا جاتا هے - مترادف هے آتھ پہل کا ؛ جد -

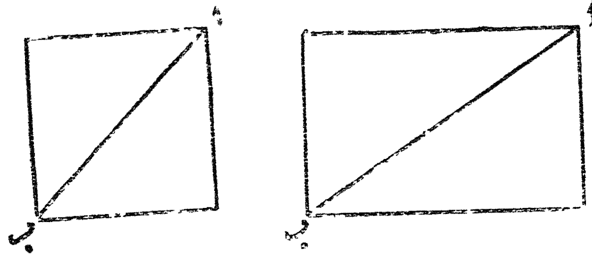
اُجبَک—امث - (الف کے پیش؛ ج کے سکون؛ اور ب کے زبر سے - عامی بولی اُجبک؛ اُزبک = بیوقوف؛ احمق - ترکي٠ اُزبک ؛ اوزبک — ترکي قبیلے کا نام) بیتّن کي وہ قسم جسے اُلّو بھي کہتے هیں - دیکھو بیتّن -

اُچھالا—امذ - (پہلے الف کے پیش سے ؛ هندي اُچھالنا ؛ اُچھال ؛ اُچھالا) - جالی کا هر ایک سرا ؛ اُس حالت میں کہ جب جالي کو باڑ کے اوپر بیتّی (جد) رکھہ کر دونوں (سروں کي) طرف سے باندھہ دیتے هیں - دیکھو باڑ؛ جالی -

آدّھا—امذ - (پہلے الف کے زبر اور د ھ کی تشدید سے - هندی آدھہ ؛ آدھا ؛ آدھہ) - آدھي اینٹ - لمبائي کے لحاظ سے اگر

اینٹ کو توڑ کر دو ٹکڑے کر لیے جائیں، تو ہر ایک ٹکڑا ادھا کہلائیگا - دیکھو بھري، کھنڈا -

آڑاتا — امذ -(پہلے الف کے زبر سے - تغ آڑنا ، آڑانا ، آڑ، آڑا ، آڑواز) وہ خط جو کسي مُستطیل یا مربع شکل کے دو مقابل کے زاویوں کو ملانے سے پیدا ہو ، کونا کوني ریکھا - ذیل کي شکلوں میں ا ب آڑاتا ھے —



آسار — امذ - پہلے الف کے زبر سے - عربي اثر کی جمع آثار، فارسي معني میں) - دیوار کا آثار ، دیوار کي چوڑائي، موٹائي -

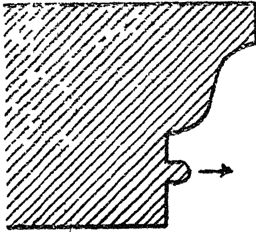
اُلو — امذ - (تلفظ : مشہور منحوس پرندے کے نام سے واو معروف سے) - پیٹن کي ایک قسم ، جسے اُجنک بھي کہتے ھیں - دیکھو پیٹن -

اِنتَھا — امذ - (الف کے زبر ، نون غنہ ، اور تٹ کے زیر سے = اینٹ ھار اینٹ والا یا والي) - اینٹیں لانے والا مزدور ، وہ مزدور جو راج کو چنائی کرنے کے لیے اینٹیں لا لا کر دیتا ھے - اُس لفظ کا دوسرا تلفظ اینتھا بھی ھے -

اندھا گولا — امذ - وہ گولا (حد) ، جو بہت کم دکھائي دے اور اپني هستي کو پوری طرح جتلا نہ سکے - دیکھو گولا -

آندھاري — امث (الف کے زبر سے - ھندی اندھا اندھیرا، اندھکار)

(۱) ڈاٹ کے اوپر جو حصہ باہر کو نکال کر بنایا جاتا ھے‘ اُس کی ایک صورت ۔ دیکھو بہادری ۔ اندھیاری کی ایک صورت یہ ھو سکتی ھے — اس شکل میں الف سے لے کر ب تک (نقطے دار خط کے ساتھہ ساتھہ) اندھیاری ھے ۔

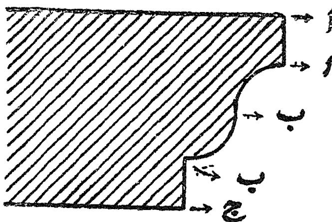


(۲) اینٹ کی چنائی میں (یا پتھر میں گڑھہ کر بھی) چوڑی کے نیچے جو ڈھال یا برساھت دیتے ھیں‘ خواہ وہ ڈھال کم ھو یا زیادہ‘ اندھداری کہلاتا ھے ۔

اول—صف ۔ (و کی تخفیف سے بھی بولا جاتا ھے ۔ عربی ۰ اول=پہلا) اینٹ کی صفت ۰ اول درجے کی‘ سب سے اچھی قسم کي اینٹ ۔

ایڑ—اسم ۔ (یائے مجہول سے تغ ۰ ایڑی ۔ عموماً ڑ سے پہلے نون غنہ بھی بولا جاتا ھے) ۔ پٹے یا چوڑي کے اوپر اینٹ (یا پتھر) کو گڑھہ کر جو لہر دار سی چنائی کی جاتی ھے‘ وہ ایڑ (یا ایلڑ) کہلاسي ھے ۔ ذیل کی شکل میں نقطہ دار خط کے ساتھہ ساتھہ الف سے ج تک ایڑ ھے ۔

اس کے مختلف حصوں کے نام یہ ھیں (۱) پہلے الف سے دوسرے الف تک پتا ھے ۔ (۲) دوسرے الف سے پہلي ب تک گہل ھے ۔ (۳) پہلي ب سے دوسري ب تک بھولن ھے؟ اور اسی کو چوبر بھی کہتے ھیں‘ اور



(۴) دوسری ب سے ج تک کا نام جنیا ؛ یا "ایڑ کی کور" ہے -
ایڑ کی کور—امث - دیکھو جنیا (۴) -
اینٹھا—امذ - یائے معروف ؛ اور ٹ کے زبر سے) - دوسرا تلفظ ہے
انٹھا کا ؛ حد -

ب

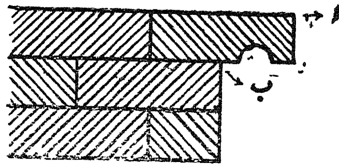
بانکڑی—امث - (بانک ؛ بانکا ؛ بانکپن=ٹیڑھا ؛ مڑا ہوا ؛ ترچھا ؛ خمیدہ) - لوہے کی ایک سیخ جس کا ایک سرا ڈیڑھ دو انچ کے طول میں کسی قدر گولائی کے ساتھ مڑا اور بٹا ہوا ہوتا ہے - گویا اُس کی شکل ہاکی کھیلنے کے ایک چھوٹے سے بلّے کی سی ہوتی ہے - یہ آلہ "رولدار" پیٹن (جد) بنانے کے کام آتا ہے - یہی بٹا ہوا سرا پیٹن کے مسالے پر رکھ کر دبا دیا جاتا ہے ؛ جس سے پیٹن کی لکیریں بن جاتی ہیں - اس کی شکل یہ ہے



بانکڑی دار—صف - ایک قسم کی پیٹن، دیکھو پیٹن (۳) -
بٹّی مارنا—مصدر - (تغ بٹّا=کمی، نقص، عیب، پتھر، پتھر کا ٹکڑا) گھوٹنا ؛ گھٹائی کرنا ؛ پالش کرنا ؛ چمکانا ؛ صاف ؛ برابر کرنا - جب پلستر کے مسالے (خاص کر چونے) کا ذرّہ گھل مل کر ایک ہو جاتا ہے ؛ اور اُس کی خامی کا زور جاتا رہتا ہے ؛ تو اُسے بٹّی سے گھوٹ (رگڑ) کر برابر اور صاف کیا جاتا ہے - اس طرح نہ صرف یہ کہ مسالے کے سب ذرّے مل کر مسالے کو مضبوط اور سطح کو صاف اور برابر

کردیتے هیں ؛ بلکه سطح پر ایک چمک بهي آ جاتي هے -
اسي کو "تتی مارنا" کہتے هیں -

برها—امذ - (ب اور ر کے زبر سے سنسکرت برهه बर्हः مور کي دم کا پر
وہ پتا (حد) " جس میں نیچے کی طرف کھانچ هو-
(دیکھو کھانچ) - جب کسی کارنس میں ؛ یا دیوار کے بالکل
اوپر سرے پر پہنچ کر ؛ پتا لگاتے هیں ؛ تو اُس پتے میں
نیچے کی طرف ایک انچ (یا پتے کی مقدار کی نسبت
سے کم یا زیادہ) گڑهه کر نیم دائرے کی شکل میں گہرا
کر دیتے هیں - اس گہرائي اور پتے کو ملا کر "برها"
کہتے هیں - اس کي غرض یه هوتی هے که جب پانی دیوار
کے سر پر گرے تو بہتا هوا پتے کے نیچے پہنچ کر اِس کھانچ
سے لٹکتے هی نیچے تک جائے اور تمام دیوار پر بہتا اور
اُسے خراب کرتا هوا نه جائے - برها کی شکل یه هے اس
میں الف سے ب تک برها هے



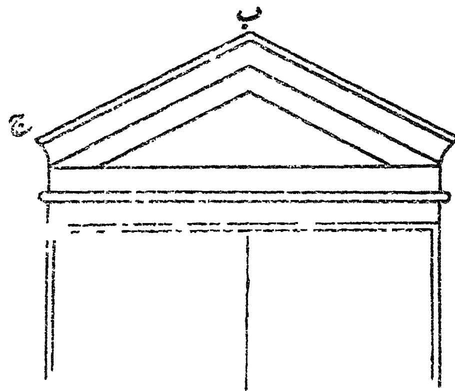
بریری—امث - (پہلی ي مجہول اور دوسری معروف) - دهنّی ؛
شہتیر ؛ جس پر کھپریل کي چھاؤنی چھانے کے وقت تھاتھه
(تھاتھر) کے پاس رکھے جاتے هیں -

بَرَبل—امث - (ب اور ر کے زبر سے) - یه دوسرا نام هے گنتي کا ؛ حد -
بسولي—امث - (واو معروف سے - لغ بسولا ؛ بڑهئي کا اوزار) معمار
کا تیشه . هتوڑي کی قسم کا لوهے کا ایک آله جس کے

آخر میں دھار ھوتي ھے، اور ایک طرف لکڑي کا دستہ لگا ھوتا ھے - راج لوگ اس سے اینٹ تراشنے، گڑھنے اور توڑنے کا کام لیتے ھیں - اس کے جس حصے میں دھار ھوتي ھے، وہ لوھے کا ایک ٹکڑا ھوتا ھے، جو ھتوڑی کے سر سے الگ ھوتا ھے - جب دھار کند ھو جاتي ھے تو اُسے نکال کر تیز کر کے پھر لگا لیا جاتا ھے -

بَکَس—اسذ - (بَ اور کَ کے زبر سے - انگریزي . بوکس box صندوق) چنائي یا کسي قسم کا تعمیري کام شروع کرنے سے پہلے اینٹوں کا ذخیرہ کرنے کے لیے اُن کو ایک جگہ ایک (پتلي یا چوڑي سي) دیوار کي صورت میں جمع کر کے ترتیب وار رکھا جاتا ھے - اس مرتب اور مجموعي صورت کو "بکس" کہتے ھیں - جب اینٹیں تعداد میں زیادہ ھوتي ھیں، تو عام طور پر پانچ سو یا ایک ھزار کا "بکس" بناتے ھیں - گویا اس کي مجموعي ھیئت ایک بڑے سے صندوق کي ھوتي ھے -

بَگَلس—اسذ - (بَ اور گَ کے زبر سے) - بہادري (جد) کي ایک وضع ھے، جو عموماً ایک مثلث کي شکل میں کھڑکي یا دروازے کے اُوپر باھر کي طرف بناتے ھیں - اس شکل میں ا، ب، ج بگلس ھے -



بلّی—اسمث - (ب کے زبر اور ل کی تشدید سے) - لکڑی کا شہتیر ، موٹی سی لکڑی ، جس کو چھت پر ڈالنے یا پاڑ کی تھڑیا وغیرہ بنانے کے کام میں لاتے ہیں - بلّیاں عموماً ساکھو کے درختوں کے پورے پورے تنوں کی ہوتی ہیں ، اور اُن کی لمبائی بھی قریب قریب پورے درخت کی اونچائی کے برابر ہوتی ہے -

بند دار (ڈاٹ)— ا ، صف - ڈاٹ کی ایک قسم ہے ، جس کو "چدری ڈاٹ" بھی کہتے ہیں - دیکھو ڈاٹ -

بوندی مار—صف - (واو معروف اور نون غنہ سے - بوند ، پانی کا قطرہ) - اینٹ کی صفت ہے وہ اینٹ جسے پانی کی بوند مار گئی ہو ، ایسی اینٹ جس پر بھٹے میں تیار ہونے کے وقت ، یا تیار ہو جانے کے فوراً بعد ، کسی سبب سے پانی کی بوندیں پڑ گئی ہوں - ایسی اینٹ میں جگہ جگہ سوراخ سے ہو جاتے ہیں ، اور جگہ جگہ سے بُھبی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے - چونکہ اس میں شور بہت جلدی اثر کرتا ہے ، اس لیے ایسی اینٹ کو عمدہ اور مضبوط تعمیری کام میں استعمال نہیں کیا جاتا ، اور اسے عیب دار شمار کیا جاتا ہے -

بہادری—اسمث - (گویا فارسی لفظ بہادر سے اسم کیفیت ہے) - وہ چنائی جو محراب کی ڈاٹ کے اوپر دیوار سے آگے کو نکلی ہوئی بنائی جاتی ہے - اس کی کئی قسمیں ہیں ، مثلاً : صرف ایک استر ، یا اندھیاری ، یا چوڑی اور ایڑ ملے ہوئے ، یا دانتوا ، یا اور طرح طرح کی سجاوت کی چنائیوں

کو ملا کر بہادری بناتے ہیں - غرض۔ کہ جو کچھہ اور جس قسم کی جڑائی (چنائی) بھی ڈات کے اوپر باہر کو نکلی ہوئی بنائی جائے وہ "بہادری ہے" - دیکھو نگلس -

بیالا—اسم - (ب کے زبر سے) - وہ سوراخ یا موکھا جو پیٹی (جد) کے رکھنے کی وجہ سے دیوار میں رہ جاتا ہے - دیکھو پیٹی و پاڑ -

بے تاو—صف - فرش یا دیوار کی وہ استرکاری جس کا تاؤ (حد) خراب ہو جائے - اگر تاو کی حالت سے کچھہ اور زیادہ عرصہ گذر جائے تو استرکاری (پلستر) کو "بے تاو" ہو جانا کہتے ہیں - یہ ضروری ہے کہ جیسے ہی پلستر (مثلاً فرش کا) تاو کی حالت پر پہونچے ویسے ہی اس کی گھٹائی کردی جائے - اگر صحیح وقت کے بعد گھٹائی کی جائے گی تو وہ ٹھیک نہ ہوگی اور پلستر مضبوط نہ ہوگا - اس خرابی کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ فرش "بے تاؤ ہو گیا" - دیکھو تاؤ -

بیضاوی—الف و صف - (=بیضاوی : عربی . بیضوی و انڈے کی شکل کا) ڈات کی ایک قسم ہے - دیکھو ڈات -

بیل—اسم - (بیاے مجہول سے سنسکرت : ویلا वेला حد و انتہا) سیدھہ و النگ، قطار کا سیدھا ہونا، سیدھی لکیر و سیدھا کنارہ و سیدھی کور یا کگر : غرض کہ ہرقسم کی سیدھہ کو "بیل" کہتے ہیں - "بیل میں ہونا" شروع سے آخر تک ایک ہی حد پر ختم ہونا یا ایک ہی حد سے شروع ہونا - ذیل کی شکل میں الف سے ب تک کی اینٹوں کو کہا جائیگا کہ ایک ہی "بیل" میں ہیں -



بیلچا—اسذ ـ (یاے مجہول سے ؛ فارسی . بیل کا مصغر ؛ بیلچہ) ـ بیلچہ ، پھاوڑا ؛ خصوصاً ولایتی پھاوڑا جس سے کام کرنے میں ہاتھ نیچے سے اوپر کی طرف کو چلتا ہے ـ ,, پھاوڑا ،، اور ,, بیلچا ،، میں عام طور پر یہی فرق سمجھا جاتا ہے ، اور کاریگر لوگ اسے اصطلاحی فرق کے ساتھ بولتے ہیں کہ ,, پھاوڑا ،، دیسی قسم کا اوزار ہے جس سے ,, الٹے ہاتھوں ،، کام ہوتا ہے ؛ مگر ,, بیلچا ،، وہ ہے جو ولایتی اوزار ہے اور نیچے سے اوپر کو چلایا جاتا ہے ـ بیلچے کا استعمال (زمین وغیرہ کو) کھودنے کے لئے نہیں ہوتا ، بلکہ مٹی ، چونا گٹی وغیرہ مسالے کو اُٹھانے ، بنانے ، یا سودنے کے کام آتا ہے ـ

بیل‌دار—اسذ ـ وہ مزدور جو پھاوڑا (بیل ، بیلچہ) چلانے کا کام کرتا ہے ـ ,, بیل‌دار ،، اور ,, مزدور ،، میں یہ فرق ہے کہ ,, بیل‌دار ،، بیلچے سے کام کرتا ہے ؛ مگر ,, مزدور ،، ہر وہ شخص ہے جو راج‌گری کے سوا اور سب طرح کے کام کرتا ہے ـ دیکھو مزدور ـ

بینڈا—اسذ ـ (یاے مجہول اور نون غنہ سے) ـ ساز میں وہ بانس (یا لکڑیاں) جو ٹھڑا (جد) میں باندھے جاتے ہیں اور زمین سے متوازی رہتے ہیں ـ یہ بانس زیادہ بڑے نہیں ہوتے ـ اگر یہ زیادہ لمبے ہوں تو اُن کو ,, دھانگڑ ،، کہتے ہیں ـ دیکھو دھانگڑ ـ



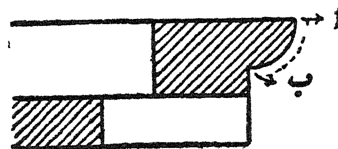
بھاگنا—مصدر ـ سیدھی سطر یا قطار سے ؛ سیدھی بیل سے باہر ؛ ہٹا ہوا ہونا ـ ,, بیل بھاگ رہی ہے ،، قطار ؛

سطر ؟ لکیر ؟ دیل تیڑھي ھوئي جارھي ھے ؟ سیدھه بگڑي جاتي ھے -

بھرا پیٹ—صف - وہ جُڑائي (چُنائی) جس کا پیٹ بھرا ھو ؟ جو پُر ھو ؟ بھري ھوئی ھو - جڑائي کرتے وقت (عام اس سے کہ وہ اینٹ کي ھو یا پتھر کی) کنّھ (حد) لگا کر جوڑ دینے کے بعد بھی جب ایک ردّا پورا ھوجاتا ھے تو پورے ردّے پر مسالا (متي یا چونا یا سیمنٹ) گھول کر پھیلا دیتے ھیں ؟ جس سے وہ درزوں میں سے ھو کر اندر بھر جاتا ھے - اس طرح جب جڑائي کے اندر (پیٹ میں) سب مسالا پہنچ جاتا ھے اور اور وہ ھر طرف سے اینٹوں کو پکڑ لیتا ھے ؟ تو اُسے "بھرا پیٹ" کہتے ھیں -

بُھڑکي—صف - (بھ کے پیش سے) - اینٹ کي صمت ٹوٹي ھوئي اینٹ ؟ خاص کر وہ جو سیدھي نہ ٹوٹي ھو بلکہ کسی زاویے پر ٹوٹي ھو ؟ یا جس کا کوئي کونا جھڑا ھوا یا کوئي کور ٹوٹی ھوئي ھو اسے "کھڑھي" بھي کہتے ھیں - دیکھو روڑا ؟ کنّل -

بھنّا—امذ - (بھ کے زبر اور نّ کی تشدید سے) - وہ جڑائی جو نے یا کسي اور قسم کی جُڑائی (مثلاً چوڑی ؟ گولے ؟ ایڑ وغیرہ میں) کے اوپر ایک نصف دائرے کی شکل میں بنائی جاتي ھے - ذیل کی شکل میں الف سے ب تک بھنّا ھے



بَھوکا—امذ - (بھ کے زبر سے) - ٹوکرا ؛ خاص کر اُس حالت میں کہ جب اُس میں کوئي مسالا (اینٹ ؛ پتھر ؛ کنکل ؛ روڑا ؛ گِتّی وغیرہ) بھرا ہوا ہو - دیکھو پلرا ؛ ٹلری -

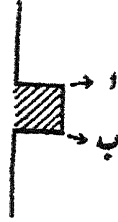
پ

پاڑ (یا پاڑھہ)—امث - بانسوں اور تختوں کا وہ ٹانڈ یا مچان ؛ جس پر بیٹھہ کر معمار دیوار چنتے ہیں - سب سے چھوٹی اور سادہ پاڑ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو بانس (یا بلّیاں) زمین پر سیدھی عمودوار کھڑی کرتے ہیں ؛ اور مضبوطي کے لیے ایک سرا کچھہ دور تک زمین میں گاڑ دیتے ہیں یہ بانس "تھڑیا" کہلاتے ہیں - پھر دو اور بانس لے کر اُن میں سے ہر ایک کا ایک سرا دیوار پر رکھتے ہیں اور دوسرے کو ایک ایک عمودی بانس سے باندھہ دیتے ہیں یہ "پینڈیاں" ہیں - اسی طرح ایک اور بانس زمین اور دیوار کے متوازی طور پر عمودی بانسوں سے باندھہ دیتے ہیں - یہ بانس "بنیترا" ہے - پھر دونوں پینڈیوں پر ایک چالی (جد) رکھہ کر اُسی پر راج بیٹھتے اور کام کرتے ہیں - یہ مکمل پاڑ ہے -

پتھر پایا—امذ - (پایا=فارسی پایہ) - ستون کی وضع کی تعمیر ؛ جو ایک دیوار کے بیچ میں (صرف ایک مرتبہ یا ایک سلسلے سے) یا عمارت کے ایک کونے میں اس طرح بناتے ہیں کہ وہ بذات خود پورا ستون نہیں ہوتا بلکہ باقي کي دیوار سے ذرا آگے کو بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ستون کی طرح دکھائی دیتا ہے - اس کا بھی باقی دیوار سے باہر کو نکلا

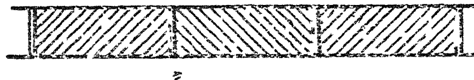
هوا هوتا هي وه خصوصيت هے جس كے سبب سے يه "پتهر پايا" كهلاتا هے -

پَتّا—امذ - (پَ كے زبر اور تّ كي تشديد سے) - وه سيدهي ، معمولي ، مگر اُبهري اور باهر كو نكلي هوئي چنائي جو چوڑي ، گولا ، ايڑ وغيره قسموں كي چنائي ميں كي جاتي هے - ذيل كی شكل ميں اَلف بَ پَتّا هے -



پٹری—امث (پَ كے زبر اور ٹ كے سكون سے) - چونے ، يا چونے اور سيمنٹ كي وه ته جو ايك پٹی كی شكل ميں كارنس كے نيچے يا منڈير كے سروں پر عموماً ڈيڑهه يا دو انچ كي چوڑائي ميں اور ديوار سے آدهه انچ اُبهري (يعني باهر كو نكلي) هوئي بنائی جاتي هے - اس كی چوڑائی كارنس وغيره كی وسعت كي نسبت سے كم يا زياده بهي هوسكتي هے -

پٹّی—امث (پَ كے زبر اور ٹ كي تشديد سے) - ديوار بنانے ميں اينٹوں كی وه جڑائی (چنائی) جس ميں اينٹيں اپنے طول ميں اس طرح ركهه كر چني جائيں كه اُن كے عرضی ضلعے ايك دوسرے سے ملے رهيں، جيسے اس شكل ميں



"پٹي" لگانا پٹي كی چنائي كرنا -

پَچھیت - امث (یاے معروف سے) دوسری صورت ھے پچیت کی، جد

پچیت — امث (پَ کے زبر اور یاے معرف سے) مکان کی پیچھے والی، پشت کی دیوار، پچھواڑے کی دیوار، دالان کے پست پر کی دیوار -

پَکا ڈھولا — امذ - کھڑکی یا دروازے کی ڈات اور چوکھٹ کے اوپر والے سیروے کے بیچ کی چنائی - اس کو سنجا بھی کہتے ھیں -

پکھہ — امذ - (پَ کے زبر سے سنسکرت پکش पक्ष - ضلع، پہل، پہلو) - (۱) چار سے زیادہ — پانچ، چھہ، سات، آٹھہ، دس، بارہ وغیرہ — ضلعوں (پہلوں) والی شکل (کی چنائی) کا کوئی ضلع یا پہل - (۲) وہ چھوٹا سا پہل جو کسی دیوار کے باھر کی طرف والے کونے، یا فرش کی کگر یا اُس کے کنارے، کو مار یا گڑہ کر یا اگر اُس پر مسالا لگا ھے تو اُسے دبا کر برابر کردینے سے پیدا ھوجائے - دیکھو پکھا -

پَکھا — امذ - (پَ کے زبر اور کھ کی تشدید سے پکھہ، پکش) ایک تکون یا چو کور (مثلث، مربع، مستطیل) شکل کا ایک ضلع یا پہل - پکھہ اور پکھا میں فرق یہ ھے کہ پکھا تین یا چار پہل کی شکل کے ایک پہل کو کہتے ھیں، اور پکھہ میں شکل کے پہل چار سے زیادہ ھونے چاھئیں -

پلَستر — امذ - (پَ کے زبر اور زیر، دونوں طرح - انگریزی پلاسٹر Plaster عموماً پ کے زبر سے) دیکھو پلستر -

پَلرا — امذ ۔ (پ کے زبر سے تغ ؟ فارسي پَلّہ) توکرا ' جس میں تعمیر کے کام کے لیے مسالا وغیرہ رکھا جاتا ھے ۔ چھوٹے توکرے (یا توکري) کو " پلري " کہتے ھیں ۔ دیکھو بَھوکا ۔

پَلري — امث ۔ (پ کے زبر سے) توکري ، چھوٹا توکرا ۔ دیکھو پلرا ' بَھوکا ۔

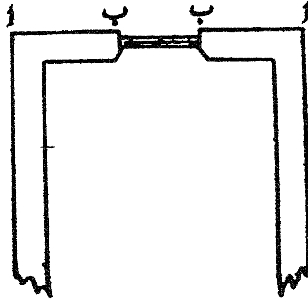
پلستر — امذ ۔ (پ کے زبر سے عموماً ' اور زیر سے بھي ۔ انگریزي پلاستر Plaster) فرش یا دیوار وغیرہ پر مٹي یا چونے کي تہ یا لپائي ' چونے یا مٹي کي استرکاري ' کہگل ' گنچکاري ۔ دیکھو پلاستر ۔

پُلوئی — امث ۔ (پ کے پیش ' اور واو معروف سے) ۔ پیٹني (حد) کی وہ قسم جس میں موٹے بانسوں کی جگہ پتلے بانس استعمال کیے جائیں ' یا یہ کہ بانس کا پتلا سرا اس کام میں لایا جائے ۔ پیٹنی اور پُلوئی میں صرف یہ فرق ھے کہ پیٹنی موٹے بانس کی ھوتی ھے اور پلوئی پتلے بانس کي ۔

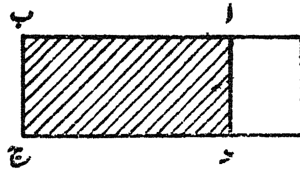
پَن چیر — امذ ۔ (پ کے زبر ' اور یاے معروف سے ۔ پن=پانی + چیر — چیرنا سے) ۔ کوئي اُبھری ھوئی چیز (مثلاً منگراوا ' کُنیا وغیرہ) یا جگہ جہاں پانی گر کر اِدھر اُدھر دونوں طرف کو بہ جائے ؛ وہ چیز یا جگہ جو پانی کو چیر کر اِدھر اُدھر بہادے ۔ دیکھو کھپرا ؛ منگراوا ؛ کنیا ۔

پَوتیا — امذ ۔ (پ کے زبر سے) ۔ دیوار کا وہ حصہ جو دروازے کی عمودي چوکھٹ (بازو) سے لے کر دیوار کے کونے تک ھوتا ھے ۔ اس طرح اگر کسی دیوار میں صرف ایک

دروازہ ہو تو اُس کے دونوں طرف-کا حصہ "پوتیا"
کہلائیگا - ذیل کي شکل میں "ا ب" اور "ب ا" دونوں
پوتیاں ہیں -



پونا-یا پَونّا-امذ - (پونا ، تین چوتھائي حصہ)- پوری اینٹ
کا تین چوتھائي حصہ جو اُس کي لمبائی میں سے کاٹ
یا توڑ کر نکالا گیا ہو - ذیل کی شکل میں ا ب ج د
پونا ہے -



پیالے دار (ڈاٹ) - امث - ڈاٹ کي ایک قسم ہے - دیکھو ڈاٹ
(۲ ب)-

پیٹن-امث - (پ کے زبر اور ٹ کے زیر سے - انگریزي
پوائنٹنگ Pointing) - اینٹ یا پتھر کي جڑائی میں
(خواہ وہ فرش میں ہو یا دیوار وغیرہ میں) اینٹوں کي
درزوں میں چونا یا سمینٹ بھرنا - پیٹن کي چار قسمیں
ہیں : (ا) لپواں (تغ لیپنا، لیپ) جس میں درزوں

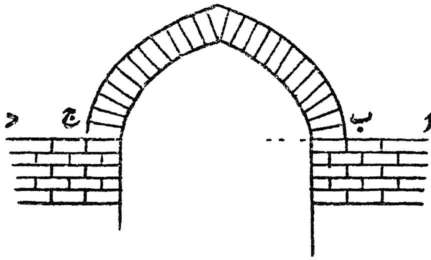
میں چونا یا سمینٹ بھر کر اُسے کنّي کي ٹیک (جد) سے اوپر سے لیپ کر چکنا کر دیا جاتا ہے - اسے انگریزي میں "فلش پوائنٹنگ" (Flush Pointing) کہتے ہیں (۲) الّو (واو معروف سے) ' جس میں درزوں میں مسالا بھر کر اندر ہي اندر اُسے لیپ کر اس طرح صاف اور برابر کردیا جاتا ہے کہ اینٹ کی درز دکھائی دیتي رہے اس کا انگریزي نام "رف پوائنٹنگ" (Rugh Pointing) ہے - اس کو "اُجبک" بھي کہتے ہیں - (۳) بانکوی دار ' جس میں درز میں مسالا بھر دیتے ہیں ' پھر اُسے بانکڑي (جد) سے اینٹوں کي درزیں بنا کر نمودار کردیا جاتا ہے - یہ انگریزي محاورے میں "رولڈ پوائنٹنگ" (Ruled) ہے - (۴) کٹوا (کاف کے زبر اور ٹ کے پیش سے) ' جس میں درزوں کے اندر مسالا بھرنے کے بعد اُن کے اوپر بھي اس طرح مسالا جمایا جاتا ہے کہ وہ ⅛ انچ اُبھرا رہے - پھر اُسے اس طرح صاف کرتے اور چکناتے ہیں کہ وہ خوشنمائی سے ہر درز کي جگہ پر اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے - پیٹن کي یہ قسم سب سے زیادہ خوشنما ہوتي ہے - پیٹن کو "ٹیپ" بھي کہتے ہیں -

پیٹھہ (کارنس کي)—امث - (یاے معروف سے) - کارنس کی اوپر کی سطح ' جس کا رخ اوپر کو یعني چھت (یا آسمان) کي طرف ہوتا ہے -

پیٹي—امث - (پہلي ی مجہول) - وہ بانس ' جو پاڑ میں زمین کے متوازي ہوتا ہے اور جس کا ایک سرا دیوار پر اور ایک ٹھڑیا (جد) سے بندھا ہوتا ہے - دیکھو پاڑ -

"پیٹی" کا جو سرا دیوار پر رکھا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ چنائی کرتے وقت اُس کے آس پاس اور اُوپر ہي چنائی هوسکتي ہے - اس طرح چنائی هو جانے کے بعد جس جگہ پیٹي کا ؤوہ سرا رکھا گیا تھا، وهاں ایک موکھا رہ جاتا ہے اسے "پٹي کا در" کہتے هیں - اگر پیٹي کا یہ سرا دیوار کے آثار کے آدھہ میں رکھا هو اور دوسري طرف سے دیوار چني جا سکے تو یہ "در" آدھے هی آثار تک رهتا ہے - لیکن اگر پیٹي کا سرا اِتنا لمبا هو کہ وہ آثار کے آر پار دوسری طرف نکل جائے، اور اس طرح دیوار میں بالکل آر پار ایک سوراخ رہ جائے، تو ایسے سوراخ کو "بیالا" کہتے هیں - دیکھو پلوئي -

پَیکار — امذ - (پ کے زبر سے) - وہ جڑائی جو کسي دروازے یا کھڑکي کے دونوں طرف، دائیں اور بائیں، ڈاٹ کے نیچے کي حد تک پہنچ گئي هو - اس شکل میں ا، ب، ج، د، پیکار ہے -

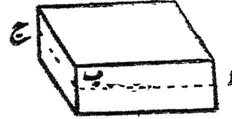


پھ

پُھٹ — امذ - صف - (پھ کے پیش سے) - ایک راج جو کسي جگہ اکیلا هی کام کر رها هو -

پھَڑّی — امث - (پھ کے زبر، اور ڑ کي تشدید سے) اینٹ کا وہ آدھا ٹکڑا، جو اینٹ کی موٹائي میں سے دو برابر کے ٹکڑے کاٹ کر نکالا جائے - هر ایک ٹکڑا "پھڑي" کہلاتا ہے -

اس شکل میں ا ب ج نقطہ دار خط کے اوپر اور نیچے ایک ایک پھری ہے -



دیکھو ادھا ؛ کھنڈا -

پھَڑوا—امذ - (پھ کے زبر اور ڑ کے پیش سے) - پھاؤڑا ؛ بیلچہ ؛ گل‌صفا زمین کھودنے یا مٹی ؛ چونا ؛ ملبا وغیرہ ھٹانے اور صاف کرنے کا لوھے کا بنا ھوا اوزار ؛ جس کے ایک طرف لکڑی یا بانس کا لمبا سا دستہ لگا ھوتا ھے ؛ جسے پکڑ کر پھڑوا چلایا جاتا ھے - دیکھو بیلچا -

پھَسیل—امث - (پھ کے زبر ؛ اور یاے مجہول سے - یہ دوسرا (اور بگڑا ھوا) تلفظ ھے فصیل کا ؛ حد -

پِھلکا—امذ - اس کا دوسرا اور بہتر تلفظ ھے فِلکا ؛ حد -

پھُولن—امث - (واو معروف ؛ اور ل کے زبر سے - پھولنا ؛ پھولا ؛ پھول—ابھرا ھوا ھونا) - دیکھو ایڑ - پھولن کو "چوتر" بھی کہتے ھیں -

ت - تھ

تاؤ—امذ - (تاؤ فارسی باؤ تاب=طاقت ؛ مضبوطی ؛ چمک) - جب فرش یا دیوار وغیرہ کی چونے کی استرکاری اس حالت پر پہنچ جائے کہ چونے کے سب ذرّے گل کر اور گُھل مِل کر ایک جان ھو گئے ھوں اور چونا اس قابل ھو گیا ھو کہ اس کی گُھٹائی کردی جائے ؛ تو اس حالت کو "تاؤ" اور "تاؤ پر آنا" کہتے ھیں - دیکھو بے تاؤ -

تِجائی—امث - (تؔ کے زیر سے) - (۱) اونچان ، اُتھان ، اُونچائی -
(۲) دیوار میں چنائی کا وہ حصہ جو کھڑکی یا دروازے میں ،
اوپر کی طرف ، چوکھٹ کے آگے اور پیچھے (یعنی اندر اور
باہر دونوں طرف) کھلا رہ جاتا ھے - یہ نام صرف اوپر کے
حصے کی ایسی چنائی کے لیے ھے ، نیچے کی چنائی کو
"تجائی" نہیں کہتے - دیکھو کودری -

تَراوا— امذ - (تؔ کے زبر سے - تغ : تلا ، تلی ، ترائی) - کسی
قسم کی چنائی کا یا کسی چیز کا وہ رخ جو نیچے کی طرف
سے دکھائی دے ، تلے کا ، نیچے کا رخ - اسے "ترایا" بھی کہتے
ھیں - اس کے مقابلے میں اوپر کے رخ کو ابراوا یا اپرایا کہتے
ھیں -

تَرایا—امذ (تؔ کے زبر سے) - وھی ھے جو تراوا ھے ، جد -

تُڑیا—امث - (تؔ کے پیش سے) - لکڑی لوھے ، اینٹ ، پتھر ،
سیمنٹ کنکریٹ کے (مختلف وضعوں اور شکلوں کے) بنے
ھوئے بازو ، جو دروازے یا کھڑکی کے دائیں بائیں دونوں طرف
دیوار میں چنائی کر کے یا میخوں سے جڑ کر بنائے جاتے
ھیں ، اور جن پر سائبان کا چھاپ (جد) ٹکتا ھے -

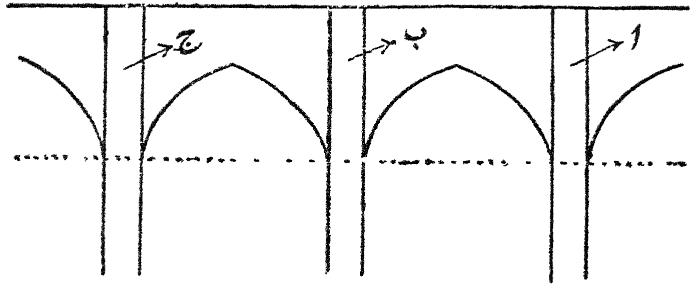
تَگار—امذ - (تؔ کے زبر سے - فارسی : تغار) - وہ گڑھا جو (زمین
میں) مٹی کا گارا یا چونا بھگو کر سوندنے اور چنائی کے لیے
تیار کرنے کی غرض سے بنایا جاتا ھے - یا تو یہ گڑھا زمین
میں بنایا جاتا ھے یا زمین در اینٹوں کا فرش بچھا کر اور
چاروں طرف ایک چھوٹی سی دیوار کھڑی کرکے تیار کیا
جاتا ھے - مٹی کے گارے کا تگار عموماً زمین میں گڑھا کھود
کر بناتے ھیں ، اور چونے کے لیے اینٹوں کے فرش سے - بڑے

نگار کو "نکار" اور چھوٹے کو مصغر کر کے "نگاری" کہتے ہیں -

نگاری—امث - چھوٹا نگار - دیکھو نگار -

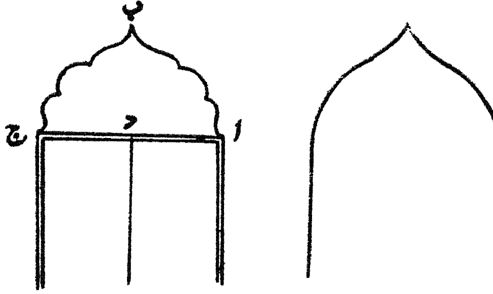
تسلا—امذ - (تؔ کے زبر سے بغ دکھنی ، تسلالو؟ ہندی تونْسا ، تونْسی) - تین یا لوہے کا تام لوٹ ، ڈونگا ، جس میں پانی بھر کر ایک آدھ اینٹ ، تھوڑا سا گارا یا چونا یا تھوڑی سی چنائی وغیرہ کو بھگوتے ہیں - عام طور پر ٹین یا لوہے کے کھلے مُنہ کے ڈبّے سے بھی تسلے کا کام لے لیتے ہیں -

تمنچا—امذ - (تؔ اور میمؔ کے زبر سے - فارسی طماچہ ، طماںچہ ، تپانچہ=تمنگچہ ، تھپڑ) - ایک (یا تناسب کے لحاظ سے زیادہ) اینٹ کی وہ چنائی ، جو قریب قریب کی دو محرابوں کے درمیان میں عمودی شکل میں دیوار سے ذرا باہر کو نکلی ہوئی ہوتی ہے اس کی شکل یہ ہے -



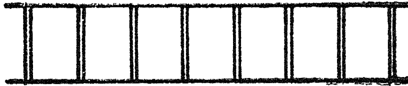
اس میں الف ، ب اور ج تمنچے ہیں - (۲) محراب کی ذات اور دروازے کی چوکھٹ کے درمیان میں نیم دائرے یا جیسی شکل پیدا ہو) کی شکل کی چنائی - ذیل کی دونوں شکلوں

میں ا ، ب ، ج ، د کے درمیان میں گھری ہوئی جگہ کی چنائی تمنچا ہے :-



اس کو "نکل (نقل)" اور "پکا ڈھولا" بھی کہتے ہیں -

توڑا—امذ - (واو مجہول سے) - چنائی میں اینٹوں کو اس طرح لگانا کہ ان کا عرضی پہلو ساتھ ساتھ رکھا جائے "توڑا لگانا" یا "توڑے کی جڑائی کرنا" کہتے ہیں - دیکھو پٹی - توڑے کی شکل یہ ہے :-



تھاپی - امث - (ىغ - تھپکنا ، تھپکی) - لکڑی کا بنا ہوا اوزار جو ایک موٹی سی کنّی کی شکل کا ہوتا ہے - اس سے فرش یا دیوار (وغیرہ) پر استرکاری کرنے کے لیے مسالا (خاص کر چونا) لگاکر آہستہ آہستہ پیٹتے (تھپکتے) ہیں تا کہ مسالا ایک جی جان ہوکے دیوار (یا فرش) کی چنائی کو پکڑلے اور مضبوط ہوجائے - اگر تھاپی سے اس طرح نہ تھپکا جائے تو استر (پلستر) پھٹ جاتا ہے اور مضبوط نہیں ہوتا -

نظم و نثر پر ایک نظر

(از اصغر حسین اصغر مرتب رسالہ)

حقیقت کی جستجو فطرت انسانی کو ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی، لیکن حقیقت خود جس طرح ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اُسی طرح کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں تک پہونچنے کے لیے طلب و جستجو کی راہیں بھی کتنی بے حد و بے شمار ہوں گی، اِس لیے کہ ہر دماغ اپنے مخصوص ماحول اور اس طرح اپنی مخصوص ساخت و صلاحیت کے اعتبار سے مختلف و منفرد واقع ہوا ہے - شاید اسی لیے ایک حکیم نے حق و صداقت کی راہوں کو انفاس خلائق کے برابر بتایا تھا -

اس اعتبار سے انسان نے اپنے خاموش "اعمال" سے کون کون سی منزلیں طے کیں، کس کس طرح اور کن کن کوششوں سے صداقت اور حقیقت کو بے نقاب کر کے عالم آشکارا کیا، یہ تمام امور اور اُن کی تفصیلات تاریخ تمدن کے اہم ترین ابواب ہیں، لیکن اسی ضمن میں اس کے "اقوال" بھی اس کے اعمال سے کم اہمیت نہیں رکھتے، اس کے "اعمال" نے اگر سوسائٹی میں تنظیم پیدا کی ہے، انتشار اور مناقشوں کو دور کر کے ملکوں اور شہروں کو سنوارا ہے اور ہر طرف امن و فارغ البالی کی لہریں دوڑا دی ہیں تو ٹھیک اُسی طرح اس کے "اقوال" نے بھی "علم و ادب" کے نام سے ذہن انسانی کے تاروں کو فطرت سے ہم آہنگ بنایا ہے، اور دل و دماغ کی فضا کو حقائق و معارف کے نغموں سے معمور کردیا ہے، باینہمہ علوم و معارف کا سمندر

آج بھي اُسی طرح بے پایاں ھے جس طرح خود انسانیت کا ذوق جستجو :—

نہ حُسنش غایتے دارد نہ سعدي را سخن پایاں

بمیرد تشنہ مستسقي و دریا ھمچناں باقي

معلوم یہ ھوتا ھے کہ طلب و جستجو میں ایک حرکت دوام کی سي کیفیت ھے ' انسان اپني استعداد کے اعتبار سے کہیں ھو مگر اس کا ذوق جستجو ھر وقت اور ھر ساعت مصروف کار رھتا ھے - اُس نے اول اول جب اس جلوہ گاہ فطرت میں آنکھیں کھولي ھوں گي ' بہتے ھوئے دریاؤں ؟ رنگ برنگ کے پھولوں اور چمکتے ھوئے ستاروں کو دیکھا ھوگا تو اس کے حیرت کا کیا عالم ھوا ھوگا اور اس کے جذبات اور احساسات پر کیا گذري ھوگي ' "شعر و شاعری" کي کل کائنات اسی جذبے اور احساس کے دم سے وابستہ ھے ' شاید اسی لیے دنیا نے اپني تاریخ ادب میں اولین درجہ شعر کو دیا ھے -

آج ھم حیرت اور اُس حیرت سے اور جو کیفیتیں پیدا ھوتی ھیں اُن سے معمولي طور پر واقف ھیں ' لیکن سوسائٹي کی رسمیات اور روب فکری کي عنان گیریوں سے اگر ایک لمحہ بھی رستگاري میسر ھو اور یہ خوبصورت اعیان و مظاھر حسن حیرت اور حسن جمالیاتي کیفیت کا ھم سے مطالبہ کر رھے ھیں وہ پوری طرح ھم پر طاری ھو سکے تو شاید اس وقت ھم اس لفظ کے حقیقي معنے سمجھہ سکیں ورنہ کیا معلوم کہ دنیائے حیرت میں جذبات کی گفتگو کیا ھے اور شاعري کی زبان کیا ؟ :—

محرم ایں ھوش جز بیھوش نیست

مرزباں را مُشتري چوں گوش نیست

کسي کا قول ہے کہ فلسفہ جذبات کو منضبط اور شبہے کو رفع کرنا چاہتا ہے - لیکن شاعري اسے جذبے اور حیرت کو دہ چند بنانا چاہتی ہے ' کون کہہ سکتا ہے کہ شاعري کی یہ کوششیں اگر مشکور ہوئیں تو خود اُس شاعري کي نوعیت کیا ہوگي نیز یہ کل کائنات اُس وقت کہاں سے کہاں پہونچي ہوئي ہوگي ؟ عارف رومي نے اسے واضح کرنا چاہا مگر ——

فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

کہہ کہہ کر سکوت اختیار کیا، اصل یہ ہے کہ نہ عالم آب و گل' اور نہ زمان و مکان، شاعرانہ جذبات کے اس آشوب و غارتگري کو گوارا بھی نہیں کر سکتے' فطرت کي نظر قیام عالم اور اس کے توازن پر رہتی ہے وہ کھودینے اور کھو جانے والي ذہنیت کا دامن پکڑ کر اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیتي ہے جسے عالم فکر و ہوش کہتے ہیں - لیکن انسان کا فطري ذوق جستجو یہاں بھي معطل نہ رہ سکا' صرف اس کی کیفیت تبدیل ہوگئی یعنی اب اُس بہتے ہوئے دریاؤں میں جہاز رانی کا سود و زیاں ' رنگ برنگ کے پھولوں میں فن باغبانی اور چمکتے ہوئے ستاروں میں فلکیات کے مسائل نظر آنے لگے' پہلي حالت میں اگر منفرد کیفیات کی نامتناہیوں سے ذوق جستجو کو سکون و سرور حاصل ہوتا تھا تو دوسري حالت میں استدلال و تجربات کے ذریعہ حقیقتوں کو متعین کرنے سے - لیکن چونکہ انسان کی فطرت میں کم و بیش یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہیں اس لیے بعض ذہنوں پر اول الذکر کا اور بعض پر آخرالذکر کا غلبہ ہوتا ہے ؟ سمجھنے کے لیے اول الذکر کو ذوقي و جذباتي اور آخرالذکر کو علمي و عقلي کہنا غالباً بے جا نہ ہو -

علم و عقل کے بارے میں ہم بداہتاً یہ دیکھتے ہیں کہ اُس میں عوام و خواص کی تخصیص ہے ' یعني عوام و خواص کے علم و عقل

میں باہم تفاوت ہے جس سے اہل علم و اہل عقل کی جماعت عوام سے بالکل ممتاز ہو جاتی ہے، اسی طرح ذوق و جذبہ گو عوام و خواص میں مشترک ہے تا ہم اُن میں بھی تفاوت ہے جس سے صاحبان ذوق کی جماعت بھی اہل علم کی طرح عوام سے ممتاز ہوتی ہے، اور جس طرح ؟ علم و عقل میں کسب و اکتساب کو دخل ہے، اُسی طرح جذبات و احساسات میں بھی وسعت و پاکیزگی پیدا کی جاسکتی ہے -

جذبات و حسیات بے پایاں و غیر محدود ہیں اور جب وہ کسی طرح لفظ و بیان ، عبارت و اشارت کا لباس اختیار کر لیتے ہیں تو سننے والے اور پڑھنے والے کی صلاحیتوں میں بھی وہی جنبش پیدا ہوجاتی ہے اور اُس کے تار جذبات سے بھی وہی نغمے بلند ہونے لگتے ہیں جنھوں نے اول اول کہنے والے کو بیتاب کردیا تھا - شاعر یا صاحب ذوق کا طرز بیان عام طرز بیان سے مختلف ہوتا ہے ، اس کی کیفیت بھی اُسی لفظ اور اُسی طرز بیان کو منتخب کرتی ہے جو اُس کی غیر محدود حقیقتوں کی متحمل ہو سکے - مجرد حقیقت عام اس سے کہ لفظ و بیان میں کتنی ہی قوت کیوں نہ ہو مادی صورتوں کی کی طرح متغیر نہیں ہوسکتی - شاعر اس کے لیے وہ انداز اختیار کرتا ہے جو جذبات و حسیات کی غیر محدود فضا تک سننے والے کے ذہن کو پہونچا سکے ، اس لیے جذبات جن مجرد حقائق تک لیجاتے ہیں اُن کو لفظ و بیان میں مسمل و متشکل کرنا شاعری ہے شاید اسی لیے تشبیہ و تمثیل مجاز و استعارہ ، غلو و مبالغہ شعر کے ضروری عناصر قرار پائے -

بر خلاف اس کے عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ منطقی استدلال اور علمی تجربات کے ذریعہ حقیقتوں کو متعین کرے - تعین ا

اور صحیح تعین کے لیے ہمیشہ ایسے الفاظ اور ایسے طرز بیان کی ضرورت ہوتی ہے جو صاف و سادہ ہوں، جن میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو اور سننے والے یا پڑھنے والے کا ذہن اُس شے سے ہٹ کر کسی دوسری طرف منتقل نہ ہو سکے۔ اس لحاظ سے عام طور پر ذوقی امور یعنی شعر کے لیے نظم اور عقلیات کے لیے نثر موزوں سمجھی جاتی ہے لیکن اگر نظم و نثر کا اس نقطۂ خیال سے جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہم نظم و نثر کے کل دفتر کو صحیح صحیح طور پر "ذوقیات" و "علمیات" کے تحت میں نہیں لا سکتے، ہمیں اکثر نظم کی شکل میں علمی و عقلی باتیں ملیں گی اور نثر میں ذوقیات و وجدانیات کے کرشمے نظر آئینگے۔ شاید ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا، اس لیے کہ عقلی و جذباتی تو دو ذہنی حالتیں ہیں جو بنائی نہیں جاتیں بلکہ ہوتی ہیں اور ہر چند کہ وہ کم و بیش سب میں موجود ہیں مگر اُن پر وہ قدرت حاصل نہیں ہوتی جو نظم و نثر کی ہیئتِ ظاہری کی ترتیب پر ہوا کرتی ہے اِس لیے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تاثر کے ساتھ جذبات کو منتقل و منشکل کرنا شاعری ہے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس نظم میں جذبات؟ کہ وہی جذبات کی برانگیختگی کا ذریعہ و سامان بھی ہیں، نہ شامل ہوں اُسے شعر کہنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ کیا یہ شعر، شعر کہا جا سکتا ہے؟:—

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
عشق بے حد ہے خودی محدود ہے

یہ شعر ممکن ہے ہمارے ذہن کو کسی واقعے یا صداقت تک پہونچا تا ہو مگر اس سے ہمارے جذبات و حسیات میں کوئی تموّج و تلاطم نہیں ہوتا، ممکن ہے یہ ایک بلند صداقت ہو لیکن

شعر نہیں ، اس سے ہمیں ایک اعلیٰ درجے کی بات معلوم ہوتی ہے مگر ہم پر کسی قسم کی کیفیت ہرگز طاری نہیں ہوتی - عشق اور بے خودی کی حکیمانہ تحلیل ، عشق اور بے خودی کی لذتوں سے بہرہ یاب نہیں بنا سکتی بلکہ صرف معقولات و معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے جو یقیناً نثر سے بھی بہ آسانی ممکن ہے - لیکن عشق و بیخودی سے متکیف ہو کر جو شعر کہا جاتا ہے اُس میں حکیمانہ نکتہ سنجیوں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی صرف اُس تاثر کی ترجمانی کافی ہوتی ہے مثلاً :—

چشم من نگاہے کرد لعل او حدیثے گفت

هوش مست و بیخود شد بیخودی نہ هوش آمد

یہ کہنا مقصود نہیں کہ شعر کا ایک ذوقی چیز ہونا شاعر کو معلوم نہ تھا بلکہ عرض یہ کرنا ہے کہ شاید اِس خیال سے کہ نظم میں قدرتی طور پر ترنّم و موسیقیت ہے اور وہ طبعاً لوگوں کو مرغوب ہوتی ہے اِس لیے معقولات و معلومات کو بھی کبھی کبھی نظم کر دیا جاتا ہے تا کہ زبان زد عام ہو کر کافی طور پر مفید ثابت ہو سکیں - بہر صورت اِس طریق کار میں کتنی ہی بڑی مصلحت پنہاں کیوں نہ ہو ، لیکن منصفانہ تنقید اُنھیں شعر کا خطاب کسی طرح نہیں دے سکتی اِسی طرح مولانا حالی مرحوم کی بھی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کی افادیت سے قطعاً اِنکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اُنھیں شعر کہنا ، یکسر شعر کی توہین ہوگی ، لیکن اب ایک نظر ملاحظہ ہو :—

" آنکھیں کُھلیں تو عہد شباب کی صبح ہو چکی تھی اور
خواہش اور ولولوں کی شبنم سے خارستان ہستی کا
ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا - اپنی

طرف دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا ۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اِس صبح فریب کے لیے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے نہ نا اُمیدی و ناکامی کی شام ۔ یہ سارا شہرستان امید اور نگارخانہ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کامجوئیوں کے لیے بنایا گیا ہے اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لئے چشم براہ ۔ جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی ۔ معلوم نہیں اپنی ہی غفلت عشرت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی ، یا تو گرفتاران عالم اسباب کی ہوش ربائیوں کے لیے خود ساز ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے ۔ (تذکرہ ۲۹۲۰) ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر ایک خاص حیثیت رکھتی ہے اُس کو مثال میں پیش کرنا غالباً عام طور پر صحیح نہ سمجھا جائے مگر علامۂ شبلی ایسے زبردست ادیب کو لیجئے جس کی جامعیت اور جس کی صحت ذوق یقیناً مُسلّم ہے ۔ سیرۃالنبی میں " ظہور قدسی " کے عنوان سے لکھتے ہیں :—

"چمنستان دہر میں بارہا بہاریں آ چکی ہیں چرخ نادرۂ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اِس سر و سامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہگئی ہیں" ۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردیئے ؟ سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے چرخ کُہن مدت ہائے دراز سے اِسی صبح جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا کارکنان

قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تر دستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراھیم جمال یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ، جاں نوازیِ مسیح، سب اِسی لیے تھے کہ یہ متاع ھائے گراں ارز شہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئینگے۔ توحید کا غلغلہ اُٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آ گئی، آفتاب ھدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاق انسان کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اُٹھا۔ (سیرۃالنبی جلد ۱، صفحہ ۱۲۳)۔

اگر شعریت کی تعریف وھی ھے کہ کہنے والے نے جوش و جذبات سے متاثر ھو کر لکھا ھو اور اُس کا اثر بھی پڑھنے والے کے جوش و جذبات کو برانگیختہ کردے تو کیا یہ دونوں عبارتیں اُس کی صحیح صحیح مصداق نہیں ھیں؟۔

خود علامۂ شبلی مرحوم شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا بتاتے ھیں یعنی اُس کو سن کر دل میں رنج یا خوشی یا جوش کا اثر پیدا ھو، اور یہی خصوصیت ھے جو شاعری کو علوم و فنون سے ممتاز بناتی ھے۔ اُن کے نزدیک شعر کا تخاطب جذبات سے ھے اور علوم کا عقل سے، علوم استدلال سے کام لیتے ھیں اور شاعری محرکات سے، اسی طرح ڈراما اور افسانے کے وہ حصے جن میں جذبات کو مشتعل کیا گیا ھو سحر میں داخل ھیں۔*

اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا غالباً بیجا نہ ھو کہ بعضوں کے نزدیک شاعری اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں ھیں، ان کے نزدیک شاعر کا تخاطب خود اپنے نفس سے ھوتا ھے لیکن خطیب یا مقرر کے لیے یہ ضروری ھے کہ وہ دوسروں کے احساسات

---

* شعرالعجم جلد چہارم صفحہ ۴۔

و جذبات پر نظر رکھتا ہو؟ شاعر کے لیے اگر یہ صحیح ہے کہ پہلے وہ خود متاثر ہوتا ہے اس کے بعد دوسرے اس سے متاثر ہو جاتے ہیں؟ تو ایک حقیقی واعظ و خطیب کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہو اس سے خود بھی متاثر ہو ورنہ اُس کا تمام بیان ایک نغمۂ بے آہنگ اور ایک جسد بے روح بن کر رہ جائے گا؟ امام ابو بکر شبلی نے حضرت جنید بغدادی سے فرمایا کہ "رازے کہ ما بس پردہ میگفتیم تو در بازار آشکارا کردی و بر منبر گفتی؟"* "بگفت کہ اے امام وقت خود میگویم و خود می شنوم کہ ہل فی الدارین غیری"۔ یہ ہے ایک خطیب کی صحیح ذہنیت جس کا اظہار خود ایک خطیب ہی کی زبان سے اس طرح ہوا ہے؟ لیکن جو خطیب یا واعظ آج کل ہمارے سامنے ہیں اگر وہ صرف دوسروں ہی کے چشم و ابرو کو دیکھتے رہتے ہیں تو اس سے ایک حقیقی خطیب کی عظمتوں پر کوئی حرف نہیں آتا آج ہمارے شعرا بھی اگر بزم سخن کی رونق بڑھانے اور لوگوں کی واہ وا کے لیے مذاق عوام کی پیروی کرتے ہیں اور حقیقی زندگی کے تقاضوں کے خلاف شاعری کو ردیف و قافیے کی بازیگری اور مشق و مزاولت کا ایک کرتب بنائے ہوئے ہیں؟ تو اس سے شعر و شاعر کی اصلی تعریف کسی طرح تبدیل نہیں ہو سکتی۔

اردو میں خطابت کی اعلیٰ ترین مثال موجودہ مذاق کے موافق مولوی ابوالکلام آزاد کے یہاں جس قدر ملتی ہے اتنی شاید ہی کسی اور کے یہاں ہو؟ ذیل کی سطروں کو ملاحظہ فرمایئے کس قدر خطیبانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

---

* وہ راز جسے میں نے چھپا کر تم کو بتایا تھا تم نے اس کو بازار میں مشہور کردیا اور منبر پر اس کا اعلان کردیا – جواب دیا کہ اے امام وقت خود ہی کہتا ہوں اور خود ہی سنتا ہوں کیا دونوں جہاں میں میرے سوا کوئی اور بھی ہے –

"افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے ؟ تم نمائش کے پجاری ، شور و ہنگامے کے بندے اور وقتی جذبات و انحطار ہیجان کی مخلوق ہو ؟ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر ؟ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو ؟ تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو ؟ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی ؟ اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے اور اُسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت ہے نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن ؟ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل؟ وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو ؟ خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو؟ خدا را بتلاؤ میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو ؟ بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں؟ تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اُسی طرح مفقود ہے جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے - اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آئی - تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اُتارو اور ایسے پُر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتحمند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں اور پھر انہی انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ اُن کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے مگر آہ ! میں تمہاری اِن بھیڑوں کو لیکر کیا

کروں جب تمہارے دلوں میں سنّاٹا چھایا ہوا ہے اور تمہارے اِس جوش استقلال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مُر جھائی ہوئی ہیں ؟ افسوس ! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو ؟ تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو ؟ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اِس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں ۔—

من بہر جمعیتے نالاں شدم
جُفت خوشحالاں و بد حالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز دروں من نہ جُست اسرار من

تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا خوگر ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہے ۔ ۴۲

ان مثالوں سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ ان میں کشش و جاذبیت ہوتی ہے اس لیے قدرتی طور پر لوگوں کو خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی اپنی تحریروں کو ایسی ہی دلکش اور جاذب نظر بنائیں - حالانکہ جذب و کشش کی علت اصلی لکھنے والے کی قلبی و ذہنی کیفیت ہے ، اِسے لفظ و بیان کے عرض و سطح پر تلاش کرنا فضول ہے ، لیمپ کی روشنی اس کی لو سے ہے ، اور بجھے ہوئے لیمپ پر فاسفورس ملنا دوسری چیز ہے - جس طرح نظم میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ شعر کی دلکشی کو دیکھ کر وہ لوگ جن کا ذہن یکسر شعریت سے خالی اور نا آشنا ہوتا ہے وہ بھی کسی کے اچھے

شعر سے الفاظ و تراکیب لے کر کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ، یا حسرت و بیکسی ، فنا و بقا یا اور اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس ظاہری ٹیپ ٹاپ سے ان کا شعر بھی شعر ہو جائیگا حالانکہ اعلیٰ قسم کی شاعری کے لئے ایک مخصوص زندگی ایک مخصوص طرز تخیّل اور ایک مخصوص اُفتاد نظر کی ضرورت ہے جس سے شاعر کی انفرادیت و شخصیت طیار ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح نثر میں بھی بعضوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ مشکل الفاظ ، پیچیدہ تراکیب اور شاعرانہ طرز بیان سے ان کی عبارتوں میں وزن پیدا ہو جائیگا ، عوام اور نا واقف لوگوں کا ذکر نہیں ، لیکن جو لوگ صحیح ذوق اور صحیح نظر رکھتے ہیں وہ اس طرح کی نثر کو بھی اُتناہی نا پسند کرتے ہیں جتنا اُس مصنوعی نظم و شعر کو۔

کسی چیز یا کسی واقع کی علمی توضیح و تشریح کے معنی یہ ہیں کہ بغیر کسی جذبے کی آمیزش کے اُسے پیش کیا جائے ، لیکن اگر اس کے بیان میں کسی قسم کا شاعرانہ رنگ روغن استعمال کیا جاتا ہے تو یہ ایک قسم کی ادبی فریب کاری ہے جس سے ہر شایستہ و سنجیدہ شخص کو اجتناب کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک مضمون جس میں اجنتا کے بتوں کا تذکرہ ہے ، عبارت کا یہ طرز اختیار کیا گیا ہے —

"بودھوں کی یادگار فن کا حصۂ کثیر اجنتا کا سرمایہ ہے" جو عظمت و حکمت کے زیور سے سرتاپا مرصع ہے ، جذبات کی نمائندگی ، پاکباری وسادگی اس صنعت رنگیں کے وہ زریں اوصاف ہیں جن کی بدولت بیکران حسن آفریں چشم نظارہ باز کو ایک ہی جلوے میں مسحور کرلیتے ہیں.... صانع کی شوخی تحریر کے فریادی

نقوش کا ہر عضو بدن بخوبی نمایاں ہے ، اس سے
ان کا حسن کمر پرور بے نقاب ہوکر اور دوبالا ہو گیا
ہے . . تلاش و تصنع کو ذرہ بھر بھی دخل نہ ہونے
کے باعث مصور کا قسرار اورد کی پیچیدگیوں کا شرمندہ
احسان ؟ نہیں ۔ وغیرہ وغیرہ "۔

خط کشیدہ لفظوں اور فقروں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیان کو زیبی اور رنگین بنانے کے لیے شاعری سے مستعار لئے گئے ہیں ، حالانکہ ان کا زیبی اور رنگین ہونا سرے سے غیر ضروری تھا بلکہ ان کا صاف اور سادہ ہونا ہی اُن کا اصلی حُسن تھا ۔

حقیقت یہ ہے کہ نظم و نثر یا بہ الفاظ دیگر شاعرانہ و علمی بیان کو باہم اُتنا ہی مختلف ہونا چاہیے جتنا اُن دونوں کے اصل سر چشمے (یعنی جذبہ و عقل) مختلف ہیں ؟ یہ ذہن کی مستقل دو جداگانہ حالتیں ہیں اور دونوں کے حُسن بھی مختلف ہیں حُسن عبارات کے نقطہ نظر سے حسن ہے یہ ضروری نہیں کہ بدذات کے نقطۂ نظر سے بھی حُسن ہو ؟ ایک کی کمی کو دوسرے سے پورا کرنا ، کمی پورا کرنا نہیں ہے بلکہ اس میں ابتذال اور بھدا پن پیدا کر دینا ہے ؟ عطر اور قورمہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں لیکن قورمے میں عطر ملا دینا اور عطر میں تھوڑا سا شوربہ ٹپکا دینا در اصل دونوں کو غارت کر دینا ہے ۔

میرے اس بیان کی غرض یہ ہے کہ نظم و نثر کی مخلوط طاقتیں یعنی ان کی عبارتوں پر اس طرح کا عمل پیدائش نہ صرف کیا جائے لیکن لکھنے والے کے ذہن میں اگر عقل اور جذبے کا خود ہی احساس ہو تو اس سے ہمارے ادب میں ایک خاص قسم کی کیفیت اور خوبصورتی پیدا ہو جائیگی ۔

اس قسم کي نثر نه تو بقول شخصے واقعات کي کھتونی کي طرح خشک ہوتی ھے اور نه کیفیات و جذبات کي شدت سے ھمیں کسی دوسرے عالم میں پہونچا دیتي ھے ' اس کے پڑھنے سے ھمیں لطف بھي آتا ھے اور ایک گونه واقعات و معلومات کي اطلاع بھي ہوتی ھے - اس کا ایک نمونه یہاں پیش کیا جاتا ھے :—

"یہي بلاغت تھي جس نے کسي زمانے میں حیدرآباد دکن کے نمسارک کو نذیر احمد کا شیدائي بنا رکھا تھا ۔ سر سالار جنگ اول اسٹیٹ ڈنر پر ھیں ۔ طلائي قابوں کا دور چل رہا ھے - چھري کانٹوں کي دھیمي موسیقت میں دفعتاً سرکاري ڈاک کے آنے کي اطلاع ہوتی ھے ۔ ارشاد ہوتا ھے کہ نذیر احمد کي کوئي مراسلت ھو تو فوراً پیش کی جائے - ایک منٹ کے بعد جلیل‌القدر میزبان شام کے ھاتھه میں ایک کاغذ ہوتا ھے برقی روشني کي جگمگاهت میں شایق‌الادب امیرالامرا کي نگاہ نقوش حرفي پر دوڑ رھی ھے اور چہرے پر وہ کیفیت طاري ہوتي ھے جسے تبسم زیر لب کی ھلکی لہریں کہئے ۔ نذیراحمد کے خوان ادب کا یه لقمۂ تر تھا جس سے شاھی میز بھی بے نیاز نه رہ سکي لیکن اب یه ھمارے گلے میں پھنسنے لگا ھے جسے ھم اگلنا چاہتے ھیں مگر نه پے سکی روایات سابقه کے لحاظ سے کچھه ٹھیک نہیں معلوم ہوتی - "

(مہدي حسن افادي‌الاقتصادی)

ادب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سوسائیٹی کو اس سے مسرّت حاصل ہو، جس نثر میں علم و فن کے اعتبار سے کوئی بڑا افادی پہلو نہ ہو لیکن اسے پڑھ کر اگر صاحبانِ علم و فن ایک لمحہ کے لیے غم غلط کرسکیں تو سمجھنا چاہئے کہ ایک بہترین غرض پوری ہو گئی؟ اس طرح کی نثر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ لغت و قواعد پر بہت زیادہ عبور حاصل ہو بلکہ ضرورت ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں عقل کے ساتھ ایک خاص قسم کی شگفتگی اور لطافت بھی ہو - مثال میں یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں :—

"خشک اور سنجیدہ فلسفے سے شکایت تو صرف یہ ہے کہ وہ کائنات کو اس کی شاعری سے محروم کر دینا چاہتا ہے اور اس فاتحانہ انداز سے کہ گویا اُس نے کائنات کا سارا طلسم توڑ دیا۔ شاعر بھی رموزِ حقیقت کا انکشاف چاہتا ہے لیکن اُسی حسنِ ادا کے ساتھ کہ حُسنِ راز حسن کا متمنی ہے مگر فلسفی ہر حسن کو ناقابلِ توجہ سمجھتا ہے۔ شاید وہ یہ نہیں جانتا کہ شاعری کی طرح فلسفہ بھی ایک دھوکا ہے۔ فرق صرف اِس قدر ہے کہ شاعری لطیف ترین دھوکا ہے اور فلسفہ نہایت خشک اور غیر دلچسپ -'

(سجاد انصاری مرحوم)

اس شگفتگی میں ہلکا ہلکا طنز بھی ہے ' لیکن طنز' شگفتگی اور رنگین خیالی کا باہمی امتزاج بھی ملاحظہ ہو.—

"مجھے حیرت تو مغرب کی رکاکت مذاق اور

کثافت تخیّل پر ہے ؛ انھیں انبساط و مسرّت اس تصوّر سے نہ ہوئی کہ اُن کے اجسام خاکی کی پرورش فردوس بریں کی اُس فضاے کی ہے جس کی دلفریبیاں آج بھی انسان کو حریص و طامع بنائے ہوئے ہیں ؛ دنیا باوجود اپنی تمام بہشت آفرینیوں کے اس فضا کے ایک ذرے کی بھی قیمت نہیں رکھتی ؛ مغربی دل و دماغ کو اگر تسکین ہوتی ہے تو اس نتیجے سے کہ انسان حقیقۃً ہیولیٰ ارتقائی ہے جس کی پرورش کنار فردوس میں نہیں بلکہ آغوش میمونی میں ہوئی تھی - حقیقت انسانی اُسے مضطرب کر رہی تھی ؛ حقیقت میمونی نے اسے مطمئن کر دیا - اس سے بحث نہیں کہ نظریہ ارتقا صحیح ہے یا غلط ؛ تخیلات و توہمات کبھی صحیح یا غلط نہیں ہوا کرتے ان کے لیے صرف لطافت و کثافت کا امتیاز ممکن ہے ـ ”　　　(سجاد انصاری مرحوم)

اصل یہ ہے کہ ایک بات کے کہنے کے بیشمار طریقے ہیں ؛ یہی مختلف طریقے جن سے بیان کی حیثیت و نوعیت تبدیل ہوتی ہے لکھنے والے کی شاعری یا نثر نگاری کا درجہ متعین کرتے ہیں ؛ جب کوئی شخص کچھ لکھنا یا بیان کرنا چاہتا ہے تو اپنی ذہنی اور نفسی کیفیتوں کے ساتھ اُسے پیش کرتا ہے اور اس طرح اُس بات یا واقعہ کی حالت میں اپنے بیان سے کچھ اضافہ کر دیتا ہے ؛ اس کی یہ ذہنی و نفسی کیفیت اس کی انفرادیت و شخصیت ہے اور اسی اضافے کا عام طریق عمل اُس کا ”طرز“ کہلاتا ہے ؛ خلاصہ یہ کہ علمی و عملی نثر جس میں کیفیت نفسی کم یا بالکل کار فرما نہ ہو وہ بیان محض اور نفس الامری تخیل کی زبان ہے اور شاعری کیفیات و جذبات کی ؛

نثر جس قدر کیفیات و جذبات سے قریب تر ہوتی جائے گی اسی قدر شعریت میں تبدیل ہوتی جائے گی اسی طرح نظم جس قدر نفس الامری تخیل اور بیان محض بنتی جائے گی اُسی قدر شعریت سے محروم ہوتی جائے گی۔ مثلاً ایک شوخ و حسین نوجوان کھڑا مسکرا رہا ہے۔ بغیر کسی جذبے اور کیفیت کے اگر اس واقعے کو دیکھا جائے تو سب اس واقعے کو اسی سادہ طور سے بیان کر دینگے مگر جذبے کی زبان ہی کچھ اور ہے وہ کیفیت نفسی کے زور سے منظر کی حالت ہی تبدیل کیے دیتی ہے اور اسے اس طرح ایک طرفہ ہنگامہ بنا دیتی ہے۔—

ہے سراپا حسن وہ رنگیں ادا جانِ بہار

حُسن در حُسنِ تبسم، صبحِ خندانِ بہار

یا بہار کے موسم میں قوت نامیہ کے فیض سے سبزہ و گل در جنبش اور لہلہاہٹ سی ہے، مگر اس کا شدید تاثر واقعے اور منظر میں اس طرح روح پھونک دیتا ہے۔

سبزہ و گل لہلہاتے نہیں نشو کا زور ہے

موج رنگا رنگ ہے یا جوشِ طوفانِ بہار

انفرادیت و شخصیت یا کیفیت نفسی کا شدید ہونا ہر انسان کا حصہ نہیں۔ عام آدمی زیادہ تر دوسری شخصیتوں کی آواز بازگشت ہوتے ہیں۔ اسی لیے نظم و نثر کا مخصوص طرز ایک زبردست انفرادیت و شخصیت کی علامت ہے۔ صاحبانِ طرز کے بیان سے یہ معلوم ہو گا کہ جو بات معہ تاثیر یا اپنی کیفیت نفسی کے انہوں نے پیش کی ہے اس کے لیے وہ طریقۂ بیان قطعی ناگزیر تھا غرض کہ اس طرح کا بیان اگر اوزان اور قوافی کے حدود میں ہو تو اُسے شعر منظوم کہینگے اور اگر ان پابندیوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو اُس بیان پر شعر منثور، خطابت اور ادبی نثر وغیرہ کا اطلاق ہوگا۔

شاعر کے بارے میں بعضوں کا قول ہے کہ قوم میں اس کی حیثیت مثل ایک بچے کے ہے ، بچہ جس عالم میں ہوتا ہے کون اس کا اندازہ کر سکتا ہے ؟ ۔ وہ چاند کی شعاؤں کو گھنٹوں دیکھتا رہتا ہے اور خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہے ، ایک ذرا سی تتلی کے اُڑ جانے سے وہ گھنٹوں روتا ہے ، اور ایک معمولی سے رنگین کھلونے کو پا کر مَن جاتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے ، اس طرح ہمہ تن وہ ایک کیفیت محض اور ایک جذبۂ بے اختیار ہوتا ہے ، اور اسی لیے اپنی موت رکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے صاحب عقل کو مسخور کر لیتا ہے ، صاحب عقل یہ سمجھتا ہے کہ وہ بچے کو کھلا رہا ہے حالانکہ بچہ اپنی استعداد کی مخفی قوتوں سے خود اُسے کھلاتا ہے اور اپنی ناز برداریوں کے لیے اُسے مجنونانہ حرکات کے لیے مجبور کر دیتا ہے ، ٹھیک اسی طرح شاعر بھی اُس مقام پر ہوتا ہے جہاں فکر و ہوش اور علم و عقل کی مخلوق کی رسائی نہیں ، اُس بلندی ، سے اس کی آواز میں یقین ، جوش اور وجدان کی وہ کیفیتیں ہوتی ہیں جن سے ہم متاثر تو ہوتے ہیں مگر مجال دم زدن نہیں رکھتے ، اس کی باتیں سن کر ہمارے جذبات میں ایک ہیجان و تلاطم تو پیدا ہو جاتا ہے مگر ایک برابر والے انسان کی طرح اُس سے ردو قدح نہیں کر سکتے ، شاعر ، مستعار کائنات کا قائل نہیں وہ رسمیات کے پردے کو چاک کر کے زمین و آسمان کا نظارہ کرنا چاہتا ہے ۔

وہ اگر مجانین و مجاذیب کی صف میں نہیں پہونچ گیا ہے ۔ اور اپنے مذاق میں شائستگی و پاکیزگی رکھتا ہے تو وہ اپنا طریق کار بھی خود ہی بہتر جانتا ہے ، مذاق کی شائستگی و پاکیزگی میں نے اس لیے کہا کہ خارجی قواعد و ضوابط معلوم کرنے پر بھی اصلی دلیل راہ اس کی یہی چیز ہے ۔

برخلاف اس کے ایک نثر نگار (یعنی علمی و عملی تحریر لکھنے والا شخص) ہماری ہی معمولی سطح پر ہماری ہی نوع کا ایک آدمی ہوتا ہے۔ اس کی گفتگو آدمی کی گفتگو ہوتی ہے۔ وہ نہ ہم پر ایسے جوشِ ملکوتیت کا دباؤ ڈال سکتا ہے اور نہ ایسے روحانی ملہمات سے ہمیں مرعوب کر سکتا ہے۔ اس کی دنیا وہی دنیا ہے جس پر جو لوگوں کے اور ایسے تجربات سے بنی ہوتی ہے "مطبوعہ تحریروں" جہاں تک صحیح معنوں میں شعر اگر کسی اور عالم کی آواز ہے تو نثر یعنی علمی و عملی تحریر ار سرتاپا سوسائٹی کی دلچسپ گفتگو اور ایک معمولی تبادلۂ خیال ہے گفتگو کو خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو گفتگو ہی رہنا چاہیے، یہ نہیں کہ وہ چیخ بن جائے یا موسیقی کا رنگ اختیار کرلے۔

شعر کی مخصوص بنیادی خوبی اگر "صحت" کہی جاسکتی ہے تو نثر اور علمی و عملی نثر کی عمدگی اس کے "انصاف" پر منحصر ہے، صحت اور انصاف وہ اصطلاحات اظہار چاہتی ہے جو انصاف کا تقاضا اصطلاح اور صحت و استدلال ہے "انصاف" کسی خاص شخص یا کسی خاص واقعے کے متعلق نہیں بلکہ اس سے مراد عام "عادلانہ انصاف" سے ہے جو نثر مستدل اور بیان سے متعلق ہو۔ علمی و [illegible] بیان کے لیے نثر نگار کا ذہن [illegible] مطمئن [illegible] اس کے ساتھ ساتھ [illegible] بھی ہوتا ہے، وہ استدلال اور بیان کے [illegible] تمام [illegible] اور خوشنمائیوں سے بچتا ہوا چلتا ہے جو اصل موضوع سے متعلق نہیں ہوتے، اور اس طرح اُس کے تکمیل کے بعد اپنی خود ایک خوشنمائی اور خوبصورتی تیار کرلیتا ہے۔

ایک عمدہ علمی نثر کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں ہم لکھنے والے کی تحسین و ستائش میں مبتلا نہیں ہوتے

اور نہ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں کوئی خاص سوال پیدا ہوتا ہے ، بیان کی اہمیت ، اس کی سنجیدگی اور اس کی خوبیء ترتیب ہماری توجہ کو اس درجہ مصروف رکھتی ہے کہ ہمیں ان امور کی فرصت ہی نہیں ملتی ، اس طرح کا ایک نمونہٴ نثر ملاحظہ ہو —

"یہ حرف جو ہر ملک کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں ، اُس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آوازیں آب و ہوا وغیرہ کے وجوہ سے اُن لوگوں کے گلے سے بہ آسانی نکلتی ہیں ، مگر دوسرے ممالک کے لوگ انھیں وجوہ سے اُن کو ادا نہیں کر سکتے ، یا بدقت ادا کرتے ہیں - اِنسان کا گلا آلۂ موسیقی کے اُصول پر بنا ہے اور اسی طور سے اُس میں تار بھی بندھے ہوئے ہیں ، سانس کے ہوا میں ملنے سے زبان ، تالو ، ہونٹ ، دانت اور خلائے دہن کی مدد سے آواز میں مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں -

اُردو ، فارسی ، عربی حروف پر اگر نظر ڈالی جائے تو گویا وہ دیکھنے میں مختلف آوازوں کی علامات ہیں - لیکن در حقیقت اِن حروف کے نام سے کوئی سادہ آواز پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ خاصے الفاظ ہیں مثلاً الف ، عین ، جیم وغیرہ وغیرہ حروف نہیں بلکہ پورے الفاظ ہیں چہ جائے کہ اُن سے سادہ آوازوں کا کچھ بھی خیال پیدا ہوتا ہو - اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اُس زمانے کی یادگار ہیں جب کہ اِس قسم کی تحریر ایجاد نہیں ہوئی تھی بلکہ لوگ اپنے خیالات تصویر میں بنا بنا کر ظاہر کیا کرتے تھے - اول اول تو جس شے کا بیان

کرنا مقصود ہوتا تھا؟ اس کی تصویر بنا دیتے تھے ۔ مثلاً
گائے یا عورت کا بتانا مقصود ہے تو گائے یا عورت کی تصویر
کھینچ دیتے تھے ۔ دوسرے دور میں یہ اصلاح ہوئی کہ
شے سے اُس کا فعل ظاہر کرنے لگے مثلاً آنکھ سے نظر
یا دو ٹانگوں سے رفتار مراد لینے لگے؟ تیسرے دور میں
یہ ہوا کہ شے سے اِس کے ممتاز خصائص یا ظاہری
علامت سے اصل شے مراد لینے لگی مثلاً لومڑی کی
تصویر سے مکّاری؟ یا تخت سے سلطنت مقصود
ہوتی تھی ۔ چوتھے دور میں ایک شے کے اظہار میں
یہ ترکیب کرنے لگے کہ اُس شے کے بولنے میں جو
آوازیں پیدا ہوتی تھیں اُن میں سے ہر ایک کے لیے
ایک ایک تصویر بناتے تھے ۔"

(مولوی عبدالحق بی ۔ اے)

غرض کہ انسانی ذہن کی حقیقت تک رسائی؟ جذبے اور عقل
ہی کے دم سے وابستہ ہے۔ کلام یعنی نظم و نثر کی عمدگی کا مفہوم
یہ ہے کہ لکھنے والے کے ذہن کے سامنے جو حقیقت آئی ہے وہ اپنے
لفظ و بیان سے اُس کی صحیح صحیح ہم آہنگی کر سکے۔ یعنی اس کے
ذہن نے اُس حقیقت کو اگر غالب طور پر جذبے کے ذریعہ محسوس
کیا ہے تو اُس کی تحریر کو نظم و شعر یا نظم و شعر سے قریب
تر ہونا چاہیے؟ اور اگر انکشاف حقیقت میں جذبے کا عنصر خفیف اور
عقلیت کا عنصر نمایاں ہو تو اُسے اسی حقیقت کا طرز اختیار کرنا چاہیے۔

اس اعتبار سے وہ تحقیق جو شدید جذبات و احساسات کے
ساتھ کی جاتی ہے اُس کا مقصود وہ موزونیت ہے جسے اُس کی
اصطلاح میں حُسن کہتے ہیں لیکن جس تحقیق میں غلبۂ عقل

هو اُس کا مقصود وہ مطابقت هے جو منطقی استدلال سے موجودات کی ماهئیت میں صرف کی جاتی هے اور جسے حکمت کی زبان علم و صداقت کے نام سے پکارتی هے -

لیکن زرا غائر نظر سے دیکھیے تو "موزونیت کا اظہار" خود ایک طرح کا عمل مطابقت هے اور "مطابقت" بھی نام هے "حسن و موزونیت" کی تشکیل و صورتگری کا ۔ اس لحاظ سے جذبے اور عقل کا طرز جستجو اور ان کی روشیں گو باهم جداگانہ هیں مگر دونوں ایک هی بے پایاں حقیقت کی طرف گرم عناں هیں —

هر دو بمنزلے رواں هر دو امیر کارواں
عقل بہ حیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں (اقبال)

"ہندستان" بغیر واو کے صحیح ہے

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، ایم - اے - پی - ایچ - ڈی)

["ہندستانی" کے سرورق پر "ہندستانی" بلا واو اور "تماہی" کا لفظ ابتدائی دورہ کے امرائی ممبروں نے اس خیال سے تجویز کیا تھا کہ اکیڈیمی کے اردو اور ہندی رسالوں میں جس حد تک ممکن ہو باہم یکسانیت پیدا ہو سکے ، اسے بعض لوگوں نے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا اور تعریض و تنقیص کا سلسلہ شروع ہو گیا -

ہمارے ادارہ کے معزز ممبر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم - اے پی - ایچ ڈی کے اس مقالے سے معلوم ہوگا کہ "ہندستانی" بلا واو فارسی میں جائز ہے ، اور جب بولنے میں "ہندستانی" کی ہیئت صوتی صاف صاف بلا واو کے معلوم ہوتی ہے اور ہندی میں بھی اس کا تلفظ ایسا ہی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اردو اور ہندی میں اسے ایک طرح کیوں نہ لکھا جائے -

"تماہی" کے بارے میں بھی ہمارے معزز کرمفرما نے ایک علحدہ مضمون مرحمت فرمانے کا وعدہ کیا ہے جسے ناظرین آیندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائینگے - مرتب]

"ہندستان" یا "ہندستانی" کے بلا واو لکھنے پر بعض صاحبوں کو اعتراض ہے - اُس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اردو بولنے والے عام طور پر اِس لفظ کا تلفظ مختص پیش کے ساتھ کرتے ہیں اور فُصحا کی زبان پر بھی "ہندستان" اور "ہندستانی" ہے ، گو کہ "ہندوستان" اور "ہندوستانی" بھی غلط نہیں - اِس لیے "ہندستان" اور "ہندستانی" صحیح ہے ، اور "ہندوستان" اور "ہندوستانی" بھی -

شاید کچھ لوگوں کو اِس جواب سے اِس وجہ سے تشفی نہ ہو کہ اُن کے خیال کے مطابق فارسی میں "ہندوستان" ہی ممکن ہے ، ہندیوں نے بیجا تصرف کر کے "ہندستان" بولنا شروع

کر دیا - دیکھنا یہ ہے کہ کیا حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے - اِس لیے فارسی کی طرف رجوع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے -

فارسی میں بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ اُن میں آ، و یا ی لکھتے بھی ہیں اور حذف بھی کردیتے ہیں - کچھ لفظ ایسے ہیں کہ اُن میں و کے لکھنے کی ضرورت نہیں یا و لکھنا اُن لفظوں میں غلط ہے مگر کاتب اکثر اُن میں بھی و لکھ دیا کرتے ہیں - کاتبوں کے اِس غلط طرز عمل کا یہ اثر ہے کہ محض طرز کتابت کی پیروی میں اردو میں بعض غلط لفظ رائج ہو گئے ہیں حالانکہ عوام کی زبان پر لفظ کا وہ تلفظ ہے جو فارسی کی رو سے صحیح ہے - اِس کی بہترین مثال "دوکان" ہے کہ اُس میں واو لکھنا بھی غلط ہے اور بولنا بھی - اِس غلطی کی تکرار کتابت میں اتنی ہوئی کہ بہت سے لوگ "دکان" کو (جو صحیح ہے) عامیوں بلکہ جاہلوں کی بول چال سمجھنے لگے اور "دوکان" کا لفظ (جو قطعاً غلط ہے) اُن کی زبانوں پر بھی چل پڑا - شاعروں نے البتہ اپنے کلام میں "دکان" کو راہ دی * جیسے —

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا گئے

متاخرین نے بھی "دکان" کہا —

دکاں بند کر کے رہا بیٹھ جو

تو دی اُس نے بالکل ہی لُٹیا ڈبو (اسمعیل میرٹھی)

بعض لفظوں میں تلفظ کے لحاظ سے واو نہیں ہے، صرف پیش کے ظاہر کرنے کو واو لکھتے ہیں اور اُسے "واو بیان ضمہ" کہتے ہیں یا

* فارسی شاعروں کے کلام میں اِس لفظ کی دو ہی صورتیں ملتی ہیں "دکاں" اور "دکّاں" جن میں دوسری صورت معرب ہے اگر کہیں "دوکاں" لکھا ہوا ملتا ہے تو وہ کاتبوں کا تصرف ہے - ایسے مقامات پر "دکاں" پڑھنا چاہیے -

"واو معدولہ" کہ لکھا جاتا ہے پڑھا نہیں جاتا ، جیسے خواجہ وغیرہ میں ۔

کچھ لفظ ایسے ہیں جن کا تلفظ دونوں طرح صحیح ہے اور اِس لیے اُن کو کبھی واو کے ساتھ لکھتے ہیں کبھی بغیر واو کے ؛ جیسے "اوستاد" ، "اُستاد" ۔ "اوستام" ، "اُستام" ۔ "اوفتاد" ، "اُفتاد" ۔ "اومید" ، "اُمید" ۔ "بوستان" "بُستان" ۔ "روستم" ، "رُستم" * ۔

اِن لفظوں کی قدیم تر صورتیں وہ ہیں جن میں واو ہے اور وہ واو اصلی ہے ۔ اِس لیے اہل لغت نے بلا واو کی صورتوں کو "مخفف" کہا ہے ۔ صرف "بستان" کے متعلق یہ شبہہ ہوسکتا ہے کہ اُس میں سے واو تعریب کی بنا پر گرا ہے ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خود ایران ہی کی زبان میں اور بہت سے لفظوں کی طرح "بوستان" کا واو بھی گر گیا اور "بوستان" کے پہلو بہ پہلو ایک ہم معنی لفظ "بستان" قائم ہو گیا اور اُس سے مرکبات بھی بنے ، جیسے "بستان افروز" ، "بُستان سرا" ، "بستان زادہ" ، "بستان سرا" ، "بستان سرین" (موسیقی کی ایک لے) ۔ یہ مرکبات کچھ نئے نہیں ہیں بلکہ پرانے ہیں اِس لیے خود "بستان" اُن سے بھی زیادہ پرانا ٹھہرتا ہے ۔ "بستان" کی مزید تخفیف ہوکر "بُست" بنا ، معنی وہی رہے جو "بوستان" اور "بستان" کے ہیں ۔ خود یہ مخفف در مخفف لفظ اِتنا پرانا ہے کہ "بُست" ایران کے ایک مقام کا نام بھی صدیوں سے چلا آتا ہے اور جب

- - - - - - - - - - - - - - - - -

* اِسی طرح کچھ لفظ ہیں کہ اُن میں ی بولتے اور لکھتے بھی ہیں اور نہیں بھی ، جیسے "میہمان" ، "مہمان" ۔ "تیشہ" ، "تشہ" ۔ "دندنیر" ، "دنتر" وغیرہ ۔

سنه ۳۰ هجري میں مسلمان فاتحوں نے سیستان کي طرف رخ کیا تو من جمله اور مقامات کے بُست کو بھي فتح کیا * -

اِس تفصیل سے ظاهر هو گیا که خود " بست " ایک بہت پرانا لفظ هے اور " بستان " لازماً اُس سے بھي پرانا - اِس لیے یه ماننا قرین صحت هوگا که جس زمانے میں عربوں کا تسلّط ایران میں هوا اُس وقت دونوں صورتیں " بوستان " اور " بستان " فارسي زبان میں دوش بدوش استعمال هوتي تھیں- یه تمام قرائن اِسي بات کے هیں که عربوں نے ایرانیوں سے " بستان " سُن کر اسے جیوں کا تیوں اپني زبان میں لے لیا یا یوں کہیے که " بوستان " اور " بُستان " دونوں لفظ سنے اور دوسرے کو اختیار کیا، اِس لیے که وہ عربی زبان کے موافق پڑتا تھا-

لفظوں کو مخفف کرنے کي طرف فارسی زبان اِس قدر مائل رهی هے که عربی لفظوں اور ناموں تک میں اکثر تصرّف هوا - چونکه فارسی لفظوں سے شروع کا الف گر گیا تھا ، جیسے ابر سے بر اور اسوار سے سوار وغیرہ ، اِس لیے ابوبکر سے بوبکر ، ابوعلي سے بوعلي هو گیا یہاں تک که ابو اسحاق سے بو اسحاق اور بو اسحاق سے بسحاق بن گیا - " بسحاق اطعمه " کو کون نہیں جانتا -

یہي حال " هندوستان " کا هوا - پہلے " هندستان " هوا پھر " هندسان " اِسی طرح " هندو بار " سے " هند بار " چنانچه فارسي کے لغت نویسوں نے یوں لکھا هے :-

(۱) " فرهنگ جہانگیری " (نولکشوري) ، جلد ۲ ، صفحه ۱۱۰ -

---

* دیکھو " فتوح البلدان " بلاذري ، مطبوعۂ لائیڈن سنه ۱۸۶۶ ع - ص ۳۹۴ ، ۳۹۶ - ۳۹۷

"هندستان مخفف هندوستان است - استاد فرخی فرماید

گر ز جود تو نسیمی بگذرد بر زنگبار*

ور ز خشم تو سمومی در وزد بر هندستان

هندوان را آتش سوزنده روید شاخ رمح

زنگیان را شوشهٔ زرین بر آید خیزران"

(۲) "بہار عجم" (نولکشوری، سنه ۱۹۱۶ع، جلد ۲، صفحه ۴۹۷ —

"هند - بالکسر و هندوبار و هندوزار و هندوستان دیار معروف -

هندستان مخفف آن و آنرا سواد اعظم ÷ نیز گویند

و هندستان اغلب که در اصل هند استهان بود . که

در هندی اصلی بمعنی مکان و ماوا است و برین قیاس

عربستان و فرنگستان و مانند آن - استاد فرخی —

گر ز جود تو الخ -"

(۳) "برهان قاطع" —

"هندستان با سین بے نقطه، بر وزن هندوان، مخفف هندستانست

و هندستان مخفف هندوستان -"

---

* اِن دونوں شعروں کا متن یہاں "بہار عجم" کے مطابق دیا گیا ہے سوا لفظ "هندستان" کے - "جہانگیری" اور "بہار" دونوں میں "هندستان" ہے جو بحر میں نہیں سماتا، اِس لیے درست نہیں - "جہانگیری" میں (جو بہت ہی غلط چھپی ہے) اِن شعروں کا متن بھی غلط ہے، مثلاً پہلے "زنگبار" کے بجائے "جویبار" "خشم" کی جگہ "رحم"، "زرین" کی جگہ "ارش" ہے -

÷ نولکشوری چھاپے میں "عظیم" ہے جو صحیح نہیں - دیکھو "مصطلحات الشعراء" (وارسته) مع حواشی بخلاصهٔ بہار عجم مطبوعه سلطان المطابع، لکھنؤ، به تصحیح و توشیح مولوی جمیل احمد (۱۲۷۰ هجری)، ص ۴۰۰، حاشیه ۱ -

"برہان قاطع" کي اِس شریح سے "جہانگیری" اور "بہار" کي عبارتیں صاف ہوگئیں - اور اب پورے یقین کے ساتھہ کہا جا سکتا هے کہ اُستاد فرخي کے شعر میں "هندساں" هي هے "هندستان" نہیں - "هندساں" شاعروں کے کلام میں زیادہ نہیں ملتا مگر اِس کا تو یقین هو گیا کہ چوتھی صدي هجری میں "هندستان" زبان میں داخل هوچکا تھا ، اِس لیے "هندستان" (جس کا وہ مخفف هے) اُس سے بھی پہلے زبان میں رائج هوگیا هوگا -

شمس الدین محمد ابن قیس رازي نے فن عروض و قافیہ میں اپني لاجواب کتاب "المعجم فی معاییر اشعارالعجم" ساتویں صدی هجري کے اوائل میں لکھي - اُس میں قافیے کي بحث میں ایک مقام پر لکھا هے —

"و بعضي ترکستان و هندستان نیز جائز داشتہ اند همچنانک † در هند بار و زنگبار گفتہ‌ایم -" (ص ۲۱۱) -

جس عبارت کي طرف مصنف نے اشارہ کیا هے وہ یہ هے —

"و بعضي هند بار و زنگبار نیز روا داشتہ اند یعني هر ایک اسم ولایتي است - و قیاس آنست کی ‡ روا نباشد همچنانک † لالہ زار و کشت زار -" (ص ۱۹۵) -

اِس سے پوري طرح ثابت هوگیا کہ ایران کے متقدمین شعرا "هندستان" (بلا واو) عام طور پر استعمال کرتے تھے -

---

* میرزا محمد ابن عبدالوهاب قزوینی کی تصحیح سے سنہ ۱۹۰۹ ع میں لیڈن اور لائیڈن سے شایع هوئی -

† قدیم رسم خط هے = "همچنانکہ -"

‡ قدیم رسم خط هے = "کہ" -

اِن اقتباسوں کے بعد اِس کی ضرورت نہیں کہ شاعروں کے کلام سے شواہد پیش کیے جائیں مگر ایک دوست نے مجھے لکھا کہ فردوسی اور سعدی نے تو "ہندوستان" (واو کے ساتھ کہا ہے) - ایک اور صاحب نے بھی [illegible] "ہندوستان" یہ کہ مصرعہ نقل فرمائے ہیں -

"[illegible] سوختی [illegible] ہندوستان"

فردوسی کا مصرعہ یہ یاد ہے -

"[illegible] نیل [illegible] ہندوستان"

اِس کا جواب یہ ہے کہ میں نے نہیں کہا کہ "ہندوستان" (مع واو) کا وجود ہی نہیں - فردوسی کے شاہنامے میں ساٹھ ہزار شعر ہے، ایک مثنوی "یوسف و زلیخا" بھی فردوسی کے نام سے مشہور ہے مگر شعر [illegible] کی ایک ہی ہے - سعدی کی بوستاں بھی اِسی بحر (متقارب) میں ہے - اِس بحر میں "ہندوستان" سما ہی نہیں سکتا ہے [illegible] ہندوستان [illegible] - غزلوں، رباعیوں وغیرہ کا مضمون اِس شرط کا ثبوت ہے کہ اِن میں "ہندستان" یا "ہندستان" [illegible] - اِس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جب کوئی شاعر ہمارے ملک کا نام لینا چاہتا ہے تو بطور اختصار پہلے "ہند" [illegible] کہ ہر شعر میں کھپ جاتا ہے - فارسی شاعروں کے یہاں کبھی کبھی خصوصاً قافیے کی ضرورت سے "ہندو زار"، "ہندو دار" اور "ہند دار" کے صیغے [illegible] ہیں - "ہندوستان" کا وجود ظاہر ہے [illegible] بحر میں آجاتا ہے اور اکثر قافیہ ہوا ہے جیسے فردوسی اور سعدی کے شعروں میں جن کے مصرعے اوپر نقل ہو چکے بخلاف اِس کے "ہندستان" بہت کثرت سے فارسی شاعروں [illegible] مثالیں اکٹھا کرنے [illegible] "ہندستان" [illegible] -

تھوڑي سی مثالیں مختلف شاعروں کے کلام سے حاضر ھیں :—

۱ - ابو سعد ابن مسعود ابن سعد ابن سلمان لاھوري ؟ جس نے سنہ ۵۱۵ ھجري کے بعد وفات پائی ؟ پانچویں چھٹي صدی ھجری کے سربرآوردہ سخنوروں میں تھا - آزاد بلگرامي نے * " خزانۂ عامرہ " میں انتخاب اُس کے کلام کا دیا ھے پانچ ساڑھے پانچ صفحے سے زیادہ نہیں - اُس میں بھي ' ھندستان " تین جگہ آیا ھے اور " ھندوستان " کہیں نہیں ' گو کہ انتخاب ایسي بحروں میں سے بھي ھے جن میں " ھندوستان " کھپ جاتا ھے - وہ تین شعر یہ ھیں —

(۱) دختری خرد دارم و پسرے
با دو جواھر دوم ھندستان - (خزانۂ عامرہ ؟ ص ۱۵)

(۲) حرام کرد میان دیارِ ھندستان
گذشت رایت عالی ز گنبد دوار (خزانہ؟ ص ۱۷)

(۳) بر سپال اے بہار ھندستان †
اے بحاب از بلاے با بستان (خزانہ ' ص ۲۰)

۲ - مولانا نظامي گنجوي کی مثنوی " شیریں و خسرو " ‡ کا قصہ ھندستان سے تعلق نہیں رکھتا پھر بھي اُس کا نام کہیں کہیں آ گیا ھے - بحر ایسي ھے جس میں " ھندوستان " اور

---

* نولکشوری - دوسري اشاعت - سنہ ۱۹۰۰ع

† اِن تینوں شعروں میں غلطي سے " ھندستان " چھپا ھے - کتاب میں چھاپے کی غلطیاں بہت ھیں -

‡ اِس کا جو نسخہ میرے سامنے ھے - وہ نہایت خوش خط ھے - مطبع کا نام یا چھپنے کا سال کہیں درج نہیں - خط کی ساخت ایراني ھے غالباً ایران ھي کا چھپا ھوا ھے کتاب کي غلطیاں کہیں کہیں نظر پڑیں -

"هندستان" دونوں کی گنجائش ہے مگر صرف ایک جگہ "هندوستان"، اور ایک جگہ "هندوستانی" - ملا وہ بھی قافیے میں - بخلاف اِس کے "هندستان" چار جگہ آیا ہے -

(۱) گرش باید بیک فتح الهی

ز هندستان فرو شوید سیاهی (ص ۱۳)

(۲) در آمد قاصدی از راه رحمل

ز هندستان حکایت کرد باطل (ص ۹۸)

(۳) مرا چون کر کدن سینه حه خاری

دماد بیل هندستان حه آری (ص ۱۴۰)

(۴) به هندستان همیشه می دواندی

غلط شد راه بادل دار ماندی (ص ۲۰۲)

۳ - حضرت امیر خسرو کی مثنوی "دول رانی خضر خان" بھی هرج میں هے جس میں لفظ کی دونوں صورتیں آ سکتی هیں - سرسری نظر سے دیکھی - "هندوستان" سے چار هی پانچ جگہ نظر پڑا، اُس میں سے بھی ایک جگہ "دوستان" کا قافیہ واقع هوا هے -

---

سیاهی توتیاے چشم از آنست - که فراش ره هندرستانست - (ص ۲۳۷

† مثنوی ملتی هندرستانی - جو در دست آمدہ در رفتہ خواہ - (ص۱۶۲

‡ صفحہ ۱۷ پر دیر بھی یہ شعر کے ساتھ آیا هے صرف دوسرے مصرعے میں فرق هے —

فرو روب ز هندستاں سیاهی —

§ کتاب میں "خواری" هے یہ درست نہیں - پہلے کاتبوں کی عام غلطی هے جیسے "برخاستن"، "آزرده هونا" کے لیے ادبر "بر خواستن" لکھہ مارتے هیں -

|| مولانا رشید احمد انصاری صاحب سالم مرحوم کی تصحیح و ترتیب سے سنہ ۱۹۱۷ء میں علی گڑہ سے شایع هوئی -

'' هندستان '' سو جگه دایا اور کہیں وافے میں تھیں ـ
ملاحظہ ہو :—

(۱) کسی کو گنگ هندستان بود دور
ز دجل و دجله لافد ، هست معذور (متن ، ص ۴۳)

(۲) دول رانی که هست اندر زمانه
ز طاؤسان هندستان یگانه (متن ، ص ۴۴)

(۳) از آن سلطان غازی بے مدارا
به هندستان شد اسلام آشکارا (متن ، ص ۴۸)

(۴) جهان کو ز آهن شمشیر شاهی
ز دود از دری هندستان سیاهی (متن ، ص ۴۸)

(۵) از آن دس سال جهدش را که شد دور
که دیوار [illegible] ز هندستان یکی سود (متن ، ص ۶۲)

(۶) کنون از صبح هندستان همه شرح
[illegible] کز [illegible] راست را طرح (متن ، ص ۶۳)

(۷) و نعل هم ز هندستانست وردی
که از نام عرب [illegible] شهر کردی (متن ، ص ۱۳۲)

(۷) سه گونه رنگ هندستان زمین است
سیاه و سبز و گندم گون همین است (متن ، ص ۱۳۴)

(۹) بفرستی واپس ترکستان دربده
بسوئی ملک هندستان خریده (متن ، ص ۲۲۲)

۴ - اشرف مازندرانی کہتا ہے —

داد از راہیان هندستان

ن هندستان ("چراغ هدایت")

۵ - میر عبدالجلیل بلگرامی نے نواب امین الدولہ کے بیٹے ارشاد خاں کی شادی پر ایک مثنوی کہی تھی جس کے چند شعر "خزانۂ عامرہ" میں نقل ہوئے ہیں - اُن میں سے ایک شعر یہ ہے —

چو داماد آن عروسِ شرمگین دید

بہندستان نگارستانِ چین دید ("خزانہ عامرہ" ص ۳۶۰)

۶ - میر غلام علی آزاد بلگرامی کا شعر ہے —

خطِّ مشکین خال رخسارِ ترا بر سر رسید

فوج هندستان بہ تسخیرِ ملک عنبر رسید (ایضاً، ص ۱۳۲)

۷ - آنند رام مخلص بھی بڑے پائے کے شاعر تھے، کہتے ہیں :—

بر دلِ ما تیرہ روزان زان صفت مژگان گذشت

آنچہ از فوجِ دکن بر ملک هندستان گذشت (ایضاً ص ۴۲۶

"هندوستانی" اور "هندستانی" شعر میں دونوں بہت کم دکھائی دیتے ہیں، اِس لیے کہ "هندی"، "هندوی"، "هندوانی"، "ہندو" زیادہ آسانی سے شعر میں کھپتے ہیں اور "هندوانی" اور "ہندو" ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں، "هندوستانی" اور "هندستانی" کی نوبت کم آتی ہے - شواهد کی چنداں ضرورت نہیں، "هندستان" کے شواهد کافی تعداد میں دیے جا چکے

---

† کتاب میں اِس جگہ غلطی سے "هندرستان" چھپا ہے جو بحر سے خارج ہے -

اور ادب پر اُن کے لکچروں کا مجموعہ ہے - کتاب کا پہلا حصہ اِن لکچروں کا مقدمہ ہے، جس میں فارسی زبان کی تاریخ سے بحث کی ہے، دوسرے حصے میں گیارہ لکچر ہیں - دوسرے لکچر کے عنوان پر "۱۵ فروری ۱۸۷۲ ع" درج ہے اور یہی تاریخ تیسرے لکچر پر بھی ہے - چوتھے لکچر کے عنوان پر "یکم مارچ ۱۸۷۷ ع" لکھا ہے - اور کسی لکچر پر کوئی تاریخ درج نہیں - اِن تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن لکچروں کا سلسلہ سنہ ۱۸۷۳ ع میں یا شاید اُس سے کچھ پہلے شروع ہوا اور کئی برس جاری رہا - جیسا کہ کتاب کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے - ایران کے سفر سے واپس آکر مصنف نے لکچروں پر نظر ثانی کی اور سنہ ۱۸۸۷ ع میں کتاب چھپنے کے لیے تیار ہوگئی - مگر کتاب کے پہلے حصے کے شائع ہونے کی نوبت سنہ ۱۸۹۸ ع میں آئی - اِس اشاعت کا اہتمام آزاد مرحوم کے شاگرد مولوی سید ممتاز علی صاحب مالک مطبع رفاہ عام، لاہور نے اپنے "دارالاشاعت" سے کیا - دوسرا حصہ الگ نہیں شائع ہوا بلکہ پوری کتاب ایک ہی جلد میں منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام، لاہور میں چھپ کر سنہ ۱۹۰۷ع میں شائع ہوئی - مصنف اُس وقت حیات تھے - اِس مکمل کتاب کی لوح ایک ہی ہے مگر ہر حصے کے صفحوں کا شمار الگ الگ ہے - پہلے حصے کے ۱۰۶ صفحوں میں جہاں "ہندوستان" یا "ہندوستانی" کا لفظ آیا ہے واو کے ساتھ ہے - دوسرے حصے کے دوسرے صفحے پر بھی (جو مضمون کے اعتبار سے پہلا صفحہ ہے) - پہلی ہی سطر میں "ہندوستان" کا لفظ آیا ہے وہ بھی واو کے ساتھ ہے - لیکن اُس کے بعد سے

"ہندستان" اور "ہندستانی" بغیر واو کے ہے* سوا صفحہ ٨٥ کے جہاں پھر "ہندوستان" ہے، اُس کے بعد پوری کتاب میں بغیر واو کے۔ صفحہ ٢ پر "ہندوستان" کے ہونے کا سبب غالباً یہ ہے کہ کاتب پہلے حصے میں جس طرح لکھتا چلا آیا تھا قلم سے اُسی طرح نکل گیا۔ صفحہ ٨٥ پر ظاہراً محض سہو قلم واو کا ذمہ دار تھا۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ جس اصل قلمی نسخے سے کاتب نے لکھا اُسی میں اِن دونوں جگہوں میں زیر بحث لفظوں کا املا واو کے ساتھ ہو۔ اِس صورت میں ممکن ہے کہ مصنف ہی کا سہو قلم ہو۔

اِن دو موقعوں کے سوا دوسرے حصے کی حالت یہ ہے کہ اُس کے ٣١٥ صفحوں میں خود مصنف کی عبارت میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے "ہندستان" یا "ہندستانی" (بغیر واو کے) لکھا ہوا ہے۔ البتہ جہاں کہیں کسی دوسرے مصنف کی کوئی عبارت نقل کی گئی ہے اور اُس میں "ہندوستان" آ گیا ہے وہ التزاماً واو کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ شمار کیا تو حوالیں (٤٤) جگہ "ہندستان" اور پانچ جگہ "ہندستانی" ملا۔ یہ بات بھی خاص توجہ کے قابل ہے کہ من جملہ حوالیس کے چار جگہ فقرے کا پہلا لفظ "ہندستان" ہے اور جلی قلم سے بغیر واو کے لکھا ہوا

* صفحہ ٧٤ پر جو عبارت "تزوک تیموری" سے نقل کی ہے اُس کی پہلی نو سطروں میں چار جگہ "ہندوستان" آیا ہے۔ صفحہ ٧٦ پر شرف الدین علی یزدی کے "ظفرنامۂ تیموری" کی عبارت کا نمونہ دیا ہے جس میں دو بار "ہندوستان" آیا ہے۔ اِن تمام اقتباسوں میں واو کو حذف نہیں کیا ہے۔ صفحہ ٢٩٤ پر درج کا یہ شعر نقل ہوا ہے جس میں بحر کی وجہ سے واو ضروری تھا —

"بہندوستاں آنچہ تو پار کردی — در اہل سلاسل نہ کرد است حیدر"

یہ خاص اہتمام محض کاتب کی رائے پر مبنی نہیں ہو سکتا —

ہے (ص ۷۱، ۸۶، ۹۳، ۹۵) - آگے چل کر صفحہ ۲۳۸ پر دسواں لکچر شروع ہوتا ہے - اور لکچروں کی طرح اِس لکچر کی سرخی بھی بہت ہی جلی قلم سے لکھی ہوئی ہے - وہ سرخی یہ ہے —

"فارسی در ہندوستان میں آکر کیا کیا رنگ چڑھے -"

کتاب کا یہہ رنگ دیکھہ کر یقین ہو گیا کہ دوسرے حصے میں واو التزاماً حذف کیا گیا ہے مگر یہ سمجھہ میں نہ آیا کہ پہلے حصے میں یہ التزام کیوں نہیں کیا گیا - معاً خیال اِس طرف گیا کہ اکیلا پہلا حصہ ایک بار پہلے بھی چھپا تھا - چنانچہ "دارالاشاعت" والا نسخہ دیکھا تو اُس میں ہر جگہ واو پایا - یہی احتمال ہوا کہ دوسری اشاعت کے لیے جب کتابت ہوئی تو پہلا حصہ کاتب نے "دارالاشاعت" والے نسخے سے نقل کیا اور دوسرا حصہ غالباً مصنف کے مسودے سے - اب قطعی شہادت کی ضرورت ہوئی -

دوسری اشاعت کی لوح اور خاتمے پر کاتب کا نام تھا جس سے معلوم ہوا کہ پوری کتاب کی کتابت منشی محمد اسد اللہ صاحب آسیوی نے فرمائی ہے، جو لاہور کے نامور خوش نویس ہیں - مخدومی مولانا خلیل الرحمان صاحب نے مجھہ پر کرم فرما کر منشی صاحب ممدوح کو لکھا کہ دوسرے حصے میں "ہندستان" اور "ہندستانی" (بلا واو) اُنھوں نے محض اپنی رائے سے لکھا یا کسی نے اُن کو ہدایت کی تھی کہ یوں لکھا جائے - اِس استفسار کے جواب میں جو خط منشی محمد اسداللہ صاحب نے مولانا خلیل الرحمن صاحب کو لکھا* اُس کے وہ حصے جو اِس بحث سے متعلق ہیں یہ ہیں —

---

* یہ خط منشی صاحب کے ہاتھہ کا لکھا ہوا ہے جو اُنھوں نے لاہور میں ۲۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ ع کو تحریر کیا -

«سخندان فارس» آزاد صاحب کی زندگی میں لکھا۔ انہوں نے کوئی ہدایت نہیں کی۔ صرف لکچر کے مرکز٭ کی بابت کہا کہ اِس طرح (لکچر) لکھو، سو جب کاپی دیکھی ہاتھ اُٹھا کر دعا دی، اور بس۔ مضمون آزاد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اور بہت صاف اور خوشخط تھا، جگہ جگہ چیپیاں لگی ہوئی تھیں۔ آغا صاحب† نے کوئی ہدایت نہیں کی تھی اور نہ عبارت میں کوئی تصرف کیا، بالکل اصل کے مطابق رکھا، نہ میں نے کسی طرح کا رد و بدل کیا۔ آزاد صاحب نے اکثر جگہ سننے، دیکھنے وغیرہ کو (سنئہ، دیکھئہ) لکھا، اُسی طرح میں نے لکھا۔ ابتدا میں سخندان فارس، حصہ اول میر صاحب‡ نے چھپایا اُس کے بعد آغا صاحب نے دونوں حصے یکجا چھپائے۔ میری عادت ہے کہ جس طرح کا مضمون ہو اُسی طرح لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ صحت کی حالت میں§ مصنف جس طرف چاہے اور جو مناسب سمجھے بنوائے، بنا دیتا ہوں۔

٭ یہ ہدایت ظاہرا صرف پہلے لکچر کی سرخی کے متعلق تھی جس میں لکچر کے لفظ کے کاف کا مرکز سیدھا نہیں ہے، ڈھلوان دار ہے۔ واقعی سیدھا مرکز اس جگہ پر بن گیا ہوتا۔ (دیکھو حصہ ۲، صفحہ ۲)۔

† آغا صاحب سے مراد ہیں آزاد مرحوم کے بیٹے آغا ابراہیم صاحب۔

‡ میر صاحب یعنی شیخ ممتاز علی صاحب مالک دارالاشاعت لاہور۔

§ یعنی کاپیوں کی تصحیح کے وقت۔

حصۂ اول میں نے چھپے ہوئے سے نقل کیا ؟ جو میر صاحب نے
چھپایا اور مکتوب عالم کاتب مرحوم نے لکھا تھا ۔ اور دوسرا
حصہ اصل مضمون سے نقل کیا اور جس طرح کا مضمون
میرے سامنے تھا اُسی طرح میں نے لکھا ۔ یہ نہیں
ہو سکتا کہ اگر میں نے پہلے حصے میں بڑھایا تو دوسرے
حصے میں کیوں نہ لکھا ۔ یہی خیال آتا ہے کہ جس
طرح مضمون میں تھا اُسی طرح میں نے لکھا ۔ نہ
اِس کی کوئی ہدایت تھی نہ میں نے از خود لکھا '
جیسا تھا ویسا لکھ دیا ۔ ''

کاتب کتاب کی اِس تحریر کے بعد اِس میں شک کی گنجائش نہیں
کہ آزاد مرحوم نے '' ہندستان '' اور '' ہندستانی '' التزاماً بغیر واو کے
لکھا اور وہ اِنھیں صورتوں کو فصیح جانتے تھے ۔ اِس ذیل کے اور لفظوں کی
بھی وہی صورتیں آزاد مرحوم نے پسند کی ہیں جو عام طور پر اردو کی
بول چال میں رائج ہیں چنانچہ '' ہشیار '' اور '' ہشیاری '' کو بھی
بغیر واو کے لکھا ہے ۔

(۱) '' کیونکہ وہ [بادشاہ] پاسبان ہے ۔ پاسبان کو ہشیار
رہنا چاہیے ۔ '' (ص ۲۵ ۔ ۱۲۴) ۔

(۲) '' لشکر دار کے حکم سے افسر تین دفعہ آ کر دیکھ جاتا
تھا کہ پہرہ پر ہشیار ہیں یا نہیں ۔ '' (ص ۱۲۶)

(۳) '' درندے جانوروں کو سامنے گھیر لائے ۔ اور ایسی
ہشیاری سے روکے کہ ایک جانور بھی نکلنے نہ پایا ۔ ''
(ص ۱۲۸) ۔

اِن کے سوا اور بھی بہت سے لفظ اِس کتاب میں اُسی صورت میں
پائے جاتے ہیں جس طرح اردو کی بول چال میں سنائی دیتے ہیں ۔

انگریزی دانی کے اثر سے اب اکثر لوگ " سمر " بولتے اور لکھتے ہیں لیکن حضرت آزاد علیہ‌الرحمہ نے اپنی دراسی زبان کو بگڑنے نہیں دیا ۔ فرماتے ہیں :—

" رفتہ رفتہ ربش سعید چودھری یا لمبردار یا سردار قبیلہ کو کہنے لگے " ۔ (ص ۱۲۹) ۔

فارسی جاننے والے اصرار کرتے ہیں کہ " خربزہ " اور " تربز " لکھو مگر فارسی کے اِس محقق کا قلم اردو تحریر میں یوں گُہر ریز ہوتا ہے —

" حجروں میں انگور، خربوزے، تربوز لٹکائے ہیں کہ قندیلیں قمقمے نظر آتے ہیں " ۔ (صفحہ ۱۸۵) ۔

" عزیزانِ وطن ! جب تک ممالک سرد سیر میں رہ کر موسموں کی حالتیں آنکھوں سے نہ دیکھی ہوں اکثر کتابوں کے خاص خاص مقاموں کا مزا نہیں آتا ۔ " (ص ۱۸۷)

یہ عمل ہے اُن بزرگوں کا جو جانتے تھے کہ اردو کیا ہے اور زبان کسے کہتے ہیں ۔

انتقاد *

(نتیجۂ فکر جناب جوش ملیح آبادی)

یہ نظم نا تمام و نا مکمل حالت میں مدت ہوئی طبع ہوچکی ہے لیکن اب مکمل و مربوط کر کے آپ کی خدمت میں روانہ کی گئی ہے — "جوش"

رحم اے نقّادِ فن! یہ کیا ستم کرتا ہے تو!
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو؟
شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیسا قتل عام؟
نشترِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام!
کیوں اُٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کے لیے؟
کیا شمیمِ سنبل و نسرین ہے چکھنے کے لیے؟
آہ اے ناداں! تجھے آتا نہیں یہ بھی خیال
ننگ ہے بزم سخن میں مدرسے کی قیل و قال
منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دل پذیر!
کاش اس نکتے کو سمجھے تیری طبعِ حرف گیر
لب کو پھر انصاف اک لَے سے کھُلنا چاہئے
پنکھڑی پر قطرۂ شبنم کو تُلنا چاہیئے!
شعر فہمی کے لیے ہیں جو شرائط بیشتر!
سوچ تو پورا اُترتا بھی ہے اُس معیار پر؟
جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا دوپے داغ
آج بے حس کی غذا بنتا ہے شاعر کا دماغ؟

---

* جناب جوش ملیح آبادی نے یہ نظم ادبی کانفرنس کے لیے مرحمت فرمائی تھی —

دل سے اسے پوچھه او ر پڑھئے علمِ کتاب
حسن مطلق کو بھی دیکھا ہے پر افگندہ نقاب ؟
تو پتا اسرار ہستی کا لگاتا ہے کبھی ؟
عالمِ محسوس سے باہر بھی جاتا ہے کبھی ؟
کیا وہاں بھی اُڑ کے پہونچا ہے کبھی اے نکتہ چیں
جس فضا میں کانپتا ہے شہپرِ روح الامیں ؟
خامشی کی نغمہ ریزی پر بھی سر دُھنتا ہے تو ؟
قلب فطرت کے دھڑکنے کی صدا سنتا ہے تو ؟
اُن بتوں کی بزم میں تو بھی ہوا ہے باریاب ؟
خاک کو جن کے تبسم نے بنایا ہے گلاب
طورِ معنیٰ پر بھی او نا فہم چڑھ سکتا ہے تو؟
کیا مصنف کی کتابِ دل بھی پڑھ سکتا ہے تو
گر نہیں، تو پھیر لے آنکھیں، یہ جلوہ اور ہے
تیری دنیا اور ہے، شاعر کی دنیا اور ہے
شعر کی تحلیل سے پہلے مری تقریر سن
خود زبانِ شاعری سے شعر کی تفسیر سُن:-
دل میں جب اشعار کی ہوتی ہے بارش بے شمار
نطق پر بوندیں ٹپک پڑتی ہیں کچھ بے اختیار
ڈھال لیتی ہے جنھیں شاعر کی ترکیبِ ادب
ڈھل کے پھر وہ گوہرِ غلطاں کا پاتی ہے لقب
اور ہوتی ہیں تجلی بخش تاجِ زرفشاں،
پھر بھی وہ شاعر کی سطروں میں ہیں خالی سیپیاں
جن کے اسرارِ درخشاں روح کی محمل میں ہیں
سیپیاں ہیں نطق کی موجوں میں، موتی دل میں ہیں!

شاعری کا خاسماں ہے نطق کا لوتا ہوا
اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا

چھائے رہتے ہیں جو شاعر کے دل سر شار پر
ٹوٹ کر آتے ہیں وہ نغمے لبِ گفتار پر

رہتے ہیں بیدار دل کی محفلِ خاموش میں
بند کر لیتے ہیں آنکھیں نطق کے آغوش میں

حسن کے جاں پرور اثر سے دل ہیں سب پکڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ اوزان میں جکڑے ہوئے

شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال
سانس کی گرمی سے پڑ جاتا ہے اس شیشے میں بال

نُطق سے خدمت ہو کیونکر سرِّ موجودات کی؟
خامشی تعبیر ہے ادراک محسوسات کی

اس سے بڑھ کر اور ہو سکتی ہے کیا حیرت کی بات
"شعر" کو سمجھا اگر شاعر کی بولے "کائنات"!

شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ نا تمام
مشتبہ سا اک اشارہ، ایک مبہم سا کلام!

نشّے میں اک لغزشِ نا کلک گوہر بار کی
اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی!

بے حقیقت نَے کے اندر زمزمہ داؤد کا
عارضِ محدود پر سایہ سا لا محدود کا!

ظُلمتِ اجمال میں تنویر تفصیلات کی
پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرّات کی!

جوئے قدرت کی رواں دشتِ مصنوعات میں
ٹوٹتا رنگیں ستارے کا اندھیری رات میں!

شعر کیا؟ کچھ "سوچنا" دل میں الجھن دل نشیں
سعر کیا؟ ہر چند کہہ کر کچھ نہ کہنے کا "یقیں"!
شعر کیا؟ عقل و جنوں کی مشترک بزمِ جمال
سعر کیا؟ عشق اور حکمت کا "مقامِ اتصال"!
شعر کیا ہے؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا
برگِ گُل پر، نیند میں، شبنم کے گرنے کی "صدا"!
بے زبانی اور خاموشی کی باہم "گفتگو"
لفظ و معنیٰ میں توازن کی مسلسل "آرزو"!
بحر میں حسنِ قمر کی اک اُچٹتی سی ضیا
جھانکنا قطرے کے روزن سے عروسِ بحر کا!
مر کے بھی تو شاعری کا بھید پا سکتا نہیں
عقل میں، یہ مسئلہ نازک ہے، آ سکتا نہیں
تو سمجھتا ہے جو کہنا چاہیے تھا، کہہ گیا
پوچھ یہ شاعر سے وہ کیا کہہ سکا، کیا رہ گیا؟
کون سمجھے شعر یہ کیسے ہیں، اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں بھی ویسے نہیں!

تبصرے

نوراللغات کی خامیاں

(از حضرت نیاز فتحپوری)

اکثر و بیشتر مجھ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ اس وقت سب سے بہتر لغت اُردو زبان کا کون ہے اور میں ہمیشہ اس کا جواب یہی دیتا ہوں کہ اگر "سب سے بہتر" کا مفہوم "کمتر غلط" ہے تو بیشک کوئی رائے دیجا سکتی ہے، لیکن اگر اس سے مقصود کسی ایسے لغات کا معلوم کرنا ہے جو واقعی سند و استناد کی ضرورت کو پورا کر سکے، تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان میں یہ اتنی بڑی کمی ہے کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ تعلیم یافتہ و مہذّب ممالک میں لغت نام ہے ایک ایسی کتاب استناد کا جو اصطلاحی و لغوی نزاعات کا فیصلہ کرنے والی سمجھی جاتی ہے اور اس کا فیصلہ، "لفظ آخرین" کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں لغت نام ہے ایک ایسے مجموعہ کا جس میں بغیر کسی تحقیق و کاوش کے مختلف کتابوں اور لغتوں سے بہت سے الفاظ و محاورات چن لیے جائیں اور یوں ہی بلا جھجک ان میں نقل کر دیا جائے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اغلاط سے پُر ہوتا ہے اور سند ہونے کی حیثیت سے گرا ہوا۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہاں اس اہم کام کی ذمہ داری صرف ایک شخص پر نہیں ہوتی، بلکہ پوری جماعت اس کو مرتب کرتی ہے اور جب تک ایک ایک لفظ پر کافی غور نہیں کر لیتے اور اساتذۂ وقت سے استصواب کر کے باہم تبادلۂ خیالات و بحث و نقد کے بعد

پورا اطمینان حاصل نہیں کر لیتے اُس وقت تک اس کو درج نہیں نہیں کرتے ۔ بر خلاف اس کے یہاں اس کام کو صرف ایک شخص انجام دیتا ہے اور وہ بھی اس قدر جلدی جلدی کہ دوسرے کو خیر کیا ' خود اپنے آپ سے بھی مشورہ کرنے کی مہلت نہیں ملتی ۔

اس وقت تک اُردو میں صرف ایک لغت امیراللغات ایسا تھا جس کی ترتیب کے لئے ایک سے زائد آدمی معین ہوئے تھے ' لیکن افسوس ہے کہ تکمیل سے قبل ہی وہ انجمن درہم برہم ہو گئی اور یہ اہم کام انجام کو نہ پہونچ سکا ۔

فرہنگ آصفیہ کو اُردو لغتوں میں خاص شہرت و اہمیت حاصل ہے ؛ لیکن اول تو وہ اب دستیاب نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ وہ بھی انفرادی سعی کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے اسقام و اغلاط سے معرا نہیں ہے ۔

حال ہی میں مولوی نورالحسن صاحب نیر کاکوروی نے نوراللغات کے نام سے ایک اُردو لغت کئی جلدوں میں شایع کیا ہے اور اِس میں کلام نہیں کہ اُنھوں نے اپنی عمر کے اُس حصہ میں جب انسان مشکل ہی سے کسی کام کرنے کا اہل رہجاتا ہے اور ایسے زمانہ میں جب کہ قدر شناسی کے فقدان کی بھی عام شکایت کی جاتی ہے ؛ ایسا ضخیم و بسیط لغت تیار کر کے اپنی قوت عمل اور احساس فرض کا پورا ثبوت دیا ہے ؛ لیکن جس وقت ہم اُس پر ایک قابل استناد لغت ہونے کی حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں ؛ تو ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی اُن تمام نقائص سے پاک نہیں ہے جو دوسرے لغتوں میں پائے جاتے ہیں ۔

ہمارا مقصود اِس مضمون سے یہ نہیں ہے کہ ہم مؤلف نوراللغات کی محنت کی اہمیت کو کم کریں اور یہ ہم ایسا

کر سکتے ھیں ؟ کیوں کہ جتنا اور جیسا کام اُنھوں نے کیا ھے وہ یقیناً ھر شخص کے بس کا نہ تھا اور دوسرے سے شاید اتنا بھی ممکن نہ ھوتا لیکن جس حد تک صحیح تنقید کا تعلق ھے ؟ ھم یہ کہنے پر مجبور ھیں کہ ابھی اِس میں بہت کچھہ اصلاح کی ضرورت ھے اور اگر کبھي دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کي نوبت آئے جس کي بظاھر کوئي اُمید نہیں تو اِن اغلاط کو تو ضرور رفع کر دیا جائے جو بہت نمایاں طور پر اس میں نظر آتي ھیں -

نوراللغات میں مختلف قسم کي غلطیاں نظر آتي ھیں کہیں تو سرے سے معنے ھي غلط دیے گئے ھیں اور کہیں توجیھہ و تمثیل نا درست ھے ؟ اِس کے ساتھہ تضاد بیان بھي پایا جاتا ھے اور تطویل بیجا بھی - ھم نے سرسري طور پر صرف الف اور آ کی ردیف پر نگاہ ڈالي ھے اور اُس سے اندازہ ھو سکتا ھے کہ پوري کتاب میں کتني غلطیاں ھوں گی اور کس کس قسم کي - پہلے ھم نوراللغات کي عبارت جلی قلم سے نقل کرینگے اور اِس کے بعد خفی قلم سے قوسین میں اپنا اعتراض پیش کرینگے -

آر — ایک نوک دار لوھا جو کوڑے میں لگاتے ھیں -

(آر ؟ باریک میخ کا نام ھے جو بیلوں کے ھانکنے کی لکڑی میں لگائي جاتی ھے - کوڑے میں کبھی آر نہیں لگائی جاتي - بعض لوگ یہ ضرور کرتے ھیں کہ اِس لکڑي میں چمڑے کے دو تین تسمے بھی باندھہ دیتے ھیں اور اِس کی صورت کوڑے کی سی ھو جاتی ھے) -

آر پار — اُس سوراخ کی نسبت کہتے ھیں جو ایک طرف سے دوسری طرف ھو جائے - فصحا وار پار بولتے ھیں -

(فصحا کبھی وار پار نہیں بولتے بلکہ ھمیشہ آر پار ھی استعمال کرتے ھیں ؛ چنانچہ خود صاحب نوراللغات نے لفظ تھمبا کي تشریح کرتے ھوئے

آر بار کا لفظ استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو نور اللغات جلد ۱، صفحہ ۶۹۴ ۔)

بد وضع — ناموزوں ۔ نامناسب ۔

(اُردو میں یہ لفظ اوباش کے معنے میں مستعمل ہوتا ہے ۔ نہ کہ ناموزوں و نامناسب کے معنے میں ۔ صاحب نور اللغات نے اس معنے میں اس کو فارسي کا لغت قرار دیا ہے ، حالانکہ یہ درست نہیں ۔)

بدن پھوٹ جانا — بدن میں زخم پڑ جانا (مثال) چاہے اپنی لونڈی ہو چاہے غیر کی ، آپ نے مارا کیوں اور پھر اس طرح کہ لہولہان ہوگئی ، سارا بدن پھوٹ گیا ۔

(مؤلف نے یہ مثال خود وضع کی ہے جو غلط ہے ۔ بدن پھوٹنا اس وقت کہتے ہیں جب کسي کشتہ یا گرم دوا ، یا آتشک و جذام کی وجہ سے جسم میں دانے یا زخم نمودار ہو جائیں ۔ محض ضرب کي وجہ سے جسم کا زخمی ہو جانا بدن پھوٹنا نہیں ہے ۔)

برج کبوتر — ایران میں بلند خانہ دار عمارت کبوتروں کے واسطے جنگل میں بناتے ہیں — کبوتر کي ڈھابلی ۔

(برج کبوتر کے معنے صحیح ہیں ۔ لیکن ڈھابلی کہہ کر غلط کر دیا کیونکہ ڈھابلی لکڑی کی بنتی ہے اور بلند عمارت سے متعلق نہیں ہوتی ۔ خود انھوں نے ڈھابلی کے معنے بنائے ہوئے کبوتروں کے رہنے کا دربا بیان کیے ہیں ، حالانکہ دربا اور ڈھابلي دونوں بالکل جدا چیزیں ہیں ۔)

برفانی پہاڑ — وہ پہاڑ جو برف سے جمے رہتے ہیں ۔

(یوں کہنا چاہیے کہ وہ پہاڑ جن پر برف جمی رہتي ہے ۔)

بڑا گھر — معنی نمبر ۵ پاخانہ ۔

(بڑا گھر کبھی پاخانہ کے معنے میں مستعمل نہیں ہوتا ۔ جیل خانہ کے معنے میں البتہ عوام کي زبان پر ہے ۔)

بڑائی کرنا — معنی نمبر ۲ خود ستائی کرنا ۔

(خود ستائی کے معنی صرف اس وقت پیدا ہوں گے جب کوئی اشارہ نفی ذات کی طرف ہو ۔ صرف بڑائی کرنا خود ستائی نہیں ہے ۔)

بڑھنا — پھیلنا ، اُگنا ، بلند ہونا ۔

(اول و آخر معنی صحیح ہیں ۔ اُگنے کے معنے میں اس کا استعمال نہیں ہوتا سند میں داغ کا یہ شعر پیش کیا گیا ہے ۔

گھٹ کے یوں حوالہِ دل شام و سحر بڑھتی ہے

جس طرح ہو کے دام شاخ شجر بڑھتی ہے

حالانکہ اس شعر میں بھی بڑھنے کے معنے اُگنے کے نہیں ہیں ۔)

بزرگوں کا ٹھیکرا — معنی نمبر ۱ موروثی مکان ۔

(مکان کی تخصیص صحیح نہیں ۔ ہر موروثہ یا متروکہ جائداد جو بزرگوں نے چھوڑی ہو از راہ انکسار بزرگوں کا ٹھیکرا کہلاتی ہے ۔)

بطن الوادی — پہاڑ کا اندرونی حصہ ۔

(اول تو اسے اُردو کے لغت میں درج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا ، دوسرے یہ کہ اس کے معنے بھی غلط بتائے ۔ بطن الوادی اُس راستہ کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہو ۔)

بغل — اُس کپڑے کو بھی کہتے ہیں جو انگرکھے ، اچکن ، شیروانی وغیرہ میں مونڈھے کے نیچے لگایا جاتا ہے ۔

(شیروانی میں بغل یا چوبغلا نہیں لگایا جاتا) ۔

بکھاری — بخاری ۔ کھتی ، اناج کا گودام ۔

(ان دونوں کا مفہوم علیحدہ علیحدہ ہے ۔ کھتی وہ زمین میں کنواں سا کھود کر بنائی جاتی ہے ، گودام وہ جگہ جہاں بہت سا غلہ ذخیرہ تجارت کے لیے رکھا جائے اور بکھاری وہ کوٹھری ہے جو گھروں میں غلہ رکھنے کے لیے مخصوص ہوتی ہے ۔)

دیکھو — مرتبی نمبر ۳ مرن — نمبر ۴ احاطہ - نمبر ۵ گائے بھینس کے رہنے کا مکان -

(یہ لفظ جاٹوں اور گوجروں کی زبان کا ہے اور وہ لوگ اس کو بکھل یا باکھل کہتے ہیں چنانچہ مشہور شاعر دلمیر جو جاٹوں کی زبان کا ماہر ہے لکھتا ہے -

تمہاری باکھل میں آنسو دلمیر
بو کو جلوا کھیڑا ناجر کا

واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے ٹھیٹھ لفظ دیہاں سے شہروں کی طرف آئے تو ان میں اختلاف لہجہ کی وجہ سے عوام بجائے لام کے رے بولنے لگے جیسا سالے اور سارے اولال کی جگہ اولار - باؤلے کے بجائے باورے - متوالے کی جگہ متوارے - اسی طرح باکھل یہاں باکھر ہوگیا اور بکھل، بکھر بن گیا - اور صحیح لفظ باکھل غلط یعنی کیا گیا - یہ اور بکھر لکھا جاتا ... بکھر (یہ صحیح تھا) جو بالکل غلط ہے - چنانچہ مصنف نے (فرہنگ الالفاظ) میں باکھل - باکھر اور بکھر تینوں لفظ لکھے ہیں اور معنی مویشیوں کے باڑے کے لکھے ہیں - یہاں بھی معنی اول کے تین، مکان، احاطہ، گائے بھینس کے رہنے کا مکان - معلوم نہیں اصل لفظ کے ساتھ یہ تمام معنی کیوں نہیں لکھے اور غلط لفظ کے ساتھ کیوں شامل کر دیے اصل یہ ہے کہ صحیح لفظ باکھل ہے اور مویشیوں کے رہنے کے مکان کو کہتے ہیں - بوسیدگی کے وجہ کا لفظ مجازی معنی ہیں -)

بستر سے یہ کہہ لگا جانا - صاحب فراش ہو جانا -

(ناسخ) — لگ گئی ساری فرقت میں یہ بستر سے پیٹھ
اٹھ چکوں بالوں میں جو ادھر ہی بستر چلے

(صاحب فراش ہونا صحیح نہیں - ایک شخص صاحب فراش

اس وقت کہلاتا ہے جب وہ ضعف و ناتوانی یا امتداد مرض کی وجہ سے اُٹھ بیٹھ نہ سکے۔ چنانچہ خود مؤلف نے صاحب فراش ہونے کے یہی معنی لکھے ہیں۔ بستر سے پیٹھ لگ جانا؟ یہ معنی رکھتا ہے کہ پڑے پڑے بیمار کی پیٹھ زخمی ہو جائے؟ چنانچہ ناسخ کا جو شعر سند میں پیش کیا گیا ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں اور دوسرے مصرعہ نے بالکل صاف طور پر نمایاں ہیں کیونکہ بستر کا ساتھ چلنا اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ پیٹھ کے زخم سے چپک جائے۔)

بگولا—معنی نمبر ۲ غول بیابانی۔

(غول بیابانی کے معنی میں بگولا کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔)

دل کرنا—معنی نمبر ۴ قربانی کرنا۔

(یہ بھی غلط ہے۔ یہ لفظ اصل میں دلی ہے اور اسی سے دلی‌دان کرنا بہ معنی خیرات کرنا مستعمل ہے۔ لہٰذا دل کرنا اس معنی میں درست نہیں۔)

دل گئی—قربان گئی۔

(دل دل جانا محاورہ ہے۔ لہٰذا دل گئی درست نہیں۔)

دلائے جان—معشوق کے صدقے۔

(مومن)—ہوئے نہ عشق میں جانکا وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

(اُردو میں دلائے جان کوئی محاورہ نہیں جو معشوق کے صدقے ہونے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور نہ مومن نے اس معنی میں یہ لفظ لکھا۔ شعر کے دوسرے مصرعہ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جب تک دل ہلاکت جان کا باعث نہ ہوا بلائے جان ہی رہا۔ اس میں صدقے اور قربان سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ معلوم نہیں صاحب

نوراللغات نے یہ مفہوم کیونکر پیدا کیا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو اس سے اس کا عام محاورہ ہونا کیونکر ثابت ہو سکتا ہے جبکہ یہاں زیادہ سے زیادہ صرف مجازی معنی میں یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے -)

بلبلانا — مشتاق ہونا ، خواہشمند ہونا -

(اس لفظ کے معنی صرف بیتاب ہونے ، بیقرار ہونے ، درد سے تڑپنے کے ہیں - اشتیاق و خواہش کا اس سے کوئی تعلق نہیں -)

بلّی — تھونی - سال کے درخت کی لانبی شاخ -

(بلی ، تھونی کو ہرگز نہیں کہتے - بلّی نام ہے ایک لمبی یا تراشیدہ کڑی یا دھنی کا - بلکہ فی الاصل بلّی وہ ہے جو لمبے درخت کو جڑ سے اوپر کی شاخ تک کاٹ کر ایک لکڑی گولے کی طور پر نکال لی جائے - یہ لکڑی ناڑ وغیرہ باندھنے کے کام آتی ہے یا چھپر کے سہارے کے لیے ستون پر رکھی جاتی ہے - اس میں سال کے درخت کی قید بھی عجیب بات ہے ، جامن وغیرہ کی بھی بلی ہوتی ہے - تھونی بالکل جدا چیز ہے جو ستون کے جگہ کام آتی ہے - چنانچہ خود مؤلف نے جہاں تھونی کے معنے بیان کیے ہیں وہاں بلّی کا نام تک نہیں لیا - رہا رشک کا یہ شعر —

ٹوٹ جائے گی یہ بلی کہکشاں کی خود بخود

دیکھ لینا ایک دن گردوں کا چھپر اُڑ گیا

اس میں بھی بلّی کے معنی تھونی کے نہیں ہیں بلکہ اُس لکڑی کے ہیں جو چھپر کے سہارے کے لیے ستون کے اوپر رکھی جاتی ہے -)

بندری — بندر کی مادہ -

(بندر کی مادہ بندریا کہلاتی ہے - لکھنؤ دہلی میں ہر جگہ بندریا بولتے ہیں - بندری غلط ہے) -

بھڑبھڑیا — معنی نمبر ۱ جو فضول باتیں کرتا ہو، ضبط نہ کر سکتا
ہو، صاف دل، پیٹ کا ہلکا۔ معنی نمبر ۳ گنّی۔
(معنی نمبر ۱ درست ہیں، لیکن معنی نمبر ۳ صحیح نہیں۔
بھڑبھڑیا ایسے کہتے ہیں جو ضبط نہ کر سکے اور دل کی بات فوراً زبان
پر لے آئے، گنی بالکل دوسری چیز ہے۔)

بوئی — ایک قسم کی گھاس۔
(گھاس کہنا غلط ہے، کیونکہ بوئی کی بڑی بڑی جھاڑیاں
ہوتی ہیں۔)

بوئیاں — چھوٹے سے سکڑے منہ کی جس میں اندر روئی کی
پونی رکھتے ہیں۔
(بوئیاں نون کے ساتھ غلط ہے۔ ہُرمز دھوئی لکھتے ہیں —

سمجھ کو ہے جو یہ کیا مالکِ سخن کا شہسوار
ہیں بجا کرے سمند طبع کو پاں بوئیے

جیسا ادا ہے کہ اس شعر میں کیوں کھوئی عمر
کاتتے ہم سیکھتے اس سے بنائے بوئیے

ظاہر ہے کہ اگر صحیح لفظ بوئیاں ہوتا تو اس کی جمع بوئیے
نہ آتی بلکہ بوئییں آتی۔ بوئیا ایک خاص وضع کی ٹوکری ہے جو
گیہوں کی بالی سے بنائی جاتی ہے اور اس میں چرخہ کاتنے والیاں
روئی کے گالے وغیرہ رکھتی ہیں۔)

بھاڑ — وہ چولہا جس میں بھڑبھونجے دانے بھونتے ہیں، نمبر ۲ بھٹی،
نمبر ۳ تنور۔
(دونوں معنی صحیح نہیں۔ کیونکہ بھاڑ نہ چولہا ہے، نہ بھٹی
نہ تنور، بلکہ وہ زمین میں سرنگ کی طرح بنایا جاتا ہے، بھٹی
لوہار کی ہوتی ہے اور تنور نانبائی کا اور ان سب کی ساخت

علاحدہ علاحدہ ہے - علاوہ اس کے جنے ہونے کی تخصیص بھی عجیب ہے -)

بھارا — جوس کی ہوئی دوا -

(ایسا کہنا چاہیے کہ جوس کی ہوئی دوا کی بھاپ -)

بھدانہ — صحیح بہی دانہ ہے بمعنی بہی کا بیج - ایک قسم کا چھوٹا بوٹ - ایک قسم کا انار -

(مؤلف کا بھدانہ کی صحت میں بہی دانہ کہنا غلط ہے کیونکہ جس کو وہ بہی سمجھے ہیں وہ خود بہ ہے اور فارسی میں اُسے بہہ کہتے ہیں اس لیے یہ کہنا کہ صحیح بہی دانہ ہے درست نہیں - بوٹ اور انار کی کسی قسم کو بہدانہ کہنا دوسری بڑی غلطی ہے - کیونکہ وہ بوٹ یا انار جس میں دانہ نہ ہو اُسے بیدانہ کہتے ہیں نہ کہ بہدانہ -)

بھربھرانا — چہرہ سنسانا -

(جب چہرہ پر ہلکے سے ورم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو کہتے ہیں چہرہ بھربھرایا ہوا ہے - سنسانے کا تعلق چہرہ کے سرخ ہونے سے ہے نہ کہ ورم و اماس سے -)

بھرتا کر دینا — جلا دینا -

(بالکل غلط معنی ہیں - بھرتا کر دینا بمعنی وہی معنی رکھتا ہے جو کچومر نکالنے کے ہیں)

بھاڑسا پھُنکنا — جب مارا جانا -

(بھاڑ سا پھُنکنا - کنایتاً بخار کی گرم بازاری کو کہتے ہیں جو کسی وبائی مرض یا لڑائی کے وجہ سے پیدا ہو -)

بھت — معنی نمبر ۳ بھتی ۴ بھار - مثال - بھت بڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان :—

(بہت کو بھتّی کا مصحف کہنا صحیح نہیں - بہت مصحف ہے بہات کا -

بہت ؟ بھتیاری ؟ بیسوا ؟ بینوں داب گذاب
آتے کی آدر کریں جاب نہ پوچھیں بات

علاوہ اس کے جو مثال دی ہے وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ بہت بڑے الخ - بہت بڑے کے معنی ضایع ہوئے ؟ برباد ہوئے کے ہیں)

بھائیں بھائیں کرنا ــــ بچھڑے کی آواز -

(ممکن ہے نواح کا کوری میں بچھڑے کی آواز کو بھائیں بھائیں کہتے ہوں - لیکن بھائیں بھائیں کرنا عام طور پر اُس ویران مکان یا سنسان مقام کی نسبت استعمال ہوتا ہے جہاں غیر معمولی وحشت و ویرانی ٹپکتی ہو -)

بے صرفہ ــــ بہت زیادہ ؟ بے احتیاطی سے -

(رشک) ــــ میں پیا کرتا ہوں یونہی بادۂ عشق غاں
جس طرح بے صرفہ پیجاتا ہے دیوانہ شراب

(بے صرفہ کے معنی بیکار و بے سود کے ہیں اور رشک کے شعر میں بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ دیوانہ کو شراب کی حاجت نہیں اور اگر وہ شراب پیتا ہے تو اُس کو بے صرفہ ہی کہیں گے -)

مرزا غالب نے بھی بے صرفہ اس معنے میں استعمال کیا ہے ــــ

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

اب چند وہ محاورات و لغات ملاحظہ فرمائیں جو صرف مؤلف نوراللغات کی اُپج کہلائے جانے کے قابل ہیں اور جنھوں نے خواہ مخواہ

کتاب کو صحیح بنانے کے لیے بغیر کسی حوالہ و سند کے داخل محاورات
کرلیا ہے - مثلاً :—

آبلے بھرنا—چھالے میں مواد کا بھر جانا

(یہ کوئی محاورہ نہیں - نہ مفہوم صحیح ہے کیونکہ چھالا جب
پڑتا ہے اس میں اُسی وقت سے مواد بھرا ہوا ہوتا ہے -)

آس چھوٹنا—نااُمید ہونا - مایوس ہونا -

(آس چھوڑنا مسموع ہے ، آس چھوٹنا مسموع نہیں - اس کے
بجائے آس ٹوٹنا بولتے ہیں -)

بدزبان—گالی گلوج ، گستاخ ، سخت کلامی -

(مؤلف نے اس لفظ کو فارسی کہا ہے ، حالانکہ فارسی میں
کہیں اس معنی میں مستعمل نہیں ہوا - بعض گنوار ضرور اسی طرح
بولتے ہیں کہ دیکھو بد زبان منھہ سے نہ نکالنا ، لیکن اس معنے میں یہ
بالکل اردو ہے فارسی سے اسے کیا واسطہ -)

برا دن کرنا—بری رات کرنا - تکلیف میں بسر کرنا -

(اِس معنی میں دن اور رات دونوں جمع کے ساتھہ اِسی طرح
استعمال ہوئے ہیں - برے دن کٹے - بری راتیں کٹیں -)

بساھا—بکسر اول ، کتا جس کے بیس ناخن اور زہریلے دانت
ہوتے ہیں -

(اصل لفظ بِسہاَ ہے - ممکن ہے یہ لفظ بس (بہ معنی زہر سے)
بنا ہو یا بیس سے اِس شہرت کی بنا پر کہ جس کُتے کے بیس ناخن ہوتے
ہیں وہ بہت زہریلا ہوتا ہے -)

بغل میں منھہ ڈالنا — سر نیچا کرنا خجالت ظاہر کرنا -

(بالکل غلط ہے - محاورہ گریبان میں منھہ ڈالنا اور بغلیں
جھانکنا ہے -)

بکری کرے گھاس سے یاری تو چرنے کہاں جائے—مثل - جو شخص اپنا رزق دوستی کی وجہ سے چھوڑ دے تو وہ کس طرح بسر کرے -

(یہ محاورہ غلط ہے - صحیح یہ ہے - گھوڑا گھاس دانے سے یاری کرے تو کھائے کیا -)

بکری اپنی جان سے گئی کھانے والے کو مزہ نہ آیا -

(اِس میں بجائے بکری کے مرغی ہونا چاہیے اور بجائے مزہ کے سواد -)

بہرا بہشتی - اندھا دوزخی -

(یہ مثل صرف اِس وجہ سے ہے کہ ب کی ردیف میں اضافہ ہو جائے اُلٹی لکھی - اصل یوں ہے اندھا دوزخی بہرا بہشتی اِسی طرح کی تقدیم و تاخیر اِس محاورہ میں کی گئی ہے - بھانمتی نے کنبہ جوڑا - کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا - دوسرا ٹکڑا پہلے ہونا چاہیے -)

آٹے کے ساتھہ گھن نہ پس جائے -

(محاورہ گیہوں کے ساتھہ گُھن پسنا ہے -)

مؤلف نے لغات کو بڑھانے میں بھی بہت بے اعتدالی سے کام لیا ہے مثلاً آپ کی دال یہاں نہ گلے گی -

(اصل محاورہ دال گلنا ہے - اِس میں لفظ آپ کا اضافہ کر کے خواہ مخواہ الف کی ردیف میں شامل کرنا کسی طرح مناسب نہ تھا - یا آجنک بڑے ہبنگ ھگ رہے ہیں - اس میں آجتک کا اضافہ بالکل بے محل ہے - یا آخر آدمی نے کچا دودھہ پیا ہے -

اس میں بھي آخر کا اضافہ درست نہیں - یا بڑا کمر توڑ - محاورہ کمر توڑ ھے اس میں بڑا شامل کرنے کي کیا ضرورت تھی -)

اس طرح کے سیکڑوں محاورات ھیں جو بلا ضرورت کسي لفظ کے ساتھہ ملاکر کتاب میں شامل کر دئے گئے ھیں اور بیسوں حکایتیں درج کر کے انکا ایک ایک فقرہ لے لیا اور محاورات میں شامل کردیا ھے -

بہت سے ایسے محاورات بھي نظر آے ھیں جن کي سند میں کوئی شعر کسی کا ملا اور اُسے بے تکلف درج کردیا در آنحالیکہ خود اُن اشعار میں وہ محاورات غلط استعمال کیے گئے ھیں اور اس سے قبل اس زمانہ میں ان پر اعتراض بھي ھوئے ھیں مثلاً آبرو اُڑجانا-آبرو گرہ میں باندھنا- آج کدھر سے خورشید نکلا - بخت جلا - خانہ خرابی برپا کرنا - بڑا بول پیش آنا- بغل کا گھونسہ - وغیرہ کہ یہ تمام محاورات غلط نظم کیے گئے اور اُن کو صحیح جان کر لغت میں داخل کردیا گیا -

لغت کے ابتدا میں متروکات کي جو بحث مؤلف نے چھیڑي ھے وہ بہت کچھہ محل نظر ھے - کیونکہ جو متروکات انھوں نے شمار کرائے ھیں اُن میں نصف سے زاید اب بھي مستعمل ھیں -

---

یہ مضمون صرف ایک سرسري نظر کا نتیجہ ھے اور وہ بھي ردیف الف و با کے متعلق ورنہ پوري کتاب کي اگر چھان بین کی جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ھو سکتی ھے -

---

منتخبات ہندی کلام- مرتبۂ ڈاکٹر جعفر حسین ' پی ' ایچ ' ڈی - ملنے کا پتہ - دی حیدرآباد بک ڈپو ' چادر گھاٹ ' حیدرآباد دکن - ڈیمائی اکٹیو سائز ' ۲۲۵ صفحات — مجلد قیمت فی جلد ۲ روپیہ ۸ آنہ کلدار - ۲ روپیہ ۱۲ آنہ حالی -

اُردو کے ادبی حلقوں میں ہندی شعر و ادب سے دلچسپی اور مذاق پیدا کرنے کی روز بروز زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اس اعتبار سے ڈاکٹر جعفر حسین صاحب نے اپنی کتاب منتخبات ہندی کلام کے ذریعہ جو مخلصانہ کوشش کی ہے وہ صرف قابل ستائش ہی نہیں بلکہ قابل تشکر بھی ہے -

شروع میں لائق مرتب نے ایک مقدمہ تقریباً ۲۵ صفحات کا سپرد قلم کیا ہے جس میں ہندی شاعری کی خصوصیات اور مسلم شعراء کی خدمات کا ذکر ہے - اس کے بعد ہندی شاعری کے منتخبات شروع ہوتے ہیں ، جو ہر طرح کے اخلاقی ، عاشقانہ اور فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہیں - چونکہ ہندی کے الفاظ کا صحیح تلفظ اُردو کے رسم الخط میں مشکل ہے اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی حروف میں بھی اُنھیں واضح کر دیا گیا ہے -

انتخاب اور ہندی اشعار کے ترجمے سے لایق مرتب کے حسن مذاق کا اندازہ ہوتا ہے ' البتہ اشعار کی تشریح میں بعض مقامات پر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ شعر کی اصلی اسپرٹ کو بہ تمسمہ ڈلا دیا گیا اور وہ بالکل مغربی سانچے میں ڈھل کر رہ گئی ہے ' اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اشعار کے مطالب

میں موجودہ حالات و مذاق کا رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے ' حالانکہ اعلیٰ شعر و ادب کے لیے ضرورت ہے کہ اس کا مطالعہ اس کی اصلی اسپرٹ میں کیا جائے ۔ بہر صورت کتاب نہ صرف مجموعی دلچسپ ہے اور نہایت سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے ، امید ہے کہ اس کے ذریعہ اُردو کا حلقۂ شعر و ادب ہندی شعراء کے اعلیٰ تخیلات و جذبات سے لطف اندوز و مستفید ہونے کی کوشش کریگا ۔

اردو شہ پارے (جلد اول) ۔ ۳۵۹ صفحات - مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم ۔ اے - پی - ایچ - ڈی ' ملنے کا پتہ - مکتبۂ ابراهیمیہ امداد باهمی ' اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن - قیمت درج نہیں ہے -

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ملک کے ایک ذہین اور هونہار نوجوان هیں اور اپنے اندر فضل و کمال کے ساتھ ' جوش عمل اور ولولۂ کار بھی رکھتے هیں - اب سے قبل ان کی "روح تنقید" اور "اُردو اسالیب بیان" وغیرہ کتابیں ملک میں شائع هوکر کافی شہرت حاصل کر چکی هیں -

زمانۂ قیام یورپ میں بھی ان کے ذوق عمل نے ان کو بیکار نہیں رهنے دیا چنانچہ ادبیات اردو کے اُس نایاب ذخیرے کی مدد سے ' جو لندن ' ادنبرا یونیورسٹی اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں هیں ' آپ نے "اردو شہ پارے" کے نام سے ایک کتاب تین جلدوں میں لکھنے کا قصد فرمایا ' زیر تبصرہ کتاب اُن میں کی پہلی جلد ہے جو مکتبۂ ابراهیمیہ حیدرآباد سے شائع هوئی ہے -

اس جلد میں لائق مرتب نے صرف شاهکاروں اور شہ پاروں کے جمع کر دینے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ اُن مصنفین کے تذکروں اور ان کے

عہد و ماحول کے ذکر پر ۱۷۰ صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ بھي لکھا ہے - ظاہر ہے کہ ولایت کے کتبخانوں سے مصنفین و شعراء کے کارناموں کو اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کرکے شائع کر دینا کوئي بہت بڑا کام نہ تھا مگر ان کے حالات کا جمع و تلاش کرنا پھر مختلف حالات و روایات کو غور و تحقیق کے ساتھہ رد و قبول کرنا بڑي محنت و لیاقت کا کام تھا -

اس مقدمہ کے چار باب ھیں - باب اول میں اردو کے متعلق ان ابتدائي کوششوں کا ذکر ہے جو شمالي ھند میں حضرت امیر خسرو اور خواجہ مسعود سلمان وغیرھم سے ہوئیں (یہیں اس امر کي تحقیق بھي کر دی ہے کہ اردو زبان کی بنیاد خواجہ مسعود کے زمانہ میں پڑ چکي تھي جو حضرت امیر خسرو سے پہلے گزرے تھے) یا جو گجرات میں بہاءالدین باجن ؟ خوب محمد اور گم دھني کے ذریعہ رونما ہوئیں یا جو دکن میں حضرت گنج‌العلم اور خواجہ بندہ نواز کے ہاتھوں عمل میں آئیں - مگر اس کا مواد زیادہ نہ تھا لہذا یہ باب صرف ۱۱ صفحات میں ختم ہو گیا ہے -

باب دوم میں بیجا پور کے اُن اردو کارناموں کا ذکر ہے جو شاہ برھان جانم - آسي - مقیمي - صنعتي - رستمي - ملک - امین - سیوا - اور مومن بیجاپوری و غیرھم کے رہین منت ھیں - یہ ذکر ہے سنہ ۱۴۹۰ع (۸۹۵ ھ) سے سنہ ۱۶۸۶ع (۱۰۹۷ھ) تک کا -

یہ بیان تفصیلی ہے اور ۵۴ صفحات میں ختم ہوا ہے - شاہ برھان جانم کا ذکر پہلے پہل رسالہ اردو میں نکلا تھا -

تیسرے باب میں گول کنڈہ کے اردو کے اُن کارناموں کا بیان ہے جو فیروز - محمود - وجہی - احمد - شوقي - خیالی - غواصي - قطبي - ابن نشاطي اور نوری وغیرھم کے باعث ظاہر ہوئے - یہ ذکر سنہ ۱۵۰۸ع

(۹۱۹ھ) سے سنہ ۱۶۸۷ع (۱۰۹۸ھ) کا ہے اور ۳۵ صفحات میں ختم
ہوا ہے - چوتھے باب میں وہ شاعر مذکور ہیں جو سنہ ۱۰۹۸ھ سے
سنہ ۱۱۵۰ھ تک مغلوں کی فتح دکن کے بعد عالم وجود میں آئے -
قریباً ۵۰ صفحات میں اس کا ذکر ہے - اِس میں شمالی ہند کے
ان شعراء (افضل - حیون - جعفر) کا بھی ذکر کیا ہے اس کے بعد
۱ دکھنی شعرا اور ۴ نثر نگاروں کا تذکرہ ہے جن میں بحری ' عشرتی
ر ولی ' اورنگ آبادی معروف و آشنا ہیں -

غرض اس ۱۷۰ صفحات کے مبسوط مقدمہ کے بعد تقریباً ۱۵۰
صفحات میں کتاب یعنی منتخبات نظم و نثر اردو ہے جس میں
نظم کا حصہ ۱۲۷ صفحات پر اور نثر ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے -

فاضل مرتب چونکہ مشرقی طرز تصنیف کے ساتھ ساتھ مغربی
طریقۂ تصنیف سے بھی باخبر ہیں اس لئے انھوں نے اس میں
متعدد امور کے اضافہ سے اپنی تصنیف کو مفید ' سہل المطالعہ اور
زمانۂ حال کی تصانیف کے موافق بنا دیا ہے - مثلاً مقدمہ کے ہر
ب کے شروع میں فہرست مضامین اور فہرست شعراء دیدی ہے اور ہر
ب بلکہ ہر دور میں ایک ایک تمہید ہے جو اس باب یا دور کے
ات پر مجموعی رائے ہے - فہرست شعراء و مصنفین کے سنہ اور تاریخیں
ی درج ہیں - پھر اصل کتاب یعنی انتخاب کلام سے قبل
فہرستیں ہیں ایک بلحاظ مضامین دوسری بلحاظ مصنفین -

دوسری فہرست میں پھر سنین شعرا اور مختلف نسخوں کے
خذ کا ذکر کردیا ہے مگر ان سب سے زیادہ مفید آخر کے ضمیمے
ں جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہر مصنف کی دیگر
انیف کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں اور مرتب نے اُن کے حالات
کن مآخذ (یا مرتب ہی کے لفظوں میں کن "علیحدہ") سے

حاصل کیے ہیں- اس قسم کی فہرستوں اور ضمیموں سے کام لینا یا ان کو مرتب کرنا، ممکن ہے، بعض لوگوں کی نگاہوں میں تضیع اوقات و صعوبات ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے محنت اور وقت کی بچت ہوجاتی ہے اور مہذب ملکوں میں تو بغیر ان امور کے کوئی تصنیف مقبول اور بلند پایہ ہو ہی نہیں سکتی-

سب سے آخر میں ایک فرہنگ بھی شامل کردی گئی ہے جس میں قدیم مصنفین کے الفاظ و لغات کا، جو اب نامانوس اور متروک ہیں، شافی حل بھی حتی‌الوسع کیا گیا ہے-

پھر اسی کے ساتھ، شعرا و سلاطین کی سات تصویریں اور وصلی و قطعات کی چار تصویریں بھی شامل کر کے کتاب کی زینت میں اضافہ کیا گیا ہے-

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے شاہ کاروں کا یہ مجموعہ، موسوم بہ "اردو شہ پارے" عرق ریزی اور محنت کا ایک بہترین نتیجہ، اور معلومات و تحقیقات جدیدہ کا ایک اچھا ذخیرہ ہے اور بجائے خود ایک شاہکار- لیکن ہم کو بعض مقامات کے طرز بیان پر اعتراض ہے- انھوں نے بعض لوگوں کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ مشرقی تہذیب اور اردو مذاق کے موافق، اُس سے حقارت یا سوء ادب مترشح ہوتا ہے مثلاً انھوں نے امیر خسرو کا حال یوں لکھا ہے-

"امیر خسرو الخ۔ اس عہد میں تھا اور اُس مقام پر تھا...- (چند سطروں کے بعد) جس زبان میں وہ شعر گوئی کرتا تھا-"

ممکن ہے یہ عبارت، انگریزی کا ترجمہ ہو یعنی ممکن ہے فاضل مرتب نے اپنی کتاب کے کچھ اجزا پہلے انگریزی میں

لکھے ہوں پھر ان کا ترجمہ اردو میں کردیا ہو بہر صورت تحریر کا یہ آہنگ ہمارے نزدیک مناسب نہیں ہے۔

اِس کے علاوہ لفظوں اور محاوروں کی بعض غلطیاں بھی اس میں ملتی ہیں جو نہ ہوتیں تو بہتر تھا۔ مثلاً صفحہ ۱۳ پر بہاؤالدین باجن کے ذکر میں لکھتے ہیں "وہ نہ تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہیں نہ ہی معتبر و موثق" یہ "نہ ہی" پنجاب کی پیداوار ہے اور غیر فصیح بلکہ غیر صحیح۔ صفحہ ۹ پر ہے "شہ پاروں کے مد نظر" مد نظر کا استعمال اس طرح غلط ہے۔ خود زور صاحب نے اس کا صحیح استعمال بھی ایک آدھ جگہ کیا ہے۔ یوں لکھنا چاہئے "شہ پاروں کے متعلق یا شہ پاروں کو مد نظر رکھتے ہوئے" صفحہ ۷ پر دونوں "صاحبین" صاحب کا تثنیہ (اور جمع بھی) واعلی حالت میں غیر فصیح ہے۔ ہاشمی اور ولی کے ذکر میں ہے "درنویس تھا" دُرگو پر قیاس کر کے ان معنوں میں الفاظ گڑھنا مناسب نہیں۔ "اسی طرح سنہری دور" بھی غلط ہے سنہرا دور ہونا چاہیے۔ لیکن یہ تمام باتیں بہت ہی خفیف اور معمولی ہیں یہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اس دور کی ایک بہترین پیداوار ہے اور ہم جناب زورؔ کو ان کے اس قابل قدر کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

روح جذبات— جناب اکبر حیدری کے کلام کے مجموعہ، طابع و ناشر عشرت رحمانی ایڈیٹر "نیرنگ" دہلی۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ۔

یہ کتاب جناب اکبر حیدری کی نظموں کا مجموعہ ہے۔
جناب اکبر حیدری کسی تعارف کے محتاج [illegible] کا نام

اکثر ملک کے ادبی رسائل میں نکلتا رہتا ہے ۔ آپ جدید طرز کی نظمیں بہت کامیابی کے ساتھ لکھتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اجتہاد کے دُھن میں زبان و بیان کی شگفتگی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ روح جذبات کی بیشتر نظمیں قابل تحسین و ستائش ہیں کاغذ نفیس اور طباعت وکتابت دیدہ زیب ہے ۔

مصباح التعرف لارباب التصوف — ملنے کا پتہ ۔ قاضی انتظام علی خاں ؒ قاضی گڑھی ۔ کاکوری ضلع لکھنؤ — قیمت ۲ روپیہ ۔

شاہ علی حیدر ابن حافظ شاہ علی انور قلندر کاکوروی نے کمال محنت و جانفشانی سے شیخ عبدالکریم جیلی اور مولانا جامی وغیرہ کی تصانیف سے صوفیہ کی اصطلاحات ردیف وار جمع کر کے ترتیب دی ہیں ؒ اور ساتھ کے ساتھ اُن کی توضیح و تشریح بھی کردی ہے ؒ یہ کتاب شائقین علم تصوّف کے لیے نہایت کار آمد و مفید ہے ۔

(ا)

اداریہ

ہندستانی اکیڈیمی کی دوسری ادبی کانفرنس امسال توقع سے زیادہ کامیاب رہی، اس بات میں آنریبل جسٹس سر شاہ محمد سلیمان بالقابہ چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد کی سرگرمیاں و دلچسپیاں سزاوار ستائش بھی ہیں اور قابل مبارکباد بھی۔

کانفرنس کی تاریخیں ۴، ۵ اور ۶ اپریل سنہ ۳۱ء قرار پائی تھیں ملک کے سربرآوردہ حضرات کے لیے اتفاق سے یہ زمانہ سخت مصروفیتوں کا تھا، اسی زمانے میں اکیڈیمی کے ادب نواز صدر ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ سیاسی مہمات میں مصروف تھے، اسی طرح پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سر عبدالقادر، مولوی عبدالحق بی۔اے، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر محی الدین قادری وغیرہ بھی شدید مصروفیتوں کے باعث کانفرنس میں شرکت نہ فرماسکے،

جنرل سکریٹری ہندستانی اکیڈیمی نے ۴ تاریخ کے اجلاس میں ان تمام حضرات کے پیامات پڑھ کر سنائے، جن میں اکیڈیمی اور اس کی ادبی کانفرنس کے مقاصد سے ہمدردی و دلچسپی اور اس کی کامیابی کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ سر تیج بہادر سپرو کی عدم موجودگی کی باعث ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان بالقابہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھ کر سنایا (جسے ناظرین نے ہندستانی کے اپریل نمبر کے ساتھ ملاحظہ فرمایا ہوگا) سکریٹری صاحب ہندستانی اکیڈیمی نے اکیڈیمی کی کارگزاریوں کی رپورٹ پڑھ کر سنائی پھر مسٹر میکنزی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات صوبۂ متحدہ نے ایک دلچسپ

انداز میں اکیڈیمی کے کاموں سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا ، اور اس کو مفید و کارآمد بتا کر اس کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرمائی -

۵ اپریل کو کانفرنس کے شعبۂ اردو کا پہلا اجلاس زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر ٹ میوزہال میں منعقد ہوا - حاضرین کے سامنے ذیل کے مسایل پیش تھے -

(۱) علوم و فنون کی کس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کرانا مناسب ہوگا -

(۲) عورتوں اور بچوں کے لیے مفید مطالب پر کتابیں طیار کرانے کی کیا صورت اختیار کی جائے -

مذکورہ بالا مسایل پر کافی بحث و گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ مندرجۂ ذیل تجویزیں بطور سفارش اکیڈیمی کی کونسل میں پیش کیجائیں -

۱ - فی الحال موضوعات ذیل پر جو کتابیں غیر زبانوں میں ہیں ان کا ترجمہ کرایا جائے :—

(الف) سوسیالوجی -

(ب) فنون لطیفہ (نقاشی و مصوری وغیرہ) -

(ج) سائنس کی عام کتابیں -

۲ - اکیڈیمی کی جانب سے اس کا اعلان کیا جائے کہ ایک انعام اُن تصنیفات میں سب سے بہتر تصنیف پر دیا جائے گا جو خاص طور پر عورتوں کے لیے مفید ہوں -

۳ - اکیڈیمی کی جانب سے اس کا بھی اعلان کیا جائے کہ اُس تصنیف پر جو بچوں کے لیے باعتبار زبان اور مضمون مفید ہو

اور مقابلے کي کتابوں میں سب سے بہتر ہو ایک انعام دیا جائے گا -

اس کے بعد عالي جناب نقوب برجموهن دتاتریه کیفي نے ایک مبسوط مقالہ اردو لسانیات کے عنوان سے پڑھ کر سنایا جس کو حاضرین نے کمال شوق و مسرت سے سنا - جناب صدر نے اپني تقریر میں جناب کیفي کے مقالے کي بہت تعریف فرمائی ' اس کے بعد جنرل سکریٹری هندستاني اکیڈیمي نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا -

اِس شعبہ کا دوسرا اِجلاس ۹ اپریل سنہ ۳۱ع کو دو بجے زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر میوهال میں هوا - عالي جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنا محققانہ مضمون محمد هاسم برهان‌پوری کے دیوان مراثی کے متعلق پڑھ کر سنایا - پھر نواب صدر یار جنگ نے کلیات میر حسن - مثنویات اعظم‌الدولہ سرور اور مثنوي حکیم قدرت اللہ خاں قاسم دهلوي پر ایک عالمانہ مضمون پڑھ کر حاضرین کو محظوظ فرمایا - اُس کے بعد مسٹر بي - تي ورما صاحب پروفیسر فرگیوسن کالج پونا نے ایک دلچسپ مضمون ابراهیم عادل شاہ کے متعلق پڑھا -

اِن مضامین کے علاوہ چند اور مضامین بھی تھے جو وقت کي کمي کے باعث نہیں پڑھے جا سکے - چند ضروري مسائل جو ذیل میں درج کیے جاتے هیں حاضرین کے سامنے پیش کیے گئے -

(۱) زبان کو عام فہم اور سلیس بنانے اور اُس کو غیر مانوس الفاظ وتراکیب سے پاک رکھنے کے لیے کیا وسائل اختیار کیے جائیں -

(۲) وضع اصطلاحات علمیہ کے لیے کیا اُصول اختیار کیے جائیں -

چونکہ اکیڈیمي کی کونسل نے ماهرین کي ایک کمیتی مسئلہ

اول پر غور کرنے کے لیے پہلے ہی بنا دی تھی جس کی رپورٹ وصول نہیں ہوئی تھی اِس لیے یہ مسئلہ خارج از بحث سمجھا گیا -
مسئلہ دوم کے متعلق کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ قرار پایا کہ "کونسل سے اِس امر کی سفارش کی جائے کہ اُن اصطلاحی لفظوں کے علاوہ جو ہندی اور اردو میں رائج ہیں یا جو دونوں میں مشترک (رائج) ہو سکیں سائنس کی اصطلاحوں کے لیے جدید الفاظ کی اختراع سے یہ بہتر ہوگا کہ وہی اصطلاحیں بجنسہ اختیار کرلی جائیں یا "مورد" بنا لی جائیں جو دیگر ممالک میں رائج ہوں" -

چند تجویزیں اور پیش ہوئی تھیں - مگر اب وقت تنگ ہو گیا تھا اِس لیے جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کر کے جلسہ برخاست کیا گیا -

---

جیسا پہلے بھی عرض کیا گیا ہے اکیڈمی جن سالانہ لکچروں کا اہتمام کرتی ہے وہ بھی کانفرنس کے موقع پر دیے جاتے ہیں - امسال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ایم - اے، پی - ایچ - ڈی صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی نے "سامی لسانیات" پر ایک فاضلانہ خطبہ پڑھا تھا - اردو زبان میں یہ چیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے یقیناً نئی ہے - یہ خطبہ اکیڈیمی کی جانب سے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوگا، اس وقت ناظرین اس کی اہمیت اور زبردست عالمانہ تحقیق و تلاش کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں گے -

---

"ہندستانی" کے سرورق پر "سہ ماہی" کا لفظ ایڈیٹوریل بورڈ کے اعزازی ممبروں نے تجویز کیا تھا، اس پر بعض بزرگوں کو

اختلاف ہوا لیکن مخالفت کی حد تک نہیں مگر بعضوں نے اس پر اس شد و مد سے آواز بلند کی گویا وقت کا اہم ترین مسئلہ یہی تھا۔

ابتدا میں ہمارا خیال تھا کہ لوگ وقتی اور مقامی مصالح کی اہمیت کا لحاظ کرینگے اور رسالے کے عام مضامین سے اس خفیف امر کی تلافی ہو جائے گی ، چنانچہ ہمارا یہ خیال صحیح نکلا اکثر ارباب فہم خاموش بھی ہو گئے ، مگر بعض حلقوں میں اب تک اسی زور شور سے طعن و تنقیص کا سلسلہ جاری ہے اس پر ہمارے ادارے کے معزز ممبر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم' اے۔ پی۔ایچ۔ڈی آئندہ اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ مرحمت فرمائینگے ، لیکن ہم بھی آج کی صحبت میں مختصراً کچھہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں :—

" تماہی " پر اصولی اعتراض یہ ہے کہ ہندی اور فارسی لفظ کو ملا کر اس قسم کا تصرف ناجائز یا ناموزوں ہے ۔ لیکن لغوی حیثیت سے ان لفظوں کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا ؟ ۔

(۱) تپائی

(۲) بِراھا ، بِراھی —

(منیر)—صدقے اُترتے سراسی چوراھے پر سام

کیوں ایک راہ بِیری بِراھی میں رہ گئی

(۳) بسالا (تین برس کا) ۔

(۴) چوراھا (جہاں ھر چار طرف کو راستہ جاتا ھو) ۔

(بحر)—گرا ھے کوئی پُتلا اُس بت کافر کے صدقے کا

کہ چوراھے کو اکثر پوجتے ھندو نکلتے ھیں

(۵) چوگلا—گل چار برگہ - چار نلکھڑي کا پھول -

(بحر)—بہار عالمِ امکاں بہاست بے حقیقت ہے
عناصر کو سمجھہ اک چوگلا ہے باغ فاني کا

(۶) چوگوشیا -

(۷) چومنزلا—چار منزل کا مکان -

(۸) سہ رخا—سہ پہلو -

کیا مذکورہ لفظوں کی ساخت و صورت بالکل "ب ِماھی" کي نہیں ہے ؟

چھہ ماھي کے لیے بعض صاحبوں کو اصرار ہے کہ صرف مُردے کي چھہ ماھی ہوتی ہے ؛ سند میں غالب کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے —

رسم ہے مُردے کي چھہ ماھي ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

لیکن اس شعر میں یہ ممانعت کہاں ہے کہ چھہ ماھي کو اُس کے اصلی معنوں میں نہ استعمال کیا جائے ؟ غالب ھی کا شعر اس کے بعد کا ملاحظہ فرمایئے :—

مجھکو دیکھو کہ ھوں بقید حیات
اور چھہ ماھي ھو سال میں دو بار

یہاں چھہ ماھی دو معنی ہے ' ایک مردے کي چھہ ماھي دوسري چھٹے مہینے تنخواہ دیے جانے کي رسم -

اس لیے یہ کہنا کہ چھہ ماھی صرف مُردے کی چھہ ماھی کو کہتے ھیں ' ھمارے نزدیک صحیح نہیں معلوم ھوتا - صاحب فرھنگ آصفیہ نے بھي شش ماھي کے معنے چھہ ماھی اور نصف سال کے دئے ھیں اور مردے کی چھہ ماھي کا خفیف سا بھي اشارہ نہیں کرتے -

بہر صورت ہندی اور فارسی لفظوں کو ملا کر اُن پر تصرّف کرنے کا جہاں تک اصولی تعلق تھا اس کی مثالیں دیدی گئیں، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی پر قیاس کر کے کوئی نیا لفظ نہیں ڈھالا جا سکتا ؟ لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ "ساھی" کوئی نیا لفظ نہیں ہے اور نہ اس زمانے کے لوگوں کے مخترعات میں ہے -

صاحب فرہنگ آصفیہ سہ بندی کے معنوں میں سہ ماھہ اور تماھہ دیتے ہیں (جس سے مراد ہے) وہ قسط جو تیسرے مہینے ادا کی جائے -

لغوی حیثیت سے جہاں تک "ساھی" کے جواز و عدم جواز کی بحث تھی ؟ ختم ہوگئی مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ لغوی حیثیت سے کسی لفظ کے صحیح و جایز ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسا و ادب میں بھی اُسے ضرور جگہ دیجائے "ساھی" اصولی حیثیت سے صحیح ہو لیکن سہ ماہی کے ہوتے ہوئے اس کا استعمال ایک غیر ضروری اجتہاد تھا -

لیکن صورت یہ پیش آئی کہ ہندستانی اکیڈیمی کے اُردو اور ہندی کے رسالوں کے لیے ایک ایسے نام کی تلاش ہوئی جو دونوں کے لیے یکساں کام دے سکے اور جس طرح ہندستانی اکیڈیمی کا اطلاق اُردو اور ہندی دونوں شعبوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے اسی طرح خیال ہوا کہ رسالوں کا نام بھی ایسا ہونا چاہیے جس سے لفظی تفریق میں کمی ہو اور ہندی اور اُردو میں جو خلیج حائل ہے بڑھنے نہ پائے اس خیال کے زیر اثر اردو اور ہندی ایڈیٹوریل بورڈوں نے ساھی کے لفظ

کو رسالہ کے سر ورق کے لیے قبول کر لیا ان تمام حالات کے بعد ہم نہیں سمجھتے کہ "تماشی" کے متعلق کسی منصف مزاج شخص کو اعتراض کی گنجائش باقی رہ سکے -

---

ہندستانی

ہندستانی اکیڈیمی کا سہ ماہی رسالہ

جلد ۱ | اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع | حصہ ۴

کلیات میر حسن دہلوی

(از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی)

مختصر حالات میر صاحب

اُردو میں شاعر ہزاروں، استاد سیکڑوں گذرے - مگر یہ فخر سوائے میر حسن کے کسی کو حاصل نہوا کہ شاعری اُن کے خاندان میں سات پشت تک جاری رہی - اور اُردو پر کیا منحصر ہے شاید ہی کسی زبان میں اس کی مثال ملے - ساتویں پشت میں میر نفیس صاحب تھے - اُنھی پر یہ سلسلہ ختم ہوا - موصوف سے مجھکو بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا - یہ واقعہ ادب کے لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس ملاقات کے محرک خواجہ عزیزالدین عزیز لکھنوی تھے - واسطۂ تعارف میر محمد علی عارف - رفیق ملاقات علامہ شبلی -

میر حسن کے پر دادا میر امامی خراسان کے مشہور مردم خیز شہر ہرات سے دلی میں آکر آباد ہوئے تھے - میر حسن کی شہادت ہے کہ بڑے فاضل اور ہفت قلم خطاط تھے - کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے - والد میر غلام حسین ضاحک تھے - عالم، فاضل، ناثر - موسیقی میں ماہر - فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے -

غزل کی سہیلی ہزل تھی - زبان وہ جو بقول میر حسن از آدم تا ایندم نہ کسی نے بولی نہ لکھی - غزل چالیس پچاس شعر سے کم نہ ہوتی تھی - منتخب کلام کا نمونہ :—

دردبس اگر روز اجل آہ نہ ہوتا
قصہ تھا محبت کا نہ کوتاہ نہ ہوتا
اُس آن بہے آنسو جس آن کہ جی ڈوبا
سب جان سے ہم اٹھے جب دیدۂ نم بیٹھے

میر حسن کا نام غلام حسن تھا - پرانی دلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے - فارسی کی تعلیم پائی - شروع سے شاعری کی طرف خاص میلان تھا - دلی میں خواجہ میر دردؔ کی صحبت میں رہے - اودھ میں میر ضیاؔء کے شاگرد ہوئے - خود لکھتے ہیں کہ میر ضیاؔء کی طرز مجھسے نبھ نہ سکی اِس لیے دردؔ - سوداؔ - اور میرؔ کی پیروی کی - آگے چل کر اِن دونوں استادوں کے طرز کلام جدا جدا دکھائے جائینگے -

آغاز شباب میں اپنے والد کے ساتھ دہلی سے فیض آباد آئے - فیض آباد سے اُٹھ کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی - نواب سالار جنگ کی سرکار میں تعلق تھا - اُن کے فرزند مرزا نوازش علی خاں سردار جنگ کی صحبت میں رہتے تھے - ایک جگہ لکھتے ہیں - "دلی کے چھوٹنے کا داغ دل پر آخر تک رہا -" ایک جگہ کہا ہے :—

ہماری دلی کا یہ دل آزار تحفہ ہے
یہ تحفہ اُس کو ملا اِس دیار کا پہنچا

دوسری جگہ زیادہ دلگداز پیرائے میں فرماتے ہیں —

دلی سے بارہ آئی تھی یہ میر کی غزل
جس کا یہ شعر ہوش سے بیہوش کر گیا
یہ چہرہ دیکھ ہنس کے رخ زرد زرد مرے
کہتا ہے مہرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر گیا

دي حصه مهينے كى آخرى تاريخوں ميں بيمار هوئے - محرم کے عشرے میں وفات پائی - سنه ۱۲۰۱ هجري تها - مصحفي نے تاريخ كهي —

چوں حسن آں بلبل شیریں زباں
زو ارم گلزار رنگ و بو نتافت
بس که شیرین بود نطقش مصحفی
شاعر شیرین زباں تاریخ یافت
۱۲۰۱

تذكرهٔ گلشن هند میں وفات سنه ۱۲۰۵ هجری میں لکھي هے - جو ظاهر هے كه صحيح نهيں - بقول آزاد عمر پچاس (۵۰) برس سے زیادہ پائی - تذکرهٔ مصحفی میں عمر ساٹھه سال کي لکھي هے (اِس اطلاع کے لیے میں مولوی عبدالحق صاحب سکریٹري انجمن ترقي اردو کا ممنون هوں) حلیه یه تها - داڑهي منڈی هوئی - رنگ بهورا - قد اچها بڑا - (میر نفیس مرحوم تک یه قد قائم تها) -

لباس — سر پر پگڑی - بڑا سا جبه -

اخلاق — ظريف - خوش طبع - شيريں مزاج - مهذب - بیهوده اور معیوب کلام زبان سے نه نکالتے تھے - (افسوس هے که کلام کے دو ایک حصے سخت فحش هیں) - نه برا کہا نه برا سنا -

أولاد میں چار فرزند - اُن میں سے میر محسن - خلیق - خلق شاعر - دو خلیق اور خلق صاحب دیوان - اِن سب کا انداز کلام والد کے کلام سے ملتا هوا تھا -

تذکرهٔ آب حیات میں آزاد لکھتے هیں " دیوان اب نهیں ملتا . .. کلام .زمانه بدل گیا اور بدلتا جاتا هے -

وہ وقت تو گیا پھر یہ وقت بھی نہ پائینگے - آج یہ نوبت ہے
کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو اِس کتاب میں درج کرتا -
اسی سلسلے میں میر آزاد نے تذکرۂ گلزار ابراہیمی سے میر حسن کے
خط سے اصل عبارت نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ہرقسم
کا کلام آٹھ ہزار شعر تھا - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلام اُس وقت
تک مدون ہو چکا تھا - خمخانۂ جاوید سے واضح ہے کہ محسن اردو
لالہ سری رام کے کتابخانہ میں دیوان حسن کا ایک صحیح نسخہ موجود
تھا - میری خوش قسمتی کہ کلیات حسن کا نادر نسخہ لکھنؤ سے مجھکو بھی
مل گیا - حبیب گنج کے مختصر سے کتاب خانہ میں اس کا نمبر ۵۱۵/۶۲ ہے -
تقطیع بڑی ہے - ۱۲ × ۸½ انچ - سطر فی صفحہ متن میں کہیں ۱۵
اور کہیں ۱۷ - حاشیہ پر فی صفحہ ۱۴ سطر - حجم چار سو صفحے -
کاغذ باریک کشمیری - جدول سرخ ، نمبر ، طلائی ، لاجوردی - پہلا صفحہ
ندارد - دوسرا صفحہ زرافشاں مطلا - گلدار طلائی و رنگ آمیز - خط جلی
نستعلیق صاف - آخر سے ناقص سنہ ۱۲۵۶ ہجری کا لکھا ہوا - بڑی خوبی
یہ کہ اکثر صحیح ہے - غلطیاں کم ہیں - تقریباً سات ہزار اشعار ہیں -
اس میں سے غزل کے اشعار چار ہزار کے قریب ہیں - باقی دیگر اقسام -
کاتب نے ترتیب یہ رکھی ہے کہ متن میں غزلیات ہیں - غزلیات کے بعد
فردیات (۴۱) فردیات کے بعد رباعیات (۱۵۴) رباعیات کے بعد تضمین (۳)
مخمسات (۱۴) آخر کا مخمس سخت فحش ہے - مسدس ایک -
یہ بھی بہت فحش ، اور عظیم کی ہجو میں ہے - حافظ کی مشہور
غزل ، دل می رود زدستم صاحبدلاں خدارا ، کو تضمین کیا ہے - مسدس
کے بعد واسوخت ہے - عام واسوختوں کے خلاف یہ مخمس ہے - بند کا
ہر شعر فارسی ہے مختلف شعرا کا - واسوخت کے بعد مثلثات (۳۱۰) ناتمام
مثلثات پر نسخہ تمام ہو جاتا ہے - حاشیہ پر سات قصیدے ہیں - گیارہ

چھوتي بڑی مثنویاں - تذکروں سے معلوم ھوتا ھے کہ میر حسن فارسي میں بھي شعر کہتے تھے - ایک شعر اس نسخہ میں بھي ھے —

اگر از دشمنانم تیغ برکش دفع دشمن کن
وگر از دوستانم چارۂ درد دل من کن

تبصرۂ کلام

کلیات کے بعد تذکرۂ میر حسن کے دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ میرحسن کو اساتذۂ فارسي کے کلام پر پورا عبور تھا - اساتذہ کي طرز کو خوب پہچانتے تھے - اس مناسبت کا جلوہ اُن کے کلام میں صاف عیاں ھے - میر آزاد نے آب حیات میں میر صاحب کو شعرا کے چوتھے دور میں شمار کیا ھے - معاصر جرأت - انشاء وغیرہ ھیں مگر میرحسن زمانۂ وفات کے لحاظ سے اُن سے مقدم تھے -

جرأت کي وفات سنہ ۱۲۲۵ ھجري میں ھے - انشاء کي سنہ ۱۲۳۳ ھ میں - یہ واقعہ ھے کہ جن شعراء اردو کو فارسي کلام پر عبور رھا ؟ اُن کا کلام بلند پایہ سحر حاصل تھا - جب اُردو شعراء نے اُردو کلام کو سامنے رکھا کلام اُس پائے سے گرگیا - بوالھوسي کے مضامین نے پست تر کردیا - سن چکے ھو کہ میرحسن نے ابتداء عمر میں خواجہ میر درد کي صحبت کا فیض پایا تھا - اسي فیض کا اثر تھا کہ تصوف کا رنگ اُن کے کلام میں برابر نمایاں رھا - نمونے آگے آتے ھیں - کلام کا عام انداز وہ ھے جس کو میر تقي میر اور خود میر حسن ؟ ادائیہ ؟ کہتے ھیں - سوز و درد کے ساتھ حسن و عشق کی داستان گویا آپ بیتی بیان کرتے ھیں - مبالغوں سے بچتے ھیں - بال کی کھال نہیں نکالتے - پیچ در پیچ استعاروں یا دور از حال تخیل کا پتہ نہیں - اسي لئے اکثر کلام دلنشین اور دلگداز ھے - پڑھنے والا پہلی نگاہ میں متاثر ھوتا ھے - بار بار پڑھنے اور غور کرنے پر لفظ و معني کي دلاویزی قائم

بلکہ برقی بذیر رهتی هے - محض الفاظ کا طلسم یا محاوروں کی نمایش نہیں - اگرچہ مسی اور بالی کے مضمون جا بجا آئے جاتے هیں تاهم حسن و هوس کے عامیانہ مضامین سے بہت کچھہ بچے هیں - کلام صاف هے - تعقید بہت کم هے - ابہام کے پاس نہیں - جو غزلیں بطرز ایہام لکھی هیں اُن سے بیزاری کا اِظہار کیا هے - معلوم هوتا هے فرمائش سے مجبور هوگئے تھے - لفظی رعایتوں سے بھی عام طور پر دامن بچاتا هے - کہیں باندهہ گئے هیں - تو اِسطرح —

(۱) بھلی هے مجلس دنیا میں سچ پوچھو تو بیہوشی
کہ متوالا وہ هی اس بزم میں هے جو کہ مت والا

(۲) کھلے بندوں نہ پھر تو اس ادا سے
نہیں هوجائینگے سب رہ کے ذر بند

(۳) جھڑے هیں پلکوں سے موتی دختر رز کی تاک میں
یہ هوا یہ موسم اور یہ ابرنیساں دیکھکر

دور چہارم کے متروک الفاظ - تک - جاگہ - بت - ایدهر اودهر - کیدهر - سو - زور کب تئیں (کب تک کی جگہ) - آنکھہ مندنا - آنکھہ موبجنا - لوهو - اُس پاس (اُسکے پاس کی جگہ) - تھوڑ (جگہ) - بے وسواس (بےتامل) مییں نالا (میں نے ڈالا) بسبہ (باوجود اس کے) اگم ناتی (بہت ناتی) میاں وغیرہ وغیرہ اُن کے یہاں بھی هیں - معلوم هوتا هے کہ دیوان کی آخر کی ردیفیں آخر میں مرتب کی تھیں - اسی لئے ردیف یا وغیرہ میں مذکورۂ بالا متروک الفاظ کم بلکہ بہت کم آئے هیں اور زبان زیادہ صاف اور سلیس هے - اس پر خصوصاً میر آزاد کا یہ مقولہ صادق آتا هے -

" اِن کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول هیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی هوئی هے -

میر سوز کا انداز بہت ملتا ہے۔" فارسی ترکیبیں جا بجا دلکش پیرائے میں آ جاتی ہیں۔ مثلاً کم نما - کم نگاہیاں - پیش عشرت - خزاں رسیدہ - بوقلموں جلوہ - عمل دوفنون - آرے و نعم - خوش دماغی - خوش نگاہ - واسد (عقدۂ دل کی) - طرف غزالاں (مقابل غزالاں) - کہیں کہیں (بطور انساد) کوئی عربی جملہ بھی بندھ گیا ہے - '' بمرا ھی جگر بھا نہ حسن احرکم اللہ " جیسا کہ خود میر حسن نے لکھا ہے اُن سے اُن کے استاد میر ضیا کی طرز تو نہ بندھ سکی تاہم بعض غزلیں اُن کے طرز میں ہیں - اکثر کلام میر درد - میرزا سودا اور میر تقی کے انداز پر ہے - میر درد کے انداز میں جو غزلیں ہیں اُن کے اشعار کی تعداد بھی پانچ ، سات ہے - سودا کی طرح میں زیادہ آمد ہے - ایک ایک غزل سترہ سترہ شعر کی ہے - اس پر بھی قلم کا حوصلہ نہ نکلا تو دو غزلہ سہ غزلہ جو غزلہ ہے - نمونہ کلام ملاحظہ ہو —

غزلیات میں اول غزل توحید میں ہے - دوسری غزل نعت میں - تیسری غزل نعت و منقبت میں —

نمونۂ حمد -

(حمد) مرضی ہو جہاں اُس کی وھی جا ھمیں بہتر

مشتاق دل اپنا نہیں کچھ باغ جناں کا

(نعت) ہے خاصہ و خلاصۂ کونین اُس کی ذات

اُس کے لیے ظہور ہے سب کائنات کا

(منقبت) سیراب مجھکو کیجیو محشر میں یا علی

امیدوار رہتا ہوں کوثر کے جام کا

تصوف -

یہ جو کچھ قیل و قال ہے اپنا
وہم ہے اور خیال ہے اپنا

مرا ہے استقامت میں مثال شمع مر جانا
جہاں ثابت قدم رکھنا وہاں سر سے گزر جانا

ایک مجلس کے ہیں حسن و عشق اس میں عیب کیا
شمع گر تجھکو کیا تو مجھکو دیوانہ کیا

طرفہ تر ہے کہ اپناہي بجانا اور سوجھي
اپنا اپنا کہہ کے مجھکو سب سے بیگانہ کیا

جانا تھا اُس کے کھوج میں میں بے خبر چلا
یارے اُسي نے لوٹ کے پوچھا کدھر چلا

کسي رنگ میں تو تجھے لینگے ہم
تو کب تک بھلا ہم سے پنہاں رہے گا

ہر ایک بدایت کی نہایت ہے ولیکن
اس عشق کے آغاز کا انجام نہ پایا

آساں نہ سمجھیو تم نخوت سے پاک ہونا
اک عمر کھوکے ہم نے سیکھا ہے خاک ہونا

مجھے ہے شعر میں کام اپنے معشوق حقیقی سے
نہ سمجھو اور کچھہ اس گفتگو سے مدعا میرا

گر ہو حسن ، نہیں ، تو تیرے بھلے کو ورنہ
بخشش ہے اُس غني کی مذکور کیا نہیں کا

شاہ ہوے غلام کا بندہ
کون پوچھے ہے عاشقي میں ذات

توهي تو بولے هے پردے میں نہیں غیر کوئي
یار پہچانتے هیں یار کي آواز کي طرح

مجھے تو دید تھی منظور اے خدا تیری
نہ آیا تھا یہاں کچھہ میں در و دیوار کي خاطر

سرشتہ جس کے هاتھہ لگا عشق کا اُسے
تسلیم سے نہ شوق نہ رفتار سے غرض

محشر کے حرف خوف کو بھولے هے سر بسر
آتا هے یاد جس کو مزہ کا تیرے لفظ

حرف دوئي لکھوں میں کہاں اب کہ سربسر
هر لوح دلپہ ثبت هے وحدت کا تیرے لفظ

جس طرح سے شرر کے لیے سنگ هے وسیع
جلوہ کو تیرے میرا دل تنگ هے وسیع

پانی کي طرح پایا هے هر رنگ میں تجھے
یک رنگ سمجھتا کون بہر رنگ هے وسیع

دوري میں زمزمے کے هے میرے جہاں تمام
از بسکہ میرا دامن آهنگ هے وسیع

هم بھی تب تک هیں یہاں جلوہ هے جب تک اُسکا
هستي سایہ بھي سچ پوچھو تو هے نور تلک

میں بھي ایک معني پیچیدہ عجب تھا کہ حسن
گفتگو میري نہ پہونچي کبھي تقریر تلک

آتا هے کیا نظر اُسے شعلہ میں شمع کے
دیتا هے جان بوجھہ کے کیوں اپنا جي پتنگ

زندگی کا فلسفہ

سنتا ہے حسن نیکی ہی رہ جاتی ہے آخر
رہتا ہے نہ ایران نہ توران کسی کا

دھمکائے سے رقیبوں کے ڈرے ہیں کوئی ہم
ہمت جو ہو تو ایک کے آگے ہزار کیا

طول امل جہاں کا حسن حد سے ہے زیاد
اک اک اس کی راہ کا فرسنگ ہے وسیع

جب تلک زر ہے تو سب کوئی ہے پھر کوئی نہیں
سچ ہے مکھی بھی رہے ہے شکر و شہد تلک

ایک ہندو دوست کو کس محبت سے یاد کرتے ہیں —

یکجہتی ہو نصیب کہ تھا اُس کو سب سے اُنس
لالہ سروپ سنگھ بھی تھا زور یار پاس

صدمہ تھا ہجر کا کہ یہ تھا کیا غضب حسن
یوں دل جگر کو جس نے کیا میرے پاس پاش

آئی بھی رات روتی ہوئی شمع بزم میں
حال اُس کا پوچھ پوچھ صبا جان کھا گئی

جب اُس کی زلف سے نہ پھرا اور اس طرف
غم کی گھٹا تمام مرے دل پہ چھا گئی

تیر نگہ تو قہر غضب ہے کہ لاکھ میں
جس دل سے لاگ بھی اُسے پہچان لیگئی

دل دن کو چھین لے گئی مکھڑے کی یاد اور
راتوں کو نیند زلف پریشان لے گئی

نہ مینا ہے نہ مے ہے سب نہ اے ساقي تکلف ہے
اُسی کي ذات ساقي ایک اور ساقي تکلف ہے
معشوق کا مشتاق بسر کون نہیں ہے

مارا ہے محبّوں کی محبت کے ستم نے
اگر جاؤں تو یہاں سے یا علي کہتا ہوا جاؤں
محبت میں علي کے تو اُٹھانا اے خدا میرے

رباعیات

ظاہر بھي توھي ہے اور یہاں بھي تو ہے
معنی بھي توھي ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھہ سوا کوئي نہیں
یہاں بھی توھي ہے اور وہاں بھی تو ہے

کیا وحش و طیور و انس و جان عالم میں
جو ہیں سو حسن وہ روتے ہیں اس غم میں
روشن نہ سمجھہ ضریح پر قندیلیں
جلتے ہیں یہ دل حسن کے ماتم میں

دنیا کي نہ فکر میں نہ دین کے غم میں
شادي میں نہیں کسی کي نہ ماتم میں
کیا تجھکو سنائیں اپنا احوال حسن
رہتے ہیں سدا ہم اور ھي عالم میں

خط آویگا یا آپ وہ یار آجاوے
یا اُس کي خبرھي ایک بار آجاوے

اس سے بھي نہيں کام مجھے کچھ ليکن
اس دل کو کسی طرح قرار آجاوے

ايک عمر کے بعد کل جو پايا دل کو
جي جاکے چھاتي سے لگايا دل کو
افسانۂ غم اپنا سنايا دل کو
کچھ روئے آپ کچھ رولايا دل کو

دل ہجر ميں کس طرح بہل جاويگا
يہ بات غلط ہے کہ سنبھل جاويگا
گر يوں ہي قلق رہا کوئي دن تو حسن
گھبرا گھبرا کے جي نکل جاويگا

مثلثات

يہ نئي ہے مجھہ پر آفت يہ نيا ہے داغ دوري
شب از فراق منعم مکن از فغاں صبوری
چہ کنم دلے ندارم کہ فراق ديدہ باشد

مثال بلبل تصوير سب رہے بے خود
خزاں رسيد و کسے آشنائے غير نشد
بہار ہم چو غريباں دريں ديار گذشت

مرنے کے بعد بھي نہ گئي مري بات پيش
بر خاک رہ چو ديد سرم زير پائے خويش
پا بر سرم نہاد و نظر باز پس نکرد

گر عاشق صادق ہے تو کر سجدۂ یزداں
صبحے عجبی سر زد ازاں چاک گریباں
بیدار شو اے گوشہ نشیں وقت نماز است

قصہ کو اپنے میں نے بہت کردیا ہے کم
با آنکہ درد دل بتو بسیار گفتہ ام
نشنیدۂ ہنوز ز بسیار اند کے

دامن جھٹک کر مجھسے وہ جاتا رہا سرو سہی
اے آنکہ بندم می دھی خاموش کیں دست تہی
کز دامنش کوتاہ شد سوے گریباں می رود

ڈھونڈ مارا دیر و کعبہ جہان مارا دشت و باغ
خویش را ہر چند میجویم نمی یابم سراغ
آرزوے دل نمیدانم کجا دارد مرا

ہزار عقدے ہیں درپیش ایک ہو تو کہوں
زمانہ دشمن و من بے زباں و تنگ زبوں
تو رحم گر نکنی کار مشکل افتاد است

نظر آیا تیرے جلوہ کا جب رنگ
دو عالم را بیک بار از دل تنگ
بروں کردم تا جائے تو باشد

آنے کی پھر امید یہاں اب نہیں رہی
منعم مکن ز گریۂ بسیار سنتی
کز کوئے او بحسرت بسیار می روم

جو کوسنے میں تیرے ہو شغل تو اور بھلا
نظیری از تو بجاں کندن است لب بکشا
باندعدر کہ بگوئی بمسر خورسند است

زمزمہ ہونٹوںمیں آنکھوں میں نشہ دل میں ترنگ
در بغل شیشۂ و در دست قدح در برچنگ
چشم بددور، کہ بسیار بسار آمدۂ

(ترکیب تضمین ایجاد میرحسن)

مطلع پر دو مصرعے لگائے ہیں - پھر حُسن مطلع - بعد الغزل پر بدستور ایک مصرعہ -

نمونہ

تضمین بر غزل صائب -

کل کے عالم نے تو کچھ منھ میں نہیں چھوڑی تاب
باقی اب کیا ہے کہ حسن کے لئے اے خانہ خراب
دلربایانہ دگر بر سر بار آمدۂ
از دل ما چہ تمنا ماند کہ بار آمدۂ

حسن مطلع -

اس نزاکت کو تھکایا ہے کہیں اے بد مست
از عرق زلف تو چوں رشتۂ گوہر شدہ است
ہمہ جا گر چہ نہ سکدن و نثار آمدۂ

ھاہ ورد -

زمزمہ ہونٹوں میں آنکھوں میں نشہ دل میں ترنگ
در بغل شیشہ و در دست قدح در بر چنگ
چشم بددور کہ بسیار بسار آمدۂ

بیت الغزل -

اس گھڑي آپ کو بھی غیر سمجھتا ھوں صنم

آمدر باس که من ار سر جاں بر خیزم

چوں بغم خانۂ من بندہ نوار آمدۂ

ایضاً -

خرقۂ زھد کو دے شوق سے تو رنگ میں ڈوب

مي بدہ می بستاں دست بزن پائے بکوب

در خرابات بہ ار بھر بسار آمدۂ

ایضاً -

تو بو مت بیٹھہ خنک بعري تو ھے صورت گرم

بگذر ار بار بروں آئے ر بعراھی شرم

که عجب بنگ در آغوش بعار آمدۂ

ٹھہر جا آکے میرے سایۂ مژگاں میں ذرا

چوں نفس سوختگاں مدرسي اے باد صبا

میتواں یافت کزاں زلف دراز آمدۂ

قصاید

متن کی تفصیل آپ سن چکے ھیں - حاسیہ پر سات قصیدے ھیں - پہلا قصیدہ مسمی بہ لمعۂ نور منقبت میں ھے حضرت علي کرم اللہ وجہ کی - کاروان مہتاب - آسمان مہتاب قافیہ و ردیف ھے - ایک ورق گم ھونے کي وجہ سے شروع سے ناقص ھے - دوسرا قصیدہ حضرت امام حسن کي منقبت میں ھے - نگارپا ' بہارپا ' قافیہ و ردیف ھے - تیسرا قصیدہ نواب آصف‌الدولہ کی مدح میں ھے - بوستان سخن و نکتہ دان سخن ردیف و قافیہ ھے - چوتھا نواب سالار جنگ کي مدح میں - شبگیر ' اکسیر قافیہ ھے ردیف نہیں - پانچواں قصیدہ نواب آصف‌الدولہ کي مدح میں ہے ردیف مقیم و نسیم قافیہ - چھٹا قصیدہ جواھر علیخاں کي مدح میں ھے - ھلال ' کمال قافیہ ہے ردیف - ساتواں

نواب آدم علیخاں کي مدح میں تنگ' رنگ قافیہ ردیف ندارد ۔

قصیدوں میں وہ زور کلام اور شکوہ الفاظ تو نہیں جو سودا اور ذوق کے یہاں ہے تاہم آمد ہے ۔ کلام صاف ہے ۔ غزلوں کے مقابلے میں متروک الفاظ قصیدوں میں کم ہیں ۔ مضمون بھي پیدا کرتے ہیں ۔ پہلے قصیدے کي تشبیب کا شعر ہے :—

اندازِ کلام

شکن سے زلف کے عارض نمود ہے ہر جا
ہیں ایک شب میں کئی بھر عاشقاں مہتاب

نواب آصف الدولہ کی مدح میں :—

ذکر سن سن تری سخاوت کا ہے صدف گوش سامعان سخن

قصیدہ مدح سالار جنگ کي تشبیب میں —

کھنچا ہے حُسن کا اس کے ورق ورق نہ خیال
یہ دل ہے میرا کہ یا رب مُرقّعِ تصویر

مدح ۔

غرضکہ دیکھ کے ہاتھی نہ اُس کو کہتي ہے خلق
کہ جلوہ گر ہے یہ ابر سیہ میں ماہ منیر

ہاتھي کي تعریف —

ہے اُس کے ماتھے نہ اس طرح جلوہ گر آئینہ
کہ جیسے عکس مہ تو پڑے بچشمۂ قیر

گریز کا نمونہ ۔ بہاریہ تشبیب کے بعد —

گلشن ہستي میں اس طرح چمن عیش آباد
کس کی خاطر سے ہوا ہے یہ خداوند علیم
شاید اس باغ میں ہے آصف دوراں کا گزر
کہ وہ ہے ابن کریم ابن کریم ابن کریم

آصف الدولہ بہادر ہے وزیر اعظم

نائب ظل خدا صاحب تاج و دیہیم

حضرت امام حسن کی منقبت کے قصیدہ میں دعائیہ مضمون ایسا ہاتھہ آیا ہے کہ مدح حسن کا حصہ ہو گا —

از بس حسن اول سے علامِ حسن ہے تو

سر سبز رہ جہاں میں مرادیں ہزار پا

اور بعد اپنی عمر طبیعی کے ہند سے

جا جنۃالبقیع میں کنج مزار پا

مثنویاں گیارہ ہیں - اول سحرالبیان - معروف بہ بدرمنیر - | مثنویاں

اس مثنوی کی بابت اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اب کچھہ لکھنا عبث ہے - بقول پروفیسر آزاد بے نظیر اور بدرمنیر کا قصہ بے نظیر لکھا اس کی صفائی بیان اور لطف محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا اور ادا کی نزاکت اور جواب و سوال نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے -

دوسری مثنوی رموزالعارفین ہے - یہ مثنوی مولانائے روم کی بحر میں اور اُسی کے طرز میں تصوف میں ہے - جابجا مثنوی شریف کے اشعار تضمین کیے ہیں - بزرگان دین کی حکایتیں بیان کر کے نکات حقیقت سمجھائے ہیں - سنہ ١١٨٨ ھجری میں وفات سے پورے چودہ برس پہلے زاد آخرت اور کفارۂ سیئات سمجھہ کر نظم کی ہے - چنانچہ دیباچہ میں لکھا ہے —

شاعری میں عمر کھوئی میں تمام

میں نے عقبیٰ کا کیا ہرگز نہ کام

اپنی اس بیہودگی سے ہوں خجل

شعر کہنے سے بھرا ہے میرا دل

جي ميں هے وہ جو هوئے هيں نيک نام
کچھ لکھوں میں اُن بزرگوں کا کلام
جس کے سننے سے هو عقبیٰ کا حصول
کوئی دم میں جاؤں اس دنیا کو بھول

گرچہ هیں یہ درد کی باتیں لکھیں
پر بسر دنگی خوشی کا بہ کہیں
در پس هر گریه آخر خنده ایست
مرد آخر بیں مبارک بنده ایست
عارفوں کے بس کہ هیں رمزیں لکھیں
نام اس کا هے رموزالعارفین
جب بھرا دُر معانی سے یہ طشت
هے هزار و یک صد و هشتاد و هشت
۱۱۸۸

حمد و نعت کے بعد چار یار و پنجتن کی منقبت هے -
پھر وجہ تالیف - اس کے بعد شروع داستان کے عنوان سے آغاز کلام -
اس عنوان کا پہلا شعر یہ هے ---
بشنوید اے دوستان ایں داستاں
خود حقیقت نقد حال ماست آں
تیسري مثنوي جواهر علي خان کے قصر جواهر کی تعریف میں
هے - اس میں مکان کے مختلف قطعات کا باغ کا فوج کا ذکر
هے - ممدوح کي ثنا و صفت -
چوتھي مثنوی نواب آصف الدوله بہادر کی شادي کی صفت میں
هے - نواب شجاع الدوله کے عہد میں لکھی گئي - علاوہ روشني وغیرہ

برات کے لوازم کے ذکر کے نواب شجاع الدولہ کی مدح ہے -

پانچویں مثنوی '' ہجو حویلی میر حسن '' ہے - مکان کے ہر حصے کو دل کھولکر برا کہا ہے - اس مثنوی کی زبان اور طرز میر تقی میر کی مثنویوں سے ملتی جلتی ہے -

چھٹی مثنوی نواب آصف الدولہ کے باورچی خانہ کی تعریف میں ہے - مسمی بہ '' خوان نعمت '' دسترخوان کی مدح میں لکھتے ہیں :—

نہ تھا گوشہ کوئی لذت سے خالی

برنگ پر نعمت خان عالی

کھانوں کی تمام تعریف کی ہے جس سے اُس عہد کے کھانوں کے نام و اقسام معلوم ہوتے ہیں -

معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوست کو بطور نامہ منظوم یہ مثنوی بھیجی ہے اس لیے کہ جا بجا اُس کو دسترخوان کی نعمتوں کے محظوظ ہونے کی ترغیب دیتے جاتے ہیں -

ساتویں مثنوی قصر آصف کی تعریف میں ہے - اُس کا تاریخی نام گلزار ارم ؟ ہے گلزار کا املا دال سے لکھتنا ہے -

اس میں ؟ ہندوستان؟ سے نکل کر پورب جانے کا حال ہے - دلی سے چل کر کئی مہینے ڈیگ میں (ریاست بھرت پور) رہے ہیں - وہاں سے مدار صاحب کے چھڑیوں کے ساتھ مکن پور آئے ہیں - اس سلسلے میں چھڑیوں کا اُن کے رسوم کا میلے کا ذکر تفصیل سے ہے - حسن و عشق کے چرچے برابر ہوتے جاتے ہیں - مکن پور سے لکھنؤ آئے ہیں - اور اس کی دل کھول کر ہجو کرتے ہیں - نواب آصف الدولہ اور اُن کی عمارت کی البتہ تعریف کی ہے —

رھے ست آصف‌الدولہ سلامت
کہ حس نے کي یہاں طرح اقامت
عمارت کي بہاں وہ اس نے بنداد
کہ نطارہ سے حس کے ھو جہاں شاد
رھے قائم سدا یا رب یہ سردار
کہ بنگلہ لکھنؤ ھے حس سے گلزار

ایک جگہ عمارت کے بیان میں کہا ھے :—

نمونوں میں یہ ھے ھندوستان کے
ورق ھے یہ مرقع کا وہاں کے

لکھنؤ سے گھبرا کر فیض‌آباد آئے ھیں - شہر مذکور کي تعریف میں قلم توڑ دیے ھیں - قضارا پھر لکھنؤ پہنچ گئے -

نہ تھي معلوم مجھکو یہ جدائی
قضا پھر لکھنؤ میں مجھکو لائی
برا دن سر سے قسمت نے نہ ٹالا
مجھے جنت سے جوں آدم نکالا

فیض‌آباد دوبارہ جانے کی حسرت ھے اور دعا - اسی پر ختم کلام ھے - دلي کے چھوٹنے کا صدمہ دل پر برابر تھا - کہتے ھیں :—

اگرچہ اب تو وہ صحبت کہاں ھے
پہ‌ں گو زخم پر اُس کا نشاں ھے
کرے ھے ذکر دلی کا کوئی جب
مری آنکھوں سے گرتا ھے لہو تب

شروع میں اپنے دو رفیقوں نوراللہ اور سیف‌اللہ کا ذکر کیا ھے - یہ مثنوی مجدن لاھور نے مثنوی شعرالبیان کے ساتھہ چھاپ کر شائع کر دی ھے -

آٹھویں مثنوی جواہر علی خاں کی مدح اور تہنیت عید میں ہے اسی لیے اُس کا نام "عید کی تہنیت" رکھا ہے

کہ ہے عید کی تہنیت اس کا نام -

نویں، دسویں، گیارھویں، مثنویاں چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں - نویں اور گیارھویں مخمس ہے - دسویں مذاقیہ -

یہ مقالہ ہندستانی اکیڈیمی کی دوسری ادبی کانفرنس منعقدہ ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں پڑھا گیا تھا - اس میں میر حسن کی غزلوں کا انتخاب بھی شامل ہے، غزلیں چونکہ مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں اس لیے اس مضمون سے بخوف طوالت اِس انتخاب کو حذف کر دیا گیا - (مرتب)

شاہ بیگم

[جے پور کی راج کماری - جہانگیر کی پہلی بی بی - خسرو کی ماں -]

(از مولوی سید مقبول احمد صمدانی صاحب "حیات جلیل")

غوغائے عشق و شور جنوں ماورائے عقل

افسانہ تو قصہ ہو داستان بس

عصر جہانگیری کے تمام مورخ اِس بارے میں متفق ہیں کہ جہانگیر کی پہلی شادی پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہوئی اور بڑے اہتمام اور تُزک و احتشام کے ساتھ رچائی گئی تھی - حقیقتاً مصنفین کے بیان میں بھی کچھ فرق نہیں کرتے - جو کچھ فرق ہے وہ طرز ادا سخن طرازی اور انشا پردازی کا پایا جاتا ہے - ہر اہل قلم اپنے معاصر یا متقدم سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا اور ایک نقش رنگین آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتا ہے -

سردع الملک معتمد خاں ترک کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اُنتیسویں سال جلوس اکبری میں شاہزادہ کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو ۹۹۳ ہجری (۱۵۸۵ع) میں راجہ بھگوان داس کی بیٹی (مان سنگھ کی بہن) سے اس کی خواستگاری و نسبت کی گئی - راجہ نے بھی اس موقع پر بیاہ و تہنیت کے تمام لوازم ختم کر ڈالے اور اس قرابت و شادی کو اپنے اقبال و اجلال کے اعزاز و افتخار کا وسیلہ سمجھا - تمام شاہزادوں اور بیگمات اور امرا و سرداران شاہی اور ملازمان خدمت کو ان کے شایان شان سامان ضیافت بھیجا - شاگرد پیشہ اور احدیوں (باڈی گارڈ) کو نام بنام سرادیا

(خلعت) پہنچے - اس تقریب کی عظمت و جلالت اور مورخ کی تحریر کا انداز شوکت خود اُسی کا مختصر نویس قلم ظاہر کرسکتا ہے -

"صبیۂ قدسیہ راجہ بھگوانداس را کہ از اعاظم امرائے این دولت ابد مقرون بود و در زمرۂ راجہائے نامدار بہ مزید شوکت و اعتبار اختصاص داشت ؟ بجہت آن حضرت خواستگاری نمودند و دولت خانۂ خاص و عام را آئین بستہ حسن بادشاہانہ زینت دادند
حضرت عرش آشیانی بورود مقدم اقبال توام منزل راجہ را پایۂ آسمانی بخشیدند و آن بانوے حجلۂ عصمت و عفت را بگوہر یکتائی خلافت و سلطنت عقد ازدواج خجستہ انعقاد (امتزاج ؟) بستہ بدولت سرائے جاوید آوردند -"

خلاصہ - "راجہ بھگوانداس سلطنت کے بڑے امیروں میں سے تھا۔
نامور راجاؤں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی خصوصیت
اور اُس کا اعتبار اوروں سے زیادہ تھا - راجا کی بیٹی
جہانگیر کے لیے مانگی گئی - دولت خانہ خاص و عام
کی آئینہ بندی کی گئی - بادشاہانہ حسن نمایا کیا -
خود اکبر نے راجہ کے گھر جا کر اُس کی عزت بڑھائی اور
لڑکی کا بیاہ شاہزادہ سے کر کے اپنے یہاں لے آیا -"

اسی شادی کا تذکرہ خافی خان' نظام الملکی' ان الفاظ میں کرتے ہیں -

"بعدہ کہ بانوزدہ سال از سنو و نمائے نہال عمر سوزش در گلشن جاہ و جلال گذشت' صبیۂ راجہ بھگوانداس را کہ از راجہائے نامدار شمار عمدہ گشتہ می شد' برائے شاہزادۂ جوان بخت خواستگاری نمودند - و خرد بدولت و اقبال در حسن طوع بنیان راجہ تشریف ارزانی فرمودہ آن

بانوے حجلۂ عصمت را بعقد در آوردہ بدولت خانۂ آن بموند در آوردند ''

خلاصہ ـ ''شاہزادہ کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو راجہ بھگوانداس
جو ہندستان کے نامی گرامی راجاؤں میں مانا جاتا تھا '
اُس کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ کی منگنی کی گئی ـ خود
بادشاہ سلامت اس شادی کے جشن میں راجہ کے گھر تشریف
لے گئے اور عقد کر کے لڑکی کو اپنے دولت خانہ پر لے آئے ـ''

خافي خان ایک مستند و محتاط مورخ ہیں مگر سال عقد کے بارے میں یا تو اُن کے قلم نے لغزش کی ہے یا شیخ عبدالقادر بدایونی کے خامۂ معجز نگار نے ـ خافي خان کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ اسي سال جلوس اکبري یعنی ۹۹۳ ھ میں شاہزادہ محمد سلیم کا جشن طوے راجہ بھگوانداس کي بیٹي سے (بسلسلۂ جشن نوروز عالم افروز) ہوا تھا کہ کابل سے مرزا محمد حکیم کے مرنے کی خبر پہونچی اور کنور مان سنگھہ پسر راجہ بھگوانداس حکومت کابل پر ممتاز کیا گیا ـ ملائے بدایوني اس جشن کا ۹۹۳ ھ میں ہونا (یعنی سال مذکور کے ذیل میں) بتاتے ہیں ـ مسٹر بیل نے بھی یہی لکھا ہے ـ

سنہ ۹۹۳ ھ کے حالات میں مُلا قاسم ' ہندو شاہ ' فرشتہ کا بیان ہے ـ

''وہم درین سال صبیۂ راجہ بھگوانداس را طوئے وجشن عظیم کردہ بعقد شاہزادہ محمد سلیم در آوردند ـ''

شاہ نواز خان کہتے ہیں کہ سال بست و نہم دختر عفت سرشت راجہ را با شاہزادہ سلیم نموند پیوگانی بستند ـ

یہ راجہ بھگوانداس کچھواھہ ' والی جے پور ' اکبر کا امیرالامرا ' بڑا مقرب و معتمد ' آزمودہ کار سپہ سالار ' اور مدبر و منتظم صوبہ دار تھا ـ بہت سے کارھاے نمایاں کیے اور بارہا شجاعت و بسالت کے جوھر دکھائے

تھے - اُس کی تعریف اِسی قدر کافی ہے کہ راجہ بہارامل کا بڑا بیٹا ، اور مرزا راجہ مان سنگھہ فاتح میواڑ و گورنر کابل و بہار کا نامور باپ تھا - [لالہ سبحان رائے ان دونوں ناموں کو بالترتیب بھگونت داس اور بہاری مل لکھتے ہیں -]

شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس تقریب شاہانہ کی دھوم دھام اور آرائشوں کے حالات کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھہ لکھے ہیں - بدایونی نمبر بہادر شاہی کا بیان ہے کہ اکبر نے مصالح ملکی اور مہام سلطنت کے لحاظ سے سنہ ۹۹۳ ہجری میں تجویز کیا کہ شاہزادۂ ولیعہد (جہانگیر) کا عقد قرابت نامور خاندان کچھواہہ سے کیا جائے - یا یوں کہو کہ (بقول علامۂ شبلی) بعض اہل دار کی روایت ہے ، راجہ بھگوانداس نے اپنی بیٹی دینا ، ار خود ، اپنی مرضی و خوشی سے منظور کیا تھا -

محابا کیوں ہے ! میں ضامن - ادھر دیکھہ
شہیداں نگہ کا خون بہا کیا ! !

جوان دولت ، جوان بخت ، جوان سال شاہزادہ (سلیم) سولہ برس کا تھا - بادشاہ مع تمام امرا اور درباریوں اور خدم و حشم کے راجہ کے گھر گیا - مجلس عقد میں ایک طرف شرفائے اسلام ، مفتی و قاضی رونق افزا تھے ، دوسری طرف ہندو عمائد ، پروہت ، برہمن اور پنڈت جلوہ افروز - پہلے مسلمانوں کے طریقہ پر نکاح ہوا - خطبہ پڑھا گیا - دو کرور ٹنکے (با حسب تحریر مآثرالامرا ، دو کرور روپیہ) کا مہر باندھا گیا - پھر ہندوؤں کی ساری رسمیں انجام دی گئیں - پھیرے پڑے - ہَوَن ہوا - حجلہ‌گاہ عروسی یعنی دلہن کے گھر سے دلہا کے عشرت‌کدہ تک خود بادشاہ سلامت (اکبر) عروسی محافہ (چوڈولہ یا پالکی ، دالکی) پر اشرفیاں نچھاور

کرتا لایا - پالکي کو ایک طرف بادشاہ کندھا دئیے تھا ؛ دوسري جانب شہزادہ - راستہ بھر قیمتي اور پُرتکلف ریشمی کپڑوں کا فرش بچھا تھا - راجہ نے جہیز بھي دل کھول کر دیا - اصطبل کے اصطبل خالی کردئیے - ان میں عراقي بھي تھے ؛ عربی بھی ؛ ترکي بھی ؛ کچھی بھي ؛ کہ اُس زمانہ میں گھوڑوں کی اعلی سے اچھی نسلیں یہی سمجھي جاتی تھیں - سو ہاتھی تھے - اور سیکڑوں لونڈي غلام - ہندوستانی بھي ؛ حبشی بھی ، ختني و چرکس بھي - مرصع و مکلل آلات و زیورات ، سونے چاندي کے ظروف ، طرح طرح کے برتن اور اسباب - غرضکہ سب کچھ دیا اور بہت کچھ دیا - امرائے شاہي اور سرداران ہمراہي کو بھی حسب مرتبہ و حیثیت خلعت اور گھوڑے مع زین و دست زین اور جڑاؤ ساز و سامان کے عطا کیے -

شعرائے دولت نے مبارکبادیں پیش کیں - ابوالفیض فیضی نے قطعۂ تاریخ نذر دیا -

زہے عقد دُر پاس سلطان سلیم
که زیبد دہد سال امید را
ز پروردن آفتاب دراں
قرانے سعد ماہ و ناہید را (سنہ ۹۹۳ ھ)

ابوالفضل نے عرض کیا -

دین و دنیا را مبارکباد ، کین فرخندہ عقد
از برائے انتظام دین و دنیا بستہ اند
در نگارستان دولت نور چشم شاہ را
حجلۂ حور پردھائے دیدہ رنگیں بستہ اند

شیریں زبان و نغز ادا بیان شبلی نے بھی اس تقریب کو تین سو برس بعد یاد کیا ہے - اُن کے دلاویز قطعہ کے بہت سے شعر زبانوں پر رہتے ہیں - (اول و آخر چھوڑ کر)

قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی

کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا دستور تھا

سو خود فرمایدہِ جے پور نے نسبت کی خواہش کی

اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ دبدبہ و افسر تھا

ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہِ اکبر

گئے امیر تک جو تخت گاہ ملک و کشور تھا

اُدھر راجہ کی نورِ دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی

اِدھر شہزادے در چترِ عروسی سایہ گستر تھا

دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے

کہ کوسوں تک زمین پر فرش دیبائے مشجر تھا

دلہن کی پالکی خود اپنے کندھے پر جو لائے تھے

وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

شاہ نواز خان نے مآثرالامرا میں اس تقریب کو تقریباً پوری تفصیل (مندرجہ بالا) کے ساتھ درج کیا ہے مگر جیسا کہ اُن کی اور بعض اور مسلمان مورخین کی روش ہے، اس وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

عرش آستانی بفروغ قدوم، منزل راجہ را روشنی افزود۔ اُو جشن خسروانہ ترتیب دادہ جہار عروس دادیسکس از نظر گزرانیدند۔ کہ تفصیل آن مشمول بر مبالغہ می‌شود۔

آجکل کی دنیا شاید اس کو حکمت عملی یا مصلحت کوشی سے تعبیر کرے یا اکبر کی ہمہ گیر و صلاح اندیش پالسی سے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اکبر کا یا کسی اور بادشاہ کا بیٹے کے سگائی کے لیے، یا شادی بیاہ کے موقع پر، سمدھی کے یہاں جانا آئین شرافت اور دستور قرابت کا پہلا باب تھا، اور اب بھی ایشیائی ممالک کی رسوم و آداب میں اُسی قدر

ضروري و اهم سمجھا جاتا ہے ـ چنانچہ اسي تقریب کے سال بھر بعد، یعني جب جہانگیر سترہ برس کا ہوا، تو سنہ ۹۹۴ھ میں اس سے بھی زیادہ رونق و اہتمام، کوکبۂ و احتشام، جماعت و انبوہ، فرو شکوہ، شوکت و شان اور آن بان کے ساتھ اس کا دوسرا بیاہ کیا گیا ـ اور یہ بیاہ اکبر بلکہ تمام بیگمات و مخدرات حرم سرائے سلطانی، دلہن کے لینے کے لیے، اُس کے گھر گئیں ـ خافی خان لکھتے ہیں ــ

دختر فرخندہ اختر راجہ اودے سنگھہ پسر راجہ مال دیو (مرزبان مارواڑ) کہ در حسب و نسب و دولت موروثي بر همہ راج هاے عالي تبار افتخار داشت، بعقد آن گوهر بحر سلطنت و جهانباني نیز در آوردہ خود بذات شریف و همہ حجلہ نشینان سراچۂ عصمت، رونق افزاے خانہ و کاشانۂ راجہ گردیدند - و بطور رسم و دستور سربر آرایان هند لوازم شادي بتقدیم رسانیدند -

"راجہ مال دیو کا بیٹا راجہ اودے سنگھہ (والی مارواڑ) حسب و نسب اور موروثی دولت میں تمام بلند مرتبہ راجاؤں سے ممتاز و مفتخر تھا - اُس کی لڑکی کے ساتھہ شاہزادہ کا عقد ہوا ـ بذات خود بادشاہ اور تمام بیبیاں اور بیگمیں، راجہ کے یہاں گئیں اور ہندستان کے بادشاہوں کے رسم اور دستور کے مناسب لوازم شادی انجام پائے ـ"

سنائي کی تربت منور رہے، سچ فرمایا ہے ــ

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا

گذشتہ صحبت میں گذارش کر چکا ہوں کہ ان مخلوط و مختلط قرابتوں کے متعلق دوست و دشمن سب یکساں رائے رکھتے ہیں -

رہا باہمی طریق عمل اور سلوک و مودت ۔ اوراق تاریخ شاہد
ہیں کہ حق پسند و منصف مزاج دوست بھی اعتراض و حرف گیری
سے معاف نہیں رکھتے ۔ برملا سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں ۔
مگر اس کا کیا علاج کہ ہر حال میں ایسے ' ایسے سمجھے جاتے
ہیں ۔ ان کے اقوال کی ' آپ کے یہاں وقعت نہیں ۔ میرے نزدیک
ضرورت نہیں ۔ اس لیے صرف بعض مصلحت شناس و ماہر انگریز
مورخین کی تحریرات نقل کر دینا کافی ہوگا ۔ مسٹر ایچ ۔ جی ۔ کین ؟
" مغل ایمپائر " میں لکھتے ہیں کہ " اکبر نے وسط ایشیا سے
تعلقات قرابت و ازدواج قطع کر دئیے اور امبیر کے کچھواہہ خاندان سے
شادی بیاہ کرکے اتحاد و یگانگی کی بنیاد قائم کی ۔ اس نے
ہندؤں سے رسم و راہ پیدا کر کے اپنی رعایا کے لیے عمل و مواخات
کی ایک نئی راہ دکھا دی ۔ " دوسرے موقع پر کہتے ہیں کہ " نہ
تو اکبر نے ؟ نہ جہانگیر نے اپنی ہندو رانیوں یا بیبیوں کو تبدیل
مذہب کرایا ۔ نہ اسلام اختیار کرنے کی ترغیب دی ۔ " اسٹینر
ڈیکن صاحب ان بادشاہوں کی مذہبی رواداری ' رانیوں کی ہندوانہ
پرستش اور آزادانہ عبادت گزاری کی تحسین کرتے اور محلات سلطانی
میں ان کی ضروریات اور توجہات کے مناسب حال تعمیرات کا ذکر
فرماتے ہیں ۔ نامور میکس مولر نے اپنی نفیس تصنیف " سائنس
آف ریلیجن " کے حصہ اول میں اس بارہ میں سیر حاصل بحث
کی اور مشہور کتاب " فرینڈس اینڈ فوز " (دوست و دشمن) سے
اقتباسات و انتخابات دیے ہیں ۔ گارنٹ صاحب تو اس درجہ تک
بڑھ کر کہہ گئے ہیں کہ " جہانگیر اُن لوگوں کو پسند ہی نہیں
کرتا ہے جو اپنا مذہب بدل دیتے ہیں ۔ وہ ایسے خود ساختہ مذہب کے
سوا کسی دوسرے دین کا مانند ہی نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی سلطنت

میں تمام مذاہب کا یکساں احترام ہے۔" کین صاحب کہتے ہیں کہ "جہانگیر جب ولی عہد سلطنت تھا تو اکبر نے اُس کی ہندو رانیوں کے لیے فتحپور سیکری میں مکانات بنوا دیے تھے اور بقول فرگسن صاحب ان محلات در ہندوانہ' خصوصاً جس وضع کی آرایش و تزئین کرائی تھی۔" مسٹر اسٹینلے لین پول اپنی تاریخ "قرون وسطی کے ہندستان" میں راوی ہیں کہ اکبر کی جے پوری دلہن آزادی کے ساتھ اپنے مذہب و ملت کے تمام رسوم و ارکان ادا کرتی تھی اور ہندؤں کی معینہ قربانیاں بھی کرتی تھی۔ وینسنٹ اسمتھ صاحب کا قول ہے کہ مذہبی معاملات میں جہانگیر اپنے باپ ہی کی طرح رواداری برتتا تھا۔ مسٹر وھیلر بحوالہ منوکی لکھتے ہیں کہ عالمگیر کی مالکہ ایک راجپوتانی شاہزادی' اُس کی دایہ اور جوانی کی بی بی تھی۔ حرم سرائے شاہی میں بڑا رسوخ اور اثر رکھتی تھی۔ محل کے اندر اپنے بتوں پر خوشبوئیں جلاتی تھی۔ اس کا شوہر اگرچہ سخت پابند مذہب تھا' لیکن اُس کے دینی معاملات میں دست اندار نہ ہوتا؟ دخل نہ دیتا تھا۔ مولف اُمرائے ہنود کا بیان ہے کہ آگرہ کے قلعہ کے محل میں ایک طرف ترکھانا اور دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک موجود ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ محلات شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کی رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ با بالفاظ مِعر تداسوتی یہ راج کماریاں تیموری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹ کرتی تھیں۔ ٹھاکرجی کو جل پھول چڑھاتی تھیں۔ تلک لگاتی تھیں۔ پرکرما کرتی تھیں۔ ہون کرتی تھیں۔ مسٹر کین شاہجہاں کے بارے میں بہت سی باتیں الفنسٹن صاحب سے اور کچھ اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں " یہ امر قابل تحریر ہے کہ شاہجہاں نے ہندو خواتین کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج اُٹھا دیا جو اُس کے پیشروؤں نے قائم کیا تھا"

رفع دخل — میں نہیں سمجھتا کہ ان دونوں صاحبوں کی تحریر کس تحقیق یا اطلاع پر مبنی ہے ۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کے خلاف شہادت ملتی ہیں ۔ یہ سلسلہ جو اِن جے پوری ' جودھ پوری، اور اور رانیوں کے دم قدم سے چلا تھا ' فرخ سیر تک ختم نہیں ہوا ۔ سب سے آخر راجپوتنی مہاراجہ جسونت سنگھ کی بیٹی تھی جو دلی کے لال قلعہ میں آ کر دلہن بنی ۔ اس بد طالع ' نیک قدم راجکماری کی شاندار آمد ' شوہر کی معزولی و ہلاکت اور اِس کی ناشاد زندگی کے بارے میں "حیات جلیل" کے بہت سے ورق سیاہ کر چکا ہوں ۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کے محل میں پانچ ہندو رانیاں تھیں اور جہانگیر کے یہاں سات ۔ شاہجہانی چمن دیسی پھولوں کی بہار اور خوشبو سے ضرور خالی رہا ۔ لیکن اِس کے بھائی پرویز ' اِس کے دونوں بیٹوں ' مراد اور شجاع ' کی محلسراؤں میں راج دلاریاں راج کماریاں رونق افزا تھیں ۔ خود عالمگیر اورنگزیب کی دو بیگمیں راجپوت تھیں ۔ ایک راجہ کشتوار (کشمیر) کی بیٹی یا (حسب روایت منتخب اللباب) نواب بائی جن کے بطن سے بہادر شاہ تھا ۔ دوسری اودے پوری جس نے مرتے دم تک اپنے تاجدار سرتاج کا ساتھ دیا اور حق وفا ادا کیا ۔ اسی طرح اور تیموری شاہزادوں کو لیجئے ۔ دارا شکوہ کا فرزند سلیمان شکوہ عالمگیر کے چاروں بیٹے ' پوتے اور پر پوتے سب اسی شاہانہ سوغات سے مستفید و فیضیاب تھے ۔ گورگانی یا صاحب قرانی شجرۂ نسب میں ایسی بیسیوں شاہزادوں کے نام روشن نظر آتے ہیں جنکے "دادی" بھی مکٹ دھاری تھے اور "سُسر" بھی مکٹ دھاری ہوئے ۔

بارآمد — جہانگیر کی اس پہلی شادی کے پہلے ہی سال ۹۹۴ ہجری میں شاہزادی سلطان النساء پیدا ہوئی جو سلطان بیگم بھی کہلاتی ہے ۔ دوسرے برس ' ۲۴ امرداد کو (بماہ رمضان سنہ ۹۹۵ ہجری = اگست

سنہ ۱۵۸۷ ع) بیٹے کی (لاهور میں) ولادت هوئی - دادا جان (اکبر ' عرش آشیان) نے سلطان خسرو نام رکھا - یہ بڑے لڑکے کا بڑا بیٹا تھا ' اپنا پہلا پوتا - بڑے جشن منائے - خوب خوشیاں کیں - فرشتہ کہتا ہے -

و درین سال سنہ ۹۹۶ هجری ولادت سلطان خسرو ولد شاهزادهٔ عالمیان شاهزادهٔ محمد سلیم از دختر راجہ بھگوانداس روے نمود - عرش آشیانی از طلوع اولین کوکب ؟ بمره‌اخوشحال شده در آراستن جشن با قصی‌الغایه کوشید -

اس مبارک موقع پر شاهزادہ سلیم نے اس رانی یا بیگم کو " شاہ بیگم " کا خطاب دیا تھا - شاہ بیگم بڑی عقیل ؟ دانش مند ؟ زیرک و دور اندیش ' وفاکیش اور غیور تھی - اس کو اپنے شوهر سے اُلفت نہیں ' عشق تھا - شوهر کی محبت تھی جنون محبت تک پہونچی هوئی تھی - جس کو دوسری بی بی (جودھ بائی ؛ دختر راجہ اودے سنگھ) بھی کم نہ کر سکی - اور اُس کے حسن و جمال ؟ ناز و نیاز ؟ کرشمہ و انداز کے تمام حربے بیکار ثابت هوئے - ع - هم بھی دیکھیں کہ مچلتی هیں نگاهیں کیونکر - حالانکہ دونوں کے سوانح ' لطیفے اور نقلہ سنجیاں دیکھ کر خشک مزاج و خشک دماغ " معقول " کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ جودھ بائی (جگت گوسائیں) وہ خوش سلیقہ و خوش مذاق ملکہ ' وہ نگار آتشیں ' وہ محشر در آستیں تھی ' جس کی چشمکوں اور خاطر جوابیوں نے فتنہ ادا ' ناوک افگن ' نور جہاں ' بیگم کی جودت فہم و رسائی طبع ؛ ملکہ دانش حسن کو بھی مات کر دیا تھا - جہانگیر کی ایک تیسری بیگم " صاحب جمال " اسم با مسمی تھی - بڑے نامور اور کار گزار باپ کی بیٹی تھی - اکبر نے سلیم کی شادی اس سے کر دی تھی ' یا سمجھنا کہ دربار اکبری ؛ میں تحریر

؛ معقول — یہ وہی ہے جو دوسری جگہ - در ... میں ہوا اضافہ — ؟
آوارہ — یہ اپنی ہنس ' مصرعوں دوتی اور ستمگاری آج نہی روح کو تڑپا دینی اور دل کو گرما دیتی ہے - نازک والو — کہاں هو ؟ — تم هی بتاؤ —
— " هم وهاں هیں جہاں سے هم کو بھی کچھ هماری خبر نہیں آتی " —

ہے '' مینا بازار کی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خان کوکہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا ۔ غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی ۔ اکبر نے خود شادی کر دی''۔بہر کیف شوہر کی بڑی محبوب رونق اور چہیتی سی تھی ۔ لیکن سیرت نگاروں سے پوچھیے - شاہ بیگم کے سامنے صاحب جمال کی کیا حقیقت تھی ؟ ع
دری جمال ، مرحبا ! پیکر یار ، آفریں ۔

[عذر—پردگیان عصمت و عفاف کے بارے میں میں خیال کی ادنیٰ سی جولانی یا قلم کی شوخی روا نہیں رکھتا لیکن یہ اظہار حقیقت حال تھا جو زبان قلم سے بے اختیار نکل گیا - تہذیب جدید کی ضیا پاشی یا دَور حاضر کے اثر پر محمول نہ کیا جائے ۔ ابھی آپ سنیں گے کہ خود جہانگیر شاہ بیگم سے (مومن کی زبان میں) کیا کہہ رہا ہے ۔

افسوس ! کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں ،
وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا ، نہیں رہا ۔]

شاہ بیگم کا اندوہناک انجام ، یا اس تصویر کا دوسرا رخ تھی ، ملاحظہ طلب ہے ۔ وہ شاہزادہ (خسرو) ، جس کے ساتھ ساری چغتائی قوم کی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں جس کی آمد ، نشو و نما اور ترقی سے تیموری خاندان کو مسرت تھی ، جو ماں (شاہ بیگم) کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھا ، باپ سے بگڑ جاتا اور تھوڑی سی سمجھ پا کر سرکشی اختیار کرتا ہے ۔ دعوائے سلطنت ، اور اکبر کی جانشینی کے خیال خام میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ در گزر کرنے والے شفیق باپ پر جو کچھ گزری ، اُسی کا دل جانتا ہے ۔ یہاں اسی قدر کہدینا کافی ہے کہ ماں عزیز بیٹے کی شوخیوں اور سیاسی غلط کاریوں سے تنگ آگئی

تھي - خسرو کو بغاوت و سرکسی سے روکتي اور حتي الوسع باز رکھنا چاھتي تھي ، مگر برگشتہ نصیب خسرو کب ماننے والا تھا - وہ جھانگیر کي بجاے تخت و تاج کا وارث اور حقیقۃً اھل اپنے ھي کو سمجھتا تھا - ماں کی کوفت اور سوزش دل بڑھتي رھی - اُس نے عاجز آکر افیون کھالي اور جان دیدي -

جھانگیر لکھتا ھے :-

والدۂ اُوھم در ایام شاھزادگی از ناخوشی اطوار و اوضاع او ، و سلوک برادر خوردش مادھو سنگھہ تریاک خوردہ خود را کشت - از خوبی ھاے و نیک ذاتی اُو چہ نویسم - عقلے بہ کمال داشت - و اخلاص اُو بہ من در درجۂ بود کہ ھزار پسر و برادر را قربان یک موئے من می کرد - مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و اُو را دلالت بہ اخلاص و محبت من می کرد - چون دید کہ ھیچ فائدہ نہ دارد ، عاقبت تا معلوم است کہ بکجا منجر خواھد شد ، از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتانی است خاطر بر مرگ خود قرار دادہ - و چندین مرتبہ گاہ گاھے مزاج اُو در شورش می آمد - چنانچہ این حدیث میراثی بود کہ پدران و برادران او ھمہ یکبار در دیوانگي خود ھا را ظاھر می کردند و بعد از مدتے علاج پذیر می شدند - در ایامے کہ من بشکار متوجہ گشتہ بودم ، روز بیست و ششم ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ ھجري افیون بسیار در عین شورش دماغ خوردہ در اندک زمانے در گذشت - گویا کہ این احوال پسر بیدولت خود را بیشتر می دیدہ است - اول کدخدائی کہ در آغاز جواني و خورد سالي مرا دست دادہ است او بود - بعد از تولد خسرو اُو را شاہ بیگم خطاب دادہ بودم - چون بد سلوکي ھائے پسر و برادر را نسبت بہ من نتوانست دید ، از زندگانی در وقت دماغ پریشان شدن در گذشتہ ، خود را ازین ندامت و اندوہ باز رھانید -

"میری شہزادگی کے زمانے میں خسرو کی ماں بھی خسرو کے نا پسندیدہ اطوار و وضع اور اپنے چھوٹے بھائی مادھو سنگھہ کے برتاؤ کے سبب سے افیون کھا کر مر گئی تھی - اس کی خوبیاں اور نیکیاں کیا لکھوں - انتہا کی عقلمند تھی - میرے ساتھہ اُس کا خلوص اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ میرے ایک ایک رونگٹے پر ہزاروں بیٹے اور بھائی قربان کر دیتی - اس نے خسرو کو بارہا لکھا اور محبت و اخلاص کی راہ دکھاتی رہی - جب دیکھا کہ کچھہ فائدہ نہیں نکلتا - انجام معلوم نہیں - کہاں تک پہونچے - تو غیرت کے باعث، جو راجپوتوں کی طبیعت کا خاصہ، ہے اپنی جان کھو دینے کی ٹھان لی - کبھی کبھی پہلے بھی اس کے مزاج میں کئی مرتبہ شورش سردار ہو چکی تھی - یہ تو موروثی بات تھی - اس کے باپ دادا اور بھائی سب نے ایک نہ ایک بار دیوانہ پن ظاہر کیا تھا اور مدت کے بعد ٹھیک ہوا تھا - جن دنوں میں شکار کے لیے گیا ہوا تھا ۲۶ ذیحجہ سنہ ۱۰۱۳ ھ * کو عین شورش دماغ میں اس نے بہت سی افیون کھا لی اور تھوڑی دیر میں چل بسی - گویا کہ وہ اپنے نالائق بیٹے کی حالت پہلے ہی سے دیکھہ رہی تھی - میری پہلی شادی جو شروع جوانی یا لڑکپن میں مجھے نصیب ہوئی، اسی کے ساتھہ ہوئی تھی -

* ۶ مئی سنہ ۱۶۰۵ ع - لیکن اگر سال وفات ۱۰۱۲ ھجری ہے تو انگریزی سنہ ۱۶۰۴ ع ہو گا -

[یاد هیں اب تک وہ ایام فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے]

خسرو کے پیدا ہونے پر میں نے اُس کو "شاہ بیگم" خطاب
دیا تھا - جب وہ اپنے بیٹے اور بھائی کی بد سلوکی
میرے ساتھہ دیکھہ نہ سکی تو دماغ کی پریشانی
کی حالت میں ' اپنی جان کھو دی اور اپنے کو اس
رنج و تکلیف سے چُھڑا لیا - "

مادھو سنگھہ اور اُس کے خاندان والوں کے ذکر کی ضرورت نہیں اس سچی وفا شعار و غمگسار بیوی کی جدائی کا جو ماتم جہانگیر کے سادہ نگار قلم نے کیا ہے اُس کو نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس درد دل کے ظاهر کرنے کی قوت اور کون سا انشاپردار رکھتا ہے -

از فوت او بنابر تعلقے کہ داشتم ' ایامے بر من گذشت کہ از حیات و زندگانی خود هیچ گونہ لذتے نہ داشتم - چہار شبانہ روز کہ سی و دوپہر باشد از غایت کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گشت - چوں ایں قصہ بہ والد بزرگوارم رسید - دلاسا نامہ در غایت شفقت و مرحمت بدیں مُرید فدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر بر داشتہ بودند هماں طور بستہ بہ جہت من فرستادند - ایں عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی‌الجملہ قرارے و آرامے بخشید -

" اُس کے مر جانے پر ' میرے دل کے لگاؤ کی وجہ سے مجھہ
پر زمانہ گذر گیا - زندگی و حیات کی ' کسی قسم کی '
کوئی لذت میرے لیے باقی نہ تھی - چار رات دن جس
کے بتیس پہر ہوتے ہیں ' انتہا درجہ کا رنج اور تکلیف

رهي - کهانے پینے کی کوئي چيز منهه تک نہ گئي - میرے
بزرگ باپ نے جب یہ قصہ سنا تو بڑی شفقت و مهربانی
کے ساتهه اس فدوی ارادتمند کو دلاسے کا خط لکها -
خلعت اور اپني برکت والي پگڑي سر سے جس طرح
اُتاري تهي ، اُسي طرح بندهي هوئی میرے لئے بهیجي -
میرے سوز وگداز کي آگ پر اس مهربانی سے پانی
پڑ گیا اور اضطراب وبےچینی میں کم یا زیادہ قرار و آرام
پهونچا - ''

یہ خون کے آنسو جهانگیر کا قلم نهیں ، آنکهه نهیں ، دل بہا رها هے - ایک ایسي عورت کے رنج میں ، جس کي جواني ڈهل چکی تهي - دماغ کے پیچ و تاب نے اور بهي نڈهال کر دیا تها - گل چین جمال ، هوس پیشہ جهانگیر بهي وهي هے ، جس کي بیس بیگموں کي فهرست مسٹر بلاک مین نے آئین اکبری کے ترجمہ میں پیش کی هے - جو شاہ بیگم کي دائمی جدائي کے بعد بهی بہت سی بی بیوں کا خاوند هے - جس کی نسبت کین صاحب کا قلم شوخی سے کام لے کر لکهتا هے کہ '' خود جهانگیر کو بهی همیشہ یہ خبر نہ رهتی تهی کہ اُس کے کون سے بیٹے کي ماں کون هے '' جس کو فرنگستان کے اهل قلم مست الست بتاتے هیں اور رند هزار شیوہ - جس کو طاعت حق میں سجدہ کے لیے سر جهکانا بهی گراں تها آج اپنی صنم پرستي کی بدولت گم صم هو رها هے اور نیم دیوانہ - الله ری ، محبت کی فرمانیاں ! -

جهانگیر کے ایسے عیش پسند و عشرت کوش کا برابر چار سات روز بهوکا پیاسا رهنا ؟ اُس کے انتہائي رنج و قلق ، دل کي بےقراري اور بے چینی کي کیفیت کو اُسی کی زبان سے ادا کر گیا هے - لیکن شهنشاہ اکبر بهی اس سانحہ غم سے متاثر هوئے بغیر نہ رہ سکا - دلبند فرزند کي تسلي

اور دلاسے کے لیے خط لکھا ۔ سر سے پگڑی اُتار کر جیسی بندھی ہوئی تھی ویسی ہی بھیجدی کہ زخم دل کے اندمال کے لیے بھی ایک مرہم تھا ۔

ایسی سلیقہ مند، وفا سرشت، نیک نہاد بیگم کی نیکیوں اور خوبیوں کا اعتراف، جو اُنیس (۱۹) بیس (۲۰) سال کی رفاقت ویکجائی کا نتیجہ تھا، اور شوہر کا اُس کو اور اُس کی محبت و اخلاص کو اسطرح یاد کرنا صنف نازک کے ہر فرد کے لیے قابل فخر اور موجب شرف ہے ۔ شاہ بیگم کا خیال جہانگیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوا ۔ تزک کے اوراق پر وہ بارہا اُس کا ماتم کرتا نظر آتا ہے ۔ آخر یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے ۔

اک ٹیس جگر میں اُٹھتی ہے، اک درد سا دل میں ہوتا ہے
میں راتوں کو رویا کرتا ہوں، جب سارا عالم سوتا ہے

تنہا جہانگیر ہی نہیں بلکہ اور معاصر مورخ بھی اس کے اخلاق حسنہ، خصائل حمیدہ، پاکدامنی اور پاکیزہ روشی کو مد نظر رکھہ کر ادب و احترام کے ساتھہ یاد کرتے ہیں ۔ مرزا ہادی تزک کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ایک جلوس کے بعد، جب جہانگیر الہ آباد واپس پہونچا تو اکبر نے اُس کے لیے خلعت و انعامات بھیجے ۔ ہر طرح کا سامان تسلی و دلداری کیا، تب وہ کچھہ روز تہاں مطمئن و فارغ البال رہ کر بسر کر سکا تھا ۔

قضاراالدۂ سلطان خسرو نقاب آرائے تہاں خانۂ عدم گشت ۔ تفصیل این اجمال آنکہ درینولا بواسطے در دماغ آن عفت سرشت تهم رسید و سودائے بر مزاج استیلا یافت و چون خسرو از نبراہ روی در ملازمت حضرت عرش آشیانی ہموارہ بہ سکوۂ شاہنشاہی می پر داخت ۔ این غم سر بار آن گشت ۔ در روزے آنحضرت بشکار تشریف بردہ بودند پوشندہ از پرستاران افیون خوردہ سر بہ بالین فنا نہاد ۔ و چون سر آمد بردگیان حرم سرائے سلطنت بودہ اُنس و الفت تمام باو داشتند ۔ خاطر قدسی مظاہر ازین

سانحه به نهایت ملول و بغایت اندوهگین شد و بر دل مهر منزل این مصیبت سخت گرانی کرد ' و حضرت عرش آشیانی از استماع این حادثهٔ ناگوار و آشفتگی ضمیر فیض پذیر فرمان از روئے کمال مهربانی و غمگساری فرستاده تسلی بخش خاطر عاطر شدند -

"اتفاقاً ' قضاے الٰهي سے خسرو کی ماں نے دنیا سے پردہ کیا - ایدیوں ' اُس نیک بی بی کے دماغ میں خشکي پیدا هو گئی تھي - سودا مزاج پر غالب تھا - اُدھر خسرو کی بے راهی اور ناهنجاری کی حالت یہ هو رهی تھی که اکبر کے حضور میں برابر جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا تھا - بیگم کو اس کا غم اور بڑھ گیا تھا - ایک روز جہانگیر شکار کو گیا هوا تھا ' بیگم نے لونڈی باندیوں سے چھپا کر افیون کھالی اور اپنے کو ختم کر دیا - حرم سراے شاهنشاهی کی بی بیوں میں یہ سب سے بلند مرتبہ والی تھی - جہانگیر کو اس سے نہایت الفت و محبت تھي - شاهزادہ کے دل پر اس سانحه سے بڑا رنج و اندوہ هوا - یہ مصیبت بڑی بھاري تھی - اکبر کو اس حادثے اور جہانگیر کے قلق و تاسف کی اطلاع هوئي تو کمال مهربانی و غم خواری فرمائی - فرمان بھیجا اور جہانگیر کی دلداري کی - دلاسا دیا - "

اسی واقعه کی نسبت منتخب اللباب میں تحریر هے -

درهمین آوان چوں والدۂ خسرو که همشیرۂ راجه مان سنگھ می شد سوداے مزاج بهم رسانیده بود از اداهاے خارج و اطوار ناهموار خسرو نا خلف که سه سال از شاهزادۂ عالی نژاد بلند اقبال محمد خرم کلاں بود و نظر بر عنایات وتوجهات جد بزرگوار و پدر نامدار که نسبت به

خسرو در حق آن عزة جاه و جلال زیاده مبذول می گر دید از راه حسد برخود هموار نمی تواست بود و در خدمت پدر گستاخانه و بے ادبانه سلوک می نمود - و عندالفرصت بخدمت جد بزرگوار طریقهٔ عماری از طرف شاهنشاهی بکار برده شعلهٔ افروزی عناد می نمود - و مادر او در منع آن می کوشید و فائده نمی بخشید - علاوه مرض سودا گردیده بود - دریں آوان روزے خود را از غصهٔ اطوار آن فرزند بد عاقبت از افیون مسموم ساخت - و برخاستهٔ رفتن عبدالله خان و واقعهٔ والدهٔ خسرو معاً بعرض شاهزادهٔ نامدار رسید و باعث الم خاطر گردید -

"اسی زمانے میں خسرو کی ماں کا مزاج سودائی ہو گیا تھا جو راجہ مان سنگھ کی بہن ہوتی تھی - نالائق خسرو شاہزادہ خورم سے تین سال بڑا تھا - مگر اس کے طور طریق کی کیفیت یہ تھی کہ اکبر ' جب خسرو کے معاملہ میں شاہزادہ (جہانگیر) پر عنایت و توجہ زیادہ کرتا ' تو اُس کو بڑا رنج و حسد ہوتا تھا - باپ سے گستاخانہ اور بے ادبانہ برتاؤ کرتا - موقع پاتا تو دادا جان کے سامنے جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا اور دشمنی و عناد پھیلاتا - اُس کی ماں ہرچند باز رکھنے کی کوشش کرتی' فائدہ نہ ہوتا - اس کے سوا مرض سودا تو ہو ہی گیا تھا - انھیں دنوں کمبخت بیٹے کے اطوار سے عصہ ہوکر زہر (افیون) کھا لیا - عبداللہ خاں کا اُٹھ کر چلا جانا اور خسرو کی ماں کا واقعہ' خسرو نے ایک ساتھ سنا تو بڑا رنج ہوا " -

جیسا کہ جہانگیر کہتا ہے یہ سودا اور آسیبہ سری شاہ بیگم کا

خاندانی مرض تھا - خود اُس کے نامور اور بہادر باپ امیرالامرا راجہ بھگوان داس میں، جب وہ صوبہ داری کابل پر ۹۹۴ ھ (۱۵۸۶ ع) میں متعین و سرفراز ہوا تو دیوانگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے - حکیم نے نبض پر ہاتھ رکھا - راجہ نے جمدھر کھینچ کر اپنے مار لیا - زندگی باقی تھی - بادشاہی طبیبوں کے علاج و پرداخت سے کچھ دن بعد بمشکل شفایاب ہوا -

جب تک در و دیوار کی دنیا میں بنا ہے
افسانہ رہے گا مری شوریدہ سری کا

ہاں—افیون کھا لینے، یعنی اسطرح خود کشی کا خراب اور ناپاک عمل ہمارے ملک میں اگرچہ کم ہو چلا ہے، مگر اب بھی باقی ہے - بعض وقت طبقۂ ادنیٰ کی کوتاہ اندیش، نادان عورتیں جب کسی صدمہ یا رنج کو برداشت نہیں کرسکتیں تو افیون کھا کر جان دے دیتی ہیں - اسی کو آسان سمجھتی ہیں - قدیم زمانے میں اس کا رواج اونچے اونچے حلقوں میں بھی تھا - تین چار سو برس پیشتر کی متعدد مثالیں عہد جہانگیری کی تاریخوں میں ملتی ہیں - سال سوم جلوس، یعنی سنہ ۱۰۱۷ ھ (سنہ ۱۶۰۸ع) کے واقعات میں لکھا ہے کہ جلال‌الدین مسعود پسر میر گیسو دراز نے جب انتقال کیا تو اُس کی ماں نے کمال دلبستگی و تعلق سے اُس کی حالت احتضار میں اُسی کے ہاتھ سے افیون کھالی اور بیٹے کے مرنے کے ایک دو گھڑی بعد خود بھی اس جہان سے چل بسی - قریب ہی زمانہ میں لعل خاں شاہی کلاونت بھی دنیا سے رخصت ہوگیا - اکبر اُس کی بڑی قدر کرتا تھا - لعل نے بچپن سے اُس کے زیر نظر تربیت پائی تھی - ملازم خدمت خاص تھا - فن موسیقی خصوصاً ہندی گانے میں نظیر نہیں رکھتا تھا - وہ تیئیس‌ تھ ساٹھ ستر برس کے سن

میں فوت ہوا - کلاونت کی ایک کنیز تھی، جس کی دلفریب صورت کا وہ عاشق، اور فسون ساز چشم کا مسحور تھا - معمولاً اُسی کے ہاتھ سے افیون کھاتا تھا - لعل خاں کے مرنے پر اُس نے بڑی افیون کھالی، اور عدم کی راہ میں مالک کی رفاقت اختیار کی - جہانگیر کہتا ہے کہ مسلمانوں میں کسی عورت نے اس درجہ وفاداری کا حق کم ادا کیا ہوگا - میر جلال کے سلسلہ میں بخشی معتمد خاں (مؤلف اقبالنامہ جہانگیری) کا بیان ہے کہ ہندستان کی یہ رسم تو بہت پرانی ہو چکی کہ شوہر کے مر جانے پر ہندؤں کی عورتیں خود کو آگ میں زندہ جلا دیتی اور اپنی جانِ عزیز اپنی محبت و وفاکیشی پر فدا کر دیتی ہیں - بارہا ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دس بیس عورتیں خواہ بی بی رہی ہوں خواہ باندی، آگ میں خود گھس گئی ہیں اور پورے استقلال کے ساتھ اپنے کو جلا دیا ہے - مگر بیٹے کی جدائی میں ماں کی یہ کیفیت اس سے پہلے نہیں سنی گئی - جہانگیر بھی تزک میں لکھتا ہے کہ ماؤں سے خواہ مسلمان ہوں خواہ ہندو، ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا -

شاہ بیگم کے مرنے کے بارے میں، یہ تو وہ مسلمہ اور متفقہ بیان تھا، جو بلا اختلاف الفاظ تمام ہندو اور مسلمان مورخوں اور اُن کے زیرہ چین انگریزوں نے کیا ہے - مگر با ایں ہمہ ایک اور روایت بھی ہے جو بداھۃً لغو اور نا قابل التفات، یا کسی افسانہ کی ٹوٹی ہوئی کڑی معلوم ہوتی ہے - لیکن ایک ذمہ دار و نامور اہل قلم کے قلم سے نکلی ہے اِس لیے یہاں اُس کا نقل کرنا ناگزیر ہے - سر ولیم سلی مین اپنی دلچسپ کتاب "سیاحت و تذکار" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں -

"جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کی آنکھیں باپ کے حکم سے

نکلوالی گئی تھیں، کیونکہ وہ بغاوت پر بغاوت کیا کرتا تھا - بغاوت کی ترغیب دینے والے دو سبب تھے - ایک خود اُس کی خواہش کہ ماں کے قتل کا انتقام لوں - دوسرے، اُس (ماں) کے بھائی، هندو شاهزادہ مان سنگھہ اور خسرو کے خسر خان اعظم، اکبر کے وزیر اعظم، کی یہ آرزو کہ اپنے عزیز کو تخت پر دیکھیں - نور جہاں نے خسرو کی ماں یعنی راجہ مان سنگھہ کی بہن کو بلایا تھا کہ ہمارے یہاں آ کر ایک کنوئیں میں جو ہماری محلسرا کے صحن میں ھے، چاندنی رات میں میرے ساتھہ جھانکو - جب وہ جھانکنے لگی تو اُس کو کنوئیں کے اندر ڈھکیل دیا - نورجہاں نے جب دیکھا کہ اس نے ہاتھہ پاؤں مارنا چھوڑ دئے ہیں تو شور و غل کیا - اور بات بنائی کہ رانی کہ ارادیہ گر پڑی ھے -''

ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھہ سارے متن و مخطاط تاریخ نویس اس پر حاشیہ لکھہ کر اپنا خیال ظاہر کرتا ھے :-

"ممکن ھے کہ یہ حکایت صحیح ہو - مگر اس قسم کا الزام قطعاً نا ممکن‌الاثبات ھے اور محلات کی فضا میں نشو و نما پا جانے والا -"

حقیقت یہ ھے کہ تاریخی واقعات کے رد و قبول میں بعض یوروپین مورخ ایک روش خاص، یا اُن کی اصطلاح میں ایک "اُصول" رکھتے ہیں - اُن کا دستور ھے کہ مسلمان بادشاہوں اور بیگموں کی نسبت کیسی ہی بے بنیاد و بیہودہ بات بنائی یا سنائی جائے تو اُس کو باور یا یقین کرنے میں تامل نہیں کرتے - ممکن ھے کہ یہ آپ ہی کی طبع زاد ہو - مختلف و موافق تمام روایتوں کے مطابق والدۂ خسرو نے آخر سنہ ۱۰۱۲ ھ یعنی مئی سنہ ۱۶۰۴ ع میں افیون کھا کر جان دی تھی - سر تامس ہربرٹ، بنیاں اور ڈلاکٹمیں اس بارے میں متفق‌اللسان ہیں کہ شمسی حساب سے نور جہاں چونتیس (۳۴) سال کی تھی جب سنہ ۱۶۱۰ ع میں شبستان شاہی یعنی جہانگیر کے عقد میں آئی تھی - ظاہر ھے کہ

اُس کے بعد مہرالنساء کو نور محل اور نورجہاں بننے میں بھی کچھ زمانہ لگا ہوگا - وہ سنہ ۱۶۰۴ع میں شیر افگن کی بی‌بی تھی - بنگالہ میں رہی ہوگی - تو نورجہاں اور شاہ بیگم کی یکجائی اور جوش رقابت و عناد کو کون ہوش‌مند باور کرے گا !!!

جو تمہاری طرح' تم سے' کوئی جھوٹھ بات کہتا

تمہیں منصفی سے کہدو' تمہیں اعتبار ہوتا

خلوص و وفا کی پیکر' بے چین اور درد مند دل والی بیگم آج اِلہ‌آباد کے خسرو باغ میں ایک وسیع و سہ منزلہ مقبرہ میں راحت و سکون کی نیند سو رہی ہے - [یہ خسرو باغ کا تیسرا مقبرہ ہے] - اصل تربت نیچے والے درجہ میں زمین پر مع اپنی سقف اور صحنچیوں کے اینٹ چونے کی بے تکلف تعمیر ہے - کبھی چاروں طرف سے بند تھی اور مسدود' جیسا کہ مسٹر بیل نے مفتاح‌التواریخ میں لکھا ہے - فانوس اور جھنڈیوں سے روشنی کا بدرجہ اتم انتظام رہا ہوگا - مگر اب یہ کیفیت باقی نہیں - غالباً اصلی حالت میں تبدیل کردی گئی ہے - ممکن ہے کہ کبھی اس پر نقش و نگار یا رنگینیاں رہی ہوں مگر اس وقت تو سوا سفیدی اور چونے کی تہوں کے کچھ نظر نہیں آیا - بگڑی ہوئی سی حالت ہے - مقبرہ کا دوسرا درجہ خالی' پست اور سادہ ہے - تیسری منزل یعنی بالائی حصہ نسبتاً مختصر ہے' جس پر ایک خوش وضع و خوش نما قبر سادہ افگن ہے - اسی جگہ (چھت کی بلندی پر) سنگ مرمر کی نمائی یا مصنوعی قبر مع مختصر (کٹہرہ) اور لوح مزار کے بنی ہے - یہ پورا حصہ نفیس اور بارک گُل‌کاری اور دیل بوٹوں سے مزیّن ہے - تعویذ کے دائیں بائیں پہلو میں یہ رباعی جلی حروف میں باکمرہ نستعلیق میں منقوش ہے —

بیگم که ز عصمت رخ رحمت آراست

اقلیم عدم ز نور عزت آراست

سبحان الله، زہے کمال عفت

کز حسن عمل چہرۂ جنت آراست

تعویذ در حسب معمول قلمدان بنا ہے۔

لوح مزار، شاہزادی کے شایان شان، خوب بلند ہے۔ اس پر یہ کتبہ ہے:—

اللہ اکبر

چوں چرخِ فلک ز گردشِ خود آسود

در ریر زمیں آئنۂ مہ بنہفت

تاریخِ وفاتِ شاہ بیگم جُستم

از غیب مَلَک مخلد شد بیگم گفت

[سنہ ۱۰۱۲ھ]

لکاتبہ عبداللہ، مشکیں قلم، جہانگیر شاہی۔

'' مخلد شد بیگم '' سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے ہیں جو سنگ بالین پر مرقوم ہے۔ مسٹر بیل اپنی اورینٹل بیاگرفیکل ڈکشنری میں ۱۰۱۲ ھ = ۱۶۰۳ع لکھتے ہیں۔ ترک میں سال وفات ۱۰۱۳ دیا ہے۔ ممکن ہے کہ کاتب کی غلطی ہو۔

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پُری رہی، اُسی طرح آج بھی ہے۔ اُس کی آغوش میں پانچ بچے کھیل رہے اور قبر کے پہلوؤں اور بغلی حصوں کو آباد کیے ہوئے ہیں۔

شاہ بیگم کا اصلی نام مجھے تحقیق نہ ہو سکا - مقامی و زبانی روایات '' پریا '' اور '' جودھا بائی '' بتاتی ہیں - جیسا کہ تمام مورخین کو تسلیم ہے ' جودھابائی ' یا ' جودھ بائی ' اُس کی چھوتی سَوت یعنی جہانگیر کی دوسری بی بی ' ملکۂ جہاں جگت گوسائیں عرف بال متی کا نام تھا - شاہ بیگم نہ جودھ بائی تھی نہ جودھپور کی - اس لیے یہ ممکن ہے کہ اُس کا نام '' پریا '' رہا ہو ' مگر کسی پرانی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزرا - تاریخ جہانگیر میں پروفیسر بینی پرشاد نے '' مان بائی '' لکھا ہے - اُن کا ماخذ یا سند معلوم نہیں - مگر ؟ مسلّم ہے کہ ان کی دور رس نظر راجستھان کی ہندی تاریخوں اور بست ناموں سے بہت سے نادر جواہرپارے نکال کر لائی ہے جن کی چمک دمک ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے ؟ اور جن سے ہم ایسے بے مایہ اب تک محروم تھے - مزید بر آں ؟ مان سنگھ (بھائی) اور مان بائی و (بہن) کے ناموں کی یکسانی اس کو مزید قیاس و قابل قبول بناتی ہے ؟ نیز آسان -

صمصام الدولہ شاہ نواز خان کا مآثر الامرا (جلد دوم ' صفحہ ۱۸۱) میں یہ لکھنا کہ '' سلطان خسرو اودے سنگھ عرف موٹہ راجہ کی بن بیٹی نامی لڑکی کے بطن سے متولد ہوا تھا '' ایک فاش بلکہ واضح غلطی ہے - ' مان بیٹی ' بجائے ' بال متی ' کی عبارت کی عالم آشکار جرأت ہے - وہی اودے سنگھ فرمانروائے مارواڑ کی بیٹی تھی - جس سے خسرو نہیں ' خرم پیدا ہوا تھا - معاف رکھیے سوانح نویس ہوں ' اور اُس مجبور و بے بس بندے ' سلیم کو جو کہنے کو اُس وقت تک ولی عہد اور کشور ہند کا آئندہ شہنشاہ تھا جس کے عہد سلطنت میں منصب نویسی ' ہوس رانی اور ہوا پرستی کا الزام بار وا عیار ناحق لگاتے ہیں - جو حقیقۃً بیچارہ و معذور ' محض

معذور تھا - جس کی عافیت اور اٹھتی جوانی ملکہ زندگی ھر سال مصالح ملکی، تعدیلات سیاسی و انتظامی، تدابیر مملکت و جہانداری کی قربان گاھوں پر نذر چڑھائی جاتی تھی - جس کو اپنے بے ترس و ناخدا شناس باپ کی حکمت عملی، مرضی و خواھش دن روز روز مصدّق ہوتا جاتا تھا - جس کے لیے کم عمری و حداثت سن میں بھی خود کام امرائے دولت کے عصر و تنار، اعاظم سلطنت کی جاہ طلبی اور سازش اشرار پر بے بیوں کی بھرتی جاری رھتی تھی - جو تخت و تاج اور کامل اقتدار و اختیار پا کر ایک، اور صرف ایک، نور جہاں کا ھو کر رھا - لیکن ایام شاھزادگی میں اُسی کی شبستان عشرت میں سات (سو صرف) رانیاں داخل کی گئی تھیں - ان کا پتہ چلانا، نام و نشان بتانا کیا آسان بات ھے ؟ - تنہا صمصام الدولہ اور معتمد خاں ھی نہیں بلکہ بہت سے لکھنے والے ایسی ھی غلط فہمی و غلط انگاری کا شکار ھوئے ھیں - کاش! تاریخ کے کسی ھوشیار مطالعہ کرنے والے کو توفیق رفیق ھو اور دودمان گورگان کی حریم عشوۂ و ناز، سرا پردۂ خلوت و ناموس میں باریابی - تاکہ ان دُرون پردہ محرمان راز سلطنت، راج رانیوں کا تذکرہ لکھے اور معمولی معمولی غلطیوں کا ازالہ کر دے -

مرنے کے وقت بیگم کی عمر تینتیس (۳۳) سال کے قریب تھی - اونیس سال دلدار و دلنواز خاوند کی خدمت گزاری، اطاعت و رفاقت میں گزارے - آج وہ اپنے شوھر کے قرب ظاھری سے محروم اور اُس کی آخری آرامگاہ سے منزلوں دور ھے - مگر اُس کی بے چین روح کو تسکین و تسلی ھے کہ خسرو باغ کی یہ ڈھائی گز زمین اس کی ابدی خواب و راحت کے لیے اُسی کے غمگسار سرتاج نے پسند کی تھی - اُسی کے نازبردار ھاتھوں سے وہ سپرد خاک ھوئی -

نگارندۂ سطور، عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے حسین و دلکش مرقد پر بارہا گیا، اور زبان حال سے کسی کی غفلت و بے خبری کا شکوہ سنتا رہا ہے -

بر مزار ما غریباں، نے چراغے نے گُلے،
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اِنتقادِ ادب

(از ناٹک چند عشرت ' ایم ' اے ' یل ' تی)

ادب کیا ہے ؟

دنیا میں اختلاف وتنوع کی انتہا نہیں ہے ـ کہیں دریا ' کہیں صحرا ' کہیں پہاڑ ' کہیں میدان ـ مگر پھر بھی انسان جس ماحول میں رہتا ہے اُس کو دیکھتے دیکھتے اُس کا جی اُکتا جاتا ہے ـ اُس کے لیے دنیا پرانی ہو جاتی ہے ـ آفتاب روز اُسی طرح مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ہے ـ گھاس پر روز شبنم برستی ہے ـ دنیا کے کاروبار ایک ہی طرح سے چلتے رہتے ہیں ـ اِن چیزوں کو ایک ہی صورت میں کہاں تک دیکھا جائے ـ عرصکہ انسان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے ـ اور وہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے کنارہ کش ہو یا اُن میں کوئی نئی روح پھونک کر اِن کو نیا کر دے ـ بس یہیں سے ادب یا شاعری کا آغاز ہوتا ہے ـ

افلاطون کے ذہن میں شعرا کی ضرورت نہ رہی ہو مگر حقیقتاً دنیا کو نیا بنانے میں کوئی اور ہستی اِتنا کام نہیں دے سکتی ـ شاعر یا ادیب معمولی چیزوں میں ایک دلکشی پیدا کرکے اُن کو نیا کر دیتا ہے یا دنیا کو ایک نیا زاویۂ نگاہ دیتا ہے جس سے دنیا کی ہیئت بدل جاتی ہے ـ سب چیزیں نئی ہو جاتی ہیں اور بہت دن کے لیے دنیا پھر دلچسپ ہو جاتی ہے اور جب یہ دلچسپی ختم ہونے لگتی ہے تو پھر کوئی دوسرا شاعر یا ادیب پیدا ہو جاتا ہے

اور دنیا کو از سر نو دلچسپ بنا دیتا ہے - سچ تو یہ ہے کہ واجب مطلق ، قادر مطلق ہونے کے با وجود دنیا کو صرف خلق کرتا ہے - لیکن یہ کام شاعر یا ادیب کا ہے کہ دنیا کے معیار زندگی میں توسیع کرتا رہے اور اُس کو ایک بارہ حیات بخشتا رہے - در حقیقت اگر امرت کا کہیں وجود ہے تو وہ ادب ہی میں ہے ویدک میں کایا کلپ کا بیان ملتا ہے جس سے بڈھوں کو دوبارہ جوان بنایا جاتا ہے - موجودہ ڈاکٹری میں بھی جرّاحی عملوں کے ذریعہ شباب واپس بلایا جا رہا ہے - مگر ویدک ، طب ، ڈاکٹری بہت محدود ہیں - یہ معدود انسانوں کو دوبارہ جوان بنا سکتی ہیں - لیکن یہ زور ادب یا شاعری ہی میں ہے کہ تمام انسانوں کو ، نہیں نہیں ، تمام کون و مکان کو نیا کر دے -

نئی زندگی بخشنے میں ادیب و انبیا مشترک ہیں - حقیقت تو یہ ہے کہ انبیا سب سے بڑے شاعر یا ادیب ہوئے ہیں - زمانۂ جاہلیت میں عرب کی حالت ناگفتہ بہ تھی مگر محمد صاحب کے آتے ہی عرب کے زمین و آسمان تک بدل جاتے ہیں - عرب کے باشندے انسان نما حیوان سے انسان بن جاتے ہیں - بھگوان بدھ کی پیدائش سے پہلے هندستان میں کتنی قربانیاں کتنی لڑائیاں تھیں مگر بدھ مت کے پھیلنے کے بعد جب میگستھینز هندستان آیا تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ لوگ قفل کا استعمال ہی نہیں جانتے کیونکہ چوروں کا کہیں نام و نشان نہ تھا - بدھ مت نے انسانوں کو فرشتہ خصلت کر دیا تھا - ہر طرف امن چین تھا - مکاری ، دغا بازی ، چوری ، ڈاکا سب افسانہ ہو گئے تھے - جنگلوں میں درندے نظر نہیں آتے تھے - انسانوں کے لئے کون کہے جانوروں تک کی یہی استدلال ہے - سچ پوچھئے تو اگر روئے زمین پر کبھی جنت اُتری ہے - تو وہ بدھ مت ہی کے ذریعہ

ابری ہے ۔ المختصر انبیا سب سے بڑے ادیب ہوتے ہیں ۔ در اصل وید ، دھمپد ، انجیل ، قرآن وغیرہ سے بہتر ادب کسی اور کتاب میں ملنا نا ممکن ہے ۔

مختلف سائنس اور علوم کے ماہرین ؟ مختصر یہ کہ تمام وہ لوگ، جن میں تخلیق و جذب کا مادہ ہے دنیا کو نئی زندگی دینے میں شریک رہتے ہیں ۔ جب کوئی سائنس داں کوئی معرکۃ الآرا ایجاد کرتا ہے تو دنیا کی کایا پلٹ کر دیتا ہے ۔ اِسی طرح جب کوئی فلسفی کوئی نیا فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو دنیا بالکل بدل جاتی ہے ۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ ادیب اور سائنس داں یا فلسفی میں مابہ‌الامتیاز جوہر کیا ہے ؟ ادیب سائنس داں ۔ فلسفی سب الفاظ سے مافی‌الضمیر کو ادا کرتے ہیں ۔ مگر ادیب و غیر ادیب کی طرز جدا جدا ہوتی ہے ۔ ادیبات کی طرز تحریر نہایت خوبصورت و دلکش ہوتی ہے جو پڑھنے والوں کو (قطع نظر نفس مضمون) ایک خاص مسرت بخشتی ہے ۔ یہی خوبصورتی یا مسرت ادب کو غیر ادب سے ممتاز کرتی ہے ۔ اگر سائینس فلسفہ ، یا تاریخ اس طرز یا اس اسلوب (Style) سے لکھے جائیں کہ اُن میں ایک خوبصورتی آجائے تو بے شک ان کا شمار بھی ادب میں ہونے لگے گا ۔ آب حیات آزاد - شعرالعجم شبلی وغیرہ ادب کی بہترین مثالیں ہیں ۔

ایک خاص طرز تحریر جو ادب کی جان ہے ایک خاص شخصیت کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ اس لیے ادب کی تعریف (Self expression) '' اظہار نفس '' کی گئی ہے مگر ادب میں محض اظہار نہیں ہوتا بلکہ اپنے زور کا اظہار ہوتا ہے کہ اُسے کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے سے تشبیہ دے سکتے ہیں ۔ ادیب کے خیالات و جذبات میں ایک ایسا طوفان اُٹھتا ہے کہ جس کو وہ دبا نہیں سکتا بلکہ اس کے اظہار

پر مجبور ہوتا ہے - یا یوں کہیے کہ اُس کے خیالات و جذبات خود بخود باہر نکلتے ہیں اور اس طرح نکلتے ہیں کہ سامع کے قلب پر چھا جاتے ہیں - '' اندہ از دل خیزد بر دل ریزد '' - اس لیے میرے خیال میں انگریزی کی تعریف (Self expression) "اظہار نفس" کو (Self assertion) "اقتدار نفس" ہونا چاہیے - یعنی اظہار ایسا ہونا چاہیے، کہ جو ادب کی شخصیت کا سکّہ دوسروں پر بٹھادے - اور اُس کے خیالات و جذبات سامع کے دل پر قبضہ کرلیں ورنہ اظہار تو انسان معمولی سے معمولی بات چیت میں بھی کرتا ہے - جس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں - اب ادب کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہ خیالات و جذبات کا ایک ایسا اظہار ہے جو لوگوں کے دلوں پر ثبت ہو جائے اور جس کی طرز تحریر ایک خاص خوبصورتی و دلکشی لیے ہوئے سب سے جداگانہ ہو -

نقل ادب

انسانوں میں سب سے زبردست رجحان نقل کرنے کا ہوتا ہے - جہاں کوئی بڑا ادیب پیدا ہوا اور اُس کی طرز تحریر کے ڈنکے پٹنے لگے وہیں سہرت و ہر دلعزیزی کی طمع سنکڑوں کا دماغ خراب کر دیتی ہے - یہ لوگ اُسی طرز تحریر میں لکھنے لگتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کریں جنھیں اُس اصلی ادیب نے استعمال کیا ہے - اس نقل ادب میں جسم ہی جسم ہوتا ہے - روح ندارد ہوتی ہے - نقّالوں کے پاس روح کہاں ؟ کیونکہ ادیب کے ادب میں جو روح ہوتی ہے اُس سے یہ لوگ بے بہرہ و نا آشنا ہوتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ الفاظ و طرز تحریر ہی روح ہیں - اُن کی مثال ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے بہت خوب دی تھی - انھوں کہا تھا کہ کسی بیوقوف نے کبھی دریا نہیں دیکھا تھا مگر کسی طرح اُس کو معلوم ہوا کہ دریا ایک گہری چوڑی نالی میں بہتا ہے - اُس کے کنارے پر ریت ہوتی ہے

اور اُس میں سیمپ ؟ گھونگھے ؟ مینڈک ؟ مچھلیاں اور کچھوے وغیرہ پائے جاتے ھیں - بیوقوف نے ایک گہری چوڑی نالی کھود کر اُسے پانی سے لبریز کر دیا - کناروں پر ریت ڈالدی - پھر اس میں کچھ سیپ ؟ گھونگھے ؟ مینڈک ؟ مچھلیاں اور کچھوے لاکر ڈالدیے - اور سب کو اپنا دریا دکھا کر داد چاھنے لگا - ایسے بیوقوف کی عقل پر کون تاسف نہ کریگا - اگر ایک خود پرست شاعر صاحب یہ فرمائیں کہ جو ٹیگور انگریزی یا بنگلہ میں کہتے ھیں وہ میں اردو میں کہتا ھوں - پھر لوگ مجھے ٹیگور کے برابر کیوں نہیں سمجھتے تو بقول ہمارے اُن دوست کے اُن سے جاکے کوئی کہدے کہ تم میں اور ٹیگور میں وھی فرق ھے جو محمد اور مسیلمۂ کذاب میں تھا اور تمہارے کلام اور گیتا نجلی میں وھی فرق ھے جو قرآن اور نقلی قرآن میں ھے - خیر یہ تو ایک افراط کی مثال تھی - مگر اُن لوگوں کی تعداد بے شمار ھے جو مشہور ادیبوں کی طرز تحریر اور الفاظ سے اپنا ایک نیا بھان متی کا تماشہ تیار کرتے ھیں - موجودہ ھندی شاعری میں ٹیگور نے قریب قریب تمام کھڑی بولی لکھنے والوں کا دماغ خراب کر رکھا ھے - اُن کی شاعری میں ھر بندری हृत्तन्त्री یعنی "تار دل" کمپن پرکمپن (कंपन प्रकंपन) یعنی "لرزش و ارتعاش" - اسیم اور اننت (असीम और अनंत) یعنی "بے حد ولا متناھی" وغیرہ وغیرہ الفاظ کی بھر مار ھے - خواہ مخواہ معنی کو مُبہم کرنیکی عادت پیدا ھو چلی ھے تاکہ ٹیگور کے مسٹیسزم (mysticism) یعنی تصوُّف سے جس کو ھندی میں چھایا واد یا رھسیواد (छायावाद या रहस्यावाद) کہتے ھیں سُر مل جائے - اسی طرح اردو میں بھی چند خاص شاعروں کی نقل میں عام شاعروں کا رنگ بدل گیا ھے اور وہ بھی تصوف یا فلسفہ کہنے کی کوشش کرتے ھیں چاھے شعر میں معنے پیدا ھوں یا نہ ھوں - اِن نقالوں کے دل میں ادب کی روح نہیں ھوتی مگر یہ اسے کو ادب سمجھتے ھیں -

شاعر یا ادیب ایک الہامی جذبے سے بے اختیار ہو کے کچھ لکھتا ہے ؟ وہي اصلي ادب ہے - اس لیے کسي شاعر کے مصرعے پر یا کسي سمیلن کي سمسیا پر کچھ لکھنا ہرگز اصلي ادب نہیں بلکہ نقل ادب ہے - کسي صلہ یا انعام کے لالچ میں یا کسي اور غرض سے کچھ لکھنا بھي مشکل سے ادب کہلانے کا مستحق ہے - مشاعرے کے متعلق میرے ایک دوست نے ایک مرتبہ کتنا سچ کہا تھا کہ مشاعرہ چھوٹي جماعتوں کي مضمون نگاري (Composition) ہے جس میں کچھ الفاظ دئے جاتے ہیں جنھیں طلبا صحیح طور سے جملوں میں استعمال کریں - مشاعرے میں بھي جب کوئي مصرعہ نکلتا ہے تو پہلے اس کے قوافي لکھے جاتے ہیں اور انھیں قافیوں کو خوبصورتی سے ایک مخصوص بحر میں نظم کر دینا ہی بہترین شاعري ہے - مشاعرے میں جو تعریفیں ہوتی ہیں وہ بھي اسي نکتہ کي جانب دلالت کرتي ہیں - مثلاً اہاہا - آپ نے تو یہ قافیہ اٹھا کر لیا ہے " - " آپ نے اس لفظ سے کیا فائدہ اُٹھایا ہے " " اس شعر میں ردیف کتني مضبوط لگی ہے " " اس شعر میں ردیف نے کیا مزہ دیا ہے " - " اس میں آپ نے قافیہ کہاں سے تلاش کیا ہے " - " کیا زبان ہے " - " کیا زور مزہ ہے " " کیا محاورہ صرف کیا ہے " - وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں ثابت کرتي ہیں کہ مشاعرہ والي شاعري کي بنیاد محض لفظ پر ہے اور خیالات اور جذبات سے اِسے کم تعلق ہے یہاں ایک لطیفہ یاد آیا - ایک مرتبہ ایک مشاعرے کے لیے مصرعہ دیا گیا اور اسیر مرحوم استاد امیر مینائي قافیہ پیمائي کر رہے تھے - ایک قافیہ بہت بھونڈا تھا مگر اس کے بھی باندھنے کے لیے غلطاں و پیچاں تھے - ایک شاگرد نے پوچھا حضور کس فکر سے پریشان ہیں ؟ استاد نے بتلایا کہ اس قافیے کے باندھنے کی فکر میں ہوں - شاگرد نے عرض کیا - کیا اس قافیے کے بھی لکھنے کي ضرورت ہے - استاد نے فرمایا " بے شک - کیونکہ کبھی نہ کبھي

یہ سند کے لیے کام آئے گا " اردو غزلوں کے شعروں کا حسن و قبح قوافی کے باندھے جانے پر منحصر ہے - جس کا بہترین ثبوت رسالہ " معیار " ہے جو اہل زبانوں کے مرکز لکھنؤ کی سب سے بڑی ادبی انجمن کا ماہانہ رسالہ ہے - اس مشاعرے میں پڑھی ہوئی غزلیں قافیے کے مقابل سے چھاپی جاتی ہیں تاکہ معلوم ہو کہ فلاں قافیے کو فلاں نے بہترین طریقے سے باندھا ہے - اردو شاعری کی اب تک بہت سطحی رہ جانے کی وجہ بہت کچھ یہی ہے کہ اردو شاعری کا انحصار زیادہ تر غزلوں پر رہا - اور غزلوں کا مشاعرے پر - اور مشاعرے کا قافیہ پیمائی ؟ زبان و محاورہ اہاہاہا اور واہ وا پر - یہی وجہ ہے کہ اردو میں انتقاد شعر کا معیار اب تک زبان و محاورہ ہی رہا - مشاعرے والی شاعری کے لیے ممکن ہے کہ یہ ٹھیک ٹھیک ہو مگر حقیقی و وجدانی غزلوں کو جن کا مشاعرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اس پر کسنا نہایت بے انصافی ہے مگر تنقید نگاروں کی کور سوادی سے چاروں طرف یہی ہنگامہ برپا ہے - افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندی میں بھی مشاعرے کی ہنگامہ آرائی ترقی کر رہی ہے جو ناٹکہ بھید اور النکاروں سے بے روح کی ہوئی ہندی شاعری کو اور بھی مردہ ، بے کیف اور رسمی بنا رہی ہے -

سطور بالا سے میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مشاعرے اور کب سمیلن بند کر دیے جائیں ؟ کیونکہ ان سے فوائد بھی ہیں ؟ ان سے اظہار خیال کو تقویت پہنچتی ہے اور عوام میں شعر و ادب کا چرچا پھیلتا ہے - اس لیے اگر مشاعرے لاہور کی طرح ہونے لگیں تو اس صوبے میں بھی مشاعرے سے نقصان نہ ہو - وہاں کے مشاعروں میں کوئی مصرعہ نہیں دیا جاتا بلکہ شاعر اپنی کسی نظم کو سنا دیتا ہے - غزل کی بھی قید نہیں ہے - رباعی ہو چاہے مسدس - غزل ہو چاہے قصیدہ - نظم ہو چاہے قطعہ -

شاعر جو چاھے سنائے - اِس کا مطلب یہ ھے کہ شاعر پر جب کسی جذبے کا اثر ھو تو وہ اسے جذبے کے موافق کوئی بحر اور ردیف و قافیہ منتخب کر کے کچھہ لکھہ ڈالے اور محفوظ رکھے - اور جب مشاعرہ ھو تو پڑھہ دے - اس میں مشاعرے کے تمام فواید موجود ھیں مگر اس کے عیوب سے بہت کچھہ کنارہ کشی ھو جاتی ھے -

اقبال کا ایک فارسی شعر ھے -

آیا تنقید کی ضرورت ھے ؟ "گفتند جہانِ من آیا بتو می سازد

گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برھم زن - "

اسی شعر کی بنا پر جب متقدمین دنیا کو ایک ھی صورت میں دیکھتے دیکھتے تنگ آگئے تو انھوں نے اس سے بھاگنے کی کوشش کی ؟ تخیل کے گھوڑے دوڑائے اور اپنی پری سے دوڑائے کہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ گئے - دیو - پریاں - دیوی - دیوتا - غرضکہ غیر معمولی طاقت وقدرت رکھنے والی ھستیوں کی لٹریچر میں بھر مار ھوگئی - ایک زمانے تک یہ غیر حقیقی ادب لوگوں کے دماغ پر مسلط رھا - اس کے بعد لوگوں کی طبیعت اس سے بھی گھبرائی اور اپنی ھی دنیا کی چیزیں نئی معلوم ھونے لگیں - کلاسیزم (Classicism) نے پلٹا کھایا اور رومانٹسزم (Romanticism) کا دور دورہ ھوا - اس طرح کبھی رسمیات یا غیر حقیقی چیزوں کا پول بالا رھتا ھے اور کبھی روحانی اور حقیقی چیزیں اپنا تسلط جما لیتی ھیں - دنیا میں اسی طرح انقلابات ھوا کرتے ھیں - جس سے ادب پر کبھی کوئی رنگ چھایا رھتا ھے کبھی کوئی رنگ - ملک کے ترقی اور تنزل کا بھی ادب پر اثر پڑتا ھے کیونکہ افراد کا دماغ زمانے کے رنگ سے تبدیل پاتا ھے اور انفرادی شخصیت کا اظہار ھی ادب ھے - اسی سے ادب کا معیار کبھی کچھہ رھتا ھے کبھی کچھہ - مختلف ازمنہ کی

تنقیدوں میں زمین و آسمان کا فرق رہتا ہے ۔ مثلاً ایک زمانہ تھا جب لوگ ناسخ یا امانت کے شعر پر سر دُھنتے تھے مگر آج عموماً لوگ اُسے بے کیف سمجھتے ہیں ۔ مختلف زمانوں کی تنقیدوں کو کون کہے ایک ہی زمانے کے ناقدوں میں اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حق بجانب کون ہے ۔ مختلف زمانے کی تنقیدوں میں زمانے کی اُلٹ پھیر کی وجہ سے اختلاف رہتا ہے اور ایک ہی زمانے کی تنقیدوں میں انفرادی پسند و ناپسند کے باعث ؟ انفرادی اختلاف خیالات و ساخت دماغ کے اختلاف کے باعث پیدا ہوتا ہے ۔ میرے ایک دوست نے ایک مرتبہ نقد و تبصرہ پر ایک لطیف بات کہی تھی کہ اگر کسی ناقد نے کلام کی اصلیت کو دکھایا تو کیا کہنا اور اگر ایسا نہ کرسکا تو وہ کم سے کم اپنے کو دکھائے بغیر نہیں رہ سکتا - اور یہ بھی خالی از لطف نہیں ۔ صحیح ناقد چاہے جتنے منصفانہ طور سے تبصرہ کرے لیکن وہ اپنے سے کہاں بھاگ سکتا ہے ؟ وہ کلام زیر تنقید میں اکثر اوقات اپنے ہی خیالات کا عکس دیکھتا ہے اور یہ بات اتنی صحیح ہے کہ ایک ادیب نے جل کے کہا ہے کہ " اگر تمہیں عقلمندی چاہیے تو شیکسپیئر کے پاس جاؤ اور اگر بیوقوفی کی ضرورت ہو تو اُس کے شارحین کے پاس ۔ "

اب اِس حالت میں کہ تنقیدوں کا کوئی قطعی فیصلہ یا نتیجہ نہیں نکلتا تو کیا تنقید بے کار ہے ؟ کیا اس کی ضرورت ہی نہیں ہے ؟ اس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام ملکوں یا ایک ہی ملک میں تمام رہنے والوں کا ایک ہی پوشاک پر اتفاق نہیں ہے تو کیا پوشاک فضول ہے ؟ نہیں پوشاک کی ضرورت مسلّم ہے ۔ مگر مختلف ملکوں میں سردی گرمی کے اختلاف سے یا انفرادی پسند اور ناپسند سے فیشن اور پوشش میں اتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح

تنقیدوں میں لاکھ اختلاف ہو تاہم وہ مفید اور ضرور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں ان کا رواج ہے -

اول تو یہی غلط ہے کہ تنقیدوں کا کبھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوتا - جمہوریت کی طرح اس میں بھی کثرت رائے بڑی چیز ہوتی ہے - مثلاً اگر ایک کتاب کے دس ناقد ہیں اور اگر ان میں سے آٹھ گو جزئیات و تفصیلات تنقید میں ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں مگر اس بات پر متفق ہیں کہ تصنیف وقیع ہے تو اس کی وقعت میں شک نہ کرنا چاہیے - باقی دو جو کتاب کو بالکل ردی سمجھتے ہیں اُن کی رائے بہت وقیع نہیں سمجھی جا سکتی - اور اگر چھان بین کی جائے تو شاید کوئی نہ کوئی وجہ مثل تعصب ، دشمنی - پارٹی بندی یا انفرادی خبط وغیرہ نکل آئے گی - مثال کے لیے کلام غالب کو لے لیجیئے - ہر زمانے کے ناقدوں نے بہ متفقہ طور سے تسلیم کیا ہے کہ غالب کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے - گو بہت سے لوگوں کو کلام میں فارسی الفاظ و تراکیب کی زیادتی پسند نہیں ہے -

اس کے علاوہ تنقید سے اور کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں - پہلا فائدہ تو یہی ہے کہ اگر ناقد قابل ہو تو اُس کی تنقید بجائے خود ایک بیش بہا لٹریچر ہوتی ہے - مثال کے لیے آزاد ، شبلی وغیرہ کافی ہیں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قابل ناقد ہمیں بتلاتا ہے کہ کسی بڑے مصنف کو کس طرح پڑھنا چاہیے - اُس کی گہرائیوں تک کس طرح پہنچنا چاہیے - جانسن - سنٹسبری - بریڈلے وغیرہ کی تنقیدیں ہمیں سکھاتی ہیں کہ شیکسپیر کو اس طرح مطالعہ (study) کرنا چاہیے - ناقد ہمارا رہنما ہوتا ہے وہ ایک راستہ بتانے والے کھمبے (finger post) کی طرح ہوتا ہے جو بتاتا ہے

کہ ادھر جاؤ - تیسرا فائدہ یہ ہے کہ تنقید عقل و ذکاوت میں تیزی اور گہرائی پیدا کرتی ہے - جس سے ہمارا ذوق ادب بلند ہوتا ہے اور ہم میں ادبی نکات کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے - اس کے علاوہ دنیا میں ہزاروں کتابیں ہیں اور انسان کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ سب کو پڑھے مگر باخبر (up-to-date) رہنے کے لیے ضرورت ہے کہ سب کے متعلق کچھ نہ کچھ جانتا ہو - اس لئے وہ چند کتابیں جن سے اُسے خاص دلچسپی ہے ؟ پڑھتا ہے اور باقی کتابوں کو معتبر ناقدوں کے ذریعہ پڑھ لیتا ہے -

ناقد اور ادیب میں جنگ

سوسائٹی انفرادیت کی روادار نہیں ہو سکتی - وہ چاہتی ہے کہ کسی کو کوئی خصوصیت نہ ملے - جس کا مقام ذرا بھی الگ ہوتا ہے اس کو گھسیٹ کر سب لوگوں کے ساتھ بٹھانے کی کوشش کرتی ہے - یہی وجہ ہے کہ سوسائٹی ہر جدّت کو بدعت سمجھتی ہے - یہ بڑی قدامت پسند ہوتی ہے - جن چیزوں سے یہ مانوس و آشنا ہوتی ہے وہی اُس کے لئے معیار کا کام دیتی ہیں ؟ اور اُنہیں سے ملتی جلتی چیزوں کو قبول کرتی ہے اور اُس سے خلاف چیزوں کو روک دیتی ہے - یہی وجہ ہے کہ ادب سے تنقید ہمیشہ پیچھے رہتی ہے اور اِسی لیے ناقد اور جدّت پسند ادیب میں ایک ابدی جنگ رہتی ہے - اگر ادیب کی شخصیت معمولی ہوتی ہے اور وہ اپنے زمانے سے بہت آگے ہوتا ہے تو ناقد اُس کو دبا دیتے ہیں لیکن اگر اُس کی شخصیت زبردست ہوتی ہے اور زمانہ بھی اُس کے موافق ہوتا ہے تو وہ ناقدوں پر فتح پاتا ہے اور نقد ہی کا معیار بدل جاتا ہے - غالب اپنے زمانے سے بہت آگے تھا لیکن اُس وقت زمانے نے اُس کی قدر نہ کی - مگر حالی و آزاد باوجود خلاف آہنگی نقد و تبصرہ ناقدوں پر فتح پا گئے - سبب یہ تھا کہ

زمانہ آزاد و حالی کے موافق تھا - انگریزی تعلیم کا کافی اثر پڑ چکا تھا اور چونکہ حالی و آزاد کا رنگ انگریزی ادب سے ملتا تھا اس لیے وہ چھا گیا اور اب اُس کا رواج عام ہے -

تنقید کا مادہ نقد ہے جس کے معنی پرکھنے کے ہیں -

تنقید کا معیار

اب دیکھنا یہ ہے کہ کس قسم کی محک ہونی چاہیے - محک جو ناقدوں کے پاس ہوتی ہے وہ قدما کے کارناموں سے بنتی ہے - اسی بات سے ناقد اپنے زمانے کے تصانیف کو جانچتا ہے مگر جانچتے وقت بڑی ہوشیاری اور ذمہداری چاہیے ورنہ بڑی خرابی پیدا ہو سکتی ہے - اگر قدما کے تصنیفی کارناموں کی مطابقت کی جائے گی تو یقیناً وہ ہرگز نہ ہو سکے گی - کیونکہ ہر زمانے کا رنگ کچھ نہ کچھ یقیناً جداگانہ ہوتا ہے اور اگر پرانے نمونوں سے مطابقت کُلی نہ ہونے کی وجہ سے موجودہ ادب کو ناقص کہا جائے تو یہ بڑی بے انصافی ہو گی اور اگر ناقد کی انفرادی پسند اور نا پسند کو معیار قرار دیا گیا تو بھی نقد منصفانہ نہیں کہا جا سکتا - اس لیے ناقد میں ایک خاص لیاقت کی ضرورت ہے -

اوصاف ناقد

نقد و تبصرہ کے لیے انگریزی میں الفاظ کریٹی سزم (Criticism) ریویو (Review) اور ہندی میں آلوچنا - سمالوچنا - انودرشن وغیرہ مستعمل ہیں - کریٹی سزم کے معنی وہی ہیں جو نقد کے ہیں یعنی پرکھنے کے اور ریویو کے معنی پھر سے دیکھنا ہے - تبصرہ کے معنی مخص دیکھنے کے ہیں ہندی کے لفظ انودرشن کے ٹھیک وہی معنی ہیں جو انگریزی میں ریویو کے ہیں - کیونکہ انو کے معنی بعد ہے اور درشن کے معنی دیکھنا ہے - آلوچنا اور سمالوچنا کو بھی دیکھنے سے تعلق ہے - لوچنا کے معنی دیکھنے کے ہیں اور آ کے معنی سب طرف سے ہر پہلو سے -

اسی آلوچنا کے پہلے لفظ سم لگانے سے سمالوچنا بنا ہے - سم کے معنی راست - درست - منصفانہ وغیرہ کے ہیں - پہلی بات جس پر نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ سنسکرت میں تنقید کے لیے کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس کے معنے پرکھنے کے ہوں - اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے تنقید کا مقصد کھوٹا اور کھرا بتانا یعنی تحسین و تنقیص کرنا اتنا نہیں ہے جتنا کہ کسی ادیب کو اچھی طرح سمجھنا ہے - اب لفظ انو درشن پر پھر نگاہ ڈالیے - اس کے معنے پیچھے دیکھنے کے ہیں - یعنی ادیب نے جس زاویۂ نگاہ سے چیزوں کو دیکھا ہے اُن پر اُسی زاویۂ نگاہ سے نگاہ کی جائے - اس کے یہ معنے ہوئے کہ ادیب کو کماحقہ سمجھنا ہی تنقید کا مقصد ہے - آلوچنا کے معنے ہیں سب طرف سے دیکھنا یعنی ایسا دیکھنا کہ کوئی نقطہ یا کوئی چیز نظر انداز نہ ہو اور اُس کی نگاہ سے ادب کی کوئی اصلیت پوشیدہ نہ رہ جائے - سمالوچنا میں اتنا مفہوم اور زیادہ ہے کہ اس طرح سے دیکھیے کہ کوئی بے عنوانی ہونے پائے - دیکھنا راست درست یعنی ہر لحاظ سے منصفانہ ہو - پس ناقد کے یہی اوصاف ہیں کہ اچھی طرح دیکھے اور انصاف سے دیکھے - دیکھنے میں جلد بازی نہ کرے - بلکہ نہایت صبر سے کام لے -

جب ناقد کو غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے تو چاہیے کہ اُس کے آنکھیں ہوں جن کی روشنی بہت ٹھیک ہو تاکہ وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز دیکھ سکے اور دور تک دیکھ سکے - آنکھ ہونے سے یہ مراد ہے کہ ناقد میں تنقید کرنے کا قدرتی مادہ موجود ہو - اگر اس قدرتی جوہر کی کمی ہے تو علم و فضل سے اچھا ناقد بننا نہایت دشوار ہے - یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات بہت کم پڑھے لکھے لوگ اچھا تبصرہ کر جاتے ہیں اور اکثر پڑھے لکھے لوگ باوجود گرانباری علم و فضل

اتنا کامیاب نہیں ہوتے - اس جوہر لطیف کے پتہ لگنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی - جس میں یہ جوہر ہوگا اُس کی پہلی تنقید اُس سے کہیں بہتر ہوگی - جسے اس جوہر سے محروم شخص نے عمر بھر کی مشق کے بعد لکھا ہو - دو ہی تین تنقیدوں میں خود ناقد کو پتہ چل جائیگا کہ گویا یہ چیز میری روح میں مضمر تھی - اور جس میں یہ جوہر نہوگا اُسے بھی جلد معلوم ہو جائیگا کہ میں کسی اور کام کے لیے بنایا گیا ہوں - ایسے شخص کو تنقید سے ہاتھ اُٹھا لینا چاہیے -

اب جسے قدرت کی طرف سے آنکھیں ملی ہوں اُسے چاہیے کہ سُرمے اور کاجل سے اپنی آنکھوں کی روشنی تیز کرے - یعنی علم و فن سے قدرتی مادہ کو چمکائے - اس سے یہ مطلب ہے کہ ناقد فن تنقید سے محض علمی طور سے واقف نہ ہو بلکہ عملی طور سے قدما کے شاہکار ناموں کو بوجھ گیا ہو - ادب کے جتنے شاہکار مل سکے ہوں سب کا با قاعدہ مطالعہ کر چکا ہو - یوں تو جتنی ہی بڑی بافتہ زبانوں سے ناقد واقف ہو اتنا ہی اچھا ہے مگر کم از کم اس کو اپنی زبان اور ایک دوسری زبان جو اُس کے زمانہ میں معراج ترقی پر ہو جاننا لازمی ہے - اگر وہ محض اپنی زبان جانتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ اُس کی نگاہ محدود ہو اور تنقید ناقص - زبان اردو میں ہندی فارسی دو جز و اعظم ہیں اس لیے اردو کے ناقد کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندی فارسی اچھی طرح جانتا ہو - اس کے علاوہ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ یورپ کی بہترین زبانوں میں سے کسی ایک کو مثلاً انگریزی ' فرانسیسی ' یا جرمن کو بھی جانتا ہو - تعصبات کا یہ بہت بڑا دھوکا ہے کہ آدمی جب ایک شعبہ میں قابل ہوتا ہے تو وہ اپنے کو ہر چیز میں قابل سمجھتا ہے اور ہر چیز پر رائے دینے کا حق رکھنے کی کوشش کرتا ہے -

ایک وکیل صاحب ہیں جن کو ادب سے بہت کم لگاؤ ہے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے میرے ایک دوست سے ایک شعر کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی جو اتنی ہی لغو بھی جتنی کہ ایسے شخص سے امید کی جاسکتی تھی۔ مگر اس کی صحت پر بڑے شد و مد سے بحث کر رہے تھے۔ میرے دوست نے اُن سے پوچھا کیوں وکیل صاحب اگر آپ سے کسی قانون کے بارے کوئی غیر قانونی آدمی بحث کرنے لگے تو آپ اُسے کیا سمجھیں گے۔ وکیل صاحب نے جواب دیا کہ میں اُسے اول درجہ کا احمق سمجھونگا۔ اس پر میرے دوست مُسکرائے اور بحث ختم ہوگئی۔ الغرض جس میں تنقید کرنے کی اہلیت نہو اس کو چاہیے کہ اس وادی میں قدم نہ رکھے۔

جب آنکھ بھی ہو اور اُس کی روشنی بھی کافی تیز ہو چکی ہو تو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آنکھ میں کوئی عیب یا بیماری تو نہیں ہے، جس سے کچھ کا کچھ دکھائی دینے لگتا ہو جیسے احول ایک چیز کو دو دیکھتا ہے بالکل آنکھوں کے امراض تعصب، دشمنی پارٹی بندی وغیرہ ہیں۔ اگر یہ امراض ہوئے تو ادیب کا حُسن بھی اُسے عیب معلوم ہونے لگے گا۔ چند حضرات لکھنؤ کا دعویٰ ہے کہ کسی غیر لکھنوی کو زبان نہیں آسکتی۔ یا بعض اصحاب کا اعلان ہے کہ کسی ہندو کو اردو آہی نہیں سکتی۔ یہ تعصب کی مثالیں ہیں۔ مگر آج کل اردو میں جو رسالے نکل رہے ہیں اُن کو دیکھنے سے عجیب تماشا دکھائی دیتا ہے۔ "منصر" ناقب صاحب لکھنوی کی غلطیاں اور خامیاں دکھلاتا ہے۔ "جام جہاں نما" میں کتنے لکھنوی حضرات کی غلطیاں طشت از بام کی جاتی ہیں۔ جناب بہار فتحپوری کی غلطیاں "منصر" میں اُجاگر کی جاتی ہیں۔ اس لیے میری رائے ناقص میں تو یہ بات آتی ہے کہ اُردو ایک ایسی زبان ہے،

جو نہ ہندؤں کو آسکتی ہے اور نہ مسلمانوں کو نہ لکھنوی کو اور نہ غیر لکھنوی کو ۔ خیر یہ لطیفہ تو بیچ میں آگیا تھا ۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ جب کسی فرد یا جماعت کے خلاف کوئی رائے قائم کرلی جائیگی تو خوامخواہ عیوب و نقایص اور خامیاں دکھائی دینے لگیں گی دشمنی کی مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔ پارٹی بندی یہ ہے کہ ناقد کو کسی خاص پارٹی یا اسکول کا حامی نہ ہونا چاہیے ورنہ وہ دوسرے اسکول یا پارٹی کے محاسن کو نہ دیکھ سکے گا ۔ المختصر تنقید کے لیے ناقد کو پہلے خود اپنا ناقد ہونا چاہیے ۔

غرض کہ جب آنکھ تیز ہو اور اس میں کوئی بیماری بھی نہ ہو تو چاہیے کہ تنقید کرتے وقت ناقد خوردبین اور دوربین کا استعمال کرے تاکہ جزئیات تک سے واقفیت ہوجائے اور کوئی ضروری بات نظر انداز نہ ہونے پائے ۔ اپنی انفرادی پسند اور ناپسند سے کنارہ کش ہونا دوربین ہے اور ادب کے ساتھ انتہائی ہمدردی خوردبین ہے ۔ اگر ناقد ان دونوں چیزوں سے کام لے تو یقیناً اس کی تنقید صحیح ہوگی ۔ الفاظ ریویو اور اپودرشن صاف طور سے بتلاتے ہیں کہ جس طرح ادیب نے چیزوں کو دیکھا ہے اُسی طرح تم بھی تنقید کرتے وقت اُن چیزوں کو اُسی زاویۂ نگاہ سے دیکھو ۔ اور یہ کب ممکن ہو سکتا ہے جب کہ ناقد اپنی انفرادی پسند اور ناپسند کو بالائے طاق رکھدے اور ادب کے ساتھ نہایت ہمدردی دکھائے ۔ ناقد کو چاہیے کہ ادیب کی تصنیف پڑھتے وقت اپنے کو ادیب کی پوزیشن میں ڈالدے ۔ یعنی اپنی شخصیت کو ادیب کی شخصیت میں محو کردے اور اُس کو وہی باتیں پسند یا ناپسند ہوں جو ادیب کو پسند یا نا پسند ہوں ۔

فراهمي مواد ذہنی

حب تنقید کا اصلي مقصد ادب کو کیا حقہ سمجھنا ھے تو دیکھنا چاھیے کہ ناقد پہلے کن کن چیزوں کو جمع کرے جن سے ادب کي ساخت دماغ کو سمجھ سکے ، جو تصنیف تو تنقید کا اصلي منبع ھے - اس کے لیے سب سے پہلے ادب کے تمام تصنیفات یہاں تک کہ مراسلات تک کو جمع کرے کیونکہ یہ سب چیزیں ایک ھی دماغ کا نتیجہ ھوتی ھیں - اسی لیے ان چیزوں کي مدد سے اس کے دماغ کا صحیح رجحان اور اس کے صحیح خیالات کا پتہ چلتا ھے - دوسرے یہ کہ ادیب کی مستند سوانحعمري حاصل کرے اور ان اُمور پر غور کرے اور ان شخصیتوں کا پتہ لگائے جن سے ادیب کے دماغ کي تشکیل میں مدد ملی ھے - تیسرے یہ دیکھے کہ ناقد کس قوم ملت کا ھے - وہ قوم یا ملت کہاں تک ترقی کر چکي ھے اور اس قوم یا ملت کے کیا خصوصیات ھیں کیونکہ اِن چیزوں کا بھي دماغ پر اچھا خاصہ اثر پڑتا ھے - چوتھے یہ کہ اُس زمانے کی تاریخ اور اس زمانے کے ادب کا گہرا مطالعہ کرے کیونکہ کوئي ہستي اپنے زمانے کی تحریکوں اور خیالوں سے بچ نہیں سکتی اور پانچویں اگر ممکن ھو تو اُس زمانے کي تاریخ ادب کا بھی مطالعہ کرے کیونکہ ایک مشہور ادیب ادبی تاریخ کي ایک کڑی ھوتا ھے - وہ اپنے پیشرووں سے اثر قبول کرتا ھے اور اس کا اثر آئندہ نسلوں پر پڑتا ھے -

اصلي ادیب کي پہچان

ادب دو قسم کے ھوتے ھیں ایک تو وہ جو دنیا کو ایک نیا روانۂ نگاہ دیتے ھیں جیسے کالیداس ، ورڈسورتھ ، ٹیگور وغیرہ - دوسرے وہ جو فنی حُسن کو ہمیشگی عطا کرتے ھیں یا دنیا کي معمولي سی معمولي چیزوں میں ایک

حُسن دیکھتے ھیں جس پر عوام کي نگاہ نہیں جاتي اور اسي حُسن کي تصویر کھینچ کر وہ دنیا کو نیا بنانے کی کوشش کرتے ھیں - دنیا کے تمام نیچرل شعرا کا اسي طبقہ میں شمار ھے - نظیر اکبرآبادي نے دنیا کي معمولي سے معمولي چیزوں میں ایک حُسن دیکھا جسے اور لوگ نہیں دیکھہ سکتے تھے - اُس نے اسي حُسن کی مرقع نگاریاں کي ھیں - وقتی خوبصورتی بھي دنیا کے لیے نئي چیز ھوتي ھے جو قدرت کی طرف سے ھمیں ملتي ھے - اگر اس کا فوتو ذریعہ ادب ھمیشہ کے لیے ھمارے درمیان نہ رہ جاے تو دنیا کی یکسانیت سے ھم بہت جلد اُکتا جائیں - سیکڑوں حسن قدرت کي طرف سے آتے ھیں - سچے ادیب اس کو ادب کا آب حیات پلا کر زندگی دوام بخش دیتے ھیں - قدرتي مناظر کے علاوہ انساني زندگي کے مختلف شعبوں میں سیکڑوں تصویریں وفا کي، محبت کي، غرور کي، غصہ کي اور نہیں معلوم کتنے جذبات کي سامنے آتی ھیں - سچے ادیب ان کو شعر میں، ناول میں، قصوں میں، ڈراموں میں بیان کر کے امر کر دیتےھیں - رامائن کیا ھے؟ انساني زندگي و جذبات کے مختلف مرقعوں کا ایک مجموعہ ھے جس کو والمیک اور تلسی‌داس حیات جاوداني دے گئے ھیں - شکسپیر، فردوسي، آتش وغیرہ بھی اسي قسم کے ادیب ھوگئے ھیں -

پہلي قسم کے شعرا یا ادیب جو دنیا کو ایک نیا زاویۂ نگاہ دیتے ھیں اور دوسري قسم کے ادیب جو وقتي حُسن کو ھمیشگی عطا کرتے یا معمولي چیزوں میں کوئي حسن دیکھہ کر اس کا فوتو کھینچتے ھیں - اِن دونوں میں فرق یہ ھے کہ پہلا اپنے پڑھنے والوں کو اس دنیا سے اُٹھا کر اپنے ساتھہ دوسری دنیا میں لے جاتا ھے -

اور دوسرا خود پڑھنے والوں کے پاس آتا ہے - پہلا غیر محسوس یا غیر مرئی چیزوں کا پرستار ہوتا ہے اور دوسرا اسی دنیا کی محسوس اور مرئی چیزوں کا عاشق ہوتا ہے - ٹیگور - میرا - کبیر - پہلی قسم میں آتے ہیں اور ایلیس - فردوسی وغیرہ دوسری میں -

تنقید کا مقصد جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے ادیب کو سمجھنا ہے اس لیے مواد تنقید فراہم کرنے کے بعد کلیات ادیب کا گہرا مطالعہ کرے اور جہاں کہیں کوئی غلطی یا خامی یا نقصان نظر آئے اُس سے بد ظن نہ ہو - جہاں تک ہوسکے ان کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کرے اور جس طرح ملزم کو شک کا فائدہ ملتا ہے اسی طرح کم از کم ادیب کو بھی ملنا چاہیے - اس طرح گہرا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چل جائیگا کہ کون اصلی ادیب ہے اور کون نقلی - اور بس یہی منتہائے تنقید ہے اور یہی اس کی آخری منزل -

دونوں قسم کے ادیب کی پہچان ان کی کامیابی ہے - کامیابی کے یہ معنے ہیں کہ باوجود خلاف تنقیدوں کے بھی ادیب ہر دلعزیز ہونے لگے - محض عوام میں نہیں بلکہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی - ادیب کے الفاظ اور طرز تحریر کی نقل ہونے لگے - ٹیگور کے اصلی شاعر ہونے کی یہی دلیل ہے کہ ہندی میں خاص طور سے اور اردو میں کم و بیش ٹیگورین طرز غالب آرہی ہے - مگر اس کسوٹی پر ادیب کو کسنے کے لیے بہت وقت چاہیے - اس لیے ایک دوسری پہچان بھی ہے وہ یہ کے جن چیزوں کا ادیب بیان کرتا ہے اُن کا اُس کی زندگی پر کوئی اثر ہے کہ نہیں - اگر اثر ہے تو وہ اصلی ہے ورنہ نقلی - ورڈسورتھ نے اگر کوئل پر نظم لکھی تو واقعی کوئل کی آواز اس کو ایک جذبے سے بیقرار کر دیتی تھی - اگر اُس نے ڈیفوڈلز (ایک پھول) پر کچھ لکھا تو وہ واقعی پھولوں کو دیکھ کر مست ہو جاتا تھا - لیکن کیا اردو غزل گویوں نے کبھی اُس

بیخودی کا خواب بھی دیکھا ہے جس کا بیان وہ بڑے شوق سے کیا کرتے ہیں - بہت سے ایسے شعراء ہیں جن کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ چیز ان کے مذہب کے منافی ہے مگر غزل میں وہ تصوف کا بیان کرتے ہیں یہ سب نقلی شاعر ہیں - جتنے نقلی شاعر اُردو میں ہوئے ہیں اُتنے دنیا کے کسی اور ادب میں نہیں ہوئے ہیں - اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا ہی فارسی شاعری کی نقل سے ہوئی - علم عروض - علم معنی علم بیان وغیرہ فارسی سے عاریت لیے گئے - تشبیہات تلمیحات - وغیرہ سب فارس یا عرب کے ہیں - لیلیٰ مجنوں - شیریں، فرہاد، گل، بلبل، نرگس و شمشاد وغیرہ اس کی بین مثالیں ہیں مگر ولی دکنی کے وقت سے تا یوں کہئے کہ جب اردو شاعری دلی میں پہنچی تو فقرا اور اولیا کی برکت سے اس میں تصوف کی چاشنی مل گئی جس کی وجہ سے اس میں ایک روح آگئی تھی مگر جب یہ لکھنؤ میں پہونچی تو لفظی تکلفات و رعایات میں اُلجھ کر اپنی رسمی اور لکیر کی فقیر بن گئی کہ اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کا قول بہت سچ معلوم ہوتا ہے، انہوں نے شاید کچھ لوگوں میں فرمایا کہ اردو میں دیوان لکھنا کچھ مشکل نہیں - دو دیوان کوئی دیکھے تو تیسرا نہایت کامیابی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے - میرے ایک اور دوست کا قول ہے کہ " اگر میں چند الفاظ از قبیل گل، بلبل - آشیاں، قفس، صیاد، زندان، زنجیر، صحرا، وحشت، بیماری، جنازہ، مرقد، ہجر اور وصل وغیرہ وغیرہ لکھ دوں تو اردو میں بڑے سے بڑے استاد کا مضمون ان کے باہر نہیں جا سکتا - " اس قول میں بھی بہت کچھ صداقت ہے - اردو شاعری کے رسمی رہ جانے کا دوسرا سبب مشاعرہ ہے جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے - تیسرا

سبب رسم اُستادي و ساگردي ہے اِس کی نظیر دنیا کے پردے میں ملنا محال ہے - کسي اور زبان میں یہ طریقہ نہیں پایا جاتا - یہاں تک کہ ہندی اور فارسی میں جس سے کہ اردو کا خمیر تیار ہوا ہے یہ رسم معدوم ہے - کہا گیا ہے دد السعراء تلامذ الرحمان - مگر یہاں اُردو میں دیکھیے کتنے لوگ خدائي کا دعویٰ کر رہے ہیں - اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کے استاد کے رنگ کي وراثت ساگردوں کو ملتي ہے اور ایک خاص لکیر کا سلسلۂ لامتناہي چلتا ہے جس کے سیکڑوں ہزاروں فقیر پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں - ناسخ میں جو روکھا پھیکا پن اور بے کیفي ہے جو لفظوں کي زیادت ہے اس کا عکس خواجہ وزیر ؟ اور رسک وغیرہ میں نمایاں ہے - اس میں شاگردوں کي استعدادت کا خواہ مخواہ خون ہوتا ہے - شاید ہي کوئي ایسي شخصیت ہوتي ہے جو اس مرض کا سکار نہیں ہوتي اور اپنا ایک علیحدہ رنگ قائم رکھتی ہے - سبب یہ ہے کہ ساگرد کے لیے استاد آئیڈیل ہوتا ہے - اس لیے شاذ و نادر کوئي ایسا ناخلف ساگرد ہوتا ہے جو استادکے رنگ سے رو گرداني کرتا ہو - ساگردي کا مرض اردو میں اتنا عام ہے کہ شاید ہي کوئي ایسا شاعر ہو جسے یہ چھوت نہ لگي ہو - تعجب تو یہ ہے کے آج کل کے نو جوان جو یونیورسٹی سے اعلیٰ ڈگري لے کے نکلتے ہیں اور جوکم و بیش یوروپین لٹریچر سے آشنا ہوتے ہیں اُن پر بھی یہ جادو چل جاتا ہے اور اکثر اوقات وہ کسي پرانے دھرانے فارسی عربي پڑھے ہوئے مولوی کے ساگرد ہو جاتے ہیں جس کا دماغ اتنا محدود ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زندہ ہوتے ہوئے بھي اُس کو بلا مبالغہ سترھویں یا اٹھارھویں صدي کا آدمی کہہ سکتے ہیں - ایسا استاد اعلیٰ تعلیم یافتہ ساگرد کے خیالات کو سمجھ بھی نہیں سکتا اُصلاح بھلا کیا دیگا - کیا کرے چاروناچار اُس کو زبان و محاورہ کے دام میں پھنسا کے مرعوب

کیے رهنا هے - میری رائے میں اول استاد نہ رکھے اور اگر ضرورت هي هو تو کسي ایسے شخص کو استاد بنائے جو شعر نہ کہتا هو اُس سے عروض و قافیہ وغیرہ پڑهه لے مگر اصلاح نہ لے اور اصلاح بهي لے تو یوں کہ استاد محض غلطیوں کو بتا دے اور شاگرد اس کو خود درست کرے - استاد اس کے سوا اور کچهہ کر بهي نہیں سکتا کیونکہ کوئي استاد ؛ شاگرد کے دماغ اور خیالات کو بدل نہیں سکتا - استاد کي مثال میرے ایک دوست نے درزي سے دي هے اور وہ بہت درست هے کیونکہ درزي تراش خراش کر سکتا هے مگر کپڑے کي ماهیت نہیں بدل سکتا - اردو تنقید میں جو زبان و محاورہ کا اتنا طومار هے وہ اسي رسم استادي کي بدولت هے کیونکہ لے دے کے یهي چیز هے جس پر ان کے قصر اُستادي کی بنیاد هے - اس لیے اگر زبان و محاورہ کي دهر پکڑ اردو سے رخصت هو جائے تو کتنے استادوں کي استادی تشریف لے جائے - کتنے زبان کے مرکزوں کي مرکزیت رفو چکر هو جائے - اهل زبان و زبان داں کا امتیاز خدا جانے اُڑ کے کہاں پہونچے - زبان و محاورہ کي گرفت اردو کے لیے مخصوص هے - کسي یورپین یا ایشیائي زبان میں یہ حماقت نہیں کہ شاعر کو زبان و محاورہ کي غلطیوں کا مجرم ٹهہرایا جائے اور صرف اِس جرم کي بنا پر اُس کي تمام شاعري پر پاني پهیر دیا جائے شاید اُنهیں حماقتوں نے اقبال ایسے شاعر کو اُردو کي گود سے چهین لیا - اقبال نے اُردو شاعري سے توبہ کرلي هے کیوں کہ نہ برابر کہا جاتا تها اور اب بهي کہا جاتا هے کہ پنجابیوں کو اُردوؔ نہیں آ سکتي گو کہ حالي کی پیشین گوئي کہ اُردو دلي اور لکهنؤ سے اُٹهہ کر پنجاب پہونچ جائیگي ' بالکل صحیح اُتر رهي هے - وہ فارسی شاعر جس نے کہا تها کہ " شعر مرا

مدرسہ کہ برد؟؟ تنقید کے صحیح معنے اور زبان و محاورہ کی غلطیوں کا صحیح مقام جانتا تھا - سچ ہے زبان و محاورہ کی غلطیوں کی گرفت مدرسہ میں ہونی چاہیے جہاں طلبا کو زبان سکھائی جاتی ہے نہ کہ تنقید میں جس کا منشا ادیب کو کماحقہ سمجھنا ہے -

شاعر یا ادیب کا کام دنیا کو نیا کرنا ہے - اِس لیے وہ ایک نیا رنگ پیش کرتا ہے اور ایک نئی طرز تحریر کی بنا ڈالتا ہے - الفاظ کو نئے معنوں میں استعمال کرتا ہے اور نئے محاوروں کی تخلیق کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ورڈ سورتھ - شیلی اور ٹیگور وغیرہ کے یہاں بے شمار الفاظ ہیں جن کو اِن شعرا نے اپنے کسی خاص معنے میں استعمال کیا ہے - کیسی غلطی اور کتنی بے انصافی ہے کہ شاعری کو پہلے سے بندھے ٹکے الفاظ و محاورہ کی ناپ سے ناپا جائے - یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں کی تنقید میں زبان و محاورہ کی غلطیاں نہیں دکھائی جاتیں - بلکہ ناقد ادیب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے الفاظ کو نوٹ میں ظاہر کر دیتا ہے جن کو ادیب نے خلاف رواج اپنے کسی خاص معنے میں استعمال کیا ہے - کیونکہ یہ تو ہر شاعر کا قدرتی حق اور طُرّۂ امتیاز ہے - مگر اُردو میں جہاں اور تماشے ہیں وہاں یہ بھی ہے - اُردو میں ایک بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اگر پرانی باتوں کو لکھو تو اعتراض ہو کہ اِس میں نیا کیا ہے؟ اساتذہ یہ سب کچھ کہہ گئے ہیں چھوڑ کیا گئے ہیں؟ اور اگر کوئی جدّت کی جائے تو کہا جائے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کیونکہ سلف سے آج تک کسی اُستاد نے ایسا لکھا ہی نہیں - مثال کے لیے ایک شعر پیش کرنا چاہتا ہوں - شاعر

ے ایک نظم نعت میں لکھی ہے جس میں سجدہ کا ذکر ہے - شریعت میں نبی کے لیے سجدہ کا حکم نہیں ہے جیسا کہ اسی نظم کے ایک شعر سے ظاہر ہے -:

" جلوں میں جان جزیں کو نثار کر ڈالوں

جس جو اہل شریعت جبیں کو اذن سجود "

مگر آگے چل کے جب نبی نے خود ساعر کا مدعا پوچھا تو نظم کے آخری دو تین شعر یوں ہیں —

کچھ اس ادا سے مرا اُس نے مدعا پوچھا

ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود

ذرا خبر نہ رہی ہوس و عقل و ایمان کی

یہ شعر پڑھ کے وہیں ڈالدی جبینِ سجود

چو بعد خاک شدن یا زیاں بود یا سود

بہ نقد خاک سوم بنگرم چہ خواہد بود

جب شاعر کی یہ حالت ہوئی کہ عقل و ہوس و ایمان کی ذرا بھی خبر نہ رہی تو وہ قیود شریعت سے آزاد ہو گیا اور اِس لیے اب جبین سجود کا ڈالنا جائز ہو گیا - مگر سنئے اس پر لائق ناقد نے اعتراض کیا ہے کہ جبیں ڈالنا محاورہ نہیں ہے جبیں رکھنا یا جھکانا صحیح ہے کیونکہ آج تک کسی اُستاد نے جبیں ڈالنا نہیں لکھا - ناقد ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں - انگریزی تعلیم سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں - مگر اُردو میں زبان و محاورہ کا ایسا جال بچھا ہوا ہے کہ اُس سے بچنا مشکل ہے - اِس جمّام میں سب ننگے نظر آتے ہیں - جو نازک فرق جبین رکھنے اور جبین ڈالنے میں ہے وہ ناقد کے فہم سے یا تو بالا تر ہے یا وہ جان بوجھ کر کسی وجہ سے اُس پر نگاہ ڈالنا

نہیں چاہتا - جبیں رکھنے کے معنے سمجھ بوجھ کر کسی
مقام در سر جھکنا ہے - اِس میں ارادے کا اچھا خاصہ رنگ ہے
اور جبیں ڈالدینے میں ایک بیخودی ایک اضطراری کیفیت ہے
جو عقل و ہوش سے بے نیاز ہے - اب بتائیے یہاں کون لفظ موزوں ہے
میرے خیال میں اگر یہاں جبیں رکھ دینا یا جھکا دینا جیسا
کہ ناقد نے اصلاح دی ہے بنا دیا جائے تو شعر چوپٹ ہو جائے -
نہیں، نہیں، پوری نظم بے معنی ہو جائے اور نعت کی شان جاتی
رہے - "دیدیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذن سجود" اور "زرا خبر
نہ رہی ہوش و عقل انساں کی" وغیرہ وغیرہ کی چول نہ بیٹھے
مگر چاہے زمین اُلٹ جائے اور چاہے آسمان درہم برہم ہو جائے -
یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جبین رکھنے یا جھکانے کے بجائے جبین
ڈالدینا لکھا جائے - کیونکہ ایسا تو کسی اُستاد نے لکھا ہی
نہیں - جس ادب میں اتنی غلامی موجود ہو وہ بھلا کیا ترقی
کر سکتا ہے - اردو ادیبوں کو اِس شاعر کا ممنون ہونا چاہیے اور
خود اُردو ادب کو اِس زیر بار کرنا چاہیے کہ ایک اضطراری
حالت میں سجدہ کرنے کے لیے بلکہ سجدہ ہو جانے کے لیے
اُردو میں کوئی لفظ نہیں تھا - اِس شاعر نے اُسے عطا کیا -
یہی نئے محاورہ کی تخلیق ہے جو ایک زندہ زبان کے لیے
لازمی ہے - محاورے آسمان سے تو اُترے نہیں، انسانوں ہی نے
اُنھیں بنایا ہے - اِن کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ کبھی کوئی
ترکیب لفظی عوام کی جانب سے نکلتی ہے مگر وہ اتنی خوبصورت
و دلکش ہوتی ہے کہ خواص تک میں مقبول ہو جاتی ہے اور کبھی
خواص سے نکلتی ہے اور عوام میں پھیل جاتی ہے - ہمیشہ اِن
کی تخلیق ہوتی رہنا چاہیے اور ہرکس و ناکس کو اختیار ہے

کہ وہ نئے محاوروں کی تخلیق کرے - یہ بات دوسری ہے کہ جس
میں جان ہوگی وہ سب کے زبانوں پر چڑھ جائیگا اور اُس کا
استعمال عام ہو جائیگا اور جو رَدّی ہوگا اُسے خود کوئی نہیں پوچھے گا
یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ معنی بمنزلۂ جسم ہے اور الفاظ و
محاورہ بمنزلۂ پوشاک - اگر شیروانی فٹ نہیں آتی تو اُسے یہاں
وہاں سے کھول کر ٹھیک کر دو اور کسی طرح درست نہیں ہوتی
تو خیرباد کہو - لیکن یہ کہاں کا دستور ہے کہ شیروانی کو ہاتھ نہ
لگاؤ بلکہ ایک پسلی کو دبا دو جس سے شیروانی فٹ ہو جائے -
زبان محض خیالات کے اظہار کا آلہ ہے - وہ زبان مردہ ہے جس میں
نئے نئے الفاظ و محاورہ کی تخلیق زور شور نہ ہو رہی ہو - مگر
اردو میں زبان کے ٹھیکے دار جو کچھ اساتذہ لکھ گئے ہیں بس
اُسی سے زبان کو محدود رکھنا چاہتے ہیں - اگر ایسا ہوا تو اردو ترقی
نہیں کر سکتی اور چند ہی روز میں مثل سنسکرت ایک مردہ زبان
ہو جائیگی - سنسکرت کے گرامر بنانے والوں نے بھی یہی غلطی کی
تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت ایک مردہ زبان ہو گئی -
لسانیات کا یہ سب سے زبردست اصول ہے جس سے کوئی زبان مستثنیٰ
نہیں ہو سکتی - جو محاورے آج کل رائج ہیں اُن کی تخلیق پرانے
اساتذہ نے اپنے زمانے میں کی تھی اگر اُن کے عہد میں آج کل کی طرح
کوئی اُن سے معترض ہوتا ' کہ آپ نے یہ محاورہ کس طرح نظم کیا - اس
طرح تو قدما میں سے کسی نے لکھا ہی نہیں - تو آج زبان کی کیا
حالت ہوتی - یقیناً زبان کی ترقی رک گئی ہوتی - اسی طرح اگر
آج اسی طرح کے اعتراض کیے جاتے ہیں تو اس کے صاف معنی
یہی ہیں کہ آیندہ ترقی کے راستے مسدود کیے جاتے ہیں - اگر اردو
اخباروں پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے کہ ہمیں روز کے اندر اندر

کتنے نئے لفظ مستعمل ہوگئے ہیں، مگر اُن کے لیے کوئی شور نہیں مچاتا۔ ہاں اگر نظم میں کوئی جدّت کرے تو بے شک وہ گردن زدنی ہے -

خیر یہ تو غیر متعلق بحث تھی - میں کہہ رہا تھا کہ جس شاعر کی زندگی میں اُن باتوں کا اثر نہ ہو جن کا ذکر وہ اپنی شاعری میں کرتا ہے تو فوراً ناقد کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اصلی شاعر نہیں ہے - اگر کسی شاعر یا ادیب کی طرز تحریر سب سے الگ تھلگ نہیں ہے اور وہ ادب کو نئے معنے اور نئے لفظ نہیں دیتا تو سمجھ لو کہ وہ نقال ہے - اس لیے اگر کوئی شاعر اپنے استاد کے رنگ میں کہتا ہے یا کسی غزل یا دیوان کا جواب لکھتا ہے ؟ یا کسی کتاب کا نظم میں ترجمہ کرتا ہے تو پہچان لو کہ وہ غیر شاعر ہے - اسی طرح اگر کوئی مشاعرہ، دربار ؟ نام نمود یا انعام پانے کے لیے یا کسی اور غرض سے شعر کہتا ہے تو اُس کے شاعر ہونے پر ایمان نہ لانا چاہیے، کیونکہ شعر ایک جذبہ ہے جو خود اُبلتا ہے -

یہاں پر یہ بھی جان لینا بیجا نہ ہوگا کہ معدودے چند لوگ ایسے ہوئے ہیں کہ بغیر تجربہ یا محسوس کی ہوئی چیزوں کو اس طرح لکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں گویا اُن کے اوپر بیتی ہوئی داستان ہے - جیسے حضرت ریاض جنھوں نے شاید عمر بھر کبھی شراب نہیں پی مگر ان کے خمریات ایسے معرکۃالآرا ہیں کہ اگر ان کو کوئی نہ جانتا ہو تو شاید اُسے یقین آجائے کہ وہ بڑے میخوار ہیں - جن لوگوں میں ایسی صلاحیت موجود ہوتی ہے اُنھیں آرٹسٹ کہنا چاہیے - منظوم ترجمہ کرنے والے کو بھی آرٹسٹ ہی کہنا چاہیے - مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اور آرٹسٹ کا اجتماع ایک ہی شخصیت میں ہوجاتا ہے اور ایسے شخص کی شاعری میں چار چاند لگ جاتے ہیں - اوپر جو دو قسم کے شاعر بتلائے گئے ہیں ان میں سے دوسری قسم والوں

کو آرٹسٹ ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اُنھیں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے خود آنا پڑتا ہے - اُن کی شاعری پہلی قسم کے شعر کی طرح انفرادی نہیں ہوتی - یہ نیچر کی یا انسانی جذبات و واقعات یا تغیرات زمانہ کی تصویریں کھینچتے ہیں - اس لیے اگر یہ بڑے آرٹسٹ نہیں ہیں تو اُن کی مصوری ناقص رہ جائیگی -

گو کہ آرٹسٹ سچے شاعر کی نقل کر لیتا ہے اور اِس کمال سے کہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے مگر جیسا کہ ایک شخص کا قول ہے کہ وہ زمانہ آنے والا ہے جب فن تنقید اتنا ترقی کر جائے گا کہ آرٹسٹ دھوکا نہ دے سکے گا - مگر اِس زمانے میں بھی اگر غور کیا جائے تو بھی (بہزار دقت) پتہ چل ہی جاتا ہے کہ کون آپ بیتی کہتا ہے اور کون جگ بیتی -

آیا تنقید میں موازنہ کی ضرورت ہے؟

تنقید میں موازنہ کی ضرورت ہے؟ کیونکہ تنقید کی غرض ادب کی شخصیت کو کما حقہ سمجھنا ہے اور شخصیت اچھی طرح نمایاں نہیں ہوتی جب تک کہ اُسی قسم کے دوسرے ادیبوں سے مقابلہ و موازنہ نہ کیا جائے - خیالات میں بھی موازنہ ہونا چاہئے اور طرز تحریر میں بھی تاکہ معلوم ہو کہ اس کے خیالات میں اوروں سے کیا امتیاز ہے - اور وہ کون کون سے الفاظ و محاورہ ہیں، جن کی اُس نے تخلیق کی اور وہ کون کون الفاظ ہیں جن کو اُس نے کسی خاص معنے میں استعمال کیا - لیکن اس موازنہ میں بڑے چھوٹے کا خیال نہ ہونا چاہیے - اس بات کی کوشش نہ ہونا چاہیے کہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دی جائے یا ایک کو دوسرے سے برتر ثابت کیا جائے - ہندی میں میں دیو اور بہاری کے جھگڑے کے سلسلے میں جو ابھی تک کچھ نہ کچھ جاری ہے

موازنے کا (جس کو ہندی میں تُلنا تمک سما لوچنا کہتے ہیں) جیسا غلط استعمال کیا گیا ہے وہ بیان سے باہر ہے - تنقید میں ہرگز یہ غیر تنقیدی مظاہرہ نہیں ہونا چاہئے - اردو میں بھی یہ زہر سرایت کیے ہوئے ہے - تنقید کا مقصد یہ ہے کہ پہلے طے کر لیا جائے کہ ادیب ادیب ہے یا نقّال - اس کے بعد سمجھنے سمجھانے کی بہترین کوشش کی جائے کیونکہ بہترین ناقد بہترین شارح ہوتا ہے - اس کے بعد ناقد بذریعہ موازنہ و مقابلہ ادیب کی خصوصیات جو خیالات و جذبات سے متعلق ہیں اور جو طرز تحریر سے وابستہ ہیں ، دونوں کو نمایاں طور سے پیش کرے - اس کے علاوہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بھی موازنہ کی ضرورت ہے - ناقد کے پاس ادبیات کو پرکھنے کی کسوٹی صرف قدما کا بہترین کارنامہ ہے ، مگر جیسا کہ لکھا گیا ہے اس قسم کے موازنہ میں بڑی ہوشیاری و خبرداری چاہیے - ادیب قدما کے کارناموں میں مقید نہیں رہ سکتا کیونکہ اگر ایسا کرے تو وہ اصلی ادیب نہیں ہو سکتا - اس لیے کہ جدّت ہی اصلی ادیب کی پہچان ہے - قدما کے نمونوں کی ظاہری باتوں اور جزئیات و تفصیلات سے موازنہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اُن کی جو اسپرٹ یعنی روح ہے اُس سے مقابلہ کرنا چاہیے - مثلاً مرثیہ میں ساقی نامہ کہنے کا رواج ہے - تو اب اگر کوئی مرثیہ لکھے اور اس میں ساقی نامہ نظر انداز کر دے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مرثیہ ، مرثیے کے معیار سے گرگیا - یا انیس نے ساقی نامہ نہیں کہا تو اُن کے مرثیوں میں اس کی وجہ سے کوئی خامی ہے - یا حالی نے جو غالب کا مرثیہ لکھا ہے اس میں نہ چہرہ ، نہ گھوڑا ، نہ تلوار ، نہ رخصت ، نہ جنگ - یعنی مرثیہ کی مسلّمہ چیزوں میں سے کچھ نہیں ہے ، مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مرثیہ نہیں ہے -

نقائص تنقید

جب تنقید کے معنی چیزوں کو اسی نگاہ سے دیکھنا ہے جس سے کہ ادیب نے دیکھا ہے تو تنقید کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ناقد تصنیف پر تنقید میں اپنے خیالات ٹھونسنے کی کوشش کرے۔ تلسی داس کی سیدھی سیدھی چوپائیوں میں آج کل جتنے معنی پیدا کئے جا رہے ہیں وہ یقیناً تلسی داس کے بھی دماغ میں نہ رہے ہوں گے۔ رامائن ایک داستان ہے جس میں تسلسل کے اعتبار سے چوپائیوں کے ایک اور صرف ایک معنے ہیں مگر ناقدوں اور شارحوں کی موشگافیوں کو کوئی کیا کہے۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ تنقید ذاتی اغراض سے وابستہ ہو۔ مثلاً نام و نمود کے لئے۔ اپنے کو ناقد یا شارح ثابت کرنے کے لئے؟ اپنا رعب بٹھانے کے لئے، اپنے کو دوسروں سے بہتر ثابت کرنے کے لئے، دوسروں کو نیچا دکھانے کے لئے، محض اعتراض کرنے کا شوق پورا کرنے کے لئے، اپنے اسکول یا مذاق یا پارٹی کا وقار قائم رکھنے کے لئے، وغیرہ وغیرہ، ہزاروں اقسام کے اغراض ہو سکتے ہیں۔ تیسرا نقص مذکورۂ بالا ''آنکھوں کی بیماری'' سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر تعصب، بغض، دشمنی، پارٹی بندی وغیرہ کا چشمہ لگا ہوا ہے۔ تو یقیناً تنقید صحیح نہیں ہو سکتی۔

تاریخ تنقید ادب اردو

اردو میں دوسری زبانوں کی طرح کسی ادیب یا شاعر پر ایک پوری کتاب لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ تاریخ تنقید میں جو کچھ ملتا ہے وہ کچھ لوگوں کی بیاضیں یا تذکرے ہیں، جن میں معاصرین یا بعض قدیم شعرا کے نہایت مختصر حالات ہیں اور ایک آدھ جملے تنقید پر ہیں جن سے کسی شاعر کی خصوصیات بہ مشکل ہی معلوم کی جا سکتی ہیں اور آخر میں کلام کا کچھ انتخاب ہے۔ پہلے تو یہ سب تذکرے فارسی

میں ہیں اور بعض اوصاف تذکرہ نویس اُس شاعر کی اچھی طرح خبر لیتا ہے ، جس سے اُسے کوئی بغض یا عناد ہے ، مثلاً میر بھی ، میر شاہ حاتم استاد رفیع السودا کے بارے میں جن کا سبھی تذکرہ نویسوں نے ادب کیا ہے ، لکھتے ہیں '' مرد جاہل و متمکن '' مگر عموماً تذکرہ نویس کسی کو برا کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور سب کی کچھ نہ کچھ تعریف ہی کرتے ہے - اس رنگ میں پہلی تبدیلی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے '' گلشن بے خار '' میں کی جس کی بابت رام بابو سکسینہ اپنی ہسٹری آف اردو لٹریچر میں لکھتے ہیں کہ '' ہمارے نزدیک یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف و آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے '' مگر اب بھی تنقید کا منتہیٰ تحسین و تنقیص ہی رہا - بہر حال قدما سے لیکر مولانا آزاد تک کم و بیش یہی رنگ رہا - اسے دور اول کہہ سکتے ہیں - آزاد نے دوسرا دور شروع کیا - شعرا کے حالات جہاں تک مل سکے بہم پہنچائے - شاعر پر زمانے اور صحبتوں کا اثر بھی کچھ نہ کچھ دکھایا اور زبان کا آغاز اور اس کی ارتقائی منزلوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا - مگر آزاد کہیں کہیں جادۂ انصاف سے ہٹ گئے ہیں جیسے ذوق و غالب کے معاملے میں اور انہوں نے بہت سے بے بنیاد قصے اور کہانیوں کو اپنی کتاب میں داخل کر لیا ہے - اس دوسرے دور میں جلوۂ خضر - گل رعنا - خمخانۂ جاوید - شعر الہند وغیرہ اچھی اچھی کتابیں نکلیں - مگر اس کام کو رام بابو سکسینہ نے سب سے بہتر کر دکھایا -

منتخب شعرا پر تذکرے کے [illegible] لکھنے کی بنا مولانا حالی نے ڈالی ، '' یادگار غالب '' اور '' حیات سعدی '' لکھ کر لوگوں کو ایک نیا راستہ دکھایا مگر [illegible] میں اور

غلطیوں اور خامیوں کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس کے بعد مرزا احسان احمد بی اے ال ال بی نے " داغ جگر " پر ایک ایک مبسوط مقدمہ لکھا جس میں واہ وا کی کثرت ہے پھر تو سیکڑوں مقدمے لکھے گئے " حسن مین " داغ جگر " کی طرح شاعر کی خصوصیات کے عنوان قائم کیے گئے اور بہت سے شعر ان کی بحث میں دے گئے ۔ بہت سے شعروں کی شرح کی گئی اور اُن کی خوبیاں وضاحت سے بیان کی گئیں ۔ اس کے بعد تنقید کی جو لہر چلی تو اب جسے دیکھو وہ دوسرے کو کھائے جاتا ہے ۔ ایک صاحب لکھنوی اور غیر لکھنوی کی بحث چھیڑے ہوئے ہیں دوسرے صاحب تمام شارحین غالب سے اُلجھے ہوئے ہیں بہر حال وہ ہنگامہ برپا ہے جس کا جواب کسی اور ادب میں ملنا نا ممکن ہے ؟ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہایت غیر منصفانہ طور سے اس پر تلے ہوئے ہیں کہ اردو میں جتنی خرابیاں ہیں سب کو بجا ثابت کریں ۔

مگر تحسین و تنقیص سے ہٹ کے شاعر کی ساخت دماغ کو سمجھنے میں اُس کے خیالات و جذبات کے منبع کی تلاش کرنے میں ابھی تک بہترین کوشش نہیں ہوئی ہے ۔ جس میں انفرادیت پسندی کو بالائے طاق رکھکر انتہائی ہمدردی کے ساتھ اس طرح تبصرہ کیا گیا ہو کہ ادب کے زمانے کی تاریخ کی کافی چھان بین کی گئی ہو اور ہمعصر شعرا و ادبا کے اشعار و تصانیف سے زمانے کی پسند کو نمایاں کیا گیا ہو اور جو انفرادیت ادب کو کسی خاص قوم یا ملت میں پیدا ہونے کی وجہ سے ملی ہو اس پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہو اور جن جن تحریکوں یا ہستیوں نے ادیب کے دماغ کی تشکیل میں مدد دی ہو اُن کے اثرات کا پورا پورا

تجربہ کیا گیا ہو - یعنی ادیب کے نفسیات (psy chology) کی
انصاف کے ساتھ پوری تحقیق و تدقیق کی گئی ہو اور ادب کی
مختلف خصوصیات کا منبع و ماخذ بتایا گیا ہو - مگر ساتھ ہی ساتھ
واہ یا آہ ؟ تحسین اور نفرین سے مبرّا و منزّہ ہو - گذشتہ سال ایک
آدھ جگہ ایسی تنقیدوں کی جھلک دکھائی دی ہے - یہاں سے
تنقید کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کی قسمت آئندہ کے ہاتھ
میں ہے مگر اختتام مضمون پر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر
اردو تنقید کو تنقید کا درجہ حاصل کرنا ہے تو چاہیے کہ اعلی
تعلیم یافتہ لوگ جو یورپین طرز تنقید سے بخوبی واقف ہوں اس
کام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور جہاں ایسا ہوا وہاں ان نا اہلوں کا گروہ
جو موجودہ اردو پر خواہ مخواہ قابض ہے خود بخود غائب ہو جائیگا -
مجھے امید ہے کہ اکیڈیمی بھی اردو کی اس اہم ترین خامی
کی طرف توجہ کریگی -

ضلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاحیں

(از پروفیسر محمد نعیم الرحمان ' ایم - اے)

(۲)

ت

تاپ—امث - ستون کے نیچے (فرش پر یا اُس کے قریب) گول یا چوکور کرسی ' جو باقی ستون سے باہر کو نکلی رہتی ہے - اگر اوپر پہنچ کر ستون پھر اسی طرح کی چنائی میں ختم ہو ' تو اُسے بھی تاپ کہتے ہیں - ان دونوں میں فرق کرنے کے لیے "نیچے کی تاپ" اور "اوپر کی (یا اوپر والی) تاپ" بولا جاتا ہے -

تاکی—یا تانکی (نون غنہ سے) - امث - - لوہے کی ایک موتی سی مضبوط سیخ ' جس کا ایک سرا پتلا ہوا اور دھار دار ہوتا ہے - اس سے دیوار یا سخت زمین یا فرش کھودنے اور چنائی کو توڑنے کا کام لیا جاتا ہے - اگر چھوٹی ہو تو اُسے چھینی کہتے ہیں -

تیپ— امث - (یائے معروف سے) - دوسرا نام ہے (۱) پیتن ' اور (۲) مکھائی کا - دیکھو پیتن ' مکھائی -

تمک (کنی کی)—امث - (یائے مجہول سے - بغ تیکنا—ٹکنا ' ٹکنا) کنی (ـعد) کا نیچے کا حصہ جو رکھنے میں زمین پر لگتا (ٹکتا) ہے -

تھ

تھاتھہ—اسذ - ناس یا لوھے کا پنجر' جافری (جعفري) - دیکھو جافري -

تھڑیا—اسث - (تھہ کے زبر سے - دیہاتي پوربي تھڑا' تھڑي- تھڑنا = کھڑا ھونا - لہذا تھڑیا = کھڑی ھوئي' کھڑي) - باڑ میں وہ بانس یا بلیاں جو زمین پر عمودوار کھڑي کی جاتي ھیں اور جن سے اور بانس زمین کے متوازي باندھہ کر باڑ بنائي جاتي ھے - دیکھو باڑ -

تھیّا—اسذ - (تھ کے زبر' اور ي کے تشدید سے) - دیوار کي چنائي میں اینٹوں کا ردّا رکھتے ھوئے دونوں طرف کی انتہا پر نئے ردّے کي اونچائی اور سیدھہ کا اندازہ درست رکھنے کے لیے دونوں طرف ایک ایک اینٹ چن (جوڑ) کر اور ایک اینٹ پر سوت کا ایک آدھہ چکّر لپیٹ کر دوسري اینٹ سے دبا دیتے ھیں کہ سوت ھلنے اور ڈھیلا ھونے نہ پائے - یہ اینٹیں تھیا یا تھیہا کہلاتی ھیں -

تھیبا—اسذ- وہ پتھر جو تعمیر (مثلاً کمرے) کے کونے یا زاوئے میں لگایا جاتا ھے -

تھیہا—اسذ - (یاے معروف سے) - وھی ھے جو تھیا ھے'حذ-

ج

جافري—اسث - (جعفری) - جال' جنگلا سا پنجر جو بانس یا لکڑي یا لوھے کي چھڑیوں یا چھڑوں کو اس طرح اوپر نیچے رکھہ کر بناتے ھیں کہ ان کے بیچ بیچ میں لوري شکل کے خانے بنتے چلے جاتے ھیں - اسی قسم کا جال یا جنگلا جو

اینٹوں کی چنائی سے ، یا پتھر کو تراش کر یا سیمنٹ کو سانچے میں ڈھال کر بنایا جاتا ہے ۔ اس کو تھاتھ یا تھاتھر بھی کہتے ہیں ۔

جام—اسم ۔ کسی وزنی چیز کو اُٹھانے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سرکانے اور ہٹا کر رکھنے کا آلہ ، جو عموماً ایک لمبی اور موٹی سی سیخ کی شکل کا ہوتا ہے ۔

جُٹ—اسم ۔ (ج کے پیش سے) راجوں ، معماروں کی جوڑی ؛ دو راج جو ایک وقت میں کسی عمارت پر ایک ہی جگہ کام کر رہے ہوں ۔

جُڑائی—اسم ۔ (ج کے پیش سے ۔ جوڑنا ، جوڑ) ۔ تعمیری کام ، جس میں اینٹوں یا پتھر کے ٹکڑوں کو برابر برابر رکھ کر مٹی ، چونا ، سیمنٹ وغیرہ سے جوڑ کر تیار کیا جائے ۔ اسے ''چنائی'' بھی کہتے ہیں ۔ جڑائی یا چنائی کرنا یا جوڑنا مصدر ہے ۔

جیرَبند—اسم ۔ (یائے مجہول ، اور ب کے زبر سے) = زیر بند ، جد ۔

چ

چھارا—اسم ۔ وہ خشک چونا ، یا چونا اور بالو ملا ہوا ، یا سیمنٹ ، جو گیلی گچّی کے اوپر اس غرض سے چھڑکا جاتا ہے کہ وہ گچّی کی ضرورت سے زیادہ نمی کو جذب کرلے اور گچّی میں چونے کی (یا سیمنٹ کے فرش میں سیمنٹ کی) کمی کو بھی پورا کردے ۔ چھارے کو بچھا یا چھڑ دینے کے بعد گچّی پھر سے کوٹ دی جاتی ہے ۔

چھاںپ—اسم ۔ (نون غنہ سے) (۱) لکڑی ، لوہے یا پتھر کا

وہ سایبان جو کھڑکی یا دروازے پر باہر کی طرف اس غرض سے لگایا جاتا ہے کہ پانی کی بوچھاڑ یا دھوپ کھڑکی (یا دروازے) سے ہو کر اندر تک نہ پہنچ سکے۔ (۲) عموماً کسی قسم کا سایبان، جو کھڑکی یا دروازے پر باہر کی طرف لگایا جائے۔

جَھری — اسم — (جھرنے سے ؟ جھروکا) — (۱) دیوار میں یا دیوار اور زمین کے درمیان میں خالی شگاف یا خالی جگہ، عام اس سے کہ وہ شگاف باریک ہو یا فراخ۔ لیکن اگر شگاف بہت زیادہ کشادہ ہو تو اُسے جھری نہیں کہتے۔



(۲) کارنس میں یا جہاں کہیں گولے، پٹے وغیرہ کے درمیانی فاصلے میں بالکل سیدھی یا اتنی، معمولی دیوار کی چنائی ہو، اس حصے کو بھی جھری کہتے ہیں۔ اس شکل میں دونوں گولوں کے اندر جھریاں ہیں۔



چابی — اسم — (کنجی، تالی) ڈاٹ میں سب سے اوپر پہنچ کر بالکل درمیان کی اینٹ جس پر ساری ڈاٹ کا بوجھ پڑ کر ٹکا رہتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا یہ نام بھی ہوا ہے، گویا یہ کنجی ہے کہ اگر اس کو ہٹا لیا جائے تو باقی تمام ڈاٹ بھی محل کے الگ ہو جائیگی۔ انگریزی میں بھی اس

کو "کی‌سٹون" (Keystone = کنجی کا پتھر) کہتے ہیں -
اس کا دوسرا تلفظ چابھي ہے -

چابھي - امث - دوسرا تلفظ ہے چابي کا ، جد -

چالي — امث - (چلنا ؟ چال) - کئي بانس (جو عموماً زیادہ موٹے نہیں ہوتے) برابر برابر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھ کر رسي سے باندھ دئے جاتے ہیں -- چوڑائی کے لئے کوئي خاص مقدار یا حد مقرر نہیں ہے ؛ ضرورت کے مطابق ہوتی ہے - بے طور لچک کے روکنے کے لیے دونوں سروں پر اور درمیان میں نیچے کي طرف ایک ایک بانس آڑے رکھ کر باندھ دیتے ہیں - اس طرح جو ایک تختہ سا بن جاتا ہے ، اُسے چالي کہتے ہیں - اس کي غرض یہ ہوتی ہے کہ اُسے دار پر رکھ کر راج اُس پر بیٹھ کر کام کرتا ہے ، اور اُسي پر اینٹ ، چونا اور سب مسالا بھی رکھتا ہے - اس کے علاوہ کسی گہرے اور زیادہ چوڑے گڑھے پر ، یا عمارت کي دو دیواروں کے سروں پر ، جہاں سے گذرنا مشکل ہو ' چالی کو رکھ کر اُس سے پل کي طرح کام لیتے ہیں -

چَٹّا — امذ - (چ کے زبر ، اور ٹ کي تشدید سے) زمین پر اینٹوں کا (بغیر مسالے کے چنا ہوا) وہ فرش جو اس غرض سے بنایا جاتا ہے کہ اُس پر اینٹ یا پتھر کي کٹّي کو چونے میں ملاکر ساتا اور تعمیری کام کے لئے تیار کیا جائے -

چَدّري (ذات) - امث - (چدر=چادر) - ذات کی ایک قسم ہے ، جسے "بند دار ذات" بھي کہتے ہیں - دیکھو ذات -

چُکّے دار (ذات) - امث - (چ کے پیش ، اور ک کی تشدید سے)

ڈاٹ کی وہ قسم ، جسے "محراب دار ڈاٹ" بھی کہتے ہیں - دیکھو ڈاٹ -

چَسما—امذ - (ج کے زبر سے - انگریزی چیزم Chasm ؛ فارسی چسمہ) - (۱) لداؤ کی چھت کی ڈاٹ یا پُل کی ڈاٹ کی گہرائی - (۲) چھت کی کڑیوں یا شہتیروں کے درمیان کا فاصلہ -

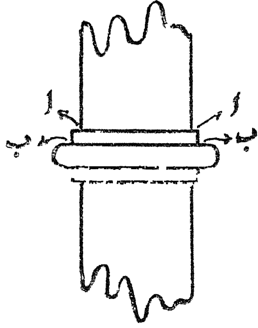
چلاکی—امث - (ج کے زبر سے - بعض لوگ الف سے پہلے نون غنہ بھی پیدا کرکے بولتے ہیں) - ڈاٹ بنانے کے لیے میانے (دیکھو میانا) میں جو کھونٹی لگا کر دائرے کا خط (اصطلاح میں فلکا) بناتے ہیں ، اُس مرکزی کھونٹی سے ڈاٹ کی سچی جڑائی کی اوپر والی آخری انتہا تک جتنی دوری (نصف قطر) ہوتی ہے ، اُسے چلاکی کہتے ہیں -

چِمنی—امث - (ج کے زیر سے - انگریزی چمنی Chimney) - دودکش کا وہ حصہ جو چھت کے اوپر نظر آتا ہے -

چِنائی—امث - (ج کے زیر سے) - مترادف ہے جڑائی کا ؛ چد -

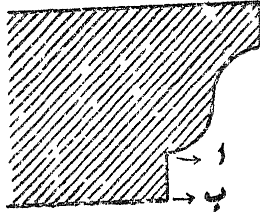
چُنَہا—امذ - (ج کے پیش اور نون کے زبر سے - چونا ؛ چونا ہار ، چونے والا) - چونا لانے والا مزدور ؛ وہ مزدور جو راج کو چونا لا لاکر دیتا ہے -

چِنیا—امث - (چ کے زیر سے) - ایک قسم کی چنائی ، جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں (۱) دیوار یا ستون میں سامنے کی طرف پتھر کے "گولے" کے اوپر ، یا اوپر اور نیچے دونوں طرف ، پتھر یا اینٹوں کی چنائی - گولا آگے کو نکلا رہتا ہے ، اور چنیا اُس کے اوپر (یا اوپر اور نیچے دونوں طرف) پیچھے کو ہٹی رہتی ہے - چنیا کے اوپر پھر معمولی



چنائی شروع ہو جاتی ہے -
اس شکل میں ا جو ستون کا ایک رخ ہے ا ب الف ب جنبا ہے جو گولے کے اوپر ہے -

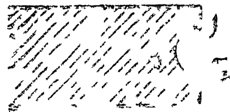
(۲) دوسری صورت جنبا کی ذیل کی شکل سے ظاہر ہے - اس میں بھی الف ب جنبا ہے - اسی کو "استر کی کور" بھی کہتے ہیں —



جُوتر—اسم - (ج کے پیش اور ت کے زبر سے) دیکھو بھولن -

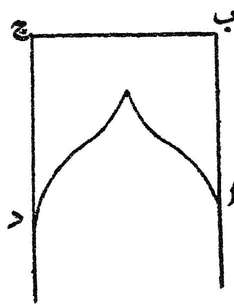
جورس—صفت - (ج اور ر کے زبر سے) - ہموار، جس کی سطح سب برابر ہو - "جورس کرنا" = ہموار، برابر کرنا -

جھوری—اسم - (واؤ معروف سے) - دیوار کے ایک پتھر میں اینٹ یا پتھر کی جوڑ دار جھلائی - خاص کر کارنس (کارنس) والے میں کام آتی ہے - ذیل کی شکل میں الف، ب، ج جھوری ہے —



چوڑی عام طور پر ڈھائي یا تین انچ میں بنائي جاتي ھے - اگر اس سے چھوٹي بنائی جائے تو اُسے "کنکي" کہتے ھیں -

چوکھٹا—امذ - (ح کے زبر سے) - وہ چوکھونٹي سي چنائي جس میں اوپر کي طرف دو قائمہ زاویے ھوتے ھیں ؛ اور جو ڈاٹ کے اوپر بنائي جاتي ھے - اِس شکل میں الف ، ب ، ج ، د چوکھٹا ھے -



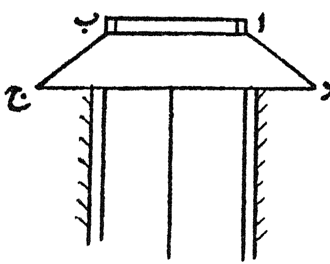
چَوّلا—امذ - (چ اور و کے زبر اور ل کي تشدید سے) - چار آدمي (راج) جو ایک ھي وقت میں ایک جگہ مل کر کام کررھے ھوں -

چھکا—امذ - (چ کے زبر سے) - کھنروں یا اینٹ کي پھوڑي کا وہ ردّا جو پتھر کی چھت تیار کرنے میں کسسے کے اُوپر رکھا جاتا ھے - پتھر کی چھت تیار کرنے کا بہترین طریقہ یہ ھے کہ پہلے سب سے نیچے لوھے یا مضبوط لکڑي کے شہتیر رکھتے ھیں - اُس کے اوپر پتھر کے چوکے رکھنے کے بعد کچھہ مٹي لادي جاتي ھے ؛ جو زیادہ سے زیادہ دو تین انچ موٹي تہہ میں دي جاتي ھے اور کسسا کہلاتي ھے - اس مٹی کے اوپر چھکا دیا جاتا ھے - پھر چھکے کے بعد گٹي کوٹ کر آخر میں چونے کا استر دے کر ختم کرتے ھیں -

چھ

چھاوني—امث - (ھندی · چھانا ؛ چھایا) - وہ چیز (مثلاً کھپریل ؛ سربت وغیرہ) جس کو چھت کے اوپر ڈال کر چھت تیار کي جائے -

چَھجلی—امث - (چھہ کے زبر ، اور ج کے پیش یا سکون سے - ہندی چھاج کی مصغر صورت) وہ چھجا جو دروازے یا کھڑکی کے اوپر پتھر میں (یا اینٹوں سے) بنا کر لگایا (اصطلاح میں "لتکایا") جاتا ہے - اس شکل میں الف ، ب ، ج ، د چھجلی ہے -



چھساس—یا چھسانس— صف ، امث - (چھ کے زبر سے) - چھ ضلعوں یا پہلوں والی شکل -

چھینٹی—امث - (پہلی ی مجہول) - چھوٹی تاکی - دیکھو تاکی -

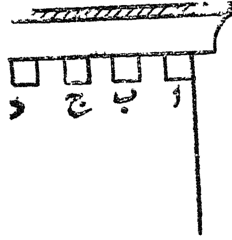
د — دھ

داغ بیل—امث - (یائے مجہول سے - فارسی داغ بیل ، داغ بیلچہ) - ہر وہ نشان یا خط جو بیل کو نمایاں اور سیدھا کرنے کے لیے بنایا جائے ، عام اس سے کہ وہ زمین پر ، مکان کی بنیاد کی کھدائی سے پہلے ہو ، تعمیر کے دوران میں کسی قسم کی سیدھ درست کرنے وغیرہ کی غرض سے بنایا جائے -

داگ بیل—امث - بگڑا ہوا تلفظ ہے داغ بیل کا ، جد -

دانتوا—امذ - (نون غنہ سے - دانت ، دانتا ، دانتو) - چنائی یا پتھر میں وہ گڑھی ہوئی چنائی جو سامنے سے بالکل دانتوں کی شکل میں نظر آتی ہے - یہ عموماً سجاوٹ کے طور پر بنایا جاتا ہے کبھی اکیلا ، اور کبھی اور قسم کی

سجاوٹی چنائی (مثلاً پٹا ، چوڑی وغیرہ) کے ساتھ ملا کر - شکل یہ ہے .



اس میں الف ، ب ، ج ، د دانتوا ہے -

در (بنّٹی کا)—امذ - (د کے زبر سے فارسی در ، دروازہ) - دیکھو پیٹّی -

دَرَج—امث - (د اور ر کے زبر سے - فارسی درز کی بگڑی ہوئی صورت) دیکھو درز -

درز—امث - (د کے زبر سے - فارسی درز) چنائی میں وہ مقام جہاں دو اینٹیں ملتی ہیں ، دو اینٹوں کے ملنے کی جگہ پر دونوں کے درمیان کی درز ، دونوں کے بیچ کا شگاف - اس کو "مکھائی" اور "تیپ" بھی کہتے ہیں -

دَریسی کرنا—مصدر - (دریسی ، دال پر زبر ، اور ر کے بعد یائے مجہول - انگریزی ڈریسنگ ، dressing) - زمین کو برابر ، ہموار ، مسطح کرنا - چورس کرنا اور سمتر کرنا بھی کہتے ہیں -

دوگا—امذ - (واو مجہول سے) - چونا ، سفیدی ، سیمنٹ کا گاڑھا گاڑھا گھولن ، محلول ، جو استرکاری میں پلستر کے اوپر لگا کر گھوٹنے کے لیے بنایا جاتا ہے -

دویم—صف ۔ (واو مجہول ' م پر زیر ۔ فارسی : دوم ' دویم) ۔
اینٹ کی صفت ۔ دوسرے درجے ' دوسرے نمبر کی اینٹ ۔

دِھری—امث ۔ (د کے زیر اور ھ کے سکون سے ۔ تغ : دھلي ' دھلیز) ۔ دھلي ' دھلیز ' دروازے ' کھڑکي اور روشندان میں اندر کي طرف نیچے کي چوکھٹ کے سامنے کا فرشي حصہ ۔ اسے ڈیہر بھی کہتے ہیں ۔

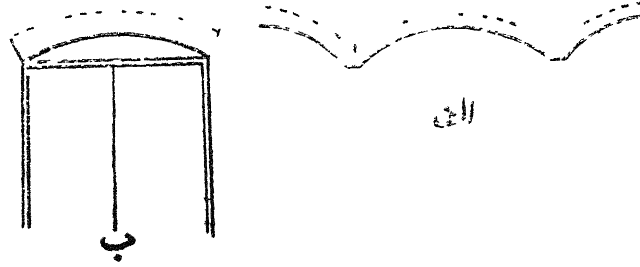
دھانگر—امذ ۔ (نون غنہ سے) ۔ پاڑ میں وہ بانس جو تھڑیا (جد) کو باندھ کر مضبوط کردینے کے لیے سامنے زمین اور دیوار کے متوازی لگایا جاتا ہے ۔ اس کو بینڈرا بھي کہتے ہیں ۔

دُھرمٹ—امذ ۔ (دھ اور م کے پیش سے) ۔ لوہے کا ایک نہایت وزني گول تاب کا اوزار ' جس کے اوپر ایک گہرا سا گھر بنا ہوتا ہے جس میں بانس یا لکڑی کا ایک لمبا سا دستہ لگا کر زمین یا کنکر ' گٹی وغیرہ کو کوٹ اور پیٹ کر برابر اور مضبوط کرتے ہیں ۔

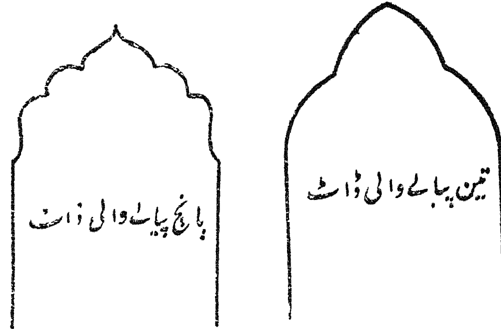
ڈ

ڈاٹ—امث ۔ (۱) لداؤ کی چھت بنانے کے لیے جو چنائي کي جاتی ہے ' جسے نیچے فرش پر کھڑے ہوکر دیکھنے سے پوري چھت ایک محراب کی صورت میں نظر آتي ہے ۔ (۲) محراب ' (کھڑکی یا در کے لیے) دروازے کي ساخت ' بناوٹ ۔ عام طور پر اس کی یہ قسمیں بتائي جاتي ہیں ۔ (۱) بجاوی (بیضاوی ۔ بیضوي) ' جس کي اوپر کي وضع بیضوی (انڈے کي وضع کي ' لمبائی کے ساتھ گول ہوتی ہے ۔

ذیل کي شکلوں میں الف چھت کي اور ب دروازے کي ڈاٹ ھے ۔

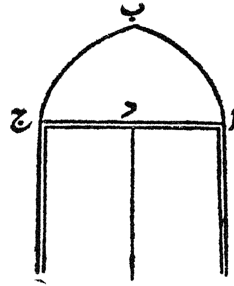


(ب) پیالے دار ' جس میں تین یا زیادہ پیالوں کي سي شکلیں بنائي جاتی ھیں - یہ پیالے تعداد میں طاق ھوتے ھیں ۔ ڈاٹ میں جتنے پیالے ھوتے ھیں اتنے ھي پیالے والي ڈاٹ کہلاتی ھے ۔ تین اور پانچ پیالے والي ڈاٹوں کي شکلیں یہ ھیں :—

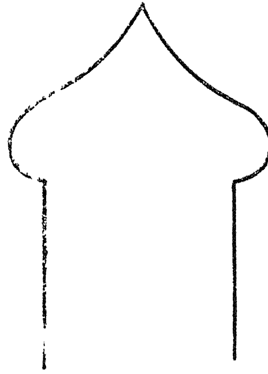


(ج) چکے دار ' جس میں اوپر چوٹی کی طرف ایک نوک سي نکلي ھوتي ھے اور دونوں طرف سے ڈھال کم ھوتا ھے ۔ اِس کا دوسرا نام " محراب دار ڈاٹ " ھے ۔

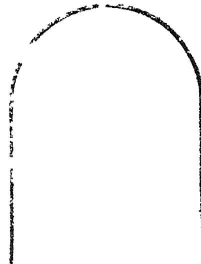
شکل یہ ہے ۔



(د) سلگمي (شلغمی) ؟ یعني وہ ذات جس کی شکل شلغم (شلجم) کي سي ہوتي ہے ۔



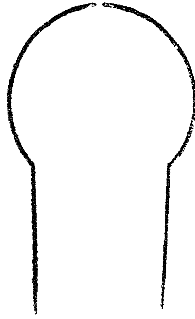
(ہ) گول ذات ؟ جس کي اُوپر کی وضع ایک نصف دائرے کي سي ہوتي ہے ۔



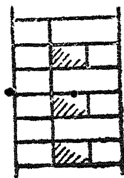
اس ذات کے بنانے میں اگر صرف ایک کھڑي اینٹ لگائی

جائے تو اُسے '' گھیرے دار ڈاٹ '' کہتے ہیں ؛ اور اگر ڈیوڑھ اینٹ (یعنی ایک اینٹ کھڑی اور ایک پڑی) لگائی جائے تو اُسے "چدری" یا "بنددار" ڈاٹ کہتے ہیں ۔

(و) گُھڑنال (گھ کے پیش سے ۔ گھوڑا × نال) ؛ جس کی وضع گھوڑے کے نال کی سی ہوتی ہے ۔ ۔

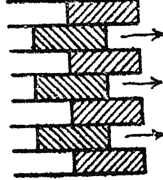


ڈاڑھا—امذ ۔ (رغ ڈاڑھہ ؛ ڈاڑھی) ۔ ایک دیوار کو چنتے ہوئے جب ایسی جگہ پہنچتے ہیں ؛ جہاں اُس سے دوسری دیوار (مقابل سے ؛ یا ایک پہلو سے ' زاویہ قائمہ پر یا کسی زاوئے پر) آ کر ملے ' تو اُس دیوار کے لیے اینٹیں آگے پیچھے گھٹا بڑھا کر چنی جاتی ہیں ۔ اِس طرح دوسری دیوار کی اینٹوں کے لیے جو حق چھوڑا جاتا ہے وہ ڈاڑھا کہلاتا ہے ۔ اِس کی دو قسمیں ہیں . (ا) سندوکچی (سندوقچی) ' جس کے دو نظارے یہ ہیں :—

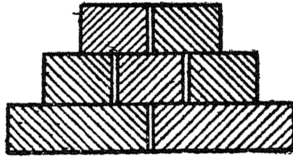


(الف) سامنے سے ' اس شکل میں تاریک حصے وہ گھر ہیں جو دوسری دیوار کی اینٹوں کے لیے چھوڑے گئے ہیں ۔

(ب) ایک پہلو سے - اس میں جو جگہیں خالی اور روشن ہیں وہ دوسری دیوار کی اینٹوں کے لیے چھوڑی گئی ہیں ۔—



(۲) ہٹتا ' جس میں اینٹیں چنائی کے وقت ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہٹتی ہوئی لگائی جاتی ہیں - اس کی صورت (ایک پہلو سے) یہ ہے : -



ڈانڑی—امث - (نون غنہ سے) - وہی ہے جو ڈنڈی ہے ، حد -

ڈَنڈی— امث - (ڈ کے زبر سے) - یا ڈانڑی - چنائی کا وہ حصہ ، جو ایک ستون میں اُس کی نیچے کی تاپ (جد) سے اوپر کی تاپ تک کے درمیان میں ہوتی ہے -

ڈنس—امذ - (ڈ کے زبر اور ن کے سکون سے) - گنیا (جد) کے مثلث میں وتر (یعنی زاویہ قائمہ کے مقابل کا ضلع) اور باقی دونوں ضلعوں میں کوئی سا ایک ضلع - وتر اور ایک ضلع ملا کر " ڈنس " کہے جاتے ہیں -

ڈوری—امث - (واو مجہول سے) - ڈوری (عموماً سوت کی) ' جس سے دیوار یا فرش وغیرہ کی سطح کے ہموار اور برابر ہونے کو جانچتے ہیں ، یا اینٹوں کی چنائی کی قطار کو ہموار اور سیدھا رکھنے کے لیے یا نشان بنانے کے لیے کام میں لاتے ہیں -

ڈیہرَ—امث (یای مجہول ، اور ہ کے زبر سے) - دوسرا نام ہے
دھری کا ، جد -

ڈھ

ڈھال—امذ - سطح کا آہستہ آہستہ نیچے کی طرف مائل ہونا ؛
ڈھلوان ، سلامی سطح - اسی معنی میں "نرماہٹ" بھی
بولتے ہیں -

ڈھاہ—امذ - (ڈھہنا - گرنا ، ٹوٹ کر گر پڑنا) - مٹی کا وہ ٹکڑا جو
زمین کھودتے ہوئے ، یا کُھدی ہوئی زمین میں چنائی کرتے
ہوئے ، زمین میں سے ٹوٹ کر گر پڑتا ہے -

ڈھولا—امذ - (واو مجہول سے) - اینٹوں کا وہ ڈھانچ جو ڈاٹ
بنانے کے لیے (عام اس سے کہ وہ ڈاٹ صرف دروازہ یا کھڑکی
بنانے کے لیے ہو یا پوری چھت کے لیے) فرش سے لے کر ڈاٹ
کے مقام تک کھڑا کرتے ہیں - جو اینٹیں اس کام میں لائی
جاتی ہیں اُن کو "نقلی اینٹیں" اور ڈھولے کی جڑائی
کو "نقلی جڑائی" کہتے ہیں -

ر

راج—امذ - معمار ، کاریگر ، جو چنائی وغیرہ کا تعمیری کام
کرتا ہے -

رَدا—امذ - (ر کے زبر ، اور د کی تشدید سے) - چنائی میں
ساتھ ساتھ رکھی ہوئی اینٹوں کی ایک قطار ، ایسی
اینٹوں کی ایک تہ - ردّا بنانے کے کام کو ردا لگانا ، رکھنا
اور جمانا کہتے ہیں -

رَنگت—امث - (ر کے زبر ، نون غنہ ، اور گ کے زبر سے - ہندی ·
رنگت ، رنگ ، رنگنا - فارسی رنگ) - بنیاد میں گِنّی

وغیرہ کُٹ جانے کے بعد جب دیوار کی چنائی شروع کی جاتی ہے، تو سب سے پہلا رّدا نہایت احتیاط کے ساتھ اونچ نیچ کی ہمواری، قطار کی سیدھ، زاویوں کا ٹھیک ٹھیک گُنیا میں (یا خاص مطلوبہ زاویئے میں) ہونا وغیرہ دیکھ کر رکھتے ہیں، کیونکہ اس پہلے ہی رّدے پر باقی تمام دیوار کی درستی منحصر ہوتی ہے - اس پہلے رّدے کو "رنگت" اور اس کام کو "رنگت کرنا" کہتے ہیں - رنگت کے درست طور پر سر انجام ہونے کو "رنگ جانا" یا "رنگت پوری ہو جانا" کہا جاتا ہے - کہتے ہیں۔ اس عمارت کی رنگت پوری ہو گئی، یا: یہ عمارت رنگ گئی -

روڑا—اسم - (واو مجہول سے) - اینٹ یا پتھر کا ٹکڑا، خواہ وہ کسی شکل اور کسی زاویئے میں ٹوٹا ہو - اُسے کنکر بھی کہتے ہیں - دیکھو بھڑکی -

روسا—اسم - (واو معروف سے) - بان کی شکل کا لکڑی کا ایک آلہ جس سے ریر بند (جد) کا کام لیا جاتا ہے - فرق صرف یہ ہے کہ ریر بند زیادہ لمبے چوڑے رقبے کی سطح پر کام میں آتا ہے، اُس سے کم رقبے کے لیے "گنکا" (جد) اور چھوٹے سے رقبے کے لیے روسا استعمال ہوتا ہے - بان کے اپراوے (یعنی اوپر کے حصے) میں لکڑی کو کچھ اُبھار کر چھوٹی سی دستی بنا دیتے ہیں - اس بان کا طول زیادہ سے زیادہ سات آٹھ انچ اور عرض چار پانچ انچ ہوتا ہے - دیکھو ریر بند، گنکا -

ز

زیر بند—امذ ـ (یای مجہول سے) ـ لکڑی کا ایک تختہ جس کی زیادہ سے زیادہ پیمائش طول میں چار فٹ ' عرض میں ڈیڑھ سے دو انچ اور موٹائی میں پون انچ ہوتی ہے ـ ایک طرف سے اُسے پوری صفائی کے ساتھہ ہموار کر کے بنایا جاتا ہے ـ دیوار یا فرش پر استرکاری کرنے میں زیر بند کو چونے (یا مٹی) کے پلستر پر پھیر کر اُسے ہموار اور صاف کیا جاتا ہے ـ زیر بند عموماً بڑے رقبے کی سطح پر استعمال ہوتا ہے ـ اس سے چھوٹی سطح کے لیے جو چھوٹا زیر بند استعمال ہوتا ہے اُسے " گتکا " اور اس سے بھی چھوٹے زیر بند کو " روسا " کہتے ہیں ـ دیکھو گتکا ' روسا ـ

س

ساج—امث ـ (ہندی . سجنا ' سجانا ' سجاوٹ) ـ سجاوٹ ' زیبائش ' آرائش کا کام ' خواہ وہ کسی قسم کا ہو ابنٹ کی عمارت میں ' یا پتھر گڑھ کر ؛ چلیا ' چوڑی ' پٹے وغیرہ کی شکل میں ' یا مختلف قسم کے نقش و نگار وغیرہ کی صورت میں ـ

ساہُل—امذ ـ (ہ کے پیش سے ـ عربی : شاقُول . ترکی : شاقول) ـ لوہے یا پتھر کا ایک گولا (یا کسی اور وضع کا ' لیکن لازمی طور اُس کا پیندا نیچے سے گول ہوتا ہے) ؛ جس کے ایک طرف ایک کُنڈا لگا ہوتا ہے ' جس میں سوت کی ڈوری باندھ دی جاتی ہے ـ اس سے دو کام لیے جاتے ہیں :

(۱) دیوار کي چنائي کی سیدھہ آزمانا اور درست کرنا '
(۲) میانہ (حد) دریافت کرنا ۔

سَبّل—امث ۔ (س کے زبر ' اور ب کے زبر اور تشدید سے)۔ وهی چیز ہے جو گدالا ہے ' حد ۔

ستماس—یا سنماس (نون غنہ سے) ۔ صف ۔ سات ضلعوں ' پہلوں والي شکل ۔

سدّھي—امث ۔ (س کے زبر اور د ھ کي تشدید سے) ۔ دوسرا اور کم استعمال تلفظ ہے " سیڑھي " کا ' جد ۔

سرخي ڈالنا یا چھوڑنا ۔ مصدر ۔ بدل کا نشان بنانے کے لیے کُٹي هوئي اینٹوں کي سرخی یا لال مٹي چھڑکنا یا ڈالنا ۔

سَلگَمي ڈات—امث ۔ (س اور گ کے زبر سے) ۔ دیکھو شلغمي ڈات ۔

سمتر—یا سمتھر ۔ صف ۔ (س اور ت یا تھ کے زبر سے) ۔ هموار ' برابر ۔ " سمتر (سمتھر) کرنا " : سیدھا ' برابر ' هموار کرنا ۔ " چورس کرنا " اور " دریسي کرنا " بھي اسی معنی میں بولے جاتے هیں ۔

سَندلا—امذ ۔ (س کے زبر سے) ۔ وہ چونا جو بیٹن کرنے میں چنائي کي درزوں کے اندر بھرا جاتا ہے ۔

سندوکچي ۔ یا سندکچی—امث ۔ (س کے زبر ' اور واو معروف یا محض د کے پیش سے ۔ فارسی صندوقچہ سے هندي مصغر ۔ موںث صندوقچي) ۔ ایک قسم ہے ڈاڑھا کي ، جد ۔

سیڑھي—امث ۔ (یاي معروف سے) ۔ بانس یا لکڑي کي بنی هوئي سیڑھي جس سے تعمیر کے کام میں مدد لي جاتي

ہے ۔ اس کا ایک اور (کم استعمال) تلفظ سدّھي بھي ہے ۔

سینگا—امذ ۔ (یاي مجہول ؛ اور نون غنہ سے) ۔ دیوار یا ستون کي اُبھري اور دبی ہوئي تحریروں یا پٹریوں کي چنائی میں وہ حصہ جو اوپر اُبھرا رہتا ہے ۔ دیکھو کھارا ۔

سیم—صف ، امذ ۔ (یاي مجہول ۔ فارسی سوم ، سویم = تیسرا ، تیسري) ۔ اینٹ کي صفت ہے ؛ اور بطور اسم کے بھی مستعمل ہے ۔ تیسرے نمبر ، درجے کي اینٹ ۔

ش

شلغمی ڈاٹ—امذ ۔ ڈاٹ کي ایک قسم ہے جس کي شکل شلغم (شلجم) کي سی ہوتي ہے ۔ دیکھو ڈاٹ ۔

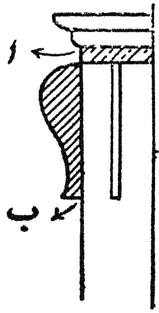
ف

فسیل—امث ۔ (ف کے زبر ، اور یاي مجہول سے ۔ عربي فصیل) ۔ (۱) کوئي ڈھلوان ، سلامي چنائي ۔ (۲) سلامی ، ڈھلوان ، نرم چنائي— خواہ وہ پوري دیوار کي صورت میں ہو ، یا کسی دیوار کو مدد پہنچا کر مضبوط کرنے کی غرض سے بنائی گئي ہو ۔ اس کو پھسل بھي کہتے ہیں ۔

فِلکا—امذ ۔ (ف کے زیر سے) ۔ محراب کی ڈاٹ بنانے کے لیے میانے میں کھونٹي لگاکر ڈھولے کے اوپر گولائی نکالنے کے لیے رسي (سوت) کو گھماکر دائرے کا نشان بنایا جاتا ہے تا کہ اس نشان کے ساتھ ساتھ چنائي کي جائے ۔ اس نشان کو فِلکا کہتے ہیں ۔

ک

کارنل — اسم - (ب کے زبر سے - انگریزی ۔ کوربل Corbel) - وہ چنائی جو کھڑکی کے اوپر، باہر کی طرف اور نگلس (جد) کے نیچے تریا کی جگہ بنائی جاتی ہے - اِس شکل میں الف سے ب تک کاربل ہے -



کانپھہ — اسم - (نون غنہ سے) - وہ سمنٹی (جونے کی) جو رکھے رکھے ہوا لگ کر جم گئی ہو ' جمی ہوئی سمنٹی -

کانٹا پکڑنا — مصدر - اینٹ اور چونے (یا سمنٹ) کے ملاپ کے بعد چونے یا سیمنٹ کا اینٹ یا اینٹوں کے اندر تک پہنچ کر جم جانا ؛ چونے یا سیمنٹ کا اینٹوں کو اپنی پوری طاقت سے پکڑ لینا -

کانس — اسم - (ن کے زبر سے - انگریزی کورنس Cornice عربی . قرناس ؟) - دیوار کی کنگنی ؛ چنائی کا وہ حصہ جو دیوار کے بالکل آخر میں اُوپر کی طرف سے دیوار سے باہر کو نکال کر بنایا جاتا ہے - اس میں یا تو صرف "پٹا" دیتے ہیں ، یا دہنا ، پٹا ، چوڑی ، گولا ؛ یہ سب ' یا اِن میں سے دو ایک ملا کر بنائے جاتے ہیں - اس سے دیوار کی مضبوطی اور خوبصورتی دونوں مقصد حاصل ہوتے ہیں -

کَبسا—امذ - (ک کے زبر سے) - مٹي کي وہ تہ جو پتھر کي چھت بنانے میں پتھر کے اُوپر دي جاتی ھے - یہ عموماً زیادہ سے زیادہ دو یا ڈھائي انچ ھوتی ھے ؛ اور اُس کي غایت یہ ھوتي ھے کہ چھت مضبوط بھي ھو جائے اور چھت کے نیچے (کمروں ، دالانوں وغیرہ میں) گرمي کا اثر بھي زیادہ نہ ھونے پائے - دیکھو چھکا -

کَہا—امذ - (ک کے زبر سے) - اصل میں کما (یا کمہ) ؛ حد -

کَتّل—امث - (ک کے زبر ؛ ت کی تشدید اور زبر سے - ھندی : کتّر) - اینٹ یا پتھر کا ٹکڑا ؛ خواہ وہ کسي شکل پر اور کسي زاویے میں ٹوٹا ھوا ھو - اُسے روڑا بھي کہتے ھیں - دیکھو بھوکي -

کُٹکي—امث - (ک کے پیش سے) - چھوٹی جوڑي ' وہ چوڑي جو صرف ایک انچ میں بنائی جائے - دیکھو چوڑي -

کَٹُوا—امث ؛ صف - (ک کے زبر اور ٹ کے پیش سے) - ایک قسم ھے پیٹنی کي ؛ جد -

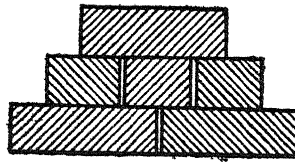
کَچھ—امذ - ک کے زبر سے - تغ پنجابی ؛ کچھہ = بغل) - دو دیواروں کے ملنے کي جگہ ' دو دیواروں کے درمیان کا زاویہ ؛ گوشۂ دیوار ' عموماً . ھر زاویہ خواہ وہ کتنے ھي درجے کا ھو - "کچھ کی اینٹ" وہ اینٹ جو کچھ میں لگي ھو یا اُس میں لگانے کے لیے بنائی یا گڑھی جائے -

کرسي—امث - بلندي ؛ اونچائي کي وہ مقدار جو زمین کي سطح اور کسي تعمیر (مثلاً چبوترے) کی سطح یا عمارت کے فرش کے درمیان میں ھو ؛ سطح زمین سے عمارت

کے فرش تک کا فاصلہ ' بنیاد سے لے کر تعمیر کے فرش
تک کی بلندی کا فاصلہ -

کَرّی— امث ؛ صف - (ک کے زبر ؛ اور ر کی تشدید سے - حقیقی
معنی : سخت ؛ مضبوط) - اینٹ کی صحت چنائی
میں اینٹ کا غلطی سے اس طرح لگ جانا کہ وہ تیل
سے باہر ہو ؛ اور اس طرح ساہل (شاقول) کے لحاظ سے
غلط لگ گئی ہو - اگر وہ اچھی طرح نمایاں طور پر
باہر تک نکل آئی ہو ؛ تو اُسے اینٹ کا " لتکنا " اور
اسی طرح لگانے کو " لتکانا " کہتے ہیں - دیکھو لتکانا -

کسکا— امذ - (ک کے زبر سے - دغ کھسکنا ؛ کھسکا ہوا) -
چنائی میں اینٹوں (یا پتھروں) کے ردوں میں اپنے سے
نیچے کے ردے کے مقابل میں اندر کی طرف ہونا -
اس قسم کا ہر ایک ردا ایک " کسکا " کہلاتا ہے -
شکل یہ ہے .



کفا— امذ - (ک کے زبر سے - فارسی کفہ ؛ کف=ہتھیلی ؛ ہاتھ) -
مسالے (یعنی مٹی ؛ چونے یا سیمنٹ) کی وہ مقدار جو
چنائی کرتے وقت اینٹوں کو جوڑنے کے لیے ان کے پہلوؤں
پر لگائی جاتی ہے - اگر پورے پہلو پر اچھی طرح مسالا
لگایا جائے تو اُسے " بھر پور کفا " کہتے ہیں -

کگار—امذ - (ک کے زبر سے - تغ کگر) - گڑھے یا کھدی
ہوئی زمین کا کنارہ اوپر کی طرف سے - "کگار گرنا" -
کگار کا ڈھیہ جانا ؛ گر پڑنا -

کَلَم—امث - (ک اور ل کے زبر سے - عربی قلم) - قلم
کی شکل کی نہایت ہی باریک کام کرنے والی کنی ؛
جس سے باریک پھول پتی وغیرہ بنائے جاتے ہیں -
یہ کنی کی سب چھوٹی اور نازک قسم ہے - اس کی
خود بھی کئی صورتیں ہوتی ہیں ؛ جیسی جیسی
جگہوں پر اس کو برتنے کی ضرورت ہوتی ہے اُسی لحاظ سے
اُس کی شکل اور بناوٹ میں فرق ہوتا ہے - دیکھو
کنی ، مجھولا ؛ پہلا -

کنکر—امث - (ک کے زبر ، اور نون غنہ سے) - (۱) اینٹوں کے
ٹکڑے ، ریزے - اسے کنکریٹ اور گٹی بھی کہتے ہیں - (۲)
مٹی کی کنکریں جو قدرتی عمل سے زمین کے اندر بنتی
رہتی ہیں اور مصنوعی طور پر بھی بنائی جاتی ہیں -

کنکریٹ—امث - (یای مجہول سے ، کنکر کے بلفظ سے - انگریزی
کونکریٹ concrete) (۱) کنکر ، گٹی ، روڑا ، روڑی ، اینٹوں
کے ٹکڑے ، ریزے - (۲) گٹی اور چونا ملا ہوا - (۳) سیمنٹ
اور پتھر کے باریک باریک ریزوں سے جو مسالا تیار کیا
جاتا ہے -

کَنّی—امث - (ک کے زبر ، نون کی تشدید ، اور یای مجہول
سے - مغربی اضلاع اور پنجاب میں اسے کرنی کہتے ہیں ،
جو غالباً سنسکرت करण=ہاتھ ، سے ماخوذ ہے) - لوہے کا
ایک آلہ جس کی شکل ایک لمبوترے یا چوڑے پان

کي سي هوتي هے - اس کے ایک طرف لکڑي کا ایک
سلامي سا دستہ لگا هوتا هے، جس کا باهر کا سرا موٹا هوتا هے
اور جو سرا کَنّي کي نوک میں لگا هوتا هے وہ پتلا هوتا هے -
یہ آلہ فرش یا دیوار وغیرہ پر مٹي، چونے، سیمنٹ
سے استرکاري (پلستر) کرنے یا جڑائي میں مسالا لگانے کے
کام آتا هے - چھوٹي کنّي کو "بگھولا" کہتے هیں، اُس سے
چھوٹي کو "نہلا" اور سب سے چھوٹي اور باریک قسم کو
"کلم" (قلم) -

کُنیا—امث - (ک کے پیش سے - کونا کی مصغر صورت) - لوهے
یا ٹین کا بنا هوا کھپرا، جس کي شکل آٹھ کے هندسے
کي سي هوتي هے (۸) اور جسے کھپریل کي چھاؤنی میں
سب سے اوپر دونوں طرف کے چھتوں کے ملنے کے مقام پر اس
غرض سے رکھا جاتا هے کہ وہ بن چپر کا کام دے اور پانی
کو دونوں طرف بہا کر اندر کي طرف ٹپکنے سے روک دے -
یہي کام مٹّي کے بنے هوئے "منگراوے" سے بھي لیا جاتا
هے - کُنیا کا ایک اور استعمال یہ هے کہ اُسے (کھپریل کی
چھت میں) اُلٹا کر کے (۷) اوپر سے نیچے تک اُس کونے
میں بچھاتے هوئے چلے آتے هیں، جو دو طرف کی کھپریلوں
سے مل کر پیدا هوتا هے - اس سے یہ هوتا هے کہ دونوں
طرف سے جو پاني بہ کر آتا هے وہ اس کُنیا میں سے
هوتا هوا نیچے جا گرتا هے اور چھت پر اثر نہیں هونے
پاتا - دیکھو کھپرا، منگراوا -

کری—امث - (راو سنبھول سے) - دیوار میں چنائي کا وہ حصہ جو
کھڑکي یا دروازے میں نیچے کي طرف چوکھٹ کے آگے اور

دیچھے کھلا ھوا رہ جاتا ھے ـ یہ نام صرف نیچے کے حصے ' یعنی فرش' کی ایسی چنائی کے لیے ھے ـ اس کے مقابل میں اوپر کی طرف کی چنائی کو "تھائی" کہتے ھیں ـ

کو تھائی ـــ امث ـ (واو مجہول سے) ـ گرڈر (گاڈر)' شہتیر کو درست اور سیدھا کر کے اُس کی صحیح جگہ پر جما کر رکھ دینے کو "کو تھائی کرنا" اور اس کی درست سمت کو "کوتھائی" کہتے ھیں ـ

کور (اینٹ کی) ـــ امث ـ دیکھو چنیا (۲)' اینٹ ـ

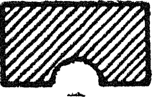
گُونچی ـــ امث ـ (واو معروف اور نون غنہ سے) ـ مونجھ کا بنا ھوا گول برش جس سے دیوار (وغیرہ) پر سفیدی (قلعی) کی جاتی ھے یا کوئی رنگ پھیرا جاتا ھے ـ

کھ

کھارا ـــ امذ ـ بعض وقت دیوار یا ستون کی چنائی اس طرح کی جاتی ھے کہ اُس میں کچھ حصہ پٹری (حد) کی شکل میں باھر کو اُبھرا ھوا ھوتا ھے' اور کچھ حصہ اندر کو دبا ھوا ـ ایسی چنائی میں دبے ھوئے حصے کو "کھارا" اور اُبھرے ھوئے کو "سنڈا" کہتے ھیں ـ یہ اُبھار اور دباؤ ھر وضع سے ھوسکتا ھے' خواہ اوپر سے نیچے کو ھو' خواہ دائیں سے بائیں کو (یعنی زمین کے متوازی)' یا ترچھی قطاروں میں ھو ـ غرض ایسی چنائی سے یہ ھوتی ھے کہ دیوار (یا ستون) خوبصورت نظر آئے ـ یہ چنائی اینٹوں اور پتھروں دونوں کو کھارے اور سینڈے میں باری باری دے کر بھی بناتے ھیں' اور صرف اینٹ یا صرف پتھر سے بھی ـ اسی طرح یہ بھی کرتے ھیں

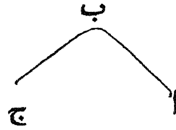
که کھارے اور سینکے میں ایک در استرکاری کردی اور دوسرے کو صرف پبتن کر کے چھوڑدیا - غرض که اس کی مختلف صورتیں اور وضعیں ھوسکتی ھیں -

کھانچ—اسم - (نون غنه سے) - اینٹ کے ایک حصے میں وہ گہرائی یا گھر جو اُسے اندر کی طرف سے کھود (گڑھ) کر بناتے ھیں - دیکھو برھا، پتّا - پتّے میں اگر کھانچ دے دیا جائے تو وہ برھا ھو جاتا ھے - کھانچ کی شکل یه ھے -



کھپرا—اسم - (کھ کے زبر سے) - کھپریل کی چھت کے چھانے کے لیے مٹی کے بنے ھوئے چوکور اور نصف دائرے کی شکل کے لمبوترے ٹکڑے کام میں لائے جاتے ھیں - چوکور ٹکڑا "کھپرا" کہلاتا ھے - یا تو وہ صحیح مستطیل شکل کا ھوتا ھے یا اُس کے عرضی ضلعوں میں سے ایک چھوٹا اور ایک بڑا ھوتا ھے، اور اس کے طولانی ضلعوں کے کنارے آدھ یا پون انچ کی اونچائی میں کھڑے ھوئے ھوتے ھیں - دوسرا ٹکڑا "نریا" کہلاتا ھے، اور ایک کُھلی ھوئی (نصف دائرے کی) شکل کی نالی کی طرح کا ھوتا ھے - چھاؤنی چھاتے وقت پہلے تو نیچے ته میں کھپرے اس طرح ساتھ رکھتے ھیں که اُن کی اُبھری ھوئی کوریں ایک دوسرے سے ملی رھیں، پھر اُن کے اوپر نریا کو اس طرح بچھاتے ھیں که ھر ایک نریا اندر (جوف) کی طرف سے دو دو کھپروں کے اُبھرے ھوئے کناروں کو ڈھک دے - اسی طرح پوری چھت پر کھپرا اور نریا بچھا کر چھاؤنی پوری کردی جاتی ھے - کھپریل کی شکل، اگر اسے ایک طرف سے دیکھا جائے تو، عموماً ایک

پھیلے ہوئے آتھ کے ھندسے کی سی ہوتي ھے -



اس میں ب کے مقام پر پہنچ کر پانی کو اندر تپکنے سے روکنے کے لیے ایک اور متي کا کھپرا پن چیر (حد) کے طور پر رکھا جاتا ھے - اُسے "منگراوا" کہتے ھیں - کبھی کبھی زیادہ مضبوطی کے خیال سے لوھے کا منگراوا رکھتے ھیں جسے کنیا کہتے ھیں -

کھبریل—امث - (کھ اور ر کے زبر سے) - وہ چھت جو کھپروں سے تیار کی جائے - دیکھو کھپرا -

کھرنجا—امذ - (کھ اور ر کے زبر سے) - دیکھو کھڑنجا -

کھڑنجا—امذ (کھ اور ڑ کے زبر سے) - کھڑی اینت کی چنائی ' وہ فرش جو کھڑی اینت کی چنائی سے تیار کیا گیا ھو -

کُھڑَھي (اینت)—صف ' امث - (کھ کے پیش اور ڑ کے زبر سے) - توتی ہوئي اینت ' ایسي اینت جس کا کوئي کونا جھڑا ہوا ھو یا کوئي کور توتي ہوئي ھو - اسے "بھڑکي" بھي کہتے ھیں -

کھنج منج—صف - (کھ اور م کے زبر سے - تغ فارسي ' کج مج ' کژ مژ=تیڑھا) فرش پر بچھائي ہوئي گئي . میں یا چنائي میں اونچ نیچ ' تیڑہ میڑہ کي مجموعي صورت -

کھنڈا— امذ - (کھ کے زبر سے) - پتری اینت کا وہ آدھا حصہ

جو اُس کے طول میں سے اس طرح کاٹ کر نکلا جائے کہ اُس کو چوڑائی میں سے آدھم آدھ کر دے -



اس شکل میں "اب ٭ د" اور "ب ٭ س ج" دونوں کھنڈے ھیں -

کھوتی ـــ امث - (واو معروف سے) - یہ دوسرا تلفظ ھے کھونٹی کا ؛ جد -

کھونٹی ـــ امث - (واو معروف ؛ اور نون غنہ سے) - (۱) میخ ؛ کھونٹی ؛ جو عموماً بانس کی کھپچی کی بنی ہوئی ہوتی ھے ؛ اور کسی بیل (خط) کے معانے (مرکز ؛ درمیانی مقام) کا نشان لگانے یا قلبا (جد) بنانے کے کام آتی ھے - (۲) بڑیا میں حھاپ کے رکنے اور ٹکنے کے لیے جو دا ب رکھے جاتے ھیں ؛ وہ بھی کھونٹی کہلاتے ھیں -

گ

گاڈر ـــ امذ - (ڈ کے زیر سے انگریزی ٬ گرڈر Girder) - شہتیر ؛ عموماً لوھے کا شہتیر -

گُٹکی ـــ امذ - (گ کے پیش سے) - چھوٹا ربر بند - دیکھو ربر بند -

گِٹّی ـــ امث - (گ کے زیر ؛ اور ت کی تشدید سے) - پتھر یا اینٹوں کے ٹکڑے - اگر یہ ٹکڑے بڑے بڑے ھوں تو اُنھیں "بڑی گٹی" اور چھوٹے چھوٹے ھوں تو "چھوٹی گِٹی" کہتے

ہیں - اینٹوں کے ٹکڑوں کو کنکر ، کنکریٹ اور ٹرپل بھی
کہتے ہیں -

گدالا—امذ - (گ کے زبر سے) - لوہے کی ایک گول سیخ ، جو تین چار فٹ تک لمبی اور ڈیڑھ سے دو انچ تک موٹی ہوتی ہے - اس کو دیوار میں سے اینٹ نکالنے ، دیوار میں سوراخ کرنے اور اسی قسم کے اور کام کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں -

گُرا—امذ - (گ کے پیش ، اور ر کی تشدید سے) - وہ رسی جس سے پاڑ کے مختلف حصے باندھے جاتے ہیں -

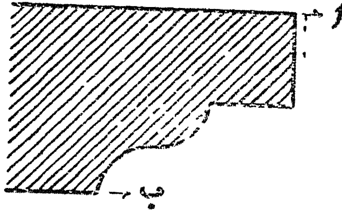
گُلتا—امذ - (گ کے زبر سے) - کارنس کی تمام اونچ نیچ کی تفصیل کا کوئی حصہ ، مثلاً : صرف ایڑ یا صرف چوڑی یا صرف بھٹا ، بھی "گلتا" کہا جا سکتا ہے -

گُنیا—امث - (گ کے پیش سے - فارسی گونیا ؟) - صحیح زاویہ قائمہ کی شکل میں بنا ہوا لکڑی یا لوہے کا کونا ، جس سے تعمیر کے قائمہ زاویوں ، یا فرش یا دیوار کی سطح کی ہمواری کو جانچتے ہیں ، اور اُس کے اندازے سے زاویے اور سطح کی غلطی کو درست کرتے ہیں - گُنیا یا تو محض ایک کونے کی شکل میں ہوتی ہے ، یا دونوں بازوؤں کو مضبوط اور سیدھا رکھنے کی غرض سے دونوں کے درمیان میں ایک اور ٹکڑا (لکڑی یا لوہے کا) لگا دیا جاتا ہے ، جس سے اس کی شکل ایک قائم‌الزاویہ مثلث کی ہو جاتی ہے - زاویہ قائمہ کی بالکل صحیح حالت کو ، یا سطح کی ہمواری کو "گُنیا میں ہونا" کہتے ہیں -

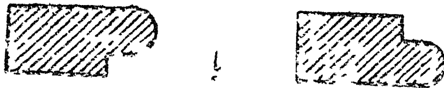
گول—امث - (واو مجہول سے) - آدمیوں (مزدوروں ، کاریگروں) کا

ایک گروہ (عموماً تین یا چار سے زیادہ کا) جو ایک ہی وقت میں کسی ایک کام کے کرنے پر لگا ہوا ہو -

گولا—اسم - (واو مجہول سے - ہندی گول ' گولائی ' گولا) - اینٹ یا پتھر کی وہ چنائی جو فرش کے کنارے پر (باہر کی طرف) ؛ یا دیوار یا ستون یا کارنس میں ؛ آگے کو نکلی ہوئی ہوتی ہے اور سامنے سے گول نظر آتی ہے - یہ ضرورت اور مقام کی مناسبت سے چھوٹا اور بڑا ہو سکتا ہے - شکل یہ ہے . -



گولا دو قسم کا ہوتا ہے (۱) اندھا گولا ؛ جو بہت چھوٹا ہوتا ہے اور اپنی ہستی کو پوری طرح جتلا نہیں سکتا - (۲) متن کا گولا ؛ جو خاصا بڑا ہوتا ہے ؛ اور اگر اینٹ میں بنایا جائے تو ایک پوری اینٹ میں سے بنایا جاتا ہے - شکل یوں ہے -



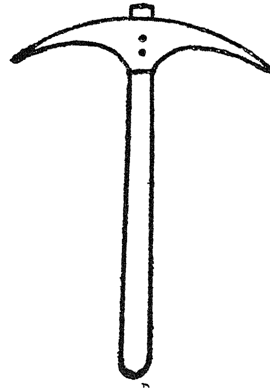
گول ڈاٹ—اسم - ڈاٹ کی ایک قسم - دیکھو ڈاٹ (۷) -

گُونا—اسم - (واو معروف سے) - دیوار کی جڑ میں ' فرش اور دیوار یا چھت اور دیوار کے درمیان میں ' چونے یا سیمنٹ کی وہ تہ جو اس غرض سے دی جاتی ہے کہ دیوار کی جڑ میں پانی نہ مرے - یہ تہ تین طرح کی ہو سکتی ہے ' (۱) سلامی شکل میں ؛ (ب) مجوف ؛ یعنی اندر کو گھسی

ہوئي ؛ اور (ج) محدب ' یعني باہر کی طرف اُبھري ہوئي -

گَہل—اسم ث - (گ اور ہ کے زبر سے) - ایڑ کا ایک حصہ دیکھو ایڑ (۲) -

گَینْتا—اسم ذ - (گ کے زیر ' اور نون غنہ سے) - لوہے کا ایک اوزار جس میں دو بازو ہوتے ہیں ' جو ۱۲۰ یا ۱۴۰ درجے کے زاویے پر ملتے ہیں - زاویے کے مقام پر ایک سوراخ ہوتا ہے جس میں لکڑي کا ایک لمبا سا دستہ لگا ہوتا ہے - ایک بازو آخر میں نوکدار ہوتا ہے ' اور دوسرے کے آخر میں ایک چپٹی سي دھار ہوتی ہے - اس اوزار سے سخت ' پختہ یا کنکریلي زمین کو کھودنے کا کام لیا جاتا ہے - شکل یہ ہے -



گھ

گھاٹا—اسم ذ - (بغ : گھاٹی ' گھاٹ) - بانسوں کو ملا ملا کر رکھ کے بنایا ہوا ایک عارضي پل ' جس پر چالي (جد) رکھ کر فرش سے چھت پر جانے آنے کا کام لیا جاتا ہے -

گھیرے دار ڈاٹ—اسم ث - ڈاٹ کي ایک قسم - دیکھو ڈاٹ (۸) -

ل

لیواں — ا ، صف - (ل کے زیر سے - ہندی : لیپنا ، لیپ) - ایک قسم ہے پیتن کی - دیکھو پیتن (ا) -

لٹکانا — مصدر - اینٹ (یا پتھر) کی چنائی میں اینٹ کے متعلق بولا جاتا ہے - اینٹ کو دیوار میں اس طرح چننا کہ وہ اپنے سے نیچے والے ردّے کی اینٹوں کے لحاظ سے دیوار کے باہر کو نکلی ہوئی رہے - اس انداز سے اینٹ لگانے کو " لٹکانا " یا " لٹکا کے لگانا " کہتے ہیں اور ایسے ردّے یا اینٹ کے بارے میں کہتے ہیں کہ " لٹک رہا (رہی) ہے " - دیکھو کری -

لَرحَھر — صف - (ل اور حھ کے زبر سے) - دیوار کی چنائی کے بعد اگر ایک طرف سے دیکھنے پر چنائی ایسی سطر آئے کہ اس کی کچھ اینٹیں باہر کو نکل آئی ہیں اور کچھ اندر کو دھنسی ہوئی سی ہیں ، تو چنائی کے اس آگے پیچھے اور ناہموار ہونے کی حالت کو " لرحھر " کہتے ہیں -

لونا — اسم - (واو مجہول سے - ہندی لون ، لونا) - نمک ، کھار ، ریہ ، جو پرانی یا خراب مسالے کی بنی ہوئی دیوار یا ایسے فرش کی چنائی میں پیدا ہو کر اُسے کمزور اور خراب کر دیتا ہے -

م

ماروازی — اسث - (ا) اینٹ یا پتھر کی وہ چنائی ، یا (۲) لکڑی کا وہ کام ، جو دیوار یا ستون یا اور کسی قسم کے تعمیری کام میں باہر کو نکلی (نکلا) رہے -

مَتَن کا گولا—امذ ـ (م اور ت کے زبر سے ـ عربي متن ' م کے زبر اور ت کے سکون سے) ـ گولے کي ایک قسم ـ دیکھو گولا ـ

متھالا—امذ ـ (م کے زبر سے)ـ چھت کي اوپر والي سطح ـ '' چھت کا متھالا '' کہتے ھیں ـ دیکھو اُپراوا ـ

مجھولا—امذ (واو مجہول سے ـ ھندي . منجھلا—سنسکرت : مدھي मध्य ' درمیانہ ' بیچ کا) ـ درمیانہ درجے کي ' بیچ کے قد کی ' چھوٹي کني ' وہ چھوٹي کني جو ناریک جگہوں میں استرکاري کرنے یا پیٹن بنانے کے کام آتي ھے ـ دیکھو کَنی ـ

محراب دار ڈات—امث ـ ڈات کی ایک قسم ھے ' جسے '' چکے دار ڈات '' بھي کہتے ھیں ـ دیکھو ڈات (ج) ـ

مزدور—امذ ـ (م کے زبر ' اور واو معروف سے ـ فارسي : مزدور ' اُجرت پر کام کرنے والا) ـ وہ شخص جو راج کے کام کے سوا اور سب کام کرتا ھے (مثلاً اینٹ ' پتھر ' چونا وغیرہ تعمیري مسالے کا لانا ' لے جانا ' ڈھونا ' اُٹھانا ' رکھنا وغیرہ) اور راج کو تعمیر میں مدد دیتا ھے ـ دیکھو بیلدار ـ

مُکھائي—امذ ـ (م کے پیش سے ـ ھندي مُکھہ ' مُنہ) ـ وہ درز جو پتھر یا اینٹ کي چنائي میں اینٹوں کے درمیان میں ھوتي ھے ـ اسی کو '' درز '' اور '' ٹیپ '' بھي کہتے ھیں ـ

ملبا—امذ ـ (م کے زبر سے) ـ ملبا ؛ گري ھوئي تعمیر کا مسالا ' اینٹ ' پتھر ' چونا ' کنکر ' مٹي ' تعمیر کے مسالے کے ریزے ' ٹکڑے ' گرے پڑے اجزاء—عام اس سے کہ وہ پرانے اور گرے ھوئے مکان وغیرہ کے ھوں یا نئي تعمیر میں کام کرتے وقت پیدا ھوں ـ

مُنڈیر—امث - (م کے پیش ' نون غنہ ' اور یاي مجہول سے) -
منڈسر ' دیوار کا سر جو چھت (یا فرش) زرا اوپر کو نکلا
رهتا هے -

منگراوا—امذ (م کے زبر ' اور نون غنہ سے) - مٹي کا بنا هوا آٹھ
کے هندسے کي شکل کا کھپرا ' جسے کھپریل کي چھاؤني میں
پن چیر (جد) کے طور پر سب سے اوپر رکھتے هیں - یهي کام
اسي شکل کے لوهے کے طرف سے بهی لیا جاتا هے ' جسے
گُنیا کهتے هیں - دیکھو کھپرا -

مُہَبّت—امذ - (م کے پیش ' ہ کے زبر ' اور ب کي تشدید اور
زبر سے) - وہ پتلے پتلے بانس یا بانس کي موتي موتي
کھپچّیاں ' جو کھپریل کی چھت میں کھپروں کو گرنے سے
روکنے کے لیے کھپروں کے آخر میں الوتیوں کے پاس لگا کر
بندھنوں سے باندھ دیے جاتے هیں -

مُہري—امث (م کے پیش سے) - موري ' نالي -

میانہ—امذ - (م کے زیر سے - فارسي : میان ' میانہ) - (۱) کسي
چیز ' یا تعمیر کے کسي حصے ' کا بالکل درمیاني حصہ '
بیچ ' مرکز - (۲) ڈیڑھ یا دو اینٹ کي چوڑائي کا ایک
چھوٹا سا مکعب چبوترہ ' جو عمارت کي تعمیر شروع کرنے
سے پہلے ' داغ بیل ڈالنے کے بعد ' دیواروں کے آثار میں بالکل
صحیح نصف کے مقام کا اندازہ قائم کرنے اور رکھنے کے لیے
بنایا جاتا هے - (۳) ایک کھونٹي (جد) ' جو اسي غرض سے
زمیں میں گاڑي جاتي هے -

ن

ناس—امث - (سنسکرت नासिका ناسکا ' ناک) - بوري چٹائي

کي يا ايک اينٹ کي کور ، يا اس کا کنارہ ، کگر - اسے ناسک بھي کہتے ھيں -

ناسک—امث - (س کے زير سے) - وھي ھے جو '' ناس '' ھے ، حد -

نرماھٹ—امث - (ن اور ہ کے زبر سے - فارسي : نرم) - ڈھال ، ڈھلوان ، ڈھلاؤ ، سطح کا سلامي ھونا -

نريا—امث - (ن کے زبر سے - ھندی : نالي ، نال—موري) - کھپريل کي چھت چھانے کے ليے مٹي کا وہ ظرف جو ايک طرف سے کُھلي ھوئی نالی کی شکل کا ھوتا ھے اور کھپروں کے نيچے بچھايا جاتا ھے - ديکھو کھپرا -

نِستَر—امذ - (ن کے زير اور ت کے زبر سے) - کنگنی اور پٹري (حد) بنانے کے ليے لکڑي کي ايک پٹری يا پٹي - اس کے استعمال کا طريقہ يہ ھے کہ جس مقام پر کنگني يا پٹري بنانا مقصود ھو وھاں نيل کا داغ ڈال کر نستر کو اس خط پر سيدھا رکھتے ھيں ؟ اور اس کے اُوپر يا (نيچے) مسالے (چونے يا سيمنٹ) کی تہ جما ديتے ھيں - تہ جم جانے پر نستر کو آھستہ سے ايک آڑا جھٹکا دے کر ھٹا ليتے ھيں - اِس طرح کنگنی (يا پٹري) کے اُوپر اور نيچے کي سطح صاف اور سيدھي بنتی ھے -

نسيني—امث - (پہلے ن پر زبر ، پہلي ي معروف اور شاذ طور پر مجہول) - بانس کي سيڑھی -

نقلي اينٹيں—امث - وہ اينٹيں ؟ جو نقلي (جد) ميں لگائی جاتي ھيں - ديکھو ڈھولا -

نقلی جڑائي—امث - وہ جڑائي (چنائي) جو ڈھولا بنانے ميں کام آتي ھے - ديکھو ڈھولا -

نکل—امث - (=عربي . نقل) - وهي چيز هےجس کو "تملچا"
اور "پکا ڈھولا" کہتے هیں دیکھو تملچا -
نکلي اینٹیں—دیکھو نقلی اینٹیں -
نکلي جڑائی—دیکھو نقلي جڑائي -
نَہلا—امذ - (ن کے زبر سے) - بہت چھوٹی سی کنی، جس
کا زیادہ سے زیادہ عرض آدھ انچ کا ہوتا ہے، اور جو
بہت باریک درزوں میں چونے یا سمینٹ سے کام بھرنے یا پیٹن
کرنے کے لیے برتي جاتي ھے - یہ کنی مجھولے سے چھوٹي
ھوتي ھے - دیکھو کني، مجھولا -
نیو—امث - (ي عموماً مجہول، کبھي کبھي معروف) - نیو،
بنیاد، بناء -

ھ

ھتتا—امذ - (ہ کے زبر سے ھندي ھتھا) - ایک قسم ھےداڑھا کي، حد -
ھول پاس—امذ - (انگریزی ? Hole pass) - لوھے کے بنے ھوئے
تار جو ضرورت اور تناسب کے لحاظ سے چھوٹے اور بڑے
ھوتے ھیں، اور کرسي یا دروازے کي چوکھٹ میں دونوں
پٹیوں کے باھر کي طرف لگائے جاتے ھیں - ان کو چنائي
کے اندر غرق کردیا جاتا ھے - غرض اِس سے یہ ھوتي ھے
کہ چوکھٹ چنائي سے الگ نہ ھونے پائے اور مضبوط رھے -

"هندستان" بغیر وآو کے صحیح هے-

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقي ' ایم اے-پي-ایچ-ڈي)

(۲)

رسالۂ "هندستاني" کي پچھلي اشاعت میں اِس مبحث پر ایک مستقل مضمون شائع هوچکا هے*؛ مگر وہ گرمیوں کي چھٹي میں لکھا گیا تھا اور اُس وقت بعض ضروري کتابیں مل نه سکیں که اُن کا حواله دیا جاتا - اُس کي تلافي اِن صفحوں میں کي جاتي هے -

مسعود سعد سلمان لاهوري† کے تین شعر لکھے گئے تھے ' اب اُسي شاعر کے دو شعر اور حاضر هیں —

(۱) بدست هر گر او را خیال و بندیشید
که من بقلعۂ سو مانم اُو به هندستان ‡

(۲) سه هفته بیش نه بودم به ملکِ هندستان
و گرچه بود بخوبي چو روے حور العین -§

امیر خسرو دهلوی کے دو شعر "دول راني خضر خان" میں سے نقل

---

* مضمون کے پہلے حصے (ص ۳۴۳—۳۷۱) میں کچھ غلطیاں رہ گئي تھیں اُن کي تصحیح یہاں کي جاتي هے —ص ۳۵۶' س ۲۱ "نولکشوري" صحیح نہیں ' "مطبوعۂ لکھنئو" چاهیے تھا - ص ۳۵۸' س ۱۶' "هر یک " ' ص ۳۶۰' س ۵ : "حو انتخاب" اور ص۳۶۸' س ۱۴ "کتاب کی کتابت" چاهیے -

† مسعود کا آبائي وطن همدان تھا ' مگر وہ لاهور میں پیدا هوا - (دیکھو رایل ایشیاٹک سوسائٹي ' لنڈن ' کا رساله بابت سنه ۱۹۰۵ ع ' ص ۷۰۱ اور اُس کے آگے) -

‡ ایضاً ' ص ۷۲۵ -

§ "آتشکدۂ آذر" (طبع بمبئي) ص ۱۶۵ -

کیے گئے تھے ' یہاں دو شعر اور لکھے جاتے ہیں ' ایک "قرانِ السعدین" سے دوسرا "ہشت بہشت" سے :—

(۱) صفتِ بیرۂ تنبول کہ نزدِ ہمہ خلق
بہ از آن نیست زمانے بہ ہمہ ہندستان ۔ *

(۲) بود فرماندھے بہ ہندستان
شہر و کشور بہ عدلِ او بستان ۔ †

اِن کے علاوہ اور اُستادوں کا کلام بھی "ہندستان" کی صحت کا شاہد ہے —

۱ ۔ محمد ابن عمر فرقدی کا شعر ہے —

باغ می ماند بہ ہندستان زانبوھیء زاغ
وآب ماند تیغِ ہندی را کہ مالی بر فسان ۔ ‡

۲ ۔ شیخ فریدالدین عطار علیہ الرحمۃ "لسان الغیب" میں فرماتے ہیں —

مِلک ہندستان و ترکستان زمیں
رفتہ چون اہلِ خطا از سوے چین ۔ §

---

* "قران السعدین" (طبع علی گڑھ) کے متن کے صفحہ ۱۸۵ پر یہ عنوان کا شعر ہے ۔

† "ہشت بہشت" (طبع علی گڑھ) ' متن ' ص ۹۶ ۔

‡ عوفی ' "لباب الالباب" (طبع یورپ)' ج ۲ ' ص ۳۱۶ ۔

§ "شعرالعجم" (مطبوعۂ اعظم گڑھ) ' ج ۲ ' ص ۱۰ ۔ "شعرالعجم" کے کاتب کا اِس شعر میں "ہندستاں" کو واو کے ساتھ لکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ اِسی جلد کے صفحہ ۲۸۳ پر خواجہ حافظ شیرازی کے اِس مصرعے "ترسم آں قوم کہ بر دُرد کشاں می خندند ' میں اصلاح دے کر حضرت کاتب نے "خندند" کو "خوانندند" بنا دیا ہے ۔ واقعی جائے اُستاد' خالی بھی تھی ۔

۳ - مولاناجلال‌الدین رومي کي مثنوي میں بهي "هندستان" (بلا واو) کئي جگه دکهائي دیا .—

(۱) چون که بازرگان سفر را ساز کرد
سوے هندستان شدن آغاز کرد -
(۲) چون که دراقصاے هندستان رسید
دربیابان طوطیے چندے بدید -
(دفتر ۱)

(۳) قاصدے دانا ز دیوانِ ادب
سوے هندستان روان کرد از طلب
(۴) سالها مي گشت آن قاصد ازو
گردِ هندستان برائے جست و جو
(دفتر ۲)

۴ - مولانا عبدالرحمن جامي کي "یوسف زلیخا" بهي "هندستان" سے خالي نهیں .—

چو ماتم دار گشت از نا امیدي
چرا رفت از سیاهي در سپیدي
ز هندستان مگر بودش نمونه
که باشد کارِ هندو بار گونه *

۵ - سلیم طهراني (متوفي سنه ۱۰۵۷ ه) —

(۱) بعیش آبادِ هندستان غمِ پیري نه مي باشد
که مو نتواند از شرمِ کمرها شد سفید اینجا - †

* " یوسف زلیخا " نولکشوري (سنه ۱۲۸۶ هجري) ص ۲۰۶ -
† " تذکرۂ حسیني " تالیف میر حسین دوست سنبهلي (نولکشوري سنه ۱۸۷۵ع ص ۱۵۶ -

(۲) نیست در ایران زمین سامانِ تحصیلِ کمال
تا نیامد سوی هندستان، حنا رنگین نہ شد - *

(۳) کی ز حسنِ سبز در ایران توان شد کامیاب
ہر کرا طاؤس باید رنجِ ہندستان کشد - †

۶ - میر رضی دانش مشہدی (متوفی سنہ ۱۰۷۶ ھ) نے ہندستان آنے کے شوق میں کہا ہے :—

راہِ دورِ ہنـــد پا بستِ وطـــن دارد مرا
چون حنا شب درمیان رفتن بہ ہندستان خوش است - ‡

۷ - ملا عبدالرزاق فیاض، لاہجی الاصل قمی الوطن، مصنف "گوہر مراد" کا شعر ہے —

سوی زلفش می کشد آشفتہ سامانی مرا
می کند تکلیفِ ہندستان پریشانی مرا §

۸ - شیخ ناصر علی سرہندی (متوفی سنہ ۱۱۰۸ھ) کی ایک غزل کا مقطع ہے —

این غزل، ناصر علی، اعجازِ ہندستانِ ماست
صائب اینجا می نہد سر خاک تا محشر جبین - ||

---

* "مآثر الکرام" ، ج ۲ ("سرو آزاد") تالیف میر غلام علی آزاد بلگرامی ص ۶۶ -

† "ارمغان" مولفۂ استادی مولانا محمد عبدالغنی خاں مرحوم (مطبوعہ آگرہ) ، ج ۳ ، ص ۱۸۵ -

‡ مآثرالکرام" ، ج ۲ ، ص ۸۷ - فیاض ، ملا صدرا کے شاگرد اور داماد تھے اور ملا محسن فیض کے ہمسبق اور ہمزلف - علاوہ "گوہر مراد" کے "سرمایۂ ایمان" بھی اُن کی ایک مشہور تصنیف ہے -

§ "مآثرالکرام" ، ج ۲ ، ص ۱۱۳ -

|| "دیوان ناصر علی" (مطبوعۂ مطبع مرتضوی) ص ۹۵ -

٩ - امین رازی نے "ہفت اقلیم" میں ہندستان کی تعریف میں تین شعر دیے ہیں، جن میں سے پہلا شعر یہ ہے —

اے خوشا وصل دے بہ ہندستان

کہ شود خانہ و چمن بستان - *

اِس قدر کثرت سے شعر اِس لیے سند میں دیے گئے ہیں کہ اطمینان ہو جائے کہ ہر طبقے اور ہر زمانے کے فارسی شاعروں نے "ہندستان" (بلا واو) کہا ہے اور بے تکلف اور ہر ممکن پہلو سے استعمال کیا ہے - ضرورتِ شعر کو اِس میں اصلا دخل نہیں -

"ہندستانی" (بلا واو) -

جو شواہد اب تک دیے گئے سب لفظِ "ہندستان" کے ہیں - "ہندستانی" (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) شعرا کے کلام میں کم ملتا ہے، لیکن اِس کے اسباب اور ہیں، یہ نہیں کہ وہ غلط ہے - جب "ہندستان" صحیح ہے تو "ہندستانی" کیوں کر غلط ہو سکتا ہے؟ اِسنادِ حجت کے لیے ایک شعر کافی ہوگا - حضرت امیر خسرو، "طوطیِ ہندستان" اپنے "ہندستانی" ہونے پر فخر کرتے ہیں - فرمایا ہے —

تُرکِ ہندستانیم، من ہندوی گویم جواب

شکرِ مصری ندارم، کز عرب گویم سخن - †

---

* "میخانہ" تصنیف ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی، مرتبہ پروفیسر محمد شفیع (لاہور سنہ ۱۹۲۶ع)، صفحہ "ص" -

† "اورینٹل کالج میگزین" لاہور بابت نومبر سنہ ۱۹۲۹ع ص ۳۳ -

ایک اور فارسی فرہنگ سے اِستدلال -

پچھلے مضمون میں " فرہنگ جہانگیری " ، " برہان قاطع " اور " بہار عجم " سے استدلال کیا گیا تھا - یہ تینوں فرہنگیں مستند ہیں ، مگر جس طرح ہر انسانی کام میں کچھ نہ کچھ کسر رہ جایا کرتی ہے اِن کتابوں میں بھی کہیں کہیں کوئی بات اصلاح کے قابل ہے - " فرہنگ جہانگیری " کی فرو گذاشتوں کی تلافی کی غرض سے " فرہنگِ رشیدی " تصنیف ہوئی - * " برہان قاطع " پر غالب نے اعتراضوں بلکہ خردہ گیریوں کی بوچھار کی ، کتنے جواب اور جواب الجواب لکھے گئے - خیر اِس بحث کا یہ مقام نہیں کہ غالب اور غالب کے جنبہ دار اِس مباحثے میں کس حد تک حق بجانب تھے - جب خان انجو (صاحب " جہانگیری ") اور محمد حسین برہان تبریزی اِس رد سے نہ بچے تو بچارے ٹیک چند بہار ، کہ ہندستان کی خاک سے تھے ، کس شمار قطار میں ہیں ؟ اِس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسی فرہنگ سے بھی استدلال کر لیا جائے ، جس کے مصنف کے قدم ہندستان کی خاک سے آلودہ نہ ہوئے ہوں ؛ وہ فرہنگ " فرہنگ انجمن آرائے ناصری " ہے - ناصرالدین شاہ قاچار کے عہد میں رضا قلی خاں ہدایت (صاحب تذکرۂ " مجمع الفصحا ") نے یہ کوشش کی کہ ٹکسالی فارسی کا ایک لغت ترتیب دے - اِسی کوشش کا نتیجہ ہے " فرہنگ انجمن آرائے ناصری " - † کتاب کے طویل مقدمے میں مصنف نے اپنے پیش رو

---

* " فرہنگ رشیدی " زیر بحث لفظ کے متعلق " فرہنگ جہانگیری " سے مطلق کوئی اختلاف ظاہر نہیں کرتی -

† طہران میں علی قلی خاں کے چھاپے خانے میں سنہ ۱۲۸۸ ہجری میں چھپی - دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف سنہ ۱۲۸۶ ھ میں ہوئی -

لغت نویسوں کی غلطیاں چن چن کر گنائی ہیں اور فرہنگ کے متن میں بھی جا بہ جا اوروں کی لغزشوں کا ذکر کیا ہے۔ رضا قلی خاں کی کتاب اِس لحاظ سے زیادہ مستند خیال کی جا سکتی ہے کہ اُس کے پیش نظر متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی تصانیف کا بیش قرار ذخیرہ تھا اور اُس نے ایران میں بیٹھ کر فارسی کا لغت لکھا، جو اُس کی زندگی ہی میں چھپ بھی گیا۔

خود فرہنگ کے متن میں مصنف نے "ہندوستان" یا "ہندستان" کو مستقل لفظ کی حیثیت سے نہیں قائم کیا ہے، البتہ "ہندسان" کو مستقل جگہ دی ہے۔ مگر اُس کی تشریح لفظ بہ لفظ وہی ہے جو "جہانگیری" میں ہے۔ اُس کے علاوہ لفظ "ہند" کے ذیل میں "ہندوستان" ضمناً آگیا ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:—

"و اہالی ایران آن ولایت را ہند و ہندوستان ولے اہل ہند ہر ولایتی را بنام آن بار خوانند چرا کہ ہند چہار قسمت شدہ و ہر قسمتی را نامے است چنانکہ اول ہند۔۔ دویم دکن الخ۔"

اِس کا مطلب یہ ہے کہ "ایران والے تو تمام ملک کو "ہند" اور "ہندوستان" کہتے ہیں مگر خود اہل ہند، صرف شمالی ہند کو "ہند" کہتے ہیں اور ملک کے باقی حصوں کو اُن کے مخصوص ناموں سے یاد کرتے ہیں، جیسے "دکن" [بنگال] وغیرہ۔" * اِس بات کا فرہنگ کے متن میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ "ہندستان" "ہندوستان" کا مخفف ہے۔ یہ غالباً اِس لیے کہ کتاب کے مقدمے

---

* کچھ "ہند" ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا "دکن" تمام۔ (میر)

میں مصنف اِس بات کو شرح و بسط سے بیان کر چکا ھے ۔ " ناصری " کے طویل مقدمے کو مصنف نے کئی حصوں میں تقسیم کیا ھے اور ھر حصے کا نام " آرائش " رکھا ھے اِس طرح پر بارہ " آرائشیں " سجائی ھیں جن میں زبان اور لغت سے متعلق اکثر مفید مطالب بیان کیے ھیں ۔ چنانچہ " آرائشِ دھم " میں " مصطلحات ضروریۂ علم صرف و نحو " سے بحث کی ھے ۔ اِس " آرائش " کے آغاز سے پانچویں صفحے * پر پہلے اِدغام کی تعریف کی ھے پھر لکھا ھے :—

"بہر کیف چوں تعبیر بادغام در فارسی کمتر آمدہ زیرا کہ خود تشدید درین زبان نہ ندرت وارد است بنا بر آن بیشتر در چنین صورتہا حرف اول را کہ ھم‌جنس ثانی یا قریب‌المخرج این باشد حذف نمودہ اند . و ظاھر آنست کہ حصولِ تخفیف نسبت بادغام در حذف زیادہ بود و حذف عبارتست از دور کردن حرفے از لفظے ؟ مفرد باشد یا مرکب ، و غرض از آن یا تخفیفِ لفظ بود یا بنائے کلمہ و یا ضرورتِ دیگر - در صورتِ تخفیف لفظ محذوف عنہ بمخفف تعبیر کردہ شود و وقوع آن برابر است کہ در صدرِ لفظ باشد یا در وسط یا در آخرش پس حذفِ یک حرف از صدر چنانکہ بلفظ شیب از نشیب . . . . و حذفِ یک حرف از وسط چنانکہ بلفظِ از از اگر و برون از بیرون و بد از بود † و چار از چہار

---

* صفحوں کے ھندسے ساری کتاب میں کہیں نہیں ھیں - پرانے دستور کے مطابق "ترک" کے لفظ ورق کے ختم پر لکھہ دیے ھیں جن سے یہ یقین ھو جاتا ھے کہ عبارت کا سلسلہ درست ھے -

† کتاب میں اِس جگہ "بودہ" ھے جو غالباً کتابت کا سہو ھے -

و راندن از رواندن و زنهار از زینهار و ستدن از ستادن و فرخت از فروخت و کشے از کاشکے و که از کاه ـ همچنین بغداد از باعداد و پرستان از پریستان و چرا از چه را و دشمن از دشت من و دشنام بمعني بدنام و شاباش از شادباش و کرا از که را و ورا از وي را و هندستان از هندوستان و با خدا از با وخدا ـ و حذفِ یک حرف از آخر چنانکه بلفظ بو از بود و رمند از رمنده و سیا از سیاه . . و گوا و گیا از گواه و گیاه و پادشا از پادشاه . . . . و شکرخند از شکرخنده و بادهند از نادهنده ـ دستور: لیکن حذفِ ها از لفظِ سیاه موجبِ مزیتِ فصاحت است و از گواه و گیاه و پادشاه مُخلِّ فصاحت باشد ـ ،،

اِس فارسی عبارت میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں اُن کا فقرہ وار خلاصہ ، اُردو میں ، یہ ہے :—

(۱) اِدغام فارسی میں کم آتا ہے اور خود تشدید ھي شاذ و نادر آتی ہے ـ بخلاف اِس کے حذف (فارسي میں) زیادہ آتا ہے ـ

(۲) تخفیف کا فائدہ اِدغام سے زیادہ حذف سے حاصل ہوتا ہے ـ

[یعنی ،، تخفیف ،، فارسي میں ایک اہم چیز ہے ـ]

(۳) حذف کہتے ہیں کسي لفظ کے شروع ، بیچ یا آخر سے ایک حرف کے دور کر دینے کو ـ

(۴) کسي حرف کو اِس طرح دور کر دینے سے غرض یا تو ،، تخفیفِ لفظ ،، ہوتي ہے یا ،، بنائے کلمہ ،، یا ،، ضرورتِ دیگر ،، ـ

[" ضرورتِ دیگر " میں ضرورتِ شعری بھی آگئی - " تخفیفِ لفظ " اُس سے الگ ایک چیز ٹھہری - *]

(۵) جس لفظ میں تخفیف واقع ہوئی ہو اُسے " مخفف " کہتے ہیں ، چاہے تخفیف لفظ کے شروع میں ہوئی ہو یا بیچ یا آخر میں -

" تخفیف " کی مثالیں :—

(الف) شروع سے ایک حرف کا حذف ، جیسے " نشیب " سے " شیب " ... وغیرہ

(ب) بیچ سے ایک حرف کا حذف ، جیسے —

" ار " (" اگر " سے) ، " برون " ، " بُد " ، " چار " . وغیرہ -

اِسی طرح " باعداد " سے " بامداد " ، " پریستان " سے " پرستان " ، " چہرا " سے " چرا " ، " دشت من " سے " دشمن " اور " دشت نام " سے " دشنام " ، " کہ را " سے " کرا " ، " وے را " سے " ورا " ، " ھندوستان " سے " ھندستان " ، " نا و خدا " سے " نا خدا " -

---

* صاحب " برھان " نے لکھ دیا تھا ' نورد بر وزن گرد مخفف نیورد است یعنی نمی ارزد - " میرزا غالب اِ ، تماشے پر یوں تنبیہ کرتے ھیں " دانستہ شد کہ ھیچ نداند ..و نورد را مخفف دکا داد گرید ، کہ نورد لغتے مستقل باشد - واینکہ در تقطیع شعر نورد بجاے نیورد آرند ضرورت شعر ست نہ تخفیف - ماھم بگذریم کدام کس در بلغا درنثر بجاے نیورد ' نورد آوردہ است - " (قاطع برھان " طبع اول ' ص۷۰=طبع دوم ' ص ۱۱۶ -)

صاحب " قاطع القاطع " نے غالب کے جواب میں جو کچھ لکھا ھے وہ ' خصوصاً رضا قلی خاں کے بیان کے مقابلے میں ' کوئی چیز نہیں - ضرورت شعری کی بحث میں جس چیز کو تخفیف کہتے ھیں وہ " تخفیفِ مشدد " ھے اور وہ اِس بحث سے تعلق نہیں رکھتی -

[اِن مثالوں سے ثابت ہو گیا کہ "ہندستان" کی وہی حالت ہے جو "بغداد"، "پرستان"، "دشمن"، "باخدا" وغیرہ کی ہے، اور یہ سب وہ لفظ ہیں جو نظم اور نثر دونوں میں بلا تکلف استعمال ہوئے ہیں -]

(ح) اخیر حرف کا حذف، جیسے —

"بود" سے "بو"، "رمندہ" سے "رمند"، "سیاہ" سے "سیا"، "گواہ" اور "گیاہ" سے "گوا" اور "گیا"، "پادشاہ" سے "پادشا" وغیرہ -

(۹) فائدہ — لیکن لفظِ "سیاہ" سے ہ کا حذف کر دینا فصاحت کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے اور "گواہ"، "گیاہ"، "پادشاہ" سے [ہ کو] حذف کرنا فصاحت میں خلل ڈالتا ہے -

[اِس فقرے سے یہ پوری طرح ثابت ہوگیا کہ "ہندستان" میں و کا حذف "مخلّ فصاحت" نہیں - کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح مصنف نے "گوا" وغیرہ کی نسبت لکھا ہے "ہندستان" کی نسبت بھی لکھہ دیتا -]

"ہندستان" عربی اور ترکی میں -

عربی میں "ہندستان" کے لیے "ہند" آتا ہے، مگر اِسے ہندستان کا اعجاز کہیے یا ایران کے لہجے کی دلکشی کہ ایک عرب مصنف نے بھی اپنی کتاب میں اِس لفظ کو جگہ دی - شمس‌الدین ابو عبداللہ محمد انصاری دمشقی (متوفی سنہ ۷۲۷ھ) کی کتاب "نخبة الدهر في عجائب البر والبحر"* کی ایک فصل کے عنوان

---

* اِسے ایک معروف مستشرق م-ا-ف مہرن نے بڑی احتیاط کے ساتھ کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے پہلے پہل سنہ ۱۸۶۶ع میں پطرسبرگ سے شائع کیا - دوبارا سنہ ۱۹۲۳ع میں لائپزگ سے شائع ہوئی مگر یہ دوسرا چھاپا پہلے کی عکسی نقل ہے -

میں "ھندستان" آیا ھے اور بغیر واو کے ھے - پھر چند ھی سطروں کے بعد یہ لفظ ملتے ھیں :—

"بلاد ھندستان و معناہ بالعربیہ بلاد ھند..."

(ص ۱۸۰) -

یہاں بھي "ھندستان" میں واو نہیں ھے - اِس سے سوا اِس کے اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ھے کہ مصنف نے جس طرح ایرانیوں کو بولتے سنا تھا اُسي طرح لکھا -

ترکي میں، مثل فارسي کے، "ھند" اور "ھندستان" دونوں لفظ استعمال ھوئے ھیں اور "ھندستان" بغیر واو کے بولا اور لکھا جاتا ھے - ردھاؤس (Redhouse) کا ترکي لغت مستند مانا جاتا ھے - اُس کا انگریزي ترکی حصہ* میرے پیش نظر ھے جس میں India کے سامنے لکھا ھے —

"ھند ھندستان"—(ص ۴۰۳)

اور Hindoo کے سامنے ھے —

"(۱) ھندي ھندستانلو† (۲) ھندستان آدمیلرینہ مخصوص و منسوب"‡

(ص ۴۰۰) -

غرض کہ ایرانیوں کا اثر جہاں کہیں پہنچا، "ھندستان" (بلا واو) بھي ساتھ ھي ساتھ لگا چلا گیا - پھر بھلا خود ھندستان کیوں کر بچ جاتا ؟

---

* مطبوعۂ قسطنطنیہ سنہ ۱۸۷۷ ع -

† "لو" کے معنے ھیں "والا" -

‡ یعني "ھندستان کے آدمیوں کے ساتھ مخصوص و منسوب" -

اُردو میں ـ

جیسا کہ پہلے حصے میں کہا جا چکا ہے اردو میں '' ہندستان '' (بلا واو) بولا جاتا ہے ' لکھنے میں بھی لوگ واو کو حذف کر دیتے ہیں ـ مثال کے طور پر چند کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے ' جو ہیں تو فارسی مگر جن کی کتابت اور تصحیح اردو بولنے والوں کے ہاتھوں ہوئی ہے :—

(١) '' غیاث اللغات '' (نولکشوری سنہ ١٨٩٠ع) کے صفحہ ١٥٧ پر '' ہندستان '' بغیر واو کے ہے باقی ہر جگہ واو کے ساتھہ ـ اسي کتاب کے اُس نسخے میں ' جو سنہ ١٨٨٧ع میں اُسي چھاپے خانے میں چھپا تھا ' اِس مقام (یعني ص ١٣٧) پر اور اُس کے علاوہ صفحہ ١٥٧ پر بھي '' ہندستان '' میں واو نہیں ہے ـ سنہ ١٢٨٣ ہجری میں ٹیک چند بہار کے پوتے دھرم چند نے '' بہار عجم '' چھپوائی تو اُس کے حاشیے پر بھی '' غیاث اللغات '' چھپی ' جس کی دوسری جلد کے صفحہ ٧٥٩ کے حاشیے پر '' ہندستان '' جلی قلم سے لکھا ہوا ملتا ہے اور اُس میں واو نہیں ہے ـ '' غیاث '' کا ایک اور نسخہ بھی نظر سے گذرا ـ یہ سنہ ١٢٧٢ ہجری میں علي بخش خاں کے '' مطبع علوي '' لکھنئو میں ' مولوي معشوق علي کی تصحیح سے چھپا تھا اور بہت صحیح ہے ـ اِس کے صفحہ ١٥٤ پر ایک بار ' صفحہ ٥٥٤ پر ایک بار جلي قلم سے اور پانچ بار معمولی قلم سے اور صفحہ ٥٥٩ پر ایک جگہ ' کل آٹھہ بار '' ہندستان '' بغیر واو کے ہے اور صرف دو جگہ (ص ١٧٧ اور ص ٥٥٥ پر) ایک ایک بار واو کے ساتھہ ـ

---

*دھلي میں منشی محمد سجادت علیخاں مدرس دھلي کالج کے '' مطبع سراجي '' میں چھپي ـ

(۲) سنہ ۱۲۹۸ھ میں '' سلطان المطابع '' لکھنؤ میں وابستہ کی
'' مصطلحات '' اور اُس کے حاشیے پر '' بہار عجم '' کا خلاصہ چھپا
تھا - اِس کی تصحیح مولوی جمیل احمد نے کی تھی - مصحح کی
نسبت خاتمے کی عبارت میں بہت سے ایسے توصیفی لفظ استعمال
کیے گئے ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ وہ اُس زمانے کے بڑے
سربرآوردہ علما میں شمار ہوتے تھے - اِس کتاب کے صفحہ ۴۰۰
کے حاشیے پر جلی قلم سے لکھا ہوا '' ہندستانی '' دکھائی
دیا جس میں واو نہیں -

اِن مثالوں سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ آج سے پچاس
ساٹھ برس اُدھر '' ہندستان '' یا '' ہندستانی '' ہمیشہ بغیر واو
کے لکھا جاتا تھا - لیکن یہ ضرور یقین ہوتا ہے کہ کاتب جن کی زبان
اُردو تھی اور جو برابر '' ہندستان '' بولتے اور سنتے رہتے تھے اپنے
تلفظ کے مطابق لکھ بھی دیا کرتے تھے اور مصحح جو اکثر فارسی کی
اعلیٰ استعداد رکھتے تھے اُسے روا رکھتے تھے - اِس لیے کہ وہ جانتے
تھے کہ '' ہندستان '' کا بغیر واو کے لکھنا بھی صحیح ہے -

خیر ، یہ تو کاتبوں اور مصححوں کا ذکر تھا - وہ حضرات بھی
جو زبان کے محقق ہیں '' ہندستان '' کو صحیح جانتے ہیں -
مولانا محمد حسین آزاد کے متعلق اِس مضمون کے پہلے حصے
میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ وہ '' ہندستان '' کو '' فصیح
سمجھتے تھے - ایک اور سند بھی حاضر ہے -

صاحب '' نوراللغات '' اپنی کتاب میں لفظ کی دونوں صورتوں
کو اِس طرح اعراب کے ساتھ درج کرتے ہیں —

'' ہِنْدُوسْتان - ہِنْدُسْتان - (ف) مذکر - مشہور
ملک . . ہندی - (ف) صفت - ہند سے

منسوب ۔ ھندُستان کا رھنے والا ۔ .... .. " *

"نوراللغات" میں اکثر لفظوں کي سند میں اُستادوں کے شعر یا مستند نثر نگاروں کے فقرے نقل کیے گئے ھیں لیکن اِس مقام پر کوئي سند نہیں دي گئي ' غالباً اِس لیے کہ اردو میں "ھندستان" برابر بولا جاتا ھے ؛ مصنف نے شاھد کي ضرورت نہ جاني ۔ پھر بھي اِس شبہے کي گنجائش رہ جاتي ھے کہ شائد مستند شاعروں کے کلام میں "ھندستان" (بلا واو) آیا ھي نہ ھو ۔ ایسا نہیں ھے ؛ ملاحظہ ھو —

۱ ۔ ملا وجہي نے ؛ جو گولکنڈے کے شاعروں میں بہت ممتاز تھے ؛ اپني ایک مثنوي میں "ھندستان" فعولن کے وزن پر (یعني لفظ کے پہلے نَ کو جو ساکن ھے نون غنہ کر کے) نظم کیا ھے† اور اِس طرح لفظ بحر متقارب میں سما گیا —

نہ پہنچے نہ پہنچیا ھے گن گیان میں
سو طوطي مُنج ایسا ھندستان میں ۔ ‡

بعضوں کے خیال میں شائد یہ سند کافي نہ ٹھہرے ؛ اِس لیے کہ مُلاّ وجہي تو بہت پرانے زمانے کے دکھني شاعر ھیں ' بعد کے جن لوگوں نے زبان کے بہت سے اجزا کو "متروک" گردان کر زبان کو "صاف" کر دیا ھے ؛ اُن کے کلام سے سند چاھیے ۔

۲ ۔ مرزا سوداؔ کے اُستاد ؛ شاہ حاتمؔ نے واقعی زبان میں بڑي

---

* " نوراللغات " ج ۴ ' ص ۶۹۲ ۔

† دکن کے لہجے میں ن ' ہ اور ي کو مخلوط بولنا آج بھي بہت عام ھے اور پرانے اساتذہ بول چال کے مطابق لفظوں کو نظم کیا کرتے تھے ۔

‡ ڈاکٹر محي الدین زور کي تصنیف " اردو شہپارے " ، ص ۹۳ ۔ وجہي کا زمانہ گیارھویں صدي ھجري کا نصف اول ھے ۔

اصلاح کی ؟ کہ دلی کے شرفا کی بول چال کو شعر کی زبان قرار دیا - چنانچہ اپنے متعلق خود ہی فرماتے ہیں:-

"و الفاظ عربی و فارسی ؟ کہ قریب الفہم و کثیرالاستعمال باشند ؟ و روزمرۂ دهلی ؟ کہ میرزایانِ ہند و فصیحانِ رند در محاورہ آرند ' منظور دارد .. ..
زبان ہندی بھاکھا را موقوف کردہ محض روزمرہ را ' کہ عام فہم و خاص پسند باشد ، اختیار نمود " *

اِن کے شعر میں بھی "ہندستان" بغیر واو کے موجود ہے -

اشک خون آلود میرے اِس قدر جاری ہیں آج
جا بجا لعلوں سے ہندستاں بدخشاں ہوگیا - †

مگر کہنے والے اِن کی نسبت بھی کچھ کہیں گے کہ اِن کی زبان بھی پرانی ہے - [لکھنئو] والے نہ بھی کہہ دیتیں تو عجب نہیں کہ دلی میں بولتے ہوں گے ؟ - بس ایک ایسے شاعر کے کلام سے سند لانا مناسب ہوگا جو بعد کے سخنوروں میں زبان کا بڑا مصلح مانا جاتا ہے -

۳ - شیخ ناسخ لکھنوی کے فارسی کلام ‡ سے قطع نظر ' اُن کے اردو کلام میں بھی "ہندستان" آیا ہے —

(ا) ہے ہمارے کفر کا باعث وہی ہندو پسر
دھوم جس کے حُسن کی ہے سارے ہندستان میں

---

* " آب حیات " آزاد (لاہور سنہ ۱۹۱۷ ع) ' ص ۱۱۵ -

† " گلشن ہند " مرزا علی لطف (لاہور و حیدرآباد سنہ ۱۹۰۶ ع) ' ص ۸۱ -

‡ جیسے رشک شاہان جہاں بادشہ " ہندستاں " - (" دیوان ناسخ " نولکشوری سنہ ۱۹۲۳ ' ج ۲ ' ص ۳۳۰) -

مقطع میں شاعر غزل کی زمین کی سختی کی شکایت اور اپنی فکر کی رسائی کی تحسین یوں کرتا ھے —

یہ زمین اچھی نہ تھی ناسخ و لیکن فکر نے
حسن پیدا کر دیا ھے نون کے اعلان میں *

اِس سے معلوم ھوا کہ یہ غزل خاص توجہ سے کہی گئی اور قافیے کے لفظ خاص اہتمام سے رکھے گئے ھیں - اُنھیں لفظوں میں "ھندستان" بھی ھے -

جرأت کے مرنے کی جو تاریخ ناسخ نے کہی یہ ھے :—

(۲) جب میاں جرأت کا باغِ دہر سے
گلشنِ فردوس کو جانا ھوا '
مصرعۂ تاریخ ناسخ نے کہا .
ھائے ! ھندستان کا شاعر مُوا - †

ناسخ کے نولکشوری دیوان میں "ھندستان" ھر جگہ واو کے ساتھ لکھا ھے اور اگر واو کو تاریخ کے مادے میں شامل کر لیجیے تو تاریخ ۱۲۳۱ ھجری ٹھہرتی ھے مگر جرأت کی وفات سنہ ۱۲۲۵ ھجری میں ھوئی - ‡ پس واو کاتب کے تصرف پر مبنی ھے - یہی حال سودا کی وفات کی تاریخ کا ھے .—

ار وحشت آبادِ دنیا - رفت بخلد رفیعِ سودا
گفتم سالِ وفاتش ناسخ - شاعرِ ھندستان ' واویلا ! §

یہاں کاتب نے ایک اور ستم کیا ھے کہ مصرعۂ تاریخ کے نیچے "۱۲۰۹"

---

* "دیوان ناسخ" ج ۲ ' ص ۱۲۶ -
† ایضاً ' ص ۳۲۵ -
‡ "آب حیات" ' ص ۲۴۹ - (یہاں بھی واو کا ذمہ دار کاتب ھی ھے -)
§ "دیوان ناسخ" ج ۲ ' ص ۳۲۴ -

لکھ دیا ہے ، حالانکہ راز کو شامل کرکے بھی مصرعے سے صرف ۱۲۰۱
نکلتے ہیں ، مگر واو یہاں بھی زائد ہے ، اِس لیے کہ سودا کی وفات کا
سال '' ۱۲۰۱ '' نہیں ہے - بلکہ ۱۱۹۵ ہجری ہے- * پس سوا اِس کے
کہ واو کو خارج کیجیے صحیح سال نہیں نکل سکتا - اِس سے بڑھ کے
کیا ثبوت اِس بات کا ہو سکتا ہے کہ ناسخ نے اپنے اِن سب شعروں
میں '' ہندستان '' بغیر واو کے لکھا تھا -

خلاصہ یہ کہ ''ہندستان'' بغیر واو کے صحیح بھی ہے اور فصیح بھی-

*'' گلشن ہند '' ص ۱۰۴ اور '' آب حیات '' ص ۱۵۱ اور حاشیہ -

اداریہ

اکتوبر کی موجودہ اشاعت میں ابتدائی تین مضامین وہ ہیں جو اکیڈیمی کی گذشتہ ادبی کانفرنس میں موصول ہوئے تھے - چوتھا مضمون "ضلع الہ آباد کے معماروں کی اصطلاح" پروفیسر نعیم الرحمان صاحب کے مضمون کا بقیہ حصہ ہے - ہم نے خیال کیا کہ "ہندستانی" کا پہلا سال ختم ہو رہا ہے ، جو مضامین طویل ہیں اُن کا سلسلہ اسی سال ختم کر دینا چاہیے تاکہ "ہندستانی" کی پہلی جلد اپنے مقام پر بالکل مکمل ہو ، اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ موصوف کا پورا مضمون اسی نمبر میں دے کر یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے -

---

"ہندستانی" کے جولائی نمبر میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ آیندہ نمبر میں ہم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ایک مقالہ لفظ ساھی پر پیش کریںگے لیکن لفظ "ہندستانی" پر موصوف کے مضمون کا ایک حصہ جولائی کے "ہندستانی" میں دیا جا چکا ہے - اُس کا بقیہ حصہ ہمیں اِسی نمبر میں ختم کر دینا چاہیے تھا اس لیے ظاہر ہے کہ "ساھی" والے مضمون کے لیے کہاں گنجائش نکل سکتی تھی ، بہر صورت "ساھی" پر موعودہ مضمون اب آیندہ نمبر میں پیش کیا جاسکتا ہے -

---

لفظ "ہندستانی" اور "ساھی" کی موافقت اور مخالفت ہمارے نزدیک چنداں قابل اعتنا نہیں ، اگر "ہندستانی" کو "ہندوستانی" اور "ساھی" کو "سہ ماھی" لکھا جاتا جب بھی

کوئي قباحت نہ تھي اور اب اگر "ھندستاني" اور "تماھي" لکھتے ھیں تو اس پر بھي قیامت برپا کرے کا کوئي موقع نہیں ھے - زندہ زبانوں کے جذب و قبول اور ان کي وسعتوں اور ھمہ گیریوں کا اگر لحاظ کیا جاے تو یہ اُمور قطعاً قابل توجہ نہیں رہ جاتے - چنانچہ ھم ڈاکٹر صدیقي صاحب کے مضامین اس عرض سے ھرگز نہیں شایع کر رھے ھیں کہ ان سے "ھندستاني" اور "تماھي" کا جواز ثابت ھوتا ھے اور یہ ایک بہت بڑي فتحمندي ھے ، بلکہ اس لیے کہ بقول عارف رومي - ع

لیک کار از کار خیزد در جہاں

ڈاکٹر صدیقي صاحب نے "ھندستاني" اور "تماھي" کے سلسلے میں جس تحقیق و تلاش سے کام لیا ھے ، اور جسے جیسے قابل قدر مسائل پر روشني ڈالي ھے وہ بجاے خود ایک مستقل حیثیت رکھتے ھیں اور اگر "ھندستاني" اور "تماھي" کي بحث بر روي کار نہ آئي ھوتي تو شاید ھم ان گرانقدر معلومات وافادات سے کلیۃً محروم رہ گئے ھوتے ، تاھم لفظ "تماھي" کي بحث کے بعد انشاء اللہ ھم اس سلسلے کو قطعاً ختم کر دینگے -

---

"ھندستاني" کے جولائي نمبر میں لفظ "سہرا" اور "سنہري" کے متعلق ایک مضمون "ادبي استفسار" کے عنوان سے شایع ھوا تھا - اس کے جواب میں ھماري اکیڈمي کے معزز ممبر مرزا محمد عسکري صاحب کا ایک مضمون اُس وقت موصول ھوا جب کہ ایڈیٹوریل بورڈ کي میٹنگ ھو چکي تھي اور اکتوبر نمبر کے لیے مضامین پریس میں دیے جا چکے تھے اس لیے افسوس ھے کہ اس مضمون کے لیے ھم گنجائش نہ نکال سکے لیکن اس خیال سے کہ اگر یہ مضمون کسي

آیندہ اشاعت میں نکلا تو "استفسار" اور جواب میں ایک طویل وقفہ ہو جائیگا اس لیے مختصراً ہم جناب مرزا صاحب کے مضمون کا خلاصہ یہاں پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں —

آپ نے اپنے ابتدائی حصۂ مضمون میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ "بعض لغات نویس اس لفظ کی حقیقت سے کماحقہ واقف نہیں ہیں، انہوں نے صرف لغت سابقہ کے معنی نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے" اس کے بعد آپ نے ان لفظوں کے محل استعمال کی تحقیق فرمائی ہے، چنانچہ آپ کے نزدیک "سنہری" ان چیزوں کو کہنا چاہیے جو ایسے تاروں یا پتر سی بنی ہوں جن پر سونے کا ملمع ہو، خالص سونے کی چیزوں کو "سنہری" نہیں بلکہ "طلائی" کہنا چاہیے دوسرے معنی سنہری کے ایک خاص رنگ کے ہیں جو زرد رنگ کی ایک قسم ہے یعنی جس میں زردی کے ساتھ ہلکی سی سرخی بھی شامل ہو، آپ کے نزدیک یہ معنی صرف کپڑوں کے لیے مخصوص ہیں اور اس معنی میں "طلائی" "سنہری" کا مرادف نہیں ہو سکتا۔ "مصنف سرمایہ زبان اردو اور ان کی تقلید میں صاحب نوراللغات نے غضب کیا کہ صاف صاف لکھ دیا کہ نام ایک رنگ کا جس کو طلائی بھی کہتے ہیں" -

خیر! یہ باتیں اصل مبحث سے چنداں تعلق نہیں رکھتیں، سوال لفظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق تھا، اس کے بارے میں مرزا صاحب کی رائے یہ ہے کہ لفظ "سنہری" کی "ی" یائے نسبت ہے اور اسی سبب سے مذکر الفاظ کے لیے "سنہرا" اور امالہ کی صورت میں "سنہرے" کا استعمال جائز ہے، آپ جلال لکھنوی کی اس تحقیق سے متفق نہیں ہیں کہ —

"شیخ ناسخ فرماتے ہیں —

وصف جب میں نے کیے تمرے سنہرے رنگ کے
خود بخود ہر صفحۂ دیوان مذہّب ہو گیا

یہاں لفظ سنہرے کو یاے مجہول کے ساتھ یعنی امالہ سنہرا پڑھنا خطا ہے اس واسطے کہ '' سنہری '' نام ایک رنگ کا ہے ' پس اس رنگ کی طرف خواہ شے مونث منسوب ہو خواہ شے مذکر' بہر طور اُس کو یاے معروف کے ساتھ پڑھینگے ' قیاس ہر رنگ ' اگرئی ' بسنتی چمپئی کے '' (سرمایہ زبان اُردو)

آخر میں '' سنہری '' اور '' سنہرے '' کی تذکیر و تانیث کے بارے میں آپ کی تحقیق یہ ہے کہ ,, (کم از کم لکھنٔو میں) مذکر الفاظ کے لیے '' سنہرا '' اور '' سنہری '' دونوں مستعمل ہیں مثلاً لچکہ ' جوڑہ ' رنگ ' کلس اور برج وغیرہ مگر مؤنث الفاظ کے لیے مثلاً ' بنت ' چنکی ' بیل ' گھڑی ' زنجیر وغیرہ کے لیے '' سنہری '' بولتے ہیں ' '' سنہرا '' قطعاً غلط ہے ' چنانچہ اِس قاعدہ کے ماتحت الفاظ مستفسرہ یعنی '' موقع '' اور '' بچھوٗ '' کے لیے چونکہ دونوں مذکر ہیں آپ کی رائے میں '' سنہرا '' اور سنہری '' دونوں بولنا جائز ہے آخر میں آپ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ '' یہ لکھنؤ کی بول چال ہے ممکن ہے دھلی میں کچھ فرق ہو '' -

---

اکیڈیمی نے اُردو اور ہندی شعبوں کی جانب سے یہ اعلان کیا تھا کہ یونیورسٹی کے اُن طلبا کو جو ڈراما ' افسانہ ' نظم ' ظفریات اور انتقاد ادب کے ذیل میں سب سے بہتر چیز پیش کرینگے سو سو روپیہ کا انعام دیگی ' ان مضامین کے بارے میں انعامی کمیٹی نے اب اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے ' چنانچہ شعبۂ اردو میں مسٹر مقبول حسین خاں بی - اے مسلم ہوسٹل الہ آباد کو '

اُن کے ڈرامے "شہید مغرب" پر اور مسٹر محمد عظیم الحق ڈی ۔ اے ، کرائیسٹ چرچ کالج ، کانپور کو اُن کے مضمون "اقبال کا فلسفۂ موت" پر سو سو روپے کے انعامات دیے گئے ۔

اسی طرح شعبۂ ہندی میں تین انعامات ، انتقاد ادب ، افسانے اور نظم پر دیے گئے ، ہندی میں "ظرافت ، افسانے اور ڈرامے ، اور اردو میں ظرافت اور نظم کے سلسلے میں کوئی چیز قابل انعام نہیں معلوم ہوئی ۔

اُردو اور ہندی ادب کی خدمت و ترقی کے سلسلے میں اکیڈیمی کا یہ طریق کار طلباء کی حوصلہ افزائی کا باعث ہے اور اس طرح بعید نہیں کہ ہم چند ہی دنوں میں بہت اچھے اچھے لکھنے والے اس صوبے میں طیار کر لیں ۔

آنجہانی بابو کرشن بلدیو ورما ہماری اکیڈیمی کی مجلس عامّہ اور مجلس عاملہ کے ایک سر گرم ممبر تھے ، آپ کی اچانک موت سے نہ صرف اکیڈیمی بلکہ ہندی کے عام ادبی حلقوں کو سخت دلی صدمہ پہونچا ہے ، اکیڈیمی کی گذشتہ کونسل کے موقع پر ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ نے بہ حیثیت پریسڈنٹ آپ کے انتقال پر اظہار تأسف فرماتے وقت یہ طے کیا تھا کہ رائے صاحب بابو شیام سندر داس ایک مقالے کی صورت میں آپ کے سوانح حیات کونسل کی آیندہ نشست میں پیش فرمائینگے ، ہمیں اُمید ہے کہ رائے صاحب حسب وعدہ یہ خدمت انجام دیکر اکیڈیمی کے ممبروں کو ممنون اور بابو کرشن بلدیو ورما کے کار ناموں کو زندہ جاوید بنائینگے

رسید کتب :—

مثنوي ناسخ — مرتبۂ حبیب‌الله خان غضنفر ایم-اے
ریسرچ اسکالر، الہ‌آباد یونیورسٹي، مطبوعہ کتابستان،
الہ‌آباد قیمت ۱۲ آنہ -

نقش ونگار —از خلیل احمد قدوائي بي-اے، مطبوعہ مسلم
یونیورسٹي علي گڑھ - قیمت ۱ روپیہ -

انتخاب حسرت —از خلیل احمد قدوائي بی-اے مطبوعہ
مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دھلی -

یورپین شعرائے اردو — مولفہ مولوی سردار علی صاحب
سلسلہ مطبوعات کتب خانہ مسجد چوک
حیدرآباد، دکن -

نفسیات تعلیمي —مصنفۂ محمد عثمان بي-اے (علیگ)
تي-ڈي (لندن آکسفورڈ) ویس پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج
حیدرآباد دکن -

اُردو گلستاں —مترجمۂ مولوي محمد خلیل الرحمن صاحب
سابق مالک و ایڈیٹر اخبار الخلیل، بجنور، ملنے کا
پتہ دفتر اردو گلستاں، بجنور (یو، پی) قیمت
۱ روپیہ ۴ آنہ -

آخری نبی —از الیاس احمد مجیبي-مؤ-فرخ آباد، ملنے کا پتہ-
"سرکار کا دربار" نام پلي، حیدرآباد دکن، قیمت ۴ آنہ

آں حضرت — ایضاً ایضاً قیمت ۶ آنہ

سرکار کا دربار — ایضاً ایضاً قیمت ۱۰ آنہ